جلد ۷۵ ماہ رمضان المبارک ۱۳۷۴ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۵۵ء عدد ۵

فہرست مضامین

معارف خاص نمبر

۵۱۳

سیرت و سوانح

فضائل و کمالات

علمی و دینی کارنامے

سلوک و تصوّف

متفرق مضامین

قطعات و تاریخی مادے

شذرات

حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے چند ہی مہینوں بعد سے سلیمان نمبر کی تیاری شروع کر دی گئی تھی، مگر مضامین کے حصول میں اتنی تاخیر ہوئی جس کا پہلے تصور بھی نہ تھا، اور خیال یہ تھا کہ خواہ کچھ دیر ہو جائے مگر اس نمبر کو حتی الامکان مکمل ہونا چاہئے، اس لئے اسکی اشاعت میں اندازہ سے زیادہ تاخیر ہوئی، مضامین میں کمیت کے بجائے کیفیت کا زیادہ لحاظ رکھا گیا ہے، چنانچہ زیادہ مضامین جمع کرنے کی کوشش نہیں کی گئی اور قریب قریب کل مضامین انہی اصحابِ علم کے ہیں، جن کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے قریبی تعلق تھا، ان کے جلوے اتنے گوناگون ہیں کہ ان کو ایک نمبر میں دکھانا مشکل تھا،

داماں نگہ تنگ و گلِ حسن تو بسیار گلچین بہار تو ز داماں گلہ دارد

تاہم اس کی کوشش کی گئی ہے کہ اُن کے جمال و کمال کا اجمالی مرقع سامنے آجائے،

شروع میں خیال تھا کہ مختلف پہلوؤں پر الگ الگ مضامین لکھائے جائیں اور کتابی ترتیب پر انکو مرتب کیا جائے، اگر مضمون نگاروں کو موضوع کا پابند کر دیتے ہیں، مضامین کے حاصل کرنے میں اور زیادہ دشواری ہوتی، اس لئے یہ خیال چھوڑ دینا پڑا، بیشتر مضامین کا موضوع اور اس کے مباحث عام ہیں یعنی ایک ہی مضمون میں مختلف پہلوؤں پر تبصرہ ہے اس لئے وہ ترتیب تو نہ ہو سکی جو پیش نظر تھی، تاہم مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے ایک موٹی سی ترتیب یہ قائم کر دی گئی ہے کہ پہلے سیرت و سوانح کا حصہ ہے پھر عمومی حیثیت کے مضامین، اس کے بعد علمی کمالات اور علمی و دینی کارناموں سے متعلق مقالات،

پھر سلوک و تصوف کے، اور آخر مین متفرق مضامین ہین، اس طرح ایک نوع کی ترتیب قائم ہوگئی ہے،

.... ✿ ....

ان مضامین سے حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی اور ان کے کمالات کے اہم رخ، اور ان کے بعض ایسے جلوے بھی سامنے آجاتے ہین، جو عام نگاہون سے مستور تھے، مگر ایک ایسی جامع کمالات ہستی کے حالات کا احاطہ جو تقریباً نصف صدی تک علم و فن کی ہر مجلس مین ضیا بار رہی ہو اور جس کے قلم نے اسلامی علوم و فنون کے دفتر کھنگال ڈالے ہون اور جس کے کارنامون سے دین و ملت کا ہر گوشہ معمور ہو، چند سو صفحات مین دشوار تھا، اس لئے یہ نمبر درحقیقت ان کا کوئی مفصل و جامع تذکرہ نہین بلکہ اس کا ایک اجمالی خاکہ ہے جس کی تفصیل انشاء اللہ حیاتِ سلیمانی میں پیش کیجائیگی، وما توفیقی الا باللہ،

آیندہ مہینہ کا پرچہ شائع نہ ہوگا، اس لئے ناظرین انتظار نہ فرمائین،

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سوانح حیات

از

سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب

ولادت و وطن حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت بروز جمعہ بتاریخ ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء مطابق ۲۳ صفر ۱۳۰۲ھ مین دیسنہ، ضلع پٹنہ، بہار مین ہوئی، یہ گاؤن پٹنہ کے سب ڈویزن بہار شریف سے مشرق جانب اٹھ میل پر واقع ہے، اور ہمیشہ سے بڑا مردم خیز گاؤن رہا ہے اور یہان بڑے بڑے اطباء، ڈاکٹر، انجینیر اور سرکاری حکام کے علاوہ علماء، فضلاء، صلحاء اور اتقیاء پیدا ہوئے،

خاندان سید صاحب اس گاؤن کے اُس خاندان کے لعلِ بے بہا تھے، جو دینی علوم کے ساتھ دینداری اور تقویٰ مین قرنون سے ممتاز چلا آتا تھا، ننہال کی طرف سے زیدی اور ددھیال کی طرف سے حسینی سید تھے، اُن کے دادا مولوی محمد شیر صاحب المعروف بہ حکیم میر محمدی اپنے زمانہ کے مشہور طبیب تھے، اور صاحبِ دل صوفی بھی، اُن کی ایک کتاب نورِ محمد مطبع برتیس الاخم گذہ مین چھپی ہے جس مین سہروردیہ اور قادریہ سلسلہ کے بزرگون کے کچھ حالات ہین، فنِ طب مین انھون نے دو کتابین قرابادینِ محمدی اور مخزن الحکمۃ العلیاء لکھین، اُن کی وفات کی تاریخ یہ ہے،

کیا ہوا ثانی بقراط و ارسطاطالیس
۱۳۰۳ھ

سید صاحب کے والد بزرگوار جناب سید ابو الحسن صاحب بھی بڑے حاذق طبیب تھے، زہد و تقویٰ وراثت مین ملا تھا، متانت و سنجیدگی تہذیب و شائستگی، اور نفاست و نظافت کے بھی نمونہ تھے، پٹنہ ضلع کے مشہور قصبہ اسلام پور

کے رئیس چودھری ظہور الحق اپنے زمانہ کے بڑے صاحب ثروت و وجاہت رئیس تھے، اُن کے گھر کے سب افراد
سید ابوالحسن صاحب کا بیحد احترام کرتے، اور اُن کے سامنے مؤدب ہو کر بیٹھتے تھے،

سید صاحب کے بڑے بھائی جناب سید ابوحبیب صاحب بھی فنِ طب میں بڑی مہارت رکھتے تھے، اتباع سنت
کا بڑا اہتمام رکھتے تھے، پوری عمر زہد و تقویٰ میں گذری، مجددی سلسلہ میں حضرت شاہ ابواحمد صاحب بھوپالی سے
بیعت بھی تھے،

سید صاحب اپنے بڑے بھائی سے اٹھارہ سال چھوٹے تھے، اُن کی تاریخِ ولادت پر اُن کے دادا صاحب نے ایک
قطعہ کہا تھا جس کے دو شعر یہ ہیں،

چو جستیم تاریخِ او از خرد	یکایک سروشے ز تاریخ و سال
بگفتا کہ بے داد شد مصرعے	شدہ مہرِ تابان ز برجِ کمال

۱۳۰۲ھ

یہ تاریخ ایسی نیک ساعت میں کہی گئی تھی کہ سید صاحب واقعی برجِ کمال کا مہرِ بن کر چمکے، اور یہ عجیب اتفاق
ہے کہ یہ مہر صوبہ بہار کے ایک گاؤں میں ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء کو طلوع ہوا، اور اکہتر سال کے بعد اسی تاریخ یعنی ۲۲ نومبر
۱۹۵۳ء کو کراچی کے اُفق میں غروب ہوا،

ابتدائی تعلیم | مکتبی تعلیم پہلے اپنے گاؤں کے ایک معلم خلیفہ انور علی اور پھر مولوی مقصود علی اکھدوی سے پائی
اور فارسی کی ابتدائی کتابیں ختم کرنے کے بعد عربی میں میزان و منشعب اپنے بڑے بھائی مولوی ابوحبیب صاحب سے
پڑھی، اس زمانہ میں اُن کے بڑے بھائی کو گاؤں کی مسلمان بی بیوں کو اسلام کی صحیح تعلیم سے آشنا کرنے کی دھن تھی، اس
کے لئے وہ ہفتہ میں ایک دن اُن کے سامنے اس طرح وعظ و تلقین فرماتے تھے کہ سید صاحب بی بیوں کے بیچ میں
بیٹھ کر مولانا اسمٰعیل شہید کی "تقویۃ الایمان" پڑھتے تھے، اور اُن کے بڑے بھائی صاحب مرحوم پردہ کے پیچھے سے اس کی
تشریح کرتے، اس طرح بھائی جو کچھ کہتے وہ سید صاحب کے دل میں بھی بیٹھتا جاتا، چنانچہ اپنی ایک تحریر میں فرماتے ہیں:
"یہی کتاب تھی جس نے مجھے دینِ حق کی باتیں سکھائیں، اور ایسی سکھائیں کہ اثنائے تعلیم و مطالعہ میں

بیسیوں آندھیاں آئیں، اور کتنی دفعہ خیالات کے طوفان اُٹھے مگر اس وقت جو باتیں جڑ پکڑ چکی تھیں اُن
میں سے ایک بھی اپنی جگہ سے ہل نہ سکی، علم کلام کے مسائل، اشاعرہ و معتزلہ کے نزاعات، غزالی و رازی
وابن رشد کے دلائل یکے بعد دیگرے نگاہوں سے گذرے مگر اسمٰعیل شہید کی تلقین بہرحال اپنی جگہ پر قائم رہی"
بڑے بھائی سے تعلیم پانے کے بعد مزید تعلیم کے لئے اپنے والد بزرگوار کے پاس اسلام پور گئے، وہاں سے ۱۸۹۹ء
میں پھلواری شریف پٹنہ آئے، یہاں ایک سال خانقاہ مجیبی میں رہ کر مولانا محی الدین (سجادہ نشین خانقاہ پھلواری
شریف) سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، خانقاہ کے بزرگوں کی صحبت میں علم و ادب کا شوق پیدا ہوا، خود سید صاحب
اپنی ایک تحریر میں فرماتے ہیں،

"یہاں خانقاہ میں ہر ہفتہ قوالی ہوتی تھی، اُس کے اثر سے اس قصبہ میں شعر و سخن کا چرچا تھا،
میں نے بھی اس فضا میں سانس لی، اور یہیں سب سے پہلے مولوی عبدالحلیم شرر کا ناول منصور موہنا دیکھا،
اس کا یہ اثر ہوا کہ جس وقت کتاب ختم کی، پھوٹ پھوٹ کر رو دیا"

یہاں کے قیام کے زمانہ میں شاہ سلیمان صاحب پھلواروی سے منطق کے ابتدائی دو چار سبق بھی پڑھے
پھلواری سے مدرسہ امدادیہ دربھنگہ بھیج دیئے گئے، یہاں چند مہینے رہے، اور داخلہ کے پہلے ہی ہفتہ میں وہاں کے
طلبہ کی انجمن میں "تعلیم نسواں" پر ایک ایسا مضمون پڑھ کر سنایا کہ ہر طرف تحسین و آفرین کا نعرہ بلند ہوا، یہ مضمون پٹنہ
کے مشہور اخبار "پنچ" میں بھی چھپا،

ندوہ میں داخلہ | ۱۹۰۱ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخل ہوئے، یہاں سات سال رہ کر تعلیم کی تکمیل
کی، طالب علمی کے زمانہ میں بھی متانت و سنجیدگی، تہذیب و شائستگی، مہر و محبت اور خلق و مروت میں ممتاز تھے،
اوصاف اُن کو اپنے والد بزرگوار سے ورثہ میں ملے تھے، عمر کے ساتھ یہ اوصاف بھی بڑھتے گئے، اور ندوہ میں اُن کے
علمی و ادبی ذوق کی نشو و نما اور ترقی ہوتی رہی، دینی علوم کی تحصیل کے ساتھ شعر و سخن کا ذوق بھی ابتدا سے تھا،
چنانچہ کم عمری ہی میں اپنے وطن دیسنہ کی انجمن الاصلاح کے سالانہ جلسہ میں ایک طویل ترکیب بند لکھ کر پڑھا جس کا

ایک شعر یہ ہے:

سچے کانون سے نہین سنتے ہین ارشاد نبی
ہین مسلمان بس اتنے ہی کہ کہلاتے ہین

اسی زمانہ مین امیر مینائی سے زیادہ متاثر تھے، ان کا دیوان مرآۃ الغیب برابر مطالعہ مین رکھتے تھے اور
کے مشاعرون مین امیر مینائی ہی کا روپ بھرتے تھے،

مضمون نگاری کی ابتداء

ان کا سب سے پہلا مضمون ۱۹۰۳ء مین "وقت" کے عنوان سے مخزن لاہور مین چھپا جس کے
اڈیٹر اس وقت اردو کے مشہور اہلِ قلم شیخ عبد القادر تھے، اسی سال سید صاحب نے اپنے وطن کی انجمن الاصلاح کے
جلسہ مین "علم اور اسلام" پر ایک بسیط مضمون پڑھا جس کو اہلِ علم نے پسند کیا، اور علی گڈھ کے مشہور رسالہ علی گڈھ
میگزین مین اڈیٹر کے تعریفی نوٹ کے ساتھ چھپا،

شاہ سلیمان پھلواروی کی پیشین گوئی

اس زمانہ مین ندوہ کے معتمد مولانا سید محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا شاہ سلیمان
پھلواروی اُس کے رکن تھے، یہ دونون بزرگ سید صاحب کی ذکاوت و ذہانت
کی وجہ سے اُن پر بے حد شفقت فرماتے تھے، خود سید صاحب بھی مولانا محمد علی مونگیری کی مذہبی اور دینی زندگی سے
بہت متاثر ہوئے، غالباً ۱۹۰۳ء مین نواب محسن الملک دار العلوم ندوہ تشریف لائے، اور طلبہ کا امتحان لیا،
اُن سے اخبارات پڑھوا کر سُنے، اس امتحان مین سید صاحب اوّل آئے، انھون نے نواب صاحب کی مدح مین اپنا
ایک عربی قصیدہ بھی پڑھ کر سنایا، جس سے نواب صاحب بہت محظوظ ہوئے، اس زمانہ کے اخبارات مین مولانا
شاہ سلیمان پھلواروی نے اس قصیدہ کا ذکر کر کے لکھا تھا کہ انشاء اللہ ہر زمانہ مین ایک سلیمان بہار کی سرزمین مین
علم اور دین کی خدمت کے لئے موجود رہے گا،

مولانا شبلی کا سایۂ عاطفت

۱۹۰۵ء مین جب مولانا شبلی دار العلوم ندوہ کے معتمد تعلیم ہو کر لکھنؤ آئے، تو طلبہ نے اس خوشی
مین جلسے کئے، تقریرین کین، نظمین لکھین، سید صاحب نے بھی اپنی مسرت کا اظہار ایک فارسی قصیدہ
مین کیا جس کا مطلع یہ تھا:

بدہ ساقی مے کو بفگند جلباب ظلمانی
خرد را نور بخشد از چراغ طور ایمانی

یہ پورا قصیدہ حیاتِ شبلی مین درج ہی مولانا شبلی مین جوہر شناسی کا خاص مادہ تھا، اس لئے ندوہ مین آتے
ہی اس جوہر قابل کو اپنے دامن تربیت مین لے لیا، اُن کے پاس مصر و شام کے مشہور عربی رسائل اور جدید تالیفات
رہتی تھین سید صاحب اُن کا برابر مطالعہ کرتے رہے جس سے اُن مین جدید عربی ادب کا ذوق پیدا ہوا، اور اتنا
بڑھا کہ وہ جدید عربی کے بھی اچھے ادیب شمار کئے جانے لگے، ۱۹۰۴ء (جمادی الثانی ۱۳۲۲ھ) مین مولانا شبلی
نے ندوۃ العلماء کی طرف سے الندوہ نکالنا شروع کیا، مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی بھی اس کی ادارت مین
شریک تھے، اسی زمانہ مین مولانا شبلی نے سید صاحب سے جرجی زیدان کی کتاب اللغۃ العربیہ کی تلخیص کرائی اور
اس کو بہت پسند کیا، اور جنوری ۱۹۰۵ء کے الندوہ مین شائع کیا، سید صاحب نے الندوہ کے لئے پہلا مضمون
"علم حدیث" پر لکھا جس کی داد مولانا حالی نے مولانا شبلی کو دی، مولانا نے سید صاحب کی علمی صلاحیت دیکھ کر اُن کی
طالب علمی ہی کے زمانہ مین الندوہ کی دیکھ بھال کا کام اُن کے سپرد کر دیا،

ذوقِ حدیث

مولانا شبلی کی تربیت مین ایک طرف اُن کی مضمون نگاری کی مشق جاری رہی، دوسری طرف
اپنے اُستاد مولانا حفیظ اللہ سے علم حدیث اور ہیئت مین علمی شوق کی تشنگی بجھا رہے تھے، اسی زمانہ مین شاہ عبد العزیز
صاحب محدث دہلوی کے رسالہ عجالۂ نافعہ کے پڑھنے سے اُن کو علم حدیث سے دلچسپی پیدا ہوئی، پھر بستان المحدثین
کے مطالعہ نے اس کا شوق اور بھی زیادہ کر دیا، اور آخر مین ائمہ محدثین مین سے امام مالکؒ نے اُن کے دل پر قبضہ کر لیا،
اور موطا امام مالک سے بڑی گرویدگی پیدا ہو گئی، پھر حافظ ذہبی کی تذکرۃ الحفاظ اور حافظ ابن حجر کی فتح الباری کے مطالعہ
سے محدثین کے کارنامون سے زیادہ واقف ہوئے،

حدیث کے شوق نے رجال کی طرف اور رجال نے تاریخ کی طرف رہنمائی کی، اور اس سلسلہ مین ابن ندیم
کی کتاب الفہرست، حاجی خلیفہ کی کشف الظنون اور ابن خلکان کی وفیات کا مطالعہ کرتے رہے، اپنی ایک تحریر مین فرماتے
تھا کہ مین نے ابن خلکان کی کتاب اتنی دفعہ پڑھی کہ اس کے حواشی اور حوالون سے اس کے اوّل و آخر کے صفحے

بھر گئے ہیں،

منطق، فلسفہ، اور ادب عربی کا ذوق مولانا فاروق چریاکوٹی کے درس میں پیدا ہوا، اور جب مولانا شبلی سے دلائل الاعجاز پڑھی، تو اس سے بہت متاثر ہوئے، اور اسی سے عربی لکھنے اور بولنے کی مشق پیدا کی، حما[سہ] اور نقد الشعر کے مطالعہ نے اس ذوق پر اور جلا دی اور ان میں عربی نظم کا بھی ذوق پیدا ہو گیا،

فقہ مفتی عبد اللطیف صاحب سے پڑھی علم کلام کا شوق تمام تر مولانا شبلی کی تربیت کا نتیجہ تھا، طالب علمی ہی کے زمانہ میں شہرستانی اور ابن حزم کی الملل والنحل، ابن رشد کی کشف الادلہ اور شاہ ولی اللہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ کے مطالعہ نے یکے بعد دیگرے اپنا رنگ دکھایا،

عربی میں مضمون نگاری

دار العلوم ندوہ میں مصر و شام سے عربی اخبارات المؤید اور اللواء وغیرہ آیا کرتے تھے، سید صاحب ان کو بالالتزام پڑھتے تھے، لکھنؤ کے مشہور اخبار اودھ پنچ کے ادارہ نے ان سے عربی مضامین کے [اردو] ترجمے بھی کرانا شروع کئے، اس زمانہ میں مولانا عبد اللہ عمادی عربی میں ایک رسالہ البیان نکالا کرتے تھے، سید صاحب نے بھی اس میں عربی کے چند مضامین لکھے، اسی زمانہ میں ان کی تحریریں مصر کے مشہور اخبار المنار میں بھی شائع ہوئیں،

خطیبانہ انداز کی پسندیدگی

۱۹۰۷ء میں ندوہ کے فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی کا پہلا جلسہ رفاہ عام لکھنؤ میں ہوا، اس جلسہ کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں جدید و قدیم علوم کے ماہرین دار العلوم ندوہ کے بلند بانگ دعووں کا امتحان کرنا چاہتے تھے، اس سلسلہ میں سید صاحب نے "علوم جدید و قدیم" کے موازنہ پر اردو میں تقریر کی، تقریر کے دوران میں کسی نے اٹھ کر کہا کہ اگر یہ عربی میں تقریر کریں تو ندوہ کی تعلیمی کرامات کا ہم یقین کریں، سید صاحب نے اسی وقت عربی میں ایسی تقریر کی کہ لوگ حیرت میں آ گئے، مولانا شبلی نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ یہ سمجھا جائے کہ وہ یہ تقریر پہلے سے تیار کر کے لائے ہیں، اگر کوئی صاحب چاہیں تو اسی وقت موضوع مقرر کر دیں یہ فی البدیہہ تقریر کریں گے، حاضرین میں سے خواجہ غلام الثقلین نے یہ موضوع دیا کہ "ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیونکر ہوئی"

سید صاحب نے بغیر کسی توقف کے فصیح و صحیح عربی میں تقریر شروع کر دی، یہ دیکھ کر پورا جلسہ محو حیرت ہو گیا، اور ہر طرف سے نعرہائے آفرین بلند ہونے لگے، مولانا شبلی نے غایت خوشی میں اپنے سر سے عمامہ اتار کر شاگرد کے سر پر باندھ دیا، یہ ہندوستان کی عربی تعلیم کی تاریخ میں بالکل نیا واقعہ تھا، اس لئے اس کا غلغلہ سارے ملک میں پھیل گیا،

الندوہ کی سب اڈیٹری

سید صاحب ۱۹۰۶ء میں جب ندوہ سے فارغ ہوئے تو مولانا شبلی نے ان کو الندوہ کا سب اڈیٹر مقرر کیا، اسی سال انھوں نے "علم ہیئت اور مسلمان" "عربی زبان کی وسعت" "طبقات الارض" "بابل کی تجلی" "مسئلہ ارتقا" اور "قرآن مجید" وغیرہ مختلف موضوعوں پر مضامین لکھ کر اپنے جامع الفنون ہونے کا ثبوت دیا، ان مضامین میں ان کے استاد ہی کے تحقیقی اور ادبی رنگ کی جھلک تھی، جو رفتہ رفتہ اور بھی نمایاں ہوتی گئی، الندوہ کے مضامین سے ان کی شہرت علمی حلقہ میں بڑھتی گئی، اور اب وہ کبھی کبھی مولانا شبلی کے بجائے الندوہ کے شذرات بھی لکھنے لگے،

۱۹۰۸ء کے الندوہ میں انھوں نے جو مضامین لکھے ان میں ایمان بالغیب، اور مکررات القرآن کی داد مولانا شبلی نے ایک مکتوب میں لکھ کر دی، اور ان کے تصنیفی سلیقہ پر اظہار مسرت کیا،

ندوہ کی مدرسی

۱۹۰۸ء میں وہ الندوہ میں علم کلام اور جدید عربی ادب کے استاد مقرر ہوئے، اور اس درس و تدریس کے زمانہ میں انھوں نے دروس الادب کے نام سے دو عربی ریڈریں لکھیں جو اب تک مقبول ہیں،

۱۹۰۹ء کے الندوہ کے مختلف نمبروں میں ان کا مشہور مضمون "خواتین اسلام کی شجاعت" شائع ہوا، جو اس قدر پسند کیا گیا کہ اس کو علیحدہ رسالہ کی صورت میں بھی چھاپا گیا، اور اس وقت سے اب تک اس کے متعدد اڈیشن نکل چکے ہیں، اور اب اس کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہو گیا ہے، اس زمانہ کے دوسرے مضامین میں "اسلامی رصد خانے" کو بھی بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، اور بعد میں اس کا بھی انگریزی میں ترجمہ ہوا،

تدوین لغات جدیدہ

فروری ۱۹۱۰ء تک الندوہ کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے، اسی سال

ندوہ کے سالانہ اجلاس دہلی میں طے ہوا کہ عربی کے جدید الفاظ کی ایک ڈکشنری ترتیب دی جائے، یہ کام سید صاحب
کے سپرد کیا گیا، جس کو انھوں نے دو برس میں پورا کرکے ۱۹۱۲ء کے اجلاس لکھنؤ میں جس کے صدر علامہ سید رشید رضا
مصری اڈیٹر المنار تھے، پیش کیا، یہ ڈکشنری لغات جدیدہ کے نام سے چھپ کر شائع ہوئی جس سے اب بھی
عربی مدارس کے طلبہ کو بڑی مدد ملتی ہے،

سیرۃ النبی کی تالیف میں شرکت

۱۹۱۰ء میں جب مولانا شبلی نے سیرۃ النبی کی تدوین و ترتیب کا ایک شعبہ قائم کیا تو سید صاحب
اُس کے لٹریری اسسٹنٹ ہوئے، اور اس کام میں استاد کی اعانت کے ساتھ ساتھ
الندوہ میں مضامین بھی لکھتے رہے، اگست ۱۹۱۱ء میں الندوہ کی ادارت کا بار پھر ان پر ڈالا گیا، اور وہ یہ خدمت
مئی ۱۹۱۲ء تک انجام دیتے رہے، جس کے بعد اس الندوہ کا خاتمہ ہوگیا، جس کے اڈیٹر مولانا شبلی اور مولانا
حبیب الرحمن خان شروانی تھے، اُن کے اس دور کے مضامین میں "اشتراکیت اور اسلام" "اسماء القرآن" اور
"فنائے مادہ" کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی، ۱۹۱۱ء کے وسط میں انھوں نے سیالکوٹ کی انجمن شبان المسلمین
میں ایک خطبہ دیا، جو "مذہب اسلام اور عقل" کے عنوان سے جولائی ۱۹۱۱ء کے الندوہ میں شائع ہوا،

الہلال کی ادارت میں شمولیت

۱۹۱۱ء میں اٹلی نے جب طرابلس پر حملہ کیا، تو اس سے پورے ہندوستان کے
مسلمانوں میں اک شور برپا ہوگیا، اور اُن کی سیاسیات میں اُبال آگیا، سید صاحب بھی اس سے متاثر ہوئے، ان کے
استاد مولانا شبلی ملکی سیاست میں آزادی کے حامی تھے، اور اسلامی سیاست میں اتحاد اسلامی پر ایمان رکھتے تھے
اسی کا اثر اُن کے شاگردوں پر بھی ہوا، چنانچہ سید صاحب خالص علمی مشاغل چھوڑ کر سیاست میں آئے، جولائی
۱۹۱۲ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے جو مولانا شبلی کے صحبت یافتہ تھے، کلکتہ سے الہلال نکالنا شروع کیا، ملکی
اور اسلامی سیاسیات میں اس کا مسلک وہی تھا جو مولانا شبلی کا تھا، اس لئے مئی ۱۹۱۳ء میں سید صاحب
الہلال کے اشاعت میں شامل ہوگئے، یہ وہ زمانہ تھا جب کہ یورپ کی بڑی سلطنتوں کی شہ پاکر بلقان کی
ریاستوں نے ترکی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تھا، اور دوسرے اسلامی ممالک کی طرح ہندوستان کے

مسلمانوں کے جذبات کا سمندر بھی جوش میں آگیا تھا، ابھی یہ شور محشر برپا ہی تھا کہ اگست ۱۹۱۳ء میں کانپور کی
مسجد کے انہدام کا واقعہ پیش آگیا، جس میں نہتے مسلمانوں اور اُن کے معصوم بچوں پر بے دردی سے گولیاں چلائی
گئیں، اس خونی سانحہ نے تمام ہندوستان کو پُرشور بنا دیا، سید صاحب نے ۱۲ راگست ۱۹۱۳ء کے الہلال میں اپنے خونِ دل سے
"شہیدِ اکبر" کے عنوان سے ایک دردانگیز مضمون لکھا جس کی ایک ایک سطر اور ایک ایک جملہ میں اُن کی مذہبی حمیت، ملی
غم خواری اور قومی درد کا طوفان اُمڈ پڑتا تھا، یہ مضمون الہلال کے جس پرچہ میں شائع ہوا، وہ حکومت نے ضبط کر لیا، الہلال
میں انھوں نے اور بھی پُرزور مضامین لکھے، اُن کے طرز نگارش میں چونکہ ابوالکلام ہی کا رنگ تھا، اور مضمون نگاروں کے
نام شائع نہیں ہوتے تھے، اس لئے بعض مضامین مولانا ابوالکلام کی جانب منسوب ہوگئے، خود سید صاحب نے رسالہ
سنقل کراچی (اکتوبر ۱۹۴۹ء) میں تحریر فرمایا ہے،

"الہلال میں چونکہ مضمون نگاروں کے نام نہیں لکھے جاتے تھے اس لئے الہلال کے مضمونوں کے
مجموعوں کے شائع کرنے والوں نے بلا تحقیق ہر مضمون کو مولانا ابوالکلام صاحب کی طرف منسوب کر دیا ہے،
حالانکہ یہ صحیح نہیں، الحریۃ فی الاسلام، تذکار نزول قرآن، حبشہ کی تاریخ کا ایک ورق، قصص بنی
اسرائیل، شہید اکبر وغیرہ میرے مضامین ہیں،"

دکن کالج پونہ کی پروفیسری

سیاسی واقعات میں کچھ سکون پیدا ہوا تو سید صاحب پھر مولانا شبلی کے دفتر سیرت میں لکھنؤ
آگئے، لیکن جلد ہی ۱۹۱۳ء کے آخر میں مولانا شبلی کے ایما سے بمبئی یونیورسٹی کے ماتحت دکن کالج پونہ
میں السنہ مشرقیہ کی معلمی قبول کر لی، اب وہ ملک میں ممتاز اہلِ علم کی صف میں شمار کئے جانے لگے، اس لئے
مذہبی اور تعلیمی جلسوں میں اُن کی طلب شروع ہوئی،

تدوین ارض القرآن

ان مشاغل کے ساتھ پونہ کے قیام کے زمانے میں ایک اہم تصنیف ارض القرآن کی تالیف
شروع کی، جس میں قدیم عرب کے جغرافیہ، اقوام عرب کی پرانی مذہبی اور تمدنی تاریخ پر محققانہ بحث کی گئی ہے، اور قرآن مجید
کے بیانات سے اُس کی مطابقت دکھائی گئی ہے، جس زمانہ میں وہ دفتر سیرت میں کام کر رہے تھے، اُسی وقت سے

اس کے لئے مواد کی فراہمی شروع کردی تھی، پونا میں اُس کی پہلی جلد ترتیب دی، اور دوسری جلد کے لئے مواد فراہم کیا، اور یہیں بیٹھ کر الہلال کے لئے "علوم القرآن" کے عنوان سے ایک مضمون بھی لکھا تھا،

رحلتِ استاد

پونہ گئے ہوئے ابھی ڈیڑھ سال بھی پورا نہ ہوا تھا کہ ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو مولانا شبلی جنت کو سدھارے، مرضِ موت میں شفیق استاد نے محبوب شاگرد کو تار دے کر بلوایا، اور جب وہ پہونچے تو مولانا نے ہونہار شاگرد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا "سیرت (یعنی سیرۃ النبی) میری تمام عمر کی کمائی ہے، سب کام چھوڑ کر سیرت تیار کرو"، سعادت مند شاگرد نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا "ضرور ضرور"

وہ شفیق اُستاد اور مُربی کی وفات سے بہت متأثر ہوئے، اور تأثرات کا اظہار "نوحۂ استاد" میں کیا، جس کا مطلع یہ ہے،

اے متاعِ عزتِ پیشیں کے پچھلے کاروان
آہ وہ بھی مٹ گیا باقی جو تھا تیرا نشان

اخباروں میں یہ نوحہ شائع ہوا تو عزیز لکھنوی، مولانا حبیب الرحمن خان شروانی اور مولانا حمید الدین فراہی نے سید صاحب کی سخن وری اور سخن سنجی کی داد دی، لیکن عماد الملک بلگرامی نے اُن کو شعر و سخن کی طرف مائل ہونے سے روکا، اور انھوں نے اُن کی نصیحت قبول کی، کبھی کبھی اشعار کہہ لیتے تھے، لیکن اپنے کو "غیر فطری شاعر" کہتے، گو اربابِ نظر نے اُن کی شاعری کی بھی داد دی ہے، ڈاکٹر اقبال نے اپنے ایک مکتوب مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۱۶ء میں ان کو لکھتے ہیں کہ

"آپ کی غزل لاجواب ہے، بالخصوص یہ شعر مجھے بڑا پسند آیا،

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں
وہ ایک قطرۂ خون جو رگِ گلو میں ہے

مولانا شبلی مرحوم و مغفور نے تاریخی واقعات کو نظم کرنا شروع کیا تھا، اور جو چند نظمیں انھوں نے لکھی تھیں، وہ نہایت مقبول ہوئیں، غزل کے ساتھ وہ سلسلہ بھی جاری رکھئے،"

شاید اسی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے سید صاحب کبھی کبھی اس قسم کی نظمیں کہہ لیا کرتے تھے،

تاسیس دار المصنفین

مولانا شبلی نے اپنی وفات سے پہلے دار المصنفین کا ایک خاکہ تیار کیا تھا، لیکن اس کو عملی جامہ پہنا نہ سکے تھے، سید صاحب اُن کی رحلت کے بعد پونہ کی ملازمت چھوڑ کر اعظم گڈھ چلے آئے، اور مولانا مسعود علی صاحب ندوی کے انتظامی تعاون اور مولانا عبد السلام صاحب ندوی کے علمی اشتراک سے ۱۹۱۵ء میں دار المصنفین کی بنیاد ڈالی، یہ گویا بغداد کے دار الحکمت کا تخیل ہندوستان کے ایک شہر اعظم گڈھ کی سرزمین پر نمودار ہوا،

سید صاحب نے اپنی تصنیف ارض القرآن کی پہلی جلد کی اشاعت سے دار المصنفین کے تصنیفی کام کی ابتدا کی، اور جب وہ اہلِ علم کے سامنے آئی تو اُن کو دار المصنفین کے علمی کام کی نوعیت اور سید صاحب کی تحقیقات اور اُن کے علم و نظر کی وسعت کا اندازہ ہوا،

انجمن ترقی اردو کی صدارت

اسی سال انجمن ترقی اردو کا سالانہ اجلاس پونہ میں ہوا، جس کی صدارت سید صاحب نے کی، اس میں انھوں نے جو خطبۂ صدارت پڑھا وہ آگے چل کر اردو کی تاریخ پر تحقیق کرنے والوں کے لئے دلیلِ راہ بنا،

سیاسی مشاغل

اس علمی و ادبی زندگی کے ساتھ سیاسی مشاغل بھی جاری رہے، ۱۹۱۴ء کے آخر میں جب ٹرکی نے جنگِ عظیم میں شرکت کی، تو ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی جوش پیدا ہوا، اور اُن کے سیاسی لیڈر قید و بند میں ڈال دیئے گئے، اس موقع پر جو نیا گروہ اُن کی قائم مقامی کے لئے بڑھا اس میں سید صاحب بھی تھے، چنانچہ ۱۹۱۵ء سے لیکر ۱۹۱۶ء تک انھوں نے مولانا عبد الباری فرنگی محلی کے ساتھ سیاسی تحریکات میں حصہ لیا،

رسالۂ معارف کا اجراء

لیکن اب اُن کا اصلی مرکزِ توجہ دار المصنفین تھا، ابھی تک اس کا کوئی آرگن نہ تھا، اس لئے ۱۹۱۶ء کے رمضان المبارک میں معارف کا پہلا پرچہ اُن کی ادارت میں نکلا، اس کا اجرا ایسے مبارک مہینہ میں ہوا کہ اس کی روشنی سے علمی دنیا آج تک منور ہے، معارف کے پہلے نمبر میں اُن کا مقالہ "روزہ" پر تھا، شروع کے نمبروں میں بیشتر مضامین انہی کے ہیں، رسالہ کی ادارت کے فرائض کے ساتھ استاذ مرحوم کے چھوڑے ہوئے مسودات اور سیرۃ النبی کی ترتیب و تبویب میں بھی مشغول رہتے، رفقاء کے لئے علمی لائحۂ عمل تیار کرنے اور دار المصنفین کے مربیوں اور ہمدردوں کا حلقہ پیدا کرنے کا بار بھی اُن ہی پر تھا،

دارالمصنفین کے فروغ مین جانکاہ کوشش

دارالمصنفین کے قیام کے زمانے سے آخر وقت تک اُن کا معمول یہ تھا کہ فجر کی نماز کے بعد ناشتہ کر کے کتب خانہ مین آجاتے، ۱۲ بجے دن تک دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر کام کرتے، پھر کھانا کھا کر کچھ قیلولہ فرماتے، ظہر کی نماز کے بعد پھر کتب خانہ تشریف لاتے، اور عصر تک کام مین مشغول رہتے، عصر کی نماز کے بعد چائے پیتے، اس وقت رفقاے دارالمصنفین سے علمی مذہبی سیاسی اور تفریحی باتین کرتے، مغرب کی نماز کے بعد بھی کام کا سلسلہ جاری رہتا، مگر جب کثرت محنت سے صحت خراب رہنے لگی، تو رات کو کام کرنا چھوڑ دیا تھا، لیکن دن بھر محنت شاقہ کرتے، جب علمی مذہبی اور سیاسی جلسون مین شرکت کے لئے سفر مین جاتے تو ذرا علمی ریاضت سے چھٹکارا اور کچھ آرام مل جاتا،

دارالمصنفین کے کتب خانہ، پریس اور دفتر کے تمام کارکنون سے اس طرح مہر و محبت اور لطف و شفقت سے پیش آتے تھے کہ ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ سب سے زیادہ اسی کو محبوب رکھتے ہین، اور وہ اُن کی خوشنودی اور رضامندی کی خاطر بڑی تن دہی اور دلسوزی سے کام کرتا، اُن کی زندگی کا اصلی کارنامہ دارالمصنفین ہی ہے جس کو وہ اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتے تھے،

اُن کے حسن نیت کی وجہ سے دارالمصنفین کا علمی وقار ملک مین جلد ہی قائم ہو گیا، چنانچہ ابھی اس کو قائم ہوے دو سال بھی نہین گذرے تھے کہ مہاراجہ بڑودہ کی طرف سے بڑے پیمانہ پر موازنۂ مذہب کا ایک ادارہ ایک فرانسیسی کی نگرانی مین قائم ہوا تو اسلامی علوم و مسائل کی تحقیقات اور دفع شبہات کے لئے دارالمصنفین ہی مرجع قرار پایا،

جلسۂ علماے بنگالہ کی صدارت

۱۹۱۷ء مین علماے بنگالہ کلکتہ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کی جس مین تمام رہنمایان ہند شریک تھے، اسی کے ساتھ کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس بھی اُن ہی تاریخون مین تھے، اس لئے مجلس علماے بنگالہ کا یہ جلسہ بڑا اہم تھا، اس مین سید صاحب نے جو خطبہ پڑھا، وہ بنگال مین بڑا اثر انداز ہوا، یہ پہلا خطبہ تھا جس مین جنگ کے ہیبت ناک اثرات کے باوجود مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کا نام جو

اس زمانہ مین نظر بند تھے، جرأت کے ساتھ لیا گیا، اس سے لوگون کے دلون سے انگریزون کا رعب اُٹھا،

۱۹۱۷ء کے علمی کام

۱۹۱۷ء کے علمی مضامین مین "اہل السنت والجماعت" بڑا مقبول ہوا، پہلے یہ معارف کے کئی نمبرون مین شائع ہوا تھا، پھر رسالہ کی صورت مین چھپا، اس کا ترجمہ ملیالم، تلگو اور بنگلہ مین بھی ہوا، اسی سال اُن کی کتاب "حیات امام مالک" شائع ہوئی، اُن کو امام مالک سے خاص عقیدت اور اُن کی موطا صحیحین سے زیادہ پسند تھی گو آخر عمر مین جزوی مسائل مین بھی امام ابوحنیفہ کے مسلک کے پابند ہو گئے تھے، لیکن امام مالک سے عقیدت قائم رہی، ۱۹۱۰ء کے الندوہ مین "حیات امام مالک" کے عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھا تھا، جو کئی نمبرون مین شائع ہوا تھا، اور تقریباً ۸۰ صفحے پر مشتمل تھا، اس کو اور زیادہ مکمل کرنے کا برابر ارادہ کرتے رہے، مگر دوسرے کامون کی مشغولیت نے اس کا موقع نہ دیا، اس لئے اسی مضمون کو رسالہ کی صورت مین شائع کر دیا، یہ کچھ ایسا مقبول ہوا کہ اُس کی مانگ ابھی تک جاری ہے، اور اس کے کئی اڈیشن نکل چکے ہین،

سیرۃ النبی جلد اول کی اشاعت

۱۹۱۸ء مین اپنے استاذ مرحوم کی سیرۃ النبی جلد اول کو مرتب کر کے ملک کے سامنے پیش کی جس کے غلغلہ سے ہندوستان کا گوشہ گوشہ گونج رہا تھا، اس کی اشاعت پر سید صاحب نے بجا طور پر لکھا تھا کہ

ع شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

ارض القرآن جلد دوم کی اشاعت

اسی سال اُن کی محققانہ تصنیف ارض القرآن کی دوسری جلد بھی شائع ہوئی، جس مین اقوام عرب کے لسانی، مذہبی، تجارتی، اور تمدنی حالات پر بحث ہے، اس سے اُن کی علمی شہرت مین اور بھی زیادہ اضافہ ہوا، ۱۹۳۶ء مین مولوی سید مظفر الدین ندوی ایم اے نے اس کا انگریزی مین ترجمہ کیا، اور معلومات مین اضافہ کر کے اس مین انگریزی کے لحاظ سے بعض ترمیمین اور تغیرات کئے،

۱۹۱۸ء کے معارف مین اُن کے جو مضامین شائع ہوے، ان مین ہندوؤن کی علمی اور تعلیمی ترقی مین مسلمانون کی کوششین کی طرف خاص طور پر لوگون کی نظر اٹھی، اس مین ہندو مسلمانون کو ایک دوسرے سے قریب

لانے کی کوشش کی گئی ہے، ارباب تحقیق کو اس سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ سید صاحب کی نظر تاریخ ہند پر بھی کتنی گہری ہے، اس مضمون کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے،

تحریک خلافت ۱۹۱۹ء کا سال ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے بڑا پرآشوب تھا، پہلی جنگ عظیم کے بعد اسلامی ممالک خصوصاً ٹرکی پر سخت وقت آیا، اس کے حصے بخرے کئے جارہے تھے، ٹرکی کا سلطان قسطنطنیہ میں اتحادیوں کے ہاتھوں بے بس ہو رہا تھا، اتحادی فتح کے غرور کے نشہ میں خدا کی خدائی کی شکست و ریخت میں مصروف تھے اور ملکوں کی قسمت کا فیصلہ کر رہے تھے، اس وقت ہندوستان کے چند بہادر غیور اور دردمند مسلمان رہنماؤں نے اپنی جانوں پر کھیل کر مجلس خلافت کے نام سے ایک مرکزی مجلس بمبئی میں قائم کی جس کی شاخیں سارے ہندوستان میں پھیل گئیں، اس مجلس میں مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی نے ایسی تنظیمی قوت پیدا کر دی کہ پورا ہندوستان اُس کی آواز پر اٹھتا اور بیٹھتا تھا، اس تحریک میں سید صاحب بھی پیش پیش رہے، اس کا پہلا اجلاس لکھنؤ میں ہوا، تو انھوں نے علما اور ارباب سیاست کے درمیان حلقۂ اتصال کا کام دیا، اور ایسی پردرد تقریر کی کہ مسندِ صدارت سے پائین تک ساری مجلس بزم ماتم بن گئی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور چودھری خلیق الزمان وغیرہ کے سارے اختلافات خس و خاشاک کی طرح بہ گئے، اسی سال انھوں نے سید الاحرار سید فضل الحسن حسرت موہانی کی رہائی کی تقریب میں نظر بندانِ اسلام کے عنوان سے معارف کے کئی نمبروں میں ایک مضمون لکھا جو بہت پسند کیا گیا،

وفد خلافت یورپ کا سفر فروری ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی کی سرکردگی میں ٹرکی کے معاملات میں انصاف طلبی اور مسلمانانِ ہند کے جذبات کی ترجمانی کے لئے ہندوستان سے جو وفد خلافت یورپ گیا تھا، اس کے تین ممبروں میں ایک ممبر یہ بھی تھے، صدر مولانا محمد علی، ارکان سید حسین اور سید صاحب اور سکریٹری حسن محمد حیات تھے، یہ وفد انڈین نیشنلزم اور پین اسلام ازم کو متحد کر کے ہندوستان کی آزادی کی جنگ لڑنے چلا تھا، جب یہ لوگ پورٹ سعید پہنچے اور سید صاحب جامع عباسی میں نماز جمعہ

پڑھنے کے لئے گئے، تو وہاں ایک بزرگ فقہ کا درس دے رہے تھے، سید صاحب نے اُن سے مل کر وفد خلافت کی غرض و غایت بیان کی تو تمام حلقۂ درس جوش مسرت سے لبریز ہو گیا، اور سب نے وفد کی کامیابی کے لئے دعا کی، اور جب سید صاحب مسجد سے نکلے، تو لوگوں کا اس قدر ہجوم ہوا کہ وہ بدقت جان چھڑا کر آگے بڑھ سکے، اس وفد کے ارکان اٹلی، فرانس اور انگلستان میں ٹرکی کے حقوق کے لئے زبان و قلم اور دعوت و اشاعت کے ذریعہ لڑتے رہے، لندن میں وزیر اعظم لائڈ جارج، لارڈ فشر اور دوسرے ممتاز لیڈروں سے ملنے کے علاوہ حجاز و شام اور مصر کے وفود سے بھی ملاقات کی، حجاز و شام کے وفد کے سرگروہ نوری سعید پاشا اور حداد پاشا تھے، سید صاحب نے اُن سے مل کر خلافت و جزیرۃ العرب کے مسائل اور ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات اور اُن کے مذہبی مطالبات بیان کئے، تو وہ سب بہت متاثر ہوئے، اور اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، اسی زمانہ میں سعد زغلول پاشا بھی مصری وفد کے ساتھ لندن آئے ہوئے تھے، اُن سے بھی مل کر سید صاحب نے ہندوستانی مسلمانوں کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی، سعد زغلول نے اُن کی عربی سے متاثر ہو کر کہا کہ آپ ہم سے بھی اچھی عربی بولتے ہیں، اس سفر میں آرنلڈ، براؤن، اسٹوری اور مارگولیتھ سے بھی ملاقات رہی، پروفیسر مارگولیتھ اور ایک اطالوی مستشرق سے مسئلۂ خلافت پر علمی نبرد آزمائی بھی ہوئی، اور اس مسئلہ پر مشہور انگریزی مجلہ "فارن افیرز" میں جو مدلل اور جامع مضمون لکھا، اس کی تعریف مولانا محمد علی نے بار بار کی، وفد کے سیاسی کاموں کے ساتھ انڈیا آفس، برٹش میوزیم، آکسفورڈ اور کیمبرج کے کتب خانے بھی دیکھتے رہے جس سے اُن کا یہ سفر علمی حیثیت سے بھی مفید رہا، لندن سے واپسی کے بعد ڈاکٹر اقبال نے اُن کو ایک خط میں تحریر فرمایا،

"مراجعت مع الخیر مبارک" آپ نے بڑا کام کیا جس کا صلہ قوم کی طرف سے شکر گذاری کی صورت میں مل رہا ہے، اور دربارِ نبوی سے نہ معلوم کس صورت میں عطا ہوگا، وزرائے انگلستان کا جواب وہی ہے، جو ان حالات میں ہمیشہ دیا گیا، .... تاہم مجھے یقین ہے کہ ہندی وفد کا سفر یورپ بڑے اہم نتائج پیدا کرے گا،"

داپسی پر قصبہ بہار شریف ضلع پٹنہ کی خلافت کمیٹی نے اُن کا شاندار خیر مقدم کیا، انھون نے اس کمیٹی کے بڑے اجلاس کی صدارت بھی کی، اس مین صوبہ کے اکابر علمار اور زعمار کے علاوہ بابو راجندر پرشاد (موجودہ صدر جمہوریۂ ہند) بھی تھے، جنھون نے اپنی تقریر مین سید صاحب کی سیاسی بصیرت کو سراہا،

سیرۃ النبی جلد دوم کی اشاعت

لندن جانے سے پہلے استاذ مرحوم کی سیرۃ النبی کی دوسری جلد چھپنے کے لئے دیدی تھی اس کا دیباچہ لندن ہی سے لکھ کر بھیجا، پہلی جلد نبوت کے پُر آشوب عہد غزوات پر مشتمل تھی دوسری جلد نبوت کے سہ سالہ امن کی زندگی کی تاریخ ہی،

سیرت عائشہ رض

ابھی وہ لندن ہی مین تھے کہ اُن کی کتاب سیرۃ عائشہ شائع ہوئی جس کا آغاز طالب علمی کے زمانہ مین کیا تھا، مگر اسکی تکمیل بعد مین کی، اس کی اشاعت پر بیگم صاحبۂ بھوپال نے پانچ سو روپے انعام مرحمت فرمایا، ڈاکٹر سر اقبال نے یہ کتاب پڑھی تو سید صاحب کو تحریر فرمایا کہ

"سیرۃ عائشہ کے لئے سراپا سپاس ہون، یہ ہدیہ سلیمانی نہیں سرمۂ سلیمانی ہی، اس کتاب کو پڑھنے سے میرے علم مین بہت مفید اضافہ ہوا، خداے تعالیٰ جزاے خیر دے"

ترک موالات

۱۹۲۰ء کے آخر مین یورپ کے سفر سے واپس ہوئے تو ترکِ موالات کی تحریک ہندوستان مین شروع ہوگئی، اور مجلسِ خلافت اور کانگریس کے پلیٹ فارم مشترک ہوگئے، سید صاحب نے بھی دوسرے علما اور زعماء کے ساتھ مل کر ترکِ موالات کی تحریک کے سلسلہ مین ملک کا دورہ کیا، اخبارات مین مضامین لکھے جابجا تقریرین کین، ۱۹۲۰ء مین مجلسِ خلافت کا جو سالانہ اجلاس میرٹھ مین منعقد ہوا تھا، اسکی صدارت کی، اسی سال "خلافتِ عثمانیہ اور دنیاے اسلام" اور "خلافت اور ہندوستان" کے عنوان سے دو اہم تاریخی مضامین معارف کے کئی نمبرون مین لکھے، جو علٰحدہ علٰحدہ رسالون کی صورت مین بھی شائع ہوئے، ان رسالون سے تحریکِ خلافت کو بڑی مدد ملی، ۱۹۲۱ء کی کانگریس احمد آباد مین منعقد ہوئی، تو اسکی ورکنگ کمیٹی کے ممبر نامزد کئے گئے، اور سال بھر تک خلافت کیساتھ کانگریس کے کامون مین شریک رہے، جمعیۃ العلما

کی مجلس عاملہ کے بھی رکن مقرر ہوئے،

دارالمصنفین کی شہرت

۱۹۲۲ء تک دارالمصنفین کی شہرت مین چار چاند لگ چکے تھے، سیرۃ النبی کی دو جلدون اور سید صاحب کی تصانیف کے علاوہ مولانا عبدالسلام ندوی کی اسوۂ صحابہ اور سیرۃ عمر بن عبدالعزیز مولوی یونس فرنگی محلی کی روح الاجتماع، مولوی عبدالباری صاحب ندوی کی برکلے، اور "مبادی علم انسانی" اور مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی "مبادی فلسفہ" اور مکالمات برکلے، پروفیسر سجاد مرزا کی الاستدلال، تسہیل البلاغت وغیرہ جیسی سنجیدہ کتابون اور معارف کے بلند پایہ علمی تحقیقی مضامین نے تمام اصحابِ علم ونظر کو اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا، اور اردو زبان کا لٹریچر ایک نئے نہج مین ڈھلنے لگا، ڈاکٹر اقبال نے معارف کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا کہ یہی ایک ایسا رسالہ ہے جس کے پڑھنے سے حرارتِ ایمانی مین ترقی ہوتی ہے، مولانا محمد علی مرحوم کو بھی معارف سے بڑا انس ہوگیا تھا، چنانچہ وہ اپنے ایک مکتوب مورخہ ۸ دسمبر ۱۹۱۹ء مین سید صاحب کو لکھتے ہین،

"میرے متعدد انگریزی رسالون کی جلدین نہین بندھی ہین، اور ممکن ہی کہ میرے عزیز دوست اور سارق کتب سید جالب صاحب اُن مین سے اکثر پر قبضہ بھی کر بیٹھے ہون، یہ شرف خاص معارف کو حاصل ہوگا کہ مجلدات تیار کرائی جائین گی،"

مولانا ابوالکلام آزاد اپنے ایک خط مین سید صاحب کو تحریر فرماتے ہین :-

"معارف کے متعلق آپ کیا کہتے ہین صرف یہی ایک پرچہ ہے، اور تو ہر طرف سناٹا ہی، بحمداللہ کہ مولانا شبلی مرحوم کی تمنائین رائگان نہ گئین، اور صرف آپ کی بدولت ایک جگہ ایسی بن گئی، جو صرف خدمت علم وتصنیف وتالیف کے لئے وقف ہی"

معارف اور دارالمصنفین کی شہرت بیرون ہند مین بھی پھیلتی جارہی تھی، چنانچہ اسی زمانہ مین ڈاکٹر نکلسن (کیمبرج یونیورسٹی) نے اس کے ناقدانہ مباحث، علمی مقالات، مستشرقانہ معلومات اور مشرقی ومغربی علوم وخیالات کی آمیزش کی داد دی، اور اس حیثیت سے ہندوستان کی ترقی پر اپنی خوشی کا اظہار کیا، پھر فرانس کے مشہور مستشرق

موسیو لوئز ماسینان نے اپنے ایک لکچر "اسلام مین پیشہ کی اجتماعی حیثیت" کے سلسلے مین دار المصنفین سے تعاون چاہا،

بہار خلافت کانفرنس کی صدارت

۱۹۲۳ء مین صوبہ بہار کی خلافت کانفرنس کی صدارت کی، اس کے خطبہ مین تحریک خلافت کی پوری تاریخی سرگذشت تھی،

سیرۃ النبی جلد سوم کی اشاعت

۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۳ء تک اپنی تصنیف سیرۃ النبی کی تیسری جلد کی تدوین مین مشغول رہے، جو ۱۹۲۴ء مین چھپ کر مشتاق نگاہون کے سامنے آئی، اس مین معجزہ کی حقیقت کے امکان و وقوع پر فلسفۂ قدیمہ، علم کلام، فلسفۂ جدیدہ اور قرآن مجید کے نقطہ ہاے نظر سے مبسوط تبصرہ ہے، اور اس کے بعد مکالمۂ الٰہی، وحی، نزول ملائکہ، عالم رؤیا، معراج اور شرح صدر کا بیان ہے، اس کی ترتیب، واقعات کی تفتیش و تلاش اور مسائل و نظریات کی بحث و تحقیق مین جو محنت و کاوش اور دیدہ ریزی کی گئی ہے، اس سے ان کا علمی پایہ اور بھی بلند ہوا،

وفد حجاز کی صدارت

اسی سال یعنی ۱۹۲۴ء ہی مین ابن سعود اور شریف حسین مین جنگ کا آغاز ہوا، دونون نے مجلس خلافت کی طرف ہاتھ بڑھایا، اس وقت مسلمانان ہند نے سید صاحب کی قیادت مین ایک وفد حجاز کو بھیجا، تاکہ وہ فریقین کے سامنے مجلس خلافت کی تجاویز کو پیش کرے، سید صاحب نے دو ماہ جدہ مین رہ کر مفوضہ فرائض انجام دیئے، اور بڑی دلیری سے شریف حسین اور سلطان ابن سعود کی حکومتون سے حجاز مین مسلمانون کی ایک جمہوری حکومت کے قیام کے مسئلہ پر گفت گو اور خط و کتابت کرتے رہے، ایک جلسہ مین ایسی پرجوش تقریر کی کہ شریف حسین کے ایک حبشی سنتری نے تقریر کے بعد کہا کہ اگر یہ وفد انگریزون کی پناہ مین نہ ہوتا تو ہم صدر وفد کو گولی مار دیتے، جب وفد کے مشن مین سید صاحب کو ناکامی ہوئی، تو مصر کا رخ کیا، اور وہان کے علماء و اکابر سے مل کر حجاز کے معاملہ پر گفت گو کی، شیخ ازہر نے انکی تجاویز سے اپنی رضامندی ظاہر کی، یہ اس دور کی ایسی کامیابی تھی کہ دنیا کے تمام اخبارات نے اس کو نمایان سرخیون سے مشتہر کیا، اس سفر مین سید صاحب نے مصر کے تعلیمی حالات کا بھی گہرا مطالعہ کیا، جس کو مضمون کی شکل مین معارف (مئی ۱۹۲۵ء) مین شائع کیا،

ندوۃ العلماء کے کام

یون تو ندوہ کے معتمد تعلیمات کی حیثیت سے ہمیشہ اس سے دلچسپی لیتے رہے لیکن ۱۹۲۵ء مین اس کی طرف خاص توجہ کی، اور فروری مین اس کا سالانہ جلسہ بڑے اہتمام سے کرایا، جس مین علماء اور خواص نے بڑی تعداد مین شرکت کی، ندوہ کو ایک دار الاقامہ کی سخت ضرورت تھی، سید صاحب کی تحریک سے اس جلسہ مین یہ قرار پایا کہ ہندوستان کے ہر صوبہ کی طرف سے دس دس کمرون کا ایک بلاک تیار کیا جائے، مختلف صوبون کے اکابر نے اس پر آمادگی ظاہر کی، اور اس اجلاس کے بعد سید صاحب نے خود صوبہ بہار کا دورہ کر کے اس مقصد کے لئے ایک گران قدر رقم جمع کی،

خطبات مدراس

اسی سال اکتوبر اور نومبر مین مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن آف سودرن انڈیا کی دعوت پر سیرۃ نبوی کے مختلف پہلوؤن پر آٹھ خطبے دیئے جو بعد مین خطبات مدراس کے نام سے شائع ہوئے، ان خطبون کے خلاصے وہان کے روزانہ انگریزی اخبارات "ہندو" اور "ڈیلی ایکسپرس" مین برابر نکلتے رہے، اور بہت دلچسپی سے پڑھے گئے، یہ اپنے مضامین و مباحث، ادب و انشاء اور زور خطابت کے لحاظ سے اردو لٹریچر کے شاہکار سمجھے جاتے ہین،[1] اسی سفر مین بنگلور، وانمباڑی اور تریانور جا کر بھی مختلف مذہبی عنوانات پر خطبے دیئے،

جمعیۃ العلماء کی صدارت

مارچ ۱۹۲۶ء مین جمعیۃ العلماء کا جو اہم سالانہ اجلاس کلکتہ مین ہوا، اس کے وہ صدر منتخب ہوئے، اس موقع پر انھون نے جو خطبۂ صدارت پڑھا، وہ مسلمانون کی سیاست مین یادگار ہے،

پھر وفد حجاز

اسی سال پھر وفد حجاز کے صدر منتخب ہوئے، اس وقت ہندوستان مین شدھی اور سنگھٹن کا زور تھا، اس موقع پر دہلی مین مجلس خلافت کا ایک خاص اجلاس ہوا، اور حکیم اجمل خان مرحوم کی تحریک پر سید صاحب نے اس کی صدارت کی، اس اجلاس مین انھون نے ہندو اور مسلمانون کے تعلقات کی نسبت مسلمانون کے نقطۂ نظر کو بڑی وضاحت سے پیش کیا، اس سے فراغت کے بعد وفد خلافت لے کر حجاز گئے، اس کے ممبر مولانا شوکت علی، اور مولانا محمد علی، اور

---

[1] اس کا انگریزی ترجمہ جناب سعید الحق صاحب (فی الحال ہیڈ ڈیٹر پاکستان ریڈیو) نے Living Prophet کے نام سے کیا ہے،

شعیب قریشی تھے، سلطان ابن سعود نے مسئلہ حجاز کے سلسلہ مین تمام دنیا سے مسلمانون کی ایک موتمر مکہ معظمہ مین طلب کی
تھی جس مین ترکی، مصر، افغانستان، ہند اور دوسرے اسلامی ملکون کے نمایندے شریک ہوئے، اور چند ہفتون تک
برابر اس کے جلسے ہوتے رہے، موتمر کے نمایندون نے سید صاحب کو موتمر کا نائب رئیس منتخب کیا، اور صدر موتمر
کی غیر حاضری مین اس کی صدارت بھی کی، اس مین انھون نے جو عالمانہ اور مبصرانہ تقریرین کین، اُن سے ہندوستان
کے مسلمانون کی علمی و دینی عظمت شرکا، کے دلون مین قائم ہوگئی، حجاز مین وفد کے کامون کی مشغولیت کے باوجود
اُن کا قلم بھی رواں دواں رہا، چنانچہ وہان سے آنے کے بعد "حجاز کے کتب خانے" کے عنوان سے معارف کے کئی
نمبرون مین ایک طویل مضمون لکھا،

مارگولیتھ سے علمی معرکہ

اس وفد سے واپسی کے بعد وہ زیادہ تر علمی، مذہبی، اور تعلیمی کامون مین مشغول رہے، ۱۹۲۵ء
مین مانچسٹر گارجین کے ایک عیسائی مضمون نگار نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق بعض نامناسب باتین واقدی
کی کتاب کے حوالہ سے لکھین جو خود مارگولیتھ نے واقدی کے جرمن ترجمہ ولہاوسن کے حوالہ سے لکھی تھین، اس پر واقدی کے
کے معتبر اور غیر معتبر ہونے کی بحث چھڑ گئی، سید صاحب نے ۱۹۲۶ء اور ۱۹۲۷ء کے معارف کے متعدد مضامین مین
یہ ثابت کیا کہ واقدی کی حیثیت ایک داستان گو سے زیادہ نہین ہے، اور اس کا شمار معتبر مورخین مین نہین ہے،
تاریخ و سیر مین اس کا حوالہ دینا ایسا ہی ہے، جیسے ملکہ الزبتھ کی سوانح عمری مین رینالڈس کا حوالہ دیا جائے،
مارگولیتھ کے علاوہ ڈرہم یونیورسٹی کے عربی کے پروفیسر ڈاکٹر گولیم نے بھی اس بحث مین حصہ لیا تھا، سید صاحب
نے دونون کو اپنے محققانہ اور فاضلانہ مضامین سے خاموش کیا، ان مضامین کا انگریزی ترجمہ اسلامک ریویو
ووکنگ مین بھی شائع ہوا، اور ایک صاحب نے حجاز مین ان کا ترجمہ عربی مین بھی کیا،

زہر کا تریاق

۱۹۲۷ء مین ایک یورپین اہل قلم نے لکھا کہ "مسلمان ارسطو کی گاڑی کے قلی تھے" سید صاحب نے
اپنے ایک مضمون مین اس کی فاضلانہ تردید کی جس کا انگریزی ترجمہ حیدر آباد دکن کے رسالہ اسلامک کلچر مین بھی
شائع ہوا، اسی سال یہ پروپیگنڈا کیا گیا کہ اسلام کا قانون عورتون کے لئے حد درجہ تنگ اور سخت گیر ہے،

سید صاحب نے "مسلمان عورتون کے حقوق" کے عنوان سے اس کی تردید مین ایک طویل مضمون لکھا، اور یہ دکھایا کہ عورتون
کے ساتھ جتنی بے انصافیان تھین، ان سب کا خاتمہ آخری ربانی پیغام اور تکمیلی دین نے کیا، اور اُن کے واجبی
حقوق دے کر ان کا درجہ بلند کیا،

انجمن حمایت اسلام لاہور مین تقریر

اسی سال کے وسط اپریل مین انجمن حمایت اسلام لاہور کی دعوت پر عہدِ رسالت مین
اشاعتِ اسلام پر تقریر کی جو بہت پسند کی گئی، اس موقع پر لاہور کے تمام اصحاب علم
سے ملاقاتین رہین، ڈاکٹر اقبال نے بڑی تواضع سے ملنے مین پیش دستی فرمائی، ان کی قیامگاہ پر آئے، اور
بڑی گرم جوشی سے ملے، اور پھر اُن کے اعزاز مین جتنی علمی صحبتین رہین، ان مین ڈاکٹر اقبال ہی شمعِ محفل رہے،
چنانچہ سید صاحب نے پنجاب کے سفر سے واپسی پر شذرات مین تحریر فرمایا کہ .... انھون نے
(یعنی ڈاکٹر اقبال نے) "شمع اور شاعر" لکھا ہے، لیکن مین نے تو لاہور مین خود شاعر کو شمع دیکھا، اور قدر شناسون کو اس کا
پروانہ پایا، اُن کی صحبت لاہور کے نوجوانون کی دماغی سطح کو بلند کر رہی ہے، اُن کے فلسفیانہ نکات، عالمانہ افکار،
شاعرانہ خیالات، اُن کے آس پاس کی دنیا کو ہمیشہ متاثر رکھتے ہین" اس ملاقات کے بعد دونون مین اور زیادہ
گہرے تعلقات پیدا ہوئے،

جنوبی ہند کا سفر

اسی سال کے اکتوبر مین مجلس العلماء کی صدارت کے لئے ترچناپلی تشریف لے گئے، یہ مجلس
تامل زبان مین اسلام کی تبلیغ اور اشاعت تعلیم کا کام انجام دیتی تھی، اس سفر مین وشارام، امبور، عمرآباد، بنگلور،
میسور اور حیدر آباد دکن مین بھی تقریرین کین، اس لمبے سفر کا مقصد ندوۃ العلماء کے دار الاقامہ کی تعمیر کے لئے چندے
کا حصول تھا، وہان سے واپسی کے بعد نومبر مین ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس مین شرکت کے لئے امرتسر گئے، اسی
اجلاس مین ندوہ کے لئے نواب صاحب بہاولپور نے پندرہ ہزار کی رقم عطا کی، امرتسر سے وہ جمعیۃ العلماء کے اجتماع
مین شرکت کے لئے پشاور بھی گئے،

دار المصنفین کی روز افزون شہرت

۱۹۲۸ء مین خاص علمی کامون خصوصاً سیرۃ النبی جلد چہارم کی تدوین مین مشغول رہے،

دار المصنفین اب اپنے مذہبی، علمی و ادبی کارناموں کی وجہ سے ہند اور بیرون ہند میں بہت مشہور ہو چکا تھا، فرانس کے علمی رسالہ "دنیائے اسلام" میں اس کا ذکر کئی بار کیا گیا، مصر کے رسالہ الزہرا میں اس پر ایک مقالہ بھی شائع ہوا، ایک ترک نوجوان شہاب الدین آفندی نے جو مولانا روم کے خاندان سے تھے، اپنے ہم وطن نادرۂ روزگار مہندس استاد عیسیٰ اور ان کے رفقاء کے حالات قلمبند کرنے کے سلسلہ میں دار المصنفین کی طرف رجوع کیا، امریکہ کے رسالہ مسلم ورلڈ اپریل ۱۹۲۳ء کے دو مضامین میں دار المصنفین کا ذکر خاص طور پر کیا گیا، ٹرکی میں الفاروق اور سیرۃ النبی کے حصہ اول دوم سوم، سیرۃ عائشہ اور سیر الصحابہ کی بعض جلدوں کے ترجمے ترکی زبان میں کئے گئے، اور وہاں کے علماء اور عام شائقین نے ان کتابوں کو توقع سے زیادہ پسند کیا،

اس کی علمی شہرت سے ہندوستان کے سیاسی لیڈروں کی نظریں بھی اس کی طرف اٹھیں، اور وہ ایسا مرکز بن گیا، جہاں مسلمان اور ہندو لیڈر بڑے فخر سے آتے تھے، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، بی اماں، مولانا حسین احمد، چودھری خلیق الزمان، ڈاکٹر محمود کے علاوہ گاندھی جی، مالوی جی، سروجنی نائیڈو، پنڈت موتی لال نہرو، اور پنڈت جواہر لال نہرو سب ہی یہاں آئے، پنڈت موتی لال نہرو پوربی اضلاع کے دورہ میں جب اعظم گڈھ آتے تو ہمیشہ دار المصنفین ہی میں ٹھہرتے، شبلی منزل ان کا بے تکلف مہمانخانہ تھا، پنڈت جواہر لال نہرو کا بھی ہمیشہ یہی طریقہ رہا، وہ جب بھی اعظم گڈھ آئے دار المصنفین میں آکر ٹھہرے، گاندھی جی جب اپنے دورہ میں اعظم گڈھ آئے تو ان کے قیام کا انتظام تو دوسری جگہ تھا، مگر وہ شبلی منزل آئے، اور ایسے وقت آئے کہ اہل دار المصنفین ایک کھلی جگہ میں مغرب کی نماز پڑھ رہے تھے، یہ دیکھ کر گاندھی جی نہایت ادب اور خاموشی سے کنارے بیٹھ گئے، اور ساتھ والوں کو باادب رہنے کے لئے اشارہ کیا، سید صاحب نے لالٹین کی روشنی میں ان کو کتب خانہ دکھایا، دار المصنفین کے ایک رفیق نے ان کے سامنے دستخط کے لئے اپنی یادداشت کی کتاب پیش کی تو انھوں نے اردو میں دستخط کیا،

۱۹۲۳ء میں سید صاحب نے "ہندوستان اور علم حدیث" کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا جو دلچسپی سے پڑھا گیا، اس موضوع پر اردو میں یہ پہلا مضمون تھا، اس کی اشاعت کے بعد دوسرے اہل قلم نے بھی اس موضوع پر

مفید مطالبات فراہم کئے، اسی سال حیدرآباد کے سفر کے موقع پر حضور نظام نے ان سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی، اور اس کے نتیجہ میں ریاست حیدرآباد سے دار المصنفین کی سالانہ امداد جاری رکھی گئی،

سارداایکٹ کے خلاف احتجاج

۱۹۲۸ء و ۱۹۲۹ء میں سارداایکٹ یعنی نابالغوں کی شادی پر پابندی کے سلسلہ میں مسلمانوں میں بڑا ہیجان پیدا ہوا، انھوں نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا، لیکن اس قانون کے بعض مسلمان حامیوں نے فقہ اسلامی میں تحریف کرنے کی کوشش کی، اور نابالغ لڑکیوں کے نکاح کو ناجائز بتایا، اور زور استدلال میں حضرت عائشہؓ کی نابالغی کی عمر نکاح سے بھی انکار کر دیا، سید صاحب نے معارف میں نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر پر محققانہ اور فاضلانہ بحث کر کے ایسے تمام لوگوں کا منہ بند کر دیا، اور یہ اعلان کیا کہ نابالغوں کا نکاح تو شرعاً جائز ہے، مگر ہر حال میں مستحسن نہیں لیکن کسی غیر اسلامی حکومت کو مسلمانوں کے نکاح و طلاق کے سلسلہ میں قانون بنانے کا حق نہیں، غیر اسلامی حکومتوں میں مناسب اصلاحات کو قانوناً نافذ کرنے کی صورت صرف یہ ہے کہ وہ حنفی تصریحات کے مطابق مسلمان والی یا قاضی کے ذریعہ جاری کی جائیں، اسی سلسلہ میں انھوں نے اس طرف بھی توجہ دلائی کہ سوراج قائم ہونے کے بعد مسلمانوں کے پیش نظر جو معاملات ہیں، ان میں ایک مطالبہ یہ بھی ہو کہ آیندہ حکومت میں مسلمانوں کے خالص مذہبی اور شخصی قوانین کے تحفظ، ترقی و اصلاح اور استحکام کے لئے ایک علیحدہ نظام ہونا چاہئے، اور اس کے لئے ایک قابل عمل خاکہ پیش کیا جائے، اس طرح کلچرل اٹونومی کی صدا پہلی بار انھوں نے بلند کی اور یہ بھی لکھا کہ اگر آسمان کو دیکھ کر موسم کے انقلاب کی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے تو موجودہ حالات کو دیکھ کر مجھکو یقین ہے کہ اگر اس قسم کی تدبیر نہیں کی گئی، تو مسلمانوں کی ممتاز ہستی اس ملک میں قائم نہیں رہ سکتی،

عرب و ہند کے تعلقات پر لکچر

۱۹۲۵ء کے مارچ میں ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کی دعوت پر "عرب و ہند کے تعلقات" پر لکچر دیئے جن میں ہندو مسلمان دونوں کو ان کا وہ زریں عہد یاد دلایا، جب دونوں گوناگوں تعلقات کے رشتوں میں جکڑے ہوئے تھے، یہ خطبات تلاش و تحقیق محنت و کاوش اور جدت و استدلال

کے اعتبار سے بے مثل سمجھے جاتے ہیں، اُن کا انگریزی ترجمہ جناب سعید الحق صاحب ایم۔ اے (فی الحال نیو اڈیٹر کراچی) نے کیا تھا، جو اسلامک کلچر حیدرآباد میں کئی سال تک شائع ہوتا رہا، [۱]

ندوۃ العلماء کے لئے سرمایہ کی فراہمی

۳۰ء میں زیادہ تر سیرۃ النبی جلد چہارم کی تدوین میں مشغول رہے، اسی کے ساتھ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی مالی حالت کو درست کرنے کی بھی فکر رہی، چنانچہ اُن کی تحریک پر مدراس کے مشہور مخیر ساہوکار سیٹھ عبدالحکیم صاحب نے ندوہ کو پانچ ہزار روپے کی رقم عنایت کی،

عربوں کی جہازرانی

۱۹۳۱ء کے مارچ میں "عربوں کی جہازرانی" پر بمبئی گورنمنٹ کے شعبۂ تعلیم کی سرپرستی میں چار خطبے دیئے، جو بڑی دلچسپی سے سُنے گئے، اُن کے اقتباسات بمبئی کے انگریزی اور اردو اخبارات نے شائع کئے، ان میں یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ موجودہ جہازرانی کی ترقی میں عربوں کا کتنا حصہ ہے، ان خطبات کا بھی انگریزی ترجمہ اسلامک کلچر حیدرآباد میں شائع ہوا،

قلمی جہاد

ان کا یہ سال زیادہ تر ان دشمنِ اسلام عناصر کے خلاف قلمی جہاد میں گذرا، جو مسلمانوں کو اپنی تحریروں سے گمراہ کرنے کی کوشش میں تھے، اسی زمانہ میں انگریزی اخبار اسٹیٹسمین میں ایک مضمون چھپا تھا جس میں واقعۂ کربلا کا حال ایسے انداز میں بیان کیا گیا تھا، جو مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے قابلِ اعتراض تھا، اس کے خلاف سید صاحب نے سخت احتجاج کیا، اسی طرح پنجاب یونیورسٹی کے نصاب میں ڈاکٹر ڈائل کی کتاب تاریخ اقوامِ اسلامیہ اور ڈاکٹر نکلسن کی تاریخ ادبیاتِ عربی داخل ہوئیں، تو انھوں نے وہاں کے اربابِ علم کو اس طرف توجہ دلائی کہ ان دونوں کتابوں میں اسلام اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ کے متعلق نہایت گمراہ کن نظریات اور بیجا اعتراضات ہیں جن کو ایک مسلمان سننا بھی گوارا نہیں کر سکتا، مسلمانوں کے اخبارات نے بھی احتجاج کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کتابیں پنجاب یونیورسٹی سے خارج کر دی گئیں، اسی طرح جب رسالہ نگار لکھنؤ نے انبیاءِ کرام علیہم السلام، رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلامی عقائد و اعمال کے متعلق دل آزار مضامین لکھے تو

[۱] ان سطور کو لکھتے وقت یہ اطلاع ملی کہ یہ انگریزی ترجمہ کتاب کی صورت میں حکومت پاکستان شائع کرنے والی ہے

سید صاحب نے اس کے خلاف بھی آواز بلند کی جس پر عام مسلمانوں نے اتنی مخالفت کی کہ اڈیٹر نگار کو توبہ نامہ لکھنا پڑا، جو دسمبر ۱۹۳۱ء کے معارف میں بھی شائع ہوا،

سیرۃ النبی جلد چہارم

۱۹۳۲ء میں سید صاحب کی مشہور تصنیف سیرۃ النبی کی چوتھی جلد شائع ہوئی جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ نبوتِ محمدی نے دنیا میں کس عظیم الشان اصلاح کا فرض انجام دیا، اُس کی اشاعت سے دارالمصنفین کی شہرت میں اور بھی چار چاند لگ گئے،

مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں تقریریں

مارچ ۳۳ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی انجمن اردوئے معلّٰی کی دعوت پر "ہندوستان میں ہندوستانی" پر ایک خطبہ دیا، یہ جلسہ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی صدر یار جنگ بہادر کی صدارت میں یونین ہال میں ہوا، جو اس موقع پر بھرا تھا، اس میں سید صاحب نے تاریخی حوالوں سے بتایا کہ اردو کا نام دراصل ہندوستانی تھا، انگریزوں کے آنے سے بہت پہلے دسویں صدی میں یہ زبان اسی نام سے پکاری جاتی تھی، اُن کی دوسری تقریر آفتاب ہوسٹل کے طلبہ کے سامنے ہوئی جس میں ان پر یہ اچھی طرح واضح کیا کہ ہماری یہ زندگی جو تمام تر دوسری قوم کی نقالی پر مبنی ہے، ہمارے اندر قومی روح کی سرگرمی نہیں پیدا کر سکتی اور اُن کی تیسری تقریر طبیہ کالج کے ہال میں ہوئی، اس میں اسلامی طب کی تاریخ کے ساتھ وہاں کے طلبہ کو نصیحت فرمائی کہ وہ ڈاکٹر بننے کے بجائے طبیب بننے کی کوشش کریں، کیونکہ ہندوستان کی صحت عامہ کا دار و مدار دیسی طب پر ہے جس کی اکثر دوائیں ہمارے ملک کی پیداوار ہیں، وہ مسلم یونیورسٹی کے کورٹ کے ممبر بھی ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۲ء تک رہے،

تاج محل کے معمار کی تحقیق

اپریل ۳۳ء میں ادارۂ معارفِ اسلامیہ لاہور کے پہلے سالانہ اجلاس کی شرکت کے لئے لاہور تشریف لے گئے، جس کی صدارت ڈاکٹر سر محمد اقبال نے کی تھی، اس جلسہ میں انھوں نے اپنا ایک مقالہ پیش کیا، جس کا عنوان "لاہور کا ایک مہندس خاندان جس نے تاج اور لال قلعہ بنایا" تھا، اس میں اس خاندان کے تقریباً ڈیڑھ سو برس کے علمی کارناموں کی سرگذشت نامعلوم گوشوں سے بڑی تلاش و تحقیق سے

مرتب کی گئی تھی، اور تاریخ میں پہلی دفعہ اس خاندان کے مورث اعلیٰ نادر العصر استاد احمد معمار شاہجہانی لاہوری [illegible]
بتائے گئے، اور نہایت مستند شہادتوں سے یہ ثابت کیا گیا کہ تاج کا معمار درحقیقت یہی استاد احمد معمار شاہجہانی تھا، جو
ہندسہ، ہیئت اور ریاضیات کا بہت بڑا عالم تھا اس حقیقت کے ظاہر ہونے کے بعد وہ تمام دعوے جو
کے کاریگروں اور معماروں سے متعلق مشہور تھے، بے سروپا ہو کر رہ گئے،

مغربی ہند کا سفر

جولائی ۱۹۳۳ء میں سیرت نبوی پر تقریر کرنے کے لئے بڑودہ تشریف لے گئے، اس کا جلسہ [illegible]
دیوان بہادر کی صدارت میں بڑودہ کالج میں ہوا، بڑودہ سے بھڑوچ، بھڑوچ سے راندیر، راندیر سے سورت، سورت
سے انکلیشور، اور وہاں سے ڈابھیل گئے، اور ہر جگہ ایک ایک دو دو مذہبی تقریریں کیں،

ضابطۂ جنایات قتل و قصاص کی ترتیب

اسی سال حکومت حیدرآباد نے دار المصنفین کو فقہ حنفی کی رو سے ایک ضابطۂ جنایات
کی ترتیب و تدوین کی خدمت سپرد کی، چنانچہ سابق دولت عثمانیہ کی مجلۃ الاحکام کی طرح
قانون جنایات بھی دفعہ وار مرتب کیا گیا، اور اس کا مسودہ سید صاحب نے حکومت حیدرآباد کو پیش کیا،

خیام

اسی سال اُن کی مشہور و معروف تصنیف خیام شائع ہوئی، انھوں نے خیام پر پہلی دفعہ فروری [illegible]
کے معارف میں ایک مضمون لکھا تھا جو دراصل پروفیسر اقبال معلم فارسی اورینٹل کالج لاہور کے اس مقالہ کا جواب تھا
جو انھوں نے "شعر العجم اور عمر خیام" کے عنوان سے رسالۂ اردو (اورنگ آباد دکن) میں تحریر کیا تھا، اس مضمون کو قلمبند کرنے
وقت سید صاحب نے خیام کا ناقدانہ مطالعہ کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دسمبر ۱۹۳۰ء کی اورینٹل کانفرنس منعقدہ پٹنہ
میں ایک مقالہ پیش کیا، ارباب نظر نے توقع سے بڑھ کر اس کی قدر کی، تو یہی مقالہ ایک کتاب کی صورت میں منتقل ہو گیا
اس کتاب کی ترتیب میں انھوں نے سنین کی تحقیق و تطبیق، واقعات کی تلاش و تفتیش، ماخذوں اور سندوں کے حوالوں
اور خیام کی فلسفیانہ تصانیف کی جستجو میں جو فکر و کاوش کی ہے، وہ ایک اہم علمی کارنامہ ہے، اس سے خیام ایک
بالکل ہی نئے رنگ میں ظاہر ہوتا ہے، اس تصنیف کی داد ہندوستان سے لیکر ایران و کابل، اور یورپ تک کے فضلاء
نے دی، فردوسی کی ہزار سالہ برسی کے موقع پر افغانستان نے ایران کو جو تحائف دیئے ان میں ایک تحفہ خیام بھی تھا

ہندوستانی اکیڈمی الٰہ آباد نے اس پر پانچ سو روپیے کا انعام دیا، ڈاکٹر سر اقبال نے اس کتاب کو پڑھ کر سید صاحب کو
ایک مکتوب میں لکھا کہ عمر خیام پر آپ نے جو کچھ لکھ دیا ہے، "اس پر اب کوئی مشرقی یا مغربی عالم اضافہ نہ کر سکے گا"

سفر افغانستان

اسی سال نادر خان شاہ افغانستان کی طرف سے ایک تعلیمی دعوت ڈاکٹر سر اقبال نواب
سر راس مسعود وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی اور سید صاحب کو وصول ہوئی کہ وہ افغانستان آکر کابل یونیورسٹی کی ترتیب
و تنظیم اور وہاں کے تراجم و تالیف کے دائرے کو وسیع کرنے کے سلسلہ میں اپنے مفید مشورے دیں، چنانچہ سید صاحب ۲۳
اکتوبر ۱۹۳۳ء کو ہندوستان سے کابل روانہ ہوئے، پاسپورٹ کے ملنے میں تاخیر ہونے کے سبب وہ اپنے دوسرے رفقائے
سفر کے ساتھ نہ ہو سکے، اور کابل اُن کے پہنچنے کے بعد پہنچے، سرکاری طور پر وہاں ان معزز مہمانوں کی بڑی پذیرائی ہوئی،
علمی انجمنوں نے اُن کو سپاسنامے پیش کئے، اور عام لوگوں نے مختلف طریقوں سے اپنی محبت کا اظہار کیا، سید صاحب
امان اللہ خان سے ملے، تو ان سے مسئلۂ تعلیم پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ افغانستان کی عربی و مذہبی تعلیم کا نصاب ایسا ہو کہ
طلبہ میں موجودہ زمانے کے لحاظ سے سیاسی و اجتماعی اصلاحات کی طرف میلان بھی ہو، اور اُن میں مذہبی شیفتگی بھی
پیدا ہو، شاہ افغانستان نے اس مشورہ کو پسند فرمایا، سید صاحب نے اسی قسم کے مشورے وہاں کے ماہرین تعلیم کو بھی
دیئے جو انھوں نے قبول کئے، وہاں کے قیام کے زمانے میں انجمن ادبی کابل نے ہندوستان کے معزز مہمانوں کو ایک سپاسنامہ
پیش کیا تو اس موقع پر افغانستان کے مشہور شاعر جناب قاری عبد اللہ صاحب نے خیر مقدم کے عنوان سے ایک نظم بھی پڑھی
جس میں سید صاحب کے متعلق یہ اشعار تھے،

سوم سید کہ از ندوہ است — ز دانش بہ ہندوستان قدوہ است
ز فیض دمش تازہ شد جان علم — در اقلیم دانش سلیمان علم
چہ کلکش بمعنی طرازندہ شد — خیالات شبلی ازو زندہ شد
چہ در شاہراہ حقائق شتافت — معارف ازو رونق تازہ یافت
مضامین او جملہ محکم بود — نگارش بکلکش مسلم بود

کابل سے چل کر غزنین آئے، جہاں حکیم سنائی اور محمود غزنوی کے مزار پر حاضری دی، پھر مقر، قلات غلزئی، قندھار، چمن، کوئٹہ اور ملتان کی سیاحت کرتے ہوئے اعظم گڑھ واپس آگئے، رخصتانہ میں نادر شاہ نے افغانستان کے بنے ہوئے عمدہ قالین، کچھ پشمینے اور اونی کپڑے بھی نذر کئے، اس طویل سفر میں اُن کے قلم کا مسافر بھی چلتا رہا، دن اور رات کے مختلف مشاغل کے باوجود سونے سے پہلے وہ سفر کے تمام کوائف قلمبند کر لیتے، چنانچہ آخر میں ایک سفرنامہ مرتب ہوگیا جو معارف میں شائع ہوا، اور بعد میں سفرنامۂ افغانستان کے نام سے ایک کتاب بھی مرتب ہوگئی، اس سفر میں ڈاکٹر اقبال اُن سے بے حد متاثر ہوئے، چنانچہ ایک موقع پر تحریر فرمایا کہ

"آج سید سلیمان ندوی ہماری علمی زندگی کے سب سے اونچے زینے پر ہیں، وہ عالم ہی نہیں، امیر العلماء ہیں، مصنف ہی نہیں، رئیس المصنفین ہیں، ان کا وجود علم و فضل کا ایک دریا ہے جس سے سیکڑوں نہریں نکلی ہیں اور ہزاروں سوکھی کھیتیاں سیراب ہوئی ہیں،"

جامعہ ملیہ کی توسیعی لیکچرز کی صدارت

فروری سنہ ۳۳ء میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی دعوت پر ڈاکٹر بہجت وہبی جامعہ ملیہ آئے، حضرت معاذ بن جبل رض کی اولاد میں سے تھے، مصر کی طبی درسگاہ میں علم تشریح کے استاد رہ چکے تھے، وہاں سے سبکدوش ہونے کے بعد یورپ میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے لگے، ۱۹۲۰ء میں سید صاحب سے [illegible] واقع سوئزرلینڈ میں ملاقات ہوئی تھی، اسلامی احوال، تجربات پر اُن کا مطالعہ گہرا تھا، جامعہ ملیہ میں آکر چار خطبے دیئے، ڈاکٹر انصاری کے اصرار پر ان کے پچھلے دو خطبوں کے جلسوں کی صدارت سید صاحب ہی نے کی،

سفر رانچی

جون سنہ ۳۳ء میں صوبہ بہار و اڑیسہ کے وزیر تعلیم آنریبل جناب سید عبدالعزیز کی دعوت پر عربی، اردو کے ترتیب نصاب کے سلسلہ میں رانچی تشریف لے گئے، ان کے ساتھ اُن کے عزیز دوست مولانا مناظر احسن گیلانی (صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن) بھی تھے، حکومت بہار نے اُن کو کئی بار مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے پرنسپل کے تقرر کے سلسلہ میں پبلک سروس کمیشن کا ایکسپرٹ ممبر بھی نامزد کیا؛

تاریخ ہند کی تدوین کی اسکیم

اسی سال کے آخر میں بہت سے ہمدرد اہل علم کے تقاضے اور اصرار پر اسلامی ہند کی

کی تاریخ کی تدوین و ترتیب کا ایک خاکہ ملک کے سامنے پیش کیا، مسلمانوں نے ہندوستان کو جو سیاسی، قومی، علمی، تمدنی حیثیت سے ترقی دی، اس کی ایک مکمل اور جامع تاریخ کی ضرورت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی، سید صاحب نے دسمبر ۱۹۳۴ء کے معارف میں یہ تجویز پیش کی کہ ایسی تاریخ پندرہ جلدوں میں لکھی جانی چاہیئے، پورے ملک نے اس تجویز کی تائید کی، چنانچہ دارالمصنفین میں بعض اہل قلم کی خدمات حاصل کر کے اس اہم کام کو شروع کرا دیا گیا، جو اب تک جاری ہے،

زنانہ جامعہ لاہور کا خاکہ

جنوری سنہ ۳۵ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کی دعوت پر اس کی طلائی جوبلی میں شریک ہوئے، انجمن نے اس موقع پر ایک اسلامی زنانہ جامعہ قائم کرنا چاہا تو اُس کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی جس کے ایک ممبر سید صاحب بھی تھے، انہوں نے علامہ اقبال کے ساتھ مل کر ایک خاکہ تیار کیا، اس سفر کے سلسلہ میں لاہور، لدھیانہ، سہارنپور، دیوبند اور دہلی کے علمی و تعلیمی اداروں اور کتب خانوں کی بھی سیر کی،

ضابطۂ فوجداری حیدرآباد پر نظر ثانی

اسی سال ریاست حیدرآباد دکن نے شرعی حیثیت سے وہاں کے ضابطۂ فوجداری پر نظر ثانی کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی جس میں ایک سابق جج ہائی کورٹ، مفتی ریاست اور سید صاحب تھے، اس کمیٹی نے ایک مہینہ میں اپنا کام پورا کیا،

سیرۃ النبی جلد پنجم

اسی سال اُن کی مشہور و معروف تالیف سیرۃ النبی کی پانچویں جلد شائع ہوئی، اس کا موضوع عبادات ہے، سیرۃ النبی کی جلدیں ہند اور بیرون ہند میں بے حد مقبول ہو رہی تھیں، ہندوستان میں دوگنی مانگ بڑھتی جا رہی تھی، اور ہر جلد کے کئی کئی اڈیشن شائع ہوئے، پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ترکی میں اُس کی تین جلدوں کا ترجمہ ہوا، اور وہاں اُن کی مقبولیت کا اندازہ نواب فخر یار جنگ کے حسب ذیل مکتوب سے ہوگا، جو انہوں نے سید صاحب کو تحریر فرمایا:-

"میں کچھ عرصہ ہوا ترکی گیا تھا، ..... وہاں ایک بڑی جماعت ایسے لوگوں کی ملی جو سیرۃ النبی مبارک کی بڑی مداح ہے، اور اس کا جو ترجمہ ترکی میں ہو چکا ہے، اس کو وہ بہت شوق سے مطالعہ کرتے ہیں، خود استنبول تو چونکہ مغرب زدہ ہو چکا ہے، وہاں زیادہ لوگ نہیں ملے لیکن بروصہ میں جو شاہان عثمانیہ

کا فتح استنبول سے پہلے قریب ڈیڑھ سو سال کے دارالحکومت رہا ہے، بہت سے احباب کو سیرۃ النبی کا ذکر دلچسپی سے کرتے سنا، خدا آپکے مساعی جمیلہ کو بار آور کرے،"

فارسی مین بھی سیرۃ النبی کی چند جلدون کا ترجمہ کابل مین کیا گیا، نیز مغرب اور مصر مین اُس کے عربی ترجمہ کا خیال پیدا ہوا،

اردو ہندی کا جھگڑا

اکتوبر ۳۵ء مین مرض ذات الجنب کا شدید حملہ ہوا، کئی مہینہ کے بعد شفا ہوئی، تو ڈاکٹرون نے چھ مہینے تک مکمل آرام لینے کی ہدایت کی، تین مہینے دہرہ دون جیسے صحت بخش مقام مین جا کر قیام بھی کیا، اور اسکے بعد اپنے علمی مشاغل پھر شروع کئے، تو اردو ہندی کے روز افزون جھگڑون سے اُن کو بہت دکھ پہنچا، معارف کے شذرات کے ذریعہ اپنے دردمندانہ خیالات کا اظہار کیا کہ ہندی اور اردو دونون کیلئے الگ الگ ترقی کی راہین کُھلی رہنی چاہئین کیونکہ زمانہ یہ فیصلہ کر چکا ہے کہ نہ اُردو ہندی کو مٹا سکتی ہے، اور نہ ہندی اردو کو، دونون اپنی اپنی راہین چلتی رہین گی، انھون نے یہی خیالات علی گڈھ مین آل انڈیا اردو کانفرنس مین ظاہر کئے جو اکتوبر ۱۹۳۶ء مین ہوئی،

فلسطین کانفرنس کی صدارت

یہودیون اور انگریزون کی سازش سے فلسطین کا جو نیا نقشہ بننے کو تھا اُس سے ہندوستان کے مسلمانون مین بھی بڑا سیاسی اُبال اور مذہبی جوش پیدا ہوا، مدت کی سیاسی خاموشی کے بعد سید صاحب نے فلسطین کے مسئلہ مین اپنی آواز بلند کی، اور مولانا شوکت علی اور مفتی کفایت اللہ کے اصرار پر ۶ رنومبر ۱۹۳۶ء کی آل انڈیا فلسطین کانفرنس دہلی کی صدارت کی، اس مین جو خطبہ پڑھا، وہ دنیائے اسلام مین بڑا مقبول ہوا، مصر اور شام کے اخبارات نے اس کے ترجمے چھاپے، مجلس اعلیٰ فلسطین کے صدر مفتی سید امین الحسینی نے خاص طور پر تار کے ذریعہ اُن کا شکریہ ادا کیا،

ایک ناخوشگوار واقعہ

وہ فلسطین کانفرنس کی صدارت کر رہے تھے کہ ایک بر خود غلط اہل قلم نے ۵ صفحے کا ایک رسالہ علامہ سید سلیمان ندوی کی قرآنی غلطیان لا کر اُن کے ہاتھ مین دیا، جس مین اُن کی تصانیف مین سے گیارہ غلطیان نزاعم کر کے یہ الزام لگایا تھا کہ ان کی تحریرون سے الحاد و اہمال کے جراثیم پیدا ہوتے ہین، دسمبر ۳۶ء کے معارف مین ان اعتراضات کا جواب شائع ہوا، تو رسالہ کے مرتب نے مطمئن ہونے کے بجائے سید صاحب کو ایک عدالتی سمن کے ذریعہ دہلی کی عدالت مین طلب کرنے کی کوشش کی لیکن دہلی کے اس زمانہ کے مشہور وکیل جناب عبدالرحمٰن صاحب

کی وکالت اور وساطت سے یہ مقدمہ عدالت سے خارج ہو گیا، اور سید صاحب کو عدالت مین حاضر ہونے کی نوبت نہین آئی،

ہندستانی اکیڈمی کے جلسہ کی صدارت

جنوری ۳۷ء مین لکھنؤ کی نمایشگاہ مین ہندستانی اکیڈمی کی ایک کانفرنس کے شعبۂ اردو کی صدارت کی، اس اکیڈمی کا مقصد ہندوستان کو ادب کی راہ سے ایک کرنا تھا، لیکن اس کانفرنس مین اردو اور ہندی کے دو خیمے علحدہ علحدہ تھے، ایک کے ادیبون نے دوسرے کی صورت تک نہ دیکھی، اس سے سید صاحب کو بڑا دکھ ہوا، اور اسی وقت اُن کو یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید ہندو مسلمانون کے دل ایک دوسرے سے جدا ہو رہے ہین جیسا کہ انھون نے فروری ۳۷ء کے معارف مین اظہار کیا ہے،

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی طلائی جوبلی

مارچ ۱۹۳۷ء مین مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی طلائی جوبلی علی گڈھ مین ہوئی، تو اس کے شعبۂ علوم و فنون اسلامی کی صدارت کی، اس مین خطبۂ صدارت کے علاوہ اپنا ایک مقالہ "عرب اور امریکہ" کے عنوان سے پیش کیا، جس مین یہ دکھایا کہ کولمبس سے پہلے عرب جہاز ران امریکہ پہونچ چکے تھے کیونکہ ان کو زمین کی گولائی اور اس کے تحتانی اور فوقانی حصون کا علم تھا، اسی لئے ماورائے بحر ظلمات تک پہنچنے کی کوشش کی،

سفر مدراس و حیدر آباد

اکتوبر ۱۹۳۷ء مین جامعہ دارالسلام عمر آباد مدراس کا خطبۂ اسناد دینے کے لئے وہان تشریف لے گئے، مدراس کو اُن سے اور اُن کو مدراس سے ذاتی اُنس ہو گیا تھا، مدراس سے حیدر آباد آئے، وہان اُن کی آمد کی اطلاع اخبار مین حضور نظام کی نظر سے گذری، تو اُن کے لئے خاصہ بھیجا، اور ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا، اس قیام کے زمانہ مین دائرۃ المعارف حیدر آباد نے اُن کے اعزاز مین نواب مہدی یار جنگ کی صدارت مین ایک جلسہ کیا، جس مین انھون نے اپنا ایک مقالہ عربی زبان مین "ابو البرکات بغدادی اور اُس کی کتاب المعتبر" کے عنوان سے پڑھا، اسی روز سر مہاراجہ یمین السلطنت بہادر کشن پرشاد نے اپنے یہان مدعو کر کے ایک خلعت عطا کیا، اس سفر سے اعظم گڈھ واپس آئے تو حضور نظام نے اُن کے لئے سو روپیے ماہانہ کا ذاتی وظیفہ مقرر کر کے ان کے علم و فضل سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا،

ودیا مندر اور وردھا اسکیم

۱۹۳۸ء مین سی پی مین ودیا مندر کے نام سے جبری تعلیم کی مہم شروع ہوئی، اس مین اردو پڑھنے کا کوئی انتظام نہ تھا، اس لئے مسلمانون مین ہیجان پیدا ہوا، تو سید صاحب نے بھی اس کے خلاف احتجاج کیا، اور معارف کے ذریعہ یہ اعلان فرمایا کہ مخالفت اور دشمنی کی اسپرٹ سے نہین بلکہ اپنے صحیح حق کو حاصل کرنے اور ملک مین اپنی پوزیشن محفوظ کرنے کے لئے اردو زبان سے قطع نظر کرنا ہمارے لئے قطعاً محال ہے، پھر مسلمانون نے جب کانگرسی وزارتون کی وردھا اسکیم کی مخالفت شروع کی تو سید صاحب نے اُن کو بیجا جوشِ عمل کے اظہار سے روکنے کی کوشش کی، اور یہ مشورہ دیا کہ اسلامی صوبون کی وزارتین، دار القضا، اور مسلمانون کی ابتدائی تعلیم وغیرہ کی تجویزون پر غور کرین، اور ان کو عمل مین لائین تا کہ اس کے بعد غیر اسلامی صوبے بھی اُن کے نقشِ قدم پر چل سکین"، مگر افسوس کہ اسلامی صوبے اس کام کو اب تک انجام نہ دے سکے ہین،

سیرۃ النبی جلد ششم

۱۹۳۹ء مین اُن کی سیرۃ النبی کی چھٹی جلد شائع ہوئی، اس مین اسلام کی اخلاقی تعلیمات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، یہ سیرت کے سلسلہ کی بڑی اہم جلد ہے، یون تو تمام جلدین جدید علم کلام کی اساس ہین،

نقوش سلیمانی

اسی سال اُن کی کتاب نقوشِ سلیمانی بھی شائع ہوئی، یہ ان خطبون تحریرون اور مقدمون کا مجموعہ ہے جو اردو ادب و زبان سے متعلق اُن کے قلم سے نکلے، یہ گویا پچھلی چوتھائی صدی کی ادبی تحریکون کا ایک مرقع ہے، اس لئے یونیورسٹیون کے نصاب مین جلد داخل ہوگئی،

سفر دکن

۱۹۴۰ء کا آغاز ادبی اور علمی سفرون سے کیا، ۲۵ جنوری کو وہ ندوۃ العلماء کے کام سے حیدرآباد دکن گئے، وہان سے پونہ آئے، اور دکن کالج مین ایک تقریر مسلمانون کے تحفظ پر کی، اس مین مسلمانون کو خود یہ تجزیہ کرنے کو کہا کہ اسلامی کلچر کو وہ اپنے ہاتھون تباہ کر رہے ہین، یا اُس کو غیر برباد کر رہے ہین، پونہ سے بمبئی آئے، وہان کے انجمن کی مسجد مین جمعہ کی نماز کے بعد ایک تقریر کی، جس مین فرمایا کہ دنیا کی قومون نے جب کبھی ترقی کی ہے تو اُس کی قوت بازو کے دو سہارے ہوتے ہین، ایمان اور عمل، ہمارے نوجوان ان دونون سے بے پروا ہو کر ترقی کا خواب نہین دیکھ سکتے، اسماعیل کالج کے ہال مین ایک دوسری تقریر دکن اور گجرات مین اردو زبان کی تاریخ پر کی،

سفر سرحد و پنجاب

اس سفر سے واپسی کے بعد ابھی تکان بھی دور نہین ہوئی تھی کہ پشاور، بہاولپور اور لاہور کا

سفر کرنا پڑا، اسلامیہ کالج پشاور کے سامنے ایک تجویز یہ تھی کہ اس مین ایک ایسا شعبہ کھولا جائے جس مین بعض پڑھے لکھے نوجوانون کو مختصر عربی، دینیات، اور طب کی تعلیم دیجائے، جو گاؤن مین پھیل کر اپنی روزی بھی کمائین، اور مسلمانون کی مذہبی خدمت بھی کرین، اس تجویز کو علمی جامہ پہنانے کے لئے سید صاحب مدعو کئے گئے، وہان پہنچ کر مجوزہ نصاب کی ترتیب دینے کے علاوہ مختلف عنوانات پر کئی تقریرین کین، جن مین وہان کے نوجوانون کو یہ تلقین کی کہ وہ مسلمانون کے اکثریت کے صوبے مین رہنے والے کی حیثیت سے اپنے کو ایمان و عمل مین اتنا ممتاز بنالین کہ سارے ہندوستان کے مسلمان اُن کے پیچھے چلین، پشاور سے لاہور آئے، یہان کے اصحاب علم نے بڑی پذیرائی کی، مختلف دعوتون مین علمی و قومی مسائل پر تبادلۂ خیال کرتے رہے، لاہور سے بہاولپور آگئے، جہان کی جامعہ عباسیہ ۱۹۲۵ء مین ندوۃ العلماء لکھنؤ ہی کے طرز پر قائم ہوئی تھی، یہان کے وزیر تعلیم میجر شمس الدین اُس کے نصاب مین مزید اصلاح چاہتے تھے، سید صاحب نے پہنچ کر ضروری اصلاح کی، اس موقع پر وہان کے صادق ایجرٹن کالج کی تقسیم اسناد کا جلسہ ہوا، تو خطبۂ اسناد سید صاحب ہی نے دیا، دوسرے دن رات کو اسی کالج کے ایک بہت بڑے جلسہ مین "خصائصِ اسلامی" پر ڈیڑھ گھنٹہ تک تقریر کی، پھر شہر کی جامع مسجد مین "فضائلِ نبوی" پر ایک وعظ مین مسلمانون کو نسبتِ نبوی کے شرف کی بنا پر اشرف الامم ہونے کی حیثیت سے خیر الامم بننے کا شوق دلایا، اور اولاد کو اسی رنگ مین تعلیم دینے کا مشورہ دیا،

رحمت عالم

اسی سال بچون کے لئے "رحمتِ عالم" لکھی جس مین سلیس اور آسان زبان مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ پاک ہے، گو یہ بچون کے لئے لکھی گئی تھی، لیکن جوان اور بوڑھے سب اس سے مستفید ہو رہے ہین،

مسلم یونیورسٹی کی طرف سے اعزازی ڈگری

۱۹۴۰ء کے نومبر مین ان کو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی طرف سے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری ملی، یہ گویا مسلم یونیورسٹی کی طرف سے اُن کے علمی و ادبی کمال کا اعتراف تھا، لیکن اُن کے علمی فضائل اس رسمی ڈگری سے بہت بلند ہو چکے تھے، اس لئے انھون نے اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھنا پسند نہین کیا، فرماتے تھے جس وقت اس قسم کے اعزاز کی تلاش تھی، اس وقت یہ ملے نہین، اب اِن کی کوئی خواہش نہین، اس لئے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھنے سے کیا فائدہ،

روحانی انقلاب

اسی سال ان مین ایک بڑا روحانی انقلاب پیدا ہوا، اب وہ اپنی زندگی کی اس منزل مین تھے، جب کہ ہندوستان کیا، بلکہ عالم اسلام کے ایک متبحر عالم، ایک بلند پایہ مفسر، ایک جلیل القدر متکلم، ایک دقیقہ سنج فقیہ، ایک باکمال ادیب، ایک وسیع النظر مورخ، ایک اچھے سیاسی مفکر، اور ایک زبان آور خطیب کی حیثیت سے مشہور ہوچکے تھے، اُن کی نجی زندگی بھی بڑی پاک وصاف رہی، اور اُن کے نزدیک رہنے والون کو یہ کہنے مین تامل نہ ہوتا کہ

ع مانند حرم پاک ہے تو میری نظر مین

لیکن اپنی دینی عظمت اور علمی جلالت کا لحاظ کئے بغیر حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ العزیز کے آستانہ پر جاکر اپنا سرِ نیاز جھکا دیا، حضرت مولٰنا کو بھی علم وفن کے ایک شہباز اور گلستانِ رسالت کے ایک عندلیب خوشنوا کو اپنے سایۂ عاطفت مین لینے مین بڑی مسرت ہوئی، اس تعلق کے بعد سید صاحب کے لیل ونہار ہی بدل گئے، گو اُن کی پوری زندگی، دینداری اور پرہیزگاری مین گذری تھی، لیکن بادۂ طریقت سے سرشار ہونے کے بعد اُن کی دینداری مین تقویٰ وتورع کا اور بھی زیادہ گہرا رنگ پیدا ہوگیا، عبادت وریاضت بڑھ گئی، ذکر خفی کے ساتھ ذکر جلی بھی کرنے لگے، تقریر وخطابت نے وعظ وپند کی شکل اختیار کرلی، زیادہ وقت علمی مذاکرون کے بجائے رشد وہدایت مین صرف ہونے لگا، اس انقلاب کے بعد اپنی تمام پرانی تحریرون پر نظرثانی کی، اور جس مین ذرا بھی جمہور امت سے اختلاف کا شائبہ یا خلاف احتیاط کوئی بات نظر آئی، اس سے رجوع کیا، چنانچہ "رجوع واعتراف" کے عنوان سے جنوری سنہ ۱۹۴۳ء کے معارف مین ایک تحریر شائع کی جس مین فرماتے ہین کہ

"مذہبی مسائل کی تحقیقات مین میرا یہ عمل رہا ہے کہ عقائد مین سلف صالحین رحمہم اللہ تعالیٰ کے مسلک سے علیحدگی نہ ہو، البتہ فقہیات مین کسی ایک مجتہد کی تقلید تمام نہین ہوسکی، بلکہ اپنی بساط بھر دلائل کی تنقید کے بعد فقہاء کے کسی ایک مسلک کو ترجیح دی ہے، لیکن کبھی کوئی ایسی رائے نہین اختیار کی جس کی تائید محققین مین سے کسی ایک نے بھی نہ کی ہو، خصوصیت کے ساتھ مسائل کی تشریح مین حافظ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہم کی تحقیقات پر اکثر اعتماد کیا ہے، ایسا بھی دو چار دفعہ ہوا کہ

ایک تحقیق کے بعد دوسری تحقیق سامنے آئی ہے، اور اپنی غلطی ظاہر ہوئی ہے، تو بعد کے اڈیشن مین اس کے مطابق تبدیل کر دی ہے، مثلاً معراج بحالت بیداری وبجسم ہونے پر قرآن پاک سے صحیح استدلال مجھے نہین مل سکا، اور بعد کو اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی توفیق سے صحیح دلیل سمجھا دی تو دوسرے اڈیشن مین اس کو بڑھا کر مقام کی تصحیح کردی، اسی طرح فنائے نار کے مسئلہ مین پہلے حافظ ابن تیمیہ اور ابن قیم کی پیروی مین کچھ لکھا گیا، بعد کو جمہور کی رائے کا اضافہ کرکے دونون کے دلائل کی تشریح کردی، اور اب بحمداللہ کہ اس باب مین جمہور ہی کے مسلک کا حق ہونا سمجھ مین آگیا ہے"

اسی طرح وہ پہلے تصویرون کے کھچوانے کو جائز سمجھتے تھے، اور زیورون مین زکوٰۃ کے عدم وجوب کے قائل تھے، لیکن اس رجوع کے بعد جمہور علماء کا مسلک اختیار کیا، اس سلسلہ مین تحریر فرمایا،

"یہ باتین کسی معترض کے خوف سے نہین بلکہ اللہ تعالیٰ کے حضور مین اپنی ذمہ داری کو محسوس کرکے کہہ رہا ہون اور دعا کرتا ہون کہ بارالٰہا مجھے صراط مستقیم پر قائم رکھ اور جب کبھی تقاضائے بشری سے مجھ کو غلطی ہو تو مجھے متنبہ اور معاف فرما، اور مسلمانون کو اس کے شر سے محفوظ رکھ اور مجھے راہ صواب دکھا"

اس رجوع واعتراف کو اُن کے مرشد نے بہت پسندیدگی کی نظر سے دیکھا،

اُن کو مرشد کی طرف سے خلافت بھی عطا ہوئی تھی، جس کے بعد وہ خاص خاص لوگون کو بیعت بھی کرنے لگے تھے، جولائی سنہ ۱۹۴۳ء مین اُن کے مرشد کا وصال ہوا تو بڑے سوز؛ درد اور غم کے ساتھ "موت العالم موت العالم" کے عنوان سے ماتم کیا، اُن کی رحلت کے بعد اُن کی سوانحعمری لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے، لیکن یہ پورا نہ ہوسکا،

اصلاحی کام

جنوری سنہ ۱۹۴۱ء مین نواب صاحب چھتاری کی صدارت مین اسلام کے سیاسی اور اقتصادی نظام کی ترتیب کے لئے ایک مجلس بنائی گئی جس کا پہلا اجلاس دار العلوم ندوۃ العلماء مین ہوا، اس کے ارکان سید صاحب کے علاوہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا شبیر احمد عثمانی، اور ڈاکٹر ذاکر حسین بھی تھے، اس مین طے پایا کہ مستند علماء اور لائق جدید تعلیم یافتہ اہل علم کی باہمی معاونت سے پہلے اسلامی سیاست واقتصاد پر ایک

معتبر کتاب لکھائی جائے اور پھر اُس میں اس حصہ کو الگ کیا جائے جو موجودہ زمانہ میں اور نئے ہندوستان میں قابل عمل ہو، اس تجویز کو عمل میں لانے کے لئے سید صاحب نے اپنے ایک ندوی عزیز سے ایک کتاب بھی لکھوائی، آگے چل کر وہ معارف کے ذریعہ اس کی برابر تلقین فرماتے رہے کہ "مسلمانوں کو اپنے اصولِ حکومت، اصولِ اقتصاد، اصولِ معاشرت، معاملات، قانون اور احکام کے متعلق یہ سوچنا نہیں ہے کہ اُن کی جگہ پر کیا ہو، کیونکہ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ ان کا دین کیا ہو، بلکہ یہ سوچنا ہے کہ اُن کو کس طرح رائج کیا جائے اور نئی مشکلوں کے لئے اسلامی اصول کے مطابق کیا فیصلہ کیا جا سکتا ہے"

(معارف جولائی ۱۹۴۶ء)

حیات شبلی

دارالمصنفین کی تاسیس کے وقت ہی سے وہ اپنے اُستاد کو مختلف شکلوں میں خراجِ عقیدت پیش کر رہے تھے، چنانچہ ۱۹۴۲ء تک مولانا شبلیؒ کے مختلف مضامین، خطبات، اور مکتوبات کو جمع کر کے گیارہ جلدوں میں شائع کیا، کثرتِ کار کی وجہ سے اُن کی صحت خراب رہنے لگی، تو اُن پر استاد کی اس وصیت کا خیال غالب رہنے لگا کہ "جب تم اور دنیا کے کاموں سے فارغ ہونا تو تم ہی میری سوانح عمری لکھ دینا"، چنانچہ ۱۹۴۰ء میں اس کام کو شروع کر دیا اور تین برس کی جانکاہ محنت کے بعد فروری ۱۹۴۳ء میں ۸۴۶ صفحے کی "حیات شبلی" لکھ کر اہلِ علم کے سامنے پیش کی، یہ ضخیم کتاب ایک شخص کی سوانح عمری ہی نہیں، بلکہ مسلمانانِ ہند کے پچاس برس کے علمی، ادبی، سیاسی، تعلیمی، مذہبی، اور قومی واقعات کی تاریخ بھی ہے، سید صاحب کی یہ آخری تصنیف ہے، سیرۃ النبی کی ساتویں جلد کے صرف دو باب ہی لکھنے پائے تھے کہ اس جہان رنگ و بو سے رخصت ہو گئے، اُن کی رحلت کے بعد، اردو زبان کے دیرینہ خدمتگذار اور ممتاز ترین ادیب مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی مدظلہ العالی نے اُن کے علمی و ادبی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے تحریر فرمایا

"چھوٹی بڑی، نئی پرانی، دینی، علمی، ادبی، درجنوں کتابوں کے مصنف اور بے شمار مقالات کے راقم کو کوئی اردو خوان بھلانا چاہے تو بھی کیسے بھلا سکتا ہے، اپنی چالیس سالہ تصنیفی زندگی میں ادب صالح سے اردو کے ذخیرہ کو جتنا مالا مال اس مرنے والے نے کیا ہے، اس سے بڑھ کر اور کون کر سکا ہے"

ہسٹاریکل کانگریس کی صدارت

۱۹۴۰ء کا زیادہ تر حصہ صحت کی خرابی میں گذرا، لیکن اس سال کے آخر میں انڈین

ہسٹاریکل کانگریس کی طرف سے شعبۂ تاریخ ہند از منۂ وسطیٰ کی صدارت کا دعوت نامہ پہنچا تو اُن کے بعض علمی جذبات ابھر آئے، اُن کو عرصہ سے اس بات کا دکھ تھا کہ غیر مسلم اہل قلم ہندوستان کے اسلامی عہد کو بدنام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں چنانچہ اس تاریخی حقیقت کے اظہار کے لئے یہ صدارت قبول کر لی، کیونکہ اس کے اظہار کا اور کوئی بہتر موقع نہیں ہو سکتا تھا، اپنی خرابی صحت کے باوجود مدراس کا لمبا سفر کیا، اور اپنے خطبہ میں جس حقیقت کا اظہار کیا، اس کو کانفرنس کے سمجھدار لوگوں نے اچھی طرح سمجھا،

تبلیغی تقریریں

اسی سفر میں مدراس کے دوسرے مقامات میں بھی اُن کی تقریریں ہوئیں، ادیل دیشارام میں تقریر کا عنوان "ملتِ محمدیہ کی حقیقت" اور دارالسلام عمرآباد میں "عبدیت" تھا، دارالسلام کی مسجد میں دو روز صبح کے وقت قرآن پاک کے درس بھی دیے، پریم پٹ میں بھی فجر کی نماز کے بعد ایک مسجد میں درس ہوا، مدراس سے بمبئی تشریف لے گئے تو وہاں کی جمعیۃ العلماء کی دعوت پر سورۃ الحمد کی تفسیر کے ضمن میں مسلمانوں کے حال پر تبصرہ فرمایا، پھر شہر کی انجمن اسلام ہال میں "اردو" اور صابو صدیق ہال میں "ہندوستان میں علوم عربیہ کی خدمت" اور ایک مخصوص مجمع میں توبہ و انابت کے صحیح طریقے پر تقریریں کیں، بمبئی سے حیدرآباد کا رخ کیا، وہاں ندوۃ العلماء کی مالی امداد کا کام کرتے رہے،

سفر واردھا

حیدرآباد ہی میں تھے کہ گاندھی جی نے اپنے ہاتھ سے اردو میں سید صاحب کو ایک خط لکھ کر قومی زبان کے مسئلہ میں مشورے کے لئے واردھا بلایا، چنانچہ حیدرآباد سے واپسی میں واردھا اُتر گئے، اور وہاں جو جلسہ ہوا، تو گاندھی جی کے سامنے اپنی تقریر میں ایک ملکی زبان کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے فرمایا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی زبان میں اسی حد تک فرق ہونا چاہئے جس حد تک اُن کے مذہبوں اور تمدنوں میں فرق ہے، اس لئے جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے اُن کی مذہبی و تمدنی اصطلاحوں اور لفظوں کا ماخذ عربی، فارسی اور ترکی ہونے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں، اور ایسی ہی اجازت ہندوؤں کو بھی اُن کے مذہبی اور تمدنی خصوصیات کے لئے ہونی چاہئے، اس کے بعد لفظوں کی صحت کا مدار لغت کی کتابوں کے بجائے بازار کے چلن اور عوام کے رواج پر ہونا چاہئے، اور اس وقت ہماری زبان میں عربی، فارسی اور ہندی، سنسکرت، اور انگریزی کا جو لفظ جس صورت میں بولا جاتا ہو، اسی کو برقرار رکھنا چاہئے، اس قسم کے خیالات وہ ۱۹۳۲ء سے پیش کر رہے تھے

چنانچہ ۳۹ء کے اگست مین جب راجندر عبدالحق پیکٹ ہوا تھا تو اس مین یہی طے ہوا تھا کہ ہندوستان مین جو سرکاری زبان ہو، وہ اردو اور ناگری دونون رسم الخط مین لکھی جانی چاہیئے اور اس زبان مین الفاظ کے انتخاب کا یہ معیار ہو کہ ان کا عام بول چال مین کس حد تک رواج ہے، اسی پیکٹ کے بعد حکومت بہار نے ایک ہندوستانی کمیٹی مقرر کی تھی جس کے ایک ممبر سید صاحب بھی تھے، لیکن بہار اور اردھا دونون مشترکہ قومی زبان کا مسئلہ حل نہ کر سکے، اور یہ سیاست کے بہاؤ کے تیز دھارے مین بہہ گیا،

رانڈیر اور سورت کا سفر

سید صاحب کا مدراس، بمبئی، حیدرآباد اور اردھا کا سفر دسمبر ۴۴ء مین شروع ہوا تھا اور اپریل ۴۵ء مین ختم ہوا، اُن کی صحت برابر گرتی جا رہی تھی، پھر بھی اُن کے عقیدت مندون کا اصرار ہر جگہ سے ہوتا کہ وہ اپنے قدوم لزوم میمنت سے اُن کے علمی جلسون اور تعلیمی کاشانون کو شرف بخشین، ان کو بھی اپنے دینی اور علمی مشن کو جلد از جلد مکمل کرنے کی دھن ایسی تھی کہ وہ دور دراز مقامات کا سفر کرنے مین اپنی خرابی صحت کا خیال مطلق نہ کرتے، چنانچہ جولائی ۴۶ء مین رانڈیر کے جامعہ حسینیہ اور مدرسہ اشرفیہ کی دعوت پر وہان تشریف لے گئے، اور جامعہ حسینیہ مین "الجد والجہاد و تعلیم المناسخ" کے عنوان سے ایک تقریر کی، اور مدرسہ اشرفیہ مین "خشیت الٰہی" پر خطبہ دیا، اسی سفر مین کچھ دنون بمبئی اور سورت مین بھی قیام رہا،

شدید علالت

اعظم گڈھ واپس آئے تو حوالی قلب مین ریاحی درد کا سخت دورہ پڑا، اور حالت بہت ہی نازک ہو گئی، شفا ہوئی تو اطبا نے دماغی اور علمی کام چھوڑ دینے کا مشورہ دیا، لیکن عمر بھر کی لگی ہوئی عادت کا چھوٹ جانا مشکل تھا، اس لئے معارف کے صرف شذرات اور ہلکے پھلکے مضامین ہی لکھنے پر اکتفا کیا، معارف کے شذرات کے ذریعہ مسلمانون کو دینی احیا کی تلقین فرماتے رہے، اور اُن کو "تہنہ" اور "تفریح" دونون کے خطرات سے آگاہ کیا،

ندوہ مین قیام کی تجویز

صحت کی خرابی کے بعد اُن کا ارادہ تھا کہ ندوۃ العلما لکھنؤ مین مستقل قیام کر کے اسکی تعلیمی و مالی حالت درست کرین، وہ تقریباً چالیس سال تک ندوہ کے معتمد تعلیمات رہے، اور اعظم گڈھ سے ندوہ برابر آتے جاتے رہتے، وہان کے ہر معاملہ کو اپنا ذاتی معاملہ سمجھ کر نپٹانے کی کوشش کرتے، کبھی اساتذہ کی باہمی کش مکش کو دور کرتے، کبھی اس کی اصلاح کے لئے طرح طرح کی تجویزون کو عمل مین لاتے، کبھی معلم بن کر درس و تدریس کا سلسلہ قائم کرتے، وہان کے

طلبہ کا اعتراف ہے کہ وہ کسی درجہ مین صرف و نحو پر باتین کرتے، تو معلوم ہوتا کہ سیبویہ اور زمخشری کی روح بول رہی ہے، ادب عربی کی فصاحت و بلاغت پر کچھ کہتے، تو اندازہ ہوتا کہ جاحظ اور جرجانی سامنے ہین، بوعلی سینا کی مشہور کتاب نجاۃ کبھی پڑھا دیتے تو طلبہ کی آنکھین کھل جاتین، اگر بخاری یا مسلم کے درس مین اپنے نکات بیان فرماتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ ساری عمر اسی فن کی تحصیل مین گذاری ہے، فقہ اور اصول مین بھی بڑی عقدہ کشائی کرتے،

قیام بھوپال

ندوۃ العلما مین اُن کے مستقل قیام کی صورت ممکن نہ ہو سکی، اسی اثنا مین نواب حمید اللہ خان والئی بھوپال نے ان کو دعوت دی کہ وہ ریاست کے دار القضاۃ اور عربی مدارس کو اپنی نگرانی مین لے کر خالص مذہبی اور شرعی رنگ مین کر دین، ۳۹ء و ۴۰ء مین نواب صاحب موصوف نے ریاست کے عربی مدارس کے انحطاط و تنزل سے متاثر ہو کر سید صاحب کی صدارت مین ماہرین تعلیم کی ایک مجلس مقرر کی تھی، جس نے ان مدارس کے لئے ایک نیا نصاب تیار کیا، اور ان کی اصلاح و تنظیم کے لئے ضوابط بنائے، اس خاکہ کو عملی صورت مین لانے کے لئے نواب صاحب سید صاحب کو بھوپال برسون سے مدعو کر رہے تھے، بقول جناب شعیب صاحب قریشی "قاضی ریاست کا عہدہ تو اُن کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکا، لیکن عربی تعلیم کی اصلاح و ترقی کے موقع کو وہ انکار نہ کر سکے" چنانچہ جون ۴۶ء مین وہ بھوپال کے قاضی القضاۃ، دار القضاۃ اور جامعہ مشرقیہ کے امیر کے عہدہ پر مامور ہوئے، لیکن دار المصنفین اور ندوۃ العلماء سے تعلقات بدستور سابق قائم رہے، جس مقصد کے لئے بھوپال تشریف لے گئے تھے، اس کی تکمیل کے لئے وہان اکتوبر ۴۹ء تک قیام کیا، لیکن اگست ۴۸ء کے انقلاب کے بعد ریاست کے لیل و نہار ہی بدل گئے، اس اثنا مین وہ معارف کے لئے کوئی مستقل مضمون تو نہ لکھ سکے لیکن وفیات کے عنوان سے اپنے معاصرین کی رحلت پر اپنے غمناک تاثرات کا اظہار کرتے رہے، وفیات لکھنا ان کا خاص فن ہو گیا تھا، چنانچہ اُن کے معاصر جناب عبد الماجد صاحب دریابادی مدظلہ نے ایک موقع پر تحریر فرمایا کہ "سید صاحب کا وہ معاصر خوش قسمت ہے، جو اُن کے سامنے وفات پا جائے، اور اُن کی ماتم گساری کی دولت اس کے حصہ مین آ جائے"، کبھی کبھی معارف مین شذرات بھی لکھ دیتے، اُن کے آخری شذرات جون ۵۰ء کے معارف مین شائع ہوئے جسکا آخری ٹکڑا یہ ہے

"ہم ہندو مسلمانون کے میل ملاپ اور میل جول پر دل سے یقین رکھتے ہین، لیکن یہ قطعاً ضروری

نہین سمجھتے کہ اس غرض کو دین دھرم کا فرق مٹا کر ہی حاصل کیا جا سکتا ہے، بلکہ ہندو ہندو اور مسلمان مسلمان رہکر بھی اس غرض کو حاصل کر سکتے ہین جس کی مثالین انگریزون کی دی ہوئی تعلیم سے پہلے ہندوستان مین کثرت سے تھین اور اب بھی ہین"

یہ گویا ہندوستان والون کے نام اُن کا آخری پیام تھا،

سفرِ حج سنہ ۴۹ء کے اکتوبر مین وہ اپنی اہلیہ اور صاحبزادے سلمان سلمہٗ کے ساتھ حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے جس جہاز سے وہ روانہ ہوئے اس کے امیر بنائے گئے، اور حجاز پہونچکر شاہ ابن سعود کے مہمان خاص رہے، ابن سعود نے کئی بار اُن کو اپنے ساتھ کھانے پر مدعو کیا، حج کے بعد مدینہ منورہ مین ایک مہینہ قیام فرمایا، بارگاہِ نبوی مین رسول اکرم کے سوانح نگار نے اپنے درد و عشق، عقیدت و محبت، عجز و نیاز، کیف و سرور کا اظہار ایک نعتیہ غزل مین کیا جس کے چند اشعار یہ ہین،

مکی مدنی ہاشمی و مطلبی ہے — آدم کے لئے فخر یہ عالی نسبی ہے
پاکیزہ تر از عرش و سما جنت و فردوس — آرامگہ پاکِ رسولِ عربی ہے
آہستہ قدم، نیچی نگہ، پست ہو آواز — خوابیدہ یہان روحِ رسولِ عربی ہے
بجھ جائے تری چھینٹون سے ای ابرِ کرم آج — جو آگ مرے سینہ مین مدت سے دبی ہے

مدینہ منورہ مین عالم اسلام کے علما کا جب کوئی چھوٹا بڑا اجتماع ہوتا، تو اس مین وہ بھی مدعو کئے جاتے، اور بعض زائرین حج کا بیان ہے کہ وہ تقریر یا گفتگو کرتے تو سب مین ممتاز نظر آتے،

حج سے دسمبر سنہ ۴۹ء مین واپس ہوئے تو بمبئی پہونچکر سخت علیل ہو گئے، وہان اعظم گڈھ کے سیٹھ عبدالعزیز الہ دین صاحب نے بڑے اخلاق و محبت و فیاضی سے اُن کی تیمارداری کی، شفا پائی تو جنوری کے وسط مین بھوپال آئے، وہان اپریل کے آخر مین اپنا تعلق ختم کر دیا، اہل و عیال کو لے کر اپنے منجھلے داماد کے یہان کانپور آ گئے، وہان سے لکھنؤ ہوتے ہوئے مئی مین اعظم گڈھ آئے، بھوپال سے کئی بار اعظم گڈھ آتے جاتے رہے، لیکن اس مرتبہ کی آمد سے رفقائے دار المصنفین خوش ہوئے کہ

پھر مستقل قیام کے لئے یہان آ جائین گے، اور وہی اگلی رونق اور چہل پہل قائم ہو جائے گی، اب اُن کو مکمل راحت اور سکون کی بھی ضرورت تھی،

ہجرت لیکن کارکنانِ قضا و قدر نے ان کو مسلمانون کی ایک نوزائیدہ سلطنت کی آخری خدمت کے لئے جون سنہ ۵۰ء مین کراچی پہنچا دیا، وہ کراچی گئے، تو ہندوستان مین اپنی ساری چیزین اور ساری املاک چھوڑ کر گئے، اس ہجرت سے اُن کو شدید مالی نقصانات پہونچے، رحمۃ للعالمین کے سیرت نگار کو رب العالمین نے سب کچھ عطا فرمایا تھا، ایک ہجرت کی سعادت باقی تھی، وہ بھی پوری ہو گئی، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح نگار کو اپنے محبوب رسول کی طرح مہاجر بن کر اپنی زندگی کا خاتمہ بالخیر کرنا تھا، وہ پاکستان کے شہری بن گئے، تو سنہ ۵۱ء مین معارف پر سے نہایت دکھ کے ساتھ بعض مجبوریون کی بنا پر ان کا اسم گرامی ہٹانا پڑا، جو اس کے سرورق پر دُرِّ آبدار کی طرح سنہ ۱۹۱۶ء سے چمکتا رہا تھا، لیکن معارف پر اُن کا نام رہے یا نہ رہے، یہ اُن ہی کی یادگار ہے، اس علمی رسالہ نے ملک کا جو بلند پایہ علمی ذوق بنایا، اور مضمون نگارون کو تحقیق و تلاش اور دقتِ نظر سے مضامین لکھنے کا جو سلیقہ سکھایا، پھر مستشرقین یا گمراہ مسلمان اہل قلم نے اسلام اور مسلمانون کے خلاف جب کبھی زہر اگلا، اس کے خلاف اس مین جو تریاق پیش ہوا، وہ سب معارف ہی کے نقوش ہین، اگر وہ کوئی اور علمی کام نہ بھی کرتے تو صرف معارف کی ادارت ہی اُن کو زندۂ جاوید رکھنے کے لئے کافی تھی،

اب وہ دار المصنفین کے ناظم بھی نہین رہ گئے تھے اور یہ اس ادارہ کی زندگی کی سب سے بڑی ٹریجیڈی تھی کہ وہ اپنی زندگی ہی مین اس سے علحدہ ہو گئے، گو وہ اس پر خوش تھے کہ اپنی زندگی ہی مین موت کے بعد اس کا نقشہ دیکھ لیا، لیکن درحقیقت اس کے جریدہ پر ان ہی کا دوام ثبت ہے، سید سلیمان ہی دار المصنفین ہین، اور دار المصنفین سید سلیمان ہی، ایک اسم کے دو مسمّٰی اور ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہین، وہ ہندوستان مین علوم و فنون کا ایک تاج محل بنا کر پاکستان چلے گئے اُن کے بعد جب کوئی علمی سیاح اس تاج محل کو دیکھنے آتا، تو اس کو دیکھتا تو ضرور لیکن اُن کی عدم موجودگی مین اس تاج کو چودہوین رات کی چاندنی مین دیکھنے سے محروم رہتا،

اہل پاکستان کی حسرت جب سید صاحب پاکستان کے باضابطہ شہری بن گئے، تو وہان کے خواص و عوام کو بڑی

خوشی تھی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سیرت نگار اور عالم اسلام کا ایک متبحر عالم اُن کی مملکت کا باشندہ ہوگیا ہے، حکومت پاکستان نے دستور بنانے کے سلسلہ میں ادارۂ تعلیمات اسلام کے نام سے علماء کا ایک بورڈ قائم کیا تھا، سید صاحب کو اس کی صدارت ڈیڑھ ہزار ماہانہ پر پیش کی گئی لیکن انھوں نے اس کو قبول کرنے سے انکار کیا، اور رضاکارانہ طور پر ملک کے مذہبی، قومی، تعلیمی اور علمی کاموں میں لگ گئے،

۵۰ء کے نومبر میں انجمن ترقی اردو پاکستان نے اُن کے اعزاز میں ایک علمی جلسہ کیا جس کی صدارت ڈاکٹر محمود حسین وزیر مرکزی کابینہ نے کی، اور سید صاحب نے اپنا ایک مقالہ "ہندوستان کے نو مسلم حکمران" پڑھا، لیکن اُن کے پاکستان جانے کی جو اصلی غایت تھی، اس کو اس عاجز راقم کو ایک مکتوب لکھ کر اس طرح ظاہر فرمایا:

"یہاں اصلی کام دین کی خدمت اور حکومت اور اصحاب اقتدار کو ادھر متوجہ کرنا ہے، مسلمانوں سے اس کی اشاعت اور علوم دین کی حفاظت کا کام مقدم ہے۔"

ان ہی باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہ ارباب حکومت سے ملتے اور موقع بموقع اُن کو تلقین کرتے رہے، پھر اسی خیال سے اپنی قیامگاہ کے قریب ہی زیر تعمیر جامع مسجد میں قرآن پاک کا درس دینا شروع کیا، اس جامع مسجد کا نام انہی کے نام پر جامع سلیمانی رکھا گیا، اس درس میں شرکاء کی تعداد اتنی بڑھی کہ لاؤڈ اسپیکر لگانے کی ضرورت ہوئی، اس مسجد کے چاروں طرف درس و تبلیغ کے کمرے، ایک کتب خانہ اور ایک علمی ادارہ بھی بنانے کا خیال تھا، لیکن یہ اُن کی زندگی میں پورا نہ ہوسکا،

سلہٹ جمعیۃ العلماء کی صدارت

جمعیۃ العلماء اسلام کی دعوت پر جنوری ۵۱ء میں ڈھاکہ، چاٹگام اور سلہٹ کا ایک دورہ بھی کیا، سلہٹ کے جمعیۃ العلماء اسلام کے ایک جلسہ میں ایک پر مغز صدارتی خطبہ بھی دیا، جس میں مذہبی و دینی خدمت کی ترغیب دینے کے علاوہ پاکستان کی اقلیتوں سے فیاضانہ سلوک کرنے کی بھی نصیحت کی، چنانچہ فرماتے ہیں:

"میں نے جب کبھی پاکستان میں غیر مسلم اقلیت پر کسی زیادتی کا حال سنا، تو بحیثیت مسلمان کے اس پر شرمندگی محسوس کی، مسلمانوں کا فرض ہے کہ خواہ کسی دوسرے ملک میں اُن کے ہم

ہم مذہبوں پر جو کچھ گذرے، مگر وہ اپنے ملک کی اقلیت کی پوری پوری حفاظت کریں، اور اسی طرح دوسرے ملک میں وہ اپنے بھائیوں کی مدد کر سکتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوئی غیر مسلم اقلیت (معاہد) پر ظلم کریگا تو قیامت کے دن خدا کے سامنے اس کا دامن پکڑونگا اور یہ بھی فرمایا کہ جو اس پر ظلم کریگا وہ جنت کی خوشبو تک نہ سونگھ سکیگا، اس سے اندازہ لگانا چاہیئے کہ ایک مسلمان پر غیر مسلم اقلیت کی جان و مال، عزت و آبرو کا کتنا بڑا فرض ہے۔"

تعلیمی و قومی سرگرمیاں

وہاں سے واپسی کے بعد موتمر اسلامی کا جلسہ تھا جس میں انھوں نے شرکت فرمائی، اس کے بعد ٹانڈو میں ایک دینی درسگاہ قائم ہوئی، تو اُس کی تاسیس میں پورا حصہ لیا، اور اس کے سرپرست مقرر ہوئے، اسی سال پنجاب یونیورسٹی کا ایک کمیشن مقرر ہوا تو اُس کے ممبر بنائے گئے، نومبر ۵۱ء میں ملتان میں ایک تبلیغی جلسہ ہوا، تو اس میں شرکت کی، پھر قائد اعظم کی یادگار میں ایک مجوزہ دارالعلوم کی جو کمیٹی بنی، اس کے بھی رکن ہوئے، اور اس کے لئے لاہور، ملتان اور راولپنڈی کا سفر کیا، دستور ساز اسمبلی کے بنیادی حقوق کی سب کمیٹی کے بھی ممبر مقرر کئے گئے، اس کمیٹی میں ان کا سب سے بڑا کام یہ ہوا کہ اس کے ارکان کو قرآن اور سنت کے اتباع کی اہمیت یہ واضح کر کے بتائی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو کتاب اور سنت کی جو دو نعمتیں عنایت فرمائی ہیں، ہدایت الٰہی انہی دونوں کے اندر منحصر ہے، اب جو بھی ایک کو چھوڑ کر صرف دوسری پر قناعت کرے گا، وہ یقیناً گمراہ ہوگا، اور وہ ضلالت کی خودکشی سے کبھی بچ نہیں سکتا، سید صاحب نے اس نکتہ کی وضاحت بار بار کی، چنانچہ مذکورہ بالا کمیٹی کے ممبروں کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آگئی، اور انھوں نے اپنی رپورٹ میں یہ دفعہ رکھی کہ کوئی ایسا قانون نہ بنایا جائے گا، جو قرآن پاک اور سنت کے خلاف ہو۔

فروری ۵۲ء میں انھوں نے دنیائے اسلام کے تمام علماء کو کراچی میں مدعو کیا، یہ کانفرنس احتفال علمائے اسلام کے نام سے منعقد ہوئی، اس کی کامیابی کے متعلق اپنے ایک مکتوب میں عاجز راقم کو تحریر فرماتے ہیں:

"احتفال علمائے اسلام کی مشغولیت کے سبب سے جواب نہ دے سکا، احتفال کامیاب رہا، گو ہر جگہ کے علماء کی شرکت نہ ہو سکی تاہم مختلف ملکوں کے علماء یکجا ہوگئے، خصوصاً ایران اور نجف کے علماء کی آمد سے سُنّی اور

شیعہ علماء کے درمیان توافق بحمد اللہ پیدا ہوا، اور ہم آہنگی ہوگئی۔"

مارچ ۱۹۵۰ء میں لاہور میں پاکستان ہسٹاریکل کانفرنس کے شعبۂ اسلامی تاریخ کی صدارت کی، اور اس میں ایک مقالہ بھی "ذیل" کے عنوان سے پیش کیا، وہاں عربی زبان وادب کی بھی ایک کانفرنس ہوئی، اس کی بھی صدارت انھوں نے فرمائی، پھر اسی مہینہ پنجاب یونیورسٹی میں اُن کا ایک توسیعی لکچر بھی ہوا،

اسی سال عرب ممالک کی سب سے بڑی علمی اکیڈمی مجمع الفواد الاول نے اُن کو اپنا رکن بنایا، ابو علی سینا کی ہزار سالہ جوبلی کے موقع پر حکومت عراق نے انکو اپنے یہاں مدعو کیا، لیکن اس میں شرکت نہ فرما سکے،

اپریل ۱۹۵۰ء کا پورا مہینہ ملتان اور راولپنڈی میں گذارا، یہاں عربی مدارس کے سالانہ جلسے ہوتے رہے، انکی تنظیم کے مفید مشورے دیے، ملتان کو قائد اعظم کے مجوزہ دارالعلوم کیلئے پسند فرمایا،

کراچی یونیورسٹی قائم ہوئی تو اس کے سینٹ کے ممبر نامزد کئے گئے، جناب لیاقت علی خان مرحوم کی یاد میں حکومت نے پانچ لاکھ کے سرمایہ سے ایک کتب خانہ قائم کرنا چاہا، تو اس کی تاسیس وتشکیل کی خدمت انھی کے سپرد ہوئی،

ان کے ذریعہ پاکستان کے مذہبی وقومی کام تو انجام پارہے تھے، لیکن خود ان کے لئے وہاں اب تک کوئی معاشی صورت پیدا نہیں ہوئی تھی، چنانچہ ایک مکتوب میں اس راقم کو تحریر فرمایا کہ معاشی صورت پیدا کرنے کے لئے آمادہ ہوں کہ وہی پیشۂ قدیم کتب فروشی اختیار کیا جائے، چنانچہ مکتبۃ الشرق کے نام سے کتابوں کی ایک دوکان کھولی، پاکستان کے آئین کے سلسلہ میں وہاں کی حکومت نے ادارۂ تعلیمات اسلام قائم کیا تھا، اس کی صدارت ان کو برابر پیش کی جارہی تھی، لیکن وہ اس کو قبول کرنے سے انکار کرتے رہے، لیکن ہجرت کے تقریباً ستائیس مہینے کے بعد یہ عہدہ کچھ شرائط کے ساتھ قبول فرمایا، وہ اپنے ایک مکتوب مورخہ ۲۰ اگست ۱۹۵۲ء میں اس حقیر کو تحریر فرماتے ہیں کہ

"یہ (یعنی عہدۂ صدارت ادارۂ تعلیمات اسلام) دو برس پہلے میرے سامنے پیش کیا گیا تھا، مگر میں نے بعض شرائط رکھی تھیں، وہ اب پورے ہورہے ہیں، یعنی آئین کے ساتھ قانون رائج کرنے کی اصلاح کا کام اب شروع ہوا ہے، تو میں نے ۲۰ اگست کو قبول کر لیا، تاکہ پورے مسودۂ آئین پر رائے دی جا سکے،

گو آئین کا کام اب ختم ہو رہا ہے"

یہ معلوم ہو سکا کہ اپنے شرائط پر عہدہ قبول کیا، تو کتنا الاؤنس لینا پسند فرمایا،

۱۹۵۲ء کے آخر میں جمعیۃ العلماء اسلام کے صدر مقرر ہوئے، اور اس نے پاکستان کے دستور کو اسلامی بنانے میں جو ساعی کی، اس میں اُن کا حصہ نمایاں رہا،

۱۹۵۳ء کے مارچ میں پاکستان ہسٹاریکل کانفرنس کی صدارت کیلئے ڈھاکہ تشریف لیگئے، وہاں خطبۂ صدارت میں اردو اور بنگالی کے تنازع کے سلسلہ میں ایسے درد مندانہ خیالات کا اظہار کیا جو وہاں کے ناعاقبت اندیش طلبہ کو پسند نہیں آئے، اسلئے جب کانفرنس کا اجلاس دوسرے روز شروع ہوا، تو انھوں نے ہنگامہ برپا کرنے کی کوشش کی، جس سے اجلاس کو ملتوی کردینا پڑا، اور جب سید صاحب موٹر میں بیٹھ کر اپنی قیامگاہ کو واپس جانے لگے، تو شرارت پسند طلبہ نے اُن کی موٹر گھیر لی، نازیبا الفاظ استعمال کئے، اور تشدد پر آمادہ ہو کر اُن کی اہانت پر اتر آئے، لیکن وہ اُن کی اہانت نہیں کر رہے تھے، بلکہ علم وحکمت، تحقیق وبصیرت، فکر وتدبر، علم وجلالت اور متانت ووقار کی تذلیل کر رہے تھے، مشرقی بنگال کے طلبہ کا یہ شرمناک رویہ اُن کی قومی زندگی پر ہمیشہ کے لئے ایک بدنما داغ بن کر رہے گا، یہ طوفان بدتمیزی ختم ہوا، تو ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے سید صاحب کی قیامگاہ پر آکر اظہار ندامت کیا، اور معافی مانگی، لیکن اُن کی ذات والا صفات ان رسمی باتوں سے بہت ہی بلند تھی، ڈھاکہ سے کراچی واپس جانے لگے تو ہندوستان میں اپنے منجھلے داماد جناب سید حسین صاحب اڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ فتح پور ہسوا کے یہاں آکر ٹھہرے، یہیں دارالمصنفین کا ایک چھوٹا سا قافلہ سراپا محبت شکر انکی قدمبوسی کیلئے حاضر ہوا، ان عزیزوں کو دیکھ کر بیحد مسرور ہوئے، بڑے لطف ومحبت سے پیش آئے اور وعدہ فرمایا کہ اس سال رمضان المبارک کے بعد دو مہینے دارالمصنفین میں گزاریں گے، جس سے دارالمصنفین میں انکی روحانی اولاد میں بہت خوش ہوئیں، اسی سفر میں دارالعلوم ندوہ کی مقناطیسی قوت نے اُن کو اپنی طرف کھینچا، اور وہ فتح پور سے کھینچ کر ندوہ چلے گئے، وہاں کے طلبہ اپنے بچھڑے ہوئے باپ سے بڑے والہانہ انداز سے ملے، اور وہ بھی اپنے محبوب فرزندوں سے مل کر اشکبار ہوئے، اُن کے اعزاز میں جمعیۃ الاصلاح کی طرف سے جمالیہ ہال میں ایک جلسہ ہوا، تو پورا مجمع گیا، جب سید صاحب نے ہال کے زینہ پر قدم رکھا تو عمارت پر حسرت بھری نگاہ ڈالی، اور درد بھری آواز میں یہ شعر پڑھا

مین اپنے گھر مین آیا ہون مگر انداز تو دیکھو
مین اپنے آپ کو مانند مہمان لیکے آیا ہون،

اس کے پڑھنے پر اُن کی طرح اور لوگون کی بھی آنکھین اشکبار ہوگئین، جلسہ کی کارروائی، تلاوت قرآن پاک سے شروع ہوئی، قاری نے شروع مین یہ آیت پڑھی،

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ قَالَ أَبُوهُمْ إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلَا أَنْ تُفَنِّدُونِ، (یوسف)

جب کہ قافلہ چلا تو ان کے باپ (یعنی حضرت یعقوبؑ) نے کہا کہ مین یوسف کی خوشبو پا رہا ہون، اگر تم مجھ کو بیوقوف نہ بناؤ،

اس کو سن کر تمام حاضرین متاثر ہوئے خود سید صاحب ضبط نہ فرما سکے، بے اختیار اُن کی آنکھون سے آنسوؤن کا تانتا بندھ گیا، ایک طالب علم نے عربی مین سپاسنامہ پڑھا جس کے بعد سید صاحب نے بڑے درد بھرے انداز سے اپنی تقریر شروع کی، پوری تقریر سوز و درد کا مرقع تھی، اس مین پاکستان کی ہجرت کے اسباب بیان فرمائے، اور آخر مین اپنے عزیز طلبہ کو یہ پیام دیا،

سبق پھر پڑھ صداقت کا شجاعت کا عدالت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

ندوہ کے طلبہ کے نام ان کا یہ آخری پیام تھا جو ان کی مادر درسگاہ کے ہر زمانہ کے طلبہ کے لئے باقی و جاری رہیگا،

دارالمصنفین کے خدام رمضان المبارک کے بعد اعظم گڈھ اُن کی تشریف آوری کا انتظار کر رہے تھے کہ پہلے ایک خط مین موانعِ سفر کے اسباب لکھے، پھر اپنی علالت کی اطلاع دی، آخری خط مین اُن کے روبصحت ہونے کی بشارت تھی لیکن ۱۴ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ مطابق ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء کو عشاء کے بعد یکایک ریڈیو سے خبر ملی کہ وہ اللہ کو پیارے ہوگئے!

عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا،

وہ ہم سے رخصت ہوگئے اور زبانِ حال سے کہہ رہے ہین:-

رفتم و از رفتنِ من عالمے تاریک شد
من مگر شمعم چو رفتم بزم برہم ساختم

گر عالم بالا مین اُن کو دیکھ کر فرشتے پکارتے ہونگے کہ جگہ خالی کرو مداح آتا ہے محمد کا"

بچپن اور طالب علمی کے کچھ واقعات

از

مولانا ابوظفر صاحب ندوی

علامہ سید سلیمان ندوی کی ولادت ۱۳۰۲ھ مین ہوئی، جیسا کہ اُن کے والد ماجد حکیم سید ابوالحسن مرحوم کے سفینہ مین درج ہے، مقام ولادت صوبہ بہار ضلع پٹنہ کا ایک چھوٹا سا گاؤن دیسنہ نامی ہے، جو بہار شریف سے تین چار کوس کے فاصلہ پر واقع ہے، جہان زیادہ تر سادات آباد تھے، اور اس کے باشندون کی بڑی تعداد تعلیم یافتہ ہونے کے سبب اُس کی شہرت دور دور تک تھی، جس گھر مین علامہ کی ولادت ہوئی تھی، وہ گھر آج بھی مسجد کے متصل موجود ہے،

آپ کا اصلی نام سید ابو نجیب ہے کیونکہ خاندانی نام زیادہ تر "ابو" پر ہین، چنانچہ اُن کے چچا کا نام ابوتراب، اور دوسرے کا ابویوسف، اور اُن کے بڑے بھائی کا نام ابوحبیب تھا،

آپ کے منجھلے چچا سید ابوتراب دہلی، لکھنؤ وغیرہ کا سفر کر چکے تھے، اور آج سے تقریباً ستر سال قبل جدید تہذیب سے متاثر ہو کر سر سید احمد خان کے ہم خیال ہو گئے تھے، ان ہی نے اُن کا نام سلیمان رکھا تھا کہ جب وہ لندن سے واپس آئے گا، تو لوگ اس کو "مسٹر سلومن" کہین گے، چنانچہ اسی نام سے اُن کی شہرت ہوئی، اور علامہ موصوف نے خود بھی اسی کو پسند فرما کر اپنا نام سید سلیمان قرار دیا،

لطف کی بات یہ ہے کہ واقعی اپنے چچا کی زندگی ہی مین علامہ موصوف لندن گئے جس پر انھون نے بڑی مسرت کا اظہار کیا کہ میری پیشین گوئی صحیح نکلی،

آپ کا پدری سلسلۂ نسب امام موسیٰ رضا تک پہنچتا ہے، اور مادری امام زید تک،

ابتدائی تعلیم آپ کی عمر چار پانچ برس کی ہوگی کہ آپ کی بسم اللہ ہوئی، اور وہ مکتب میں بٹھا دیئے گئے، آپکے پہلے استاد کا نام مولوی مقصود علی تھا، مولوی صاحب موصوف خاکسار کے بھی پہلے استاد تھے، لیکن میں اس قدر کم عمر تھا کہ ان کی علمی قابلیت کا صحیح اندازہ اس وقت نہ لگا سکا، البتہ اس قدر یاد رہ گیا ہے، کہ فارسی کی بڑی چھوٹی سب کتابوں کو پڑھا دیتے تھے،

مجھے ہندوستان کے دوسرے صوبوں کا حال نہیں معلوم لیکن آج سے ستر پچھتر برس قبل، صوبہ بہار کے چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں مکاتب کا نظام میری ابتدائی عمر تک موجود تھا،

گاؤں کا کوئی زمیندار کسی مولوی کو بہت معمولی تنخواہ پر اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے مقرر کرتا تھا تنخواہ کے علاوہ ناشتے کھانے کپڑے اور دھوبی حجام کے مصارف سب کا بار زمیندار پر ہوتا، ہر موسم میں کچھ غلہ بھی زمیندار ان کو دیتا تھا، اس کے علاوہ گاؤں کے دوسرے بچوں کو بھی اس کے ساتھ تعلیم کی اجازت ہوتی تھی، اُن کے والدین بھی مولوی صاحب کی اپنی اپنی استطاعت کے مطابق خدمت کرتے تھے، اس طرح مولوی صاحب کی زندگی خوش حالی سے بسر ہوتی تھی، لڑکوں کی تعداد بیس پچیس سے زیادہ نہیں ہوتی تھی اور بعض بعض گاؤں میں متعدد مکتب ہوتے تھے،

ان مکتبوں میں ہندو مسلمان دونوں کے بچے پڑھتے تھے معلم عموماً فارسی داں مسلمان ہوتے اردو کی تعلیم برائے نام ہوتی تھی، سارا زور فارسی ادب پر صرف ہوتا تھا، اس زمانہ میں مسلمان شرفا خطوط بھی فارسی ہی میں لکھتے تھے، نصاب درس میں مندرجۂ ذیل کتابیں ہوتی تھیں،

آمد نامہ، گفتگو نامہ، تعلیم عزیزی، کریما، مامقیما، گلستان، بوستان، یوسف زلیخا، اخلاق محسنی، سکندر نامہ، بہار دانش، سہ نثر ظہوری، رقعات عالمگیری، اور انشاء خلیفہ وغیرہ،

تاریخ اور جغرافیہ کی تعلیم قطعی نہیں ہوتی تھی، البتہ حساب میں جمع تفریق، ضرب تقسیم تک کی تعلیم ہوتی تھی، خوش خطی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا، طلبہ عموماً ۱۴-۱۵ سال کے اندر نصاب ختم کرکے شہر چلے جاتے، جہاں عربی یا انگریزی مدارس میں داخل ہو جاتے،

یہ مجھے معلوم نہیں کہ علامہ موصوف نے کے برس اس مکتب میں تعلیم پائی، مکتبی تعلیم ختم ہونے کے بعد موصوف کے بڑے بھائی حکیم سید ابو حبیب صاحب نے تعلیم دینی شروع کی، آہستہ آہستہ تھوڑے طلبہ یہاں بھی جمع ہوگئے، یہ مکتب بھی کچھ دنوں تک چلا، اور ایسا یاد آتا ہے کہ اُن کے حج کے لئے جانے کے سبب سے یہ سلسلہ ختم ہوگیا، ان مکاتب کی تعلیم میں بیت بازی بھی ہوتی، کبھی ایک ہی مکتب کے طلبہ دو جماعتوں میں تقسیم ہوکر بیت بازی کرتے، اور کبھی دو مکتبوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ ہوتا، علامہ سید سلیمان ندوی کے مکتب میں بھی دو پارٹیاں تھیں، جہاں تک مجھے یاد ہے ایک پارٹی کے امیر علامہ موصوف اور اُن کے حریف خاص مولوی حکیم سید نجم الہدیٰ صاحب ندوی تھے، اور دوسری کے مولوی محمد قاسم صاحب، یہ دونوں آج بھی بقید حیات ہیں، اسکا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ علامہ موصوف کو شاعری سے ایک خاص لگاؤ ہوگیا، اور ہزاروں اشعار ان کو زبانی یاد ہوگئے، خاکسار بھی باوجود کم سنی کے ان جلسوں میں عموماً شریک رہتا تھا،

اسی سلسلہ میں علامہ نے ایک بیاض تیار کی تھی جس کے سرورق کو رنگ سے خوشنما کر دیا تھا، اس میں ہزاروں منتخب اشعار درج تھے، میرے والد مرحوم کی وفات ۱۹۲۹ء تک یہ بیاض میرے ذاتی کتب خانہ میں موجود تھی، چونکہ بیت بازی میں حریف خودساختہ اشعار بھی پیش کرتے تھے، اس لئے علامہ موصوف کو تقطیع کی طرف خاص توجہ کرنی پڑی جس سے اُن کو فن عروض پر اس قدر عبور ہوگیا تھا، کہ علماء میں اس کی مثالیں کم ہوں گی،

علامہ موصوف کو کھیل کود اور اس قسم کے تفریحی مشاغل سے مطلق دلچسپی نہ تھی، اُن کے احباب جب تاش یا شطرنج کھیلتے، تو وہ صرف تماشائی ہوتے تھے، یا اخبار وغیرہ پڑھنے لگتے، اگر کبھی کسی کھیل میں شرکت کی تو وہ کبڈی ہے، جس کا رواج ہندوستان کے تمام صوبوں میں کسی نہ کسی شکل میں آج بھی موجود ہے،

علامہ صغر سنی میں ایک کھیل اور بھی کھیلا کرتے تھے آپکے والد، دادا، بھائی، بلکہ خاندان کے بیشتر بزرگوں کا پیشہ طبابت تھا، اس لئے گھر میں علاج معالجہ کا چرچا ہر وقت رہتا تھا، اس کی نقل میں کبھی کبھی مختلف قسم کے شیشیوں میں پانی بھر کر بچوں کا علاج کرتے تھے، اُن کی بڑی ہمشیرہ جب پوچھتیں کہ یہ کیا کرتے ہو تو کہتے کہ بیماروں کا علاج کرتا ہوں، لوگ کہتے کہ لڑکا آگے چل کر بڑا طبیب ہوگا، لیکن باوجود اُن کے والد کی دلی تمنا کے یہ

پیشین گوئی پوری نہ ہوئی،

عربی کی ابتدائی تعلیم اپنے برادرِ معظم حکیم سید ابو حبیب صاحب مجددی سے حاصل کرنے کے بعد دربھنگہ تشریف لے گئے اُن کے ہم مکتبوں میں سے صرف مولوی سید نجم الہدیٰ صاحب نے اُن کا ساتھ دیا، وہاں کچھ عرصہ تک تعلیم پاتے رہے، افسوس ہے کہ اُن کے کسی استاد کا نام حافظہ نے محفوظ نہیں رکھا،

علامہ موصوف بچپن سے کم سخن اور خاموش طبیعت کے انسان تھے جس سے ان کے استاد اُن کو غبی اور کند ذہن سمجھتے تھے، اور اُن کے تیز زبان ساتھیوں کو ذہین اور صاحبِ ذوق سمجھ کر اُن کی طرف زیادہ توجہ کرتے تھے، اور پھر جب اہل فضل وکمال کے بعد دنیا میں اُن کی شہرت ہوئی تو ان کی کم سخنی کی وجہ سے لوگ اُن کو مغرور سمجھنے لگے، علامہ موصوف کو یہ اندازہ ہوا، تو انھوں نے اپنے کو شگفتہ بنانے کی بے حد کوشش کی، اور آخری عمر میں تو واقعی اس قدر شگفتہ ہوگئے تھے کہ مجلس سے اٹھنے کو دل نہیں چاہتا تھا،

ایک لطیفہ سننے کے قابل ہے، علامہ موصوف اپنی شہرت کے شباب کے زمانہ میں کسی تقریب سے حیدرآباد تشریف لے گئے، اتفاق سے اس وقت دربھنگہ والے استاد وہاں موجود تھے، انھوں نے اخبار میں پڑھا کہ مولانا سید سلیمان صاحب تشریف لائے ہیں، اور فلاں جگہ مقیم ہیں، تو شاہ سلیمان صاحب پھلواروی کو سمجھ کر اُن سے ملنے کے لئے آئے، مگر اُن کے بجائے ایک دوسرے سلیمان کو پایا، مجھے یاد نہیں کہ خود استاد نے شاگرد کو پہچان لیا، یا تعارف کے بعد پہچانا،

تعارف کے بعد استاد نے کہا کہ سلیمان! تو تو بڑا غبی اور کند ذہن تھا، اس قدر بڑا آدمی کیسے بن گیا، احباب نے قہقہہ لگایا، اور بات آئی گئی ہوگئی،

دربھنگہ کی تعلیم کے کچھ دنوں کے بعد پھلواری شریف (متصل پٹنہ) کے مدرسہ میں داخل ہوئے، جناب شاہ سلیمان صاحب پھلواروی کے بڑے صاحبزادہ، شاہ حسن میاں مرحوم آپ کے ہم عمر تھے، اور غالباً ہم جماعت بھی تھے، حسن میاں حُسنِ صورت اور حُسنِ سیرت دونوں میں ممتاز تھے، ندوۃ العلماء کا جو سالانہ جلسہ عظیم آباد پٹنہ میں ہوا تھا، اس میں خاکسار بھی باوجود نوعمری کے شریک تھا، اس وقت حسن میاں کی عمر ۱۴ - ۱۵ سال سے زیادہ نہ تھی، اور علامہ موصوف کی بھی

کم و بیش یہی عمر رہی ہوگی

جہاں تک مجھے یاد ہے، اس جلسہ میں شرکت کے لئے علامہ موصوف کے والد حکیم سید ابو الحسن صاحب بھی تشریف لائے تھے، وہ اس جلسہ سے اتنا متاثر ہوئے کہ انھوں نے طے کیا کہ علامہ موصوف کو ندوہ بھیج دیا جائے، چنانچہ دوسرے سال وہ لکھنؤ پہنچ گئے، ان سے پہلے اُن کے ہم مکتب مولوی محمد قاسم صاحب ابن حضرت شاہ تجمل حسین صاحب اور مولوی عبد السبحان پہنچ چکے تھے، غالباً موصوف دوسری جماعت میں شریک ہوئے، کیونکہ جب میں ندوہ میں پہلی جماعت میں داخل ہوا تو وہ چوتھی جماعت میں تھے اور شرح وقایہ پڑھتے تھے،

ندوہ میں ورزش کا بھی انتظام تھا، مگر ورزش قدیم طریقہ کی تھی، اور کشتی کے لئے اکھاڑا بنا ہوا تھا، اس کے آس پاس مگدر رکھے ہوتے، ڈھال اور لکڑی کی تلوار بھی تھی، لاٹھی چلانا بھی سکھلایا جاتا تھا جس کو طلبہ شوق سے سیکھتے تھے، اس زمانہ میں مسٹر مکڈانل اودھ کے لفٹنٹ گورنر تھے، یہ مسلمانوں پر بڑے مہربان تھے، انھوں نے اس کی ابتداء اردو زبان کی جڑ کاٹنے سے شروع کی، اودھ کی عدالتی زبان اردو کو بدل کر ہندی کردی[1]، دوسرا حملہ ندوہ پر ہوا، اور چوتھا علی گڑھ پر لیکن نواب محسن الملک جیسے سیاست داں نے تو کالج کو بچالیا، مگر غریب ندوہ چکر میں آگیا، مکڈانل صاحب نے اراکینِ ندوہ سے دریافت کیا، کہ ندوہ میں ڈھال تلوار، مگدر، کشتی کی مشق کیا جہاد کی تیاری کے لئے کرائی جاتی ہے؟ اس سے اہلِ ندوہ اس قدر گھبرائے کہ سب کھیل بند کردیئے گئے، اور پھر ایک عرصۂ دراز کے بعد ورزش کے بعد فٹ بال کرکٹ، ہاکی، اور شب جمعہ کو کبڈی کا رواج ہوا لیکن علامہ موصوف نے کبھی بھی ان ورزشی کھیلوں میں دلچسپی نہیں لی، ورزشی کھیلوں کا وقت عصر سے لیکر مغرب تک تھا، علامہ موصوف یہ وقت رسالہ، اخبار، یا کتب بینی میں صرف کرتے، اور وہ دار الاخبار کے جس میں ہندوستان کے اکثر اخبارات اور رسالے آیا کرتے تھے، ناظم مقرر ہوئے، اس سے انھوں نے خود بھی فائدہ اٹھایا، اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیتے تھے، کچھ دنوں کے بعد انھوں نے ایک علمی پارٹی تیار کرلی جس کے تمام ممبر مشہور شاعر

---

[1] معارف اردو کے بجائے ہندی نہیں کی تھی، بلکہ اردو کے ساتھ ہندی کو بھی عدالتی زبان بنادیا تھا،

جلیل جانشین امیر مینائی کے صاحبزادے مولوی صدیق حسن صاحب اور عثمان پاشا تھے، جو شیخ پورہ ضلع مونگیر کے باشندے
تھے، اسی زمانہ میں ایک ادبی انجمن تہذیب الاخلاق کے نام سے قائم کی، جس میں طلبہ کو تحریر اور تقریر کی مشق کرائی
جاتی، جمعہ کے بعد اس کا جلسہ ہوتا، کبھی مہتمم صاحب اور کبھی کوئی دوسرا مدرس اس کا صدر ہوتا، بعض دفعہ آخری درجہ
کا کوئی موقر طالب علم اس فرض کو انجام دیتا، اس انجمن کی نظامت، جہاں تک مجھے یاد ہے، اکثر انہی کے ہاتھ میں رہی، وہ
بہترین مقررین میں تھے، لیکن انکی تقریر میں جوش و خروش نہ ہوتا اور نہ وہ جذبات کو ابھارنے والی ہوتی، بلکہ زیر بحث
مسئلہ کو دلائل اور امثال کے ذریعہ سنجیدگی کے ساتھ دل نشین کرنے کی کوشش ہوتی، ایک مرتبہ "محنت" پر تقریر کی تھی جس
سے یہ خاکسار اس قدر متاثر ہوا کہ اسی دن سے فٹ بال اور کرکٹ کے بجائے کتابوں سے زیادہ دلچسپی لینے لگا،
جس سے کچھ لکھنا پڑھنا آگیا،

اب علامہ ممدوح نے مضمون نگاری بھی شروع کر دی تھی، اس زمانہ میں مولوی عبدالحلیم صاحب شرر لکھنوی کے
ناولوں کی بڑی دھوم تھی، اور مشہور رسالہ "دلگداز" ماہوار نکلتا تھا جس میں اس زمانہ کے مذاق کے مطابق تاریخی، علمی اور ادبی
مضامین ہوتے تھے، اس قسم کے ایسے رسالے اور ناول وہ بہت پڑھتے، ابتداے شباب سے ان کی آنکھیں خراب تھیں، اور
بار بار ڈاکٹروں نے ان کو ترک تعلیم کا مشورہ دیا تھا، وہ ترک تو کیا کرتے، رات کے ایک ایک بجے تک کتابوں کے مطالعہ میں
مشغول رہتے،

اس زمانہ کا بہترین اردو رسالہ "مخزن لاہور" تھا جس کے اڈیٹر شیخ عبدالقادر بار ایٹ لا تھے، لکھائی چھپائی، کاغذ
کی عمدگی کے علاوہ وہ ایک خالص ادبی رسالہ تھا، اور اردو داں طبقے میں بہت مقبول تھا، علامہ ممدوح کا پہلا مضمون
اسی رسالہ میں شائع ہوا،

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ ابتدائی تعلیم کے زمانہ میں علامہ ممدوح بیت بازی میں پیش پیش تھے، جس سے ان میں شعری
ذوق پیدا ہو گیا تھا، جو لکھنؤ آکر اور تیز ہو گیا تھا، ندوہ کے طلبہ میں مولوی رکن الدین دانا سہسرامی، سید عبدالغفور شہرہ بہاری، نو
نادر دتی چڑیاکوٹی کے صاحبزادے ملا مبین وغیرہ شاعری کرتے تھے، اس زمانہ کے اساتذہ میں داغ، امیر، جلیل، ریاض، مضطر

دیگر بقیہ جات تھے، لکھنؤ میں گذشتہ ادبی سرگرمیاں پوری طرح موجود تھیں، عشرت لکھنوی کا نام طلبہ میں زیادہ معروف
تھا، پیام یار نامی رسالہ طرحی اور غیر طرحی غزلوں کے ساتھ ہر ماہ نکلتا تھا، مرثیہ کی مجلسیں اور مشاعرے بکثرت ہوتے تھے،
علامہ موصوف ان مشاعروں میں اکثر شرکت کرتے، آخر خود بھی شعر کہنے لگے، اور انھیں اپنے احباب خاص طور سے مولوی
صدیق حسن اور عثمان پاشا کو سنا کر داد لیتے تھے،

علامہ موصوف نے ایک بیاض بھی تیار کی تھی، اس کے ایک جانب عربی اور دوسرے جانب اردو اشعار تھے،
جس وقت یہ بیاض میرے ہاتھ آئی، اس وقت میں متنبی پڑھتا تھا، اس کو میری بدذوقی سمجھیے کہ ان کے عربی اشعار
مجھے پھیکے نظر آئے، متنبی نے جس مضمون کو صرف دو مصرعوں میں ادا کیا تھا، علامہ موصوف نے بہ تغیر الفاظ چار مصرعوں
میں کیا تھا، ناظرین اس کا لحاظ رکھیں کہ میں ان کے اوائل زندگی کا حال لکھ رہا ہوں، میری اس بدمذاقی
کا یہ نتیجہ نکلا کہ اس کا ایک عربی شعر بھی مجھے یاد نہ رہا، مگر ان کے اردو اشعار مجھے بہت یاد ہو گئے تھے، جو ان کے دیوان
یا بیاض سے نقل کیے تھے،

وہ اکثر مشاعروں میں شریک ہوتے تھے، اور اپنی غزل بھی سناتے تھے، ایک مرتبہ ایک مشاعرہ کی خبر
شام کو ملی، رات کو مشاعرہ تھا، غزل کہنے کی کوشش کی، اور صرف ایک شعر کہنے پائے تھے کہ احباب آگئے، وہ ان کے
ساتھ چل پڑے، اس زمانہ میں وہ ڈاسن کا جوتہ، علی گڑھ نما پاجامہ کرتا، یا کٹ دار قمیص، شیروانی، چشمہ اور ترکی ٹوپی
استعمال کرتے تھے، اور ہاتھ میں چھڑی لیکر باہر نکلتے تھے، اسی شان سے مشاعرہ میں پہنچکر بیٹھ گئے، ان کی صورت
شکل اور لباس دیکھ کر شمع ان کے سامنے بھی آئی، پہلے تو بہت پریشان ہوئے، لیکن انتقال ذہن نے پریشانی
سے بچا لیا، انھوں نے یہ معذرت کی کہ مجھے مشاعرہ کی مطلق خبر نہ تھی، ابھی احباب نے اطلاع دی، فوراً چلا
آیا، البتہ ایک شعر ذہن میں آیا ہے، وہ عرض کرتا ہوں،

سر سے قدم تک ہے ردائے حیا پڑی
حاجت ہی کیا ہے آپ کو صاحب نقاب کی

یہ شعر لکھنؤ کے رنگ کا تھا، خوب داد ملی،

اس زمانہ کا ایک دلچسپ واقعہ قابل ذکر ہے، مولانا فاروق چریا کوٹی (جن کی شاگردی کا فخر بندہ کو بھی
حاصل ہے) کے ندوہ سے مستعفی ہونے کے بعد نائب کے طور پر جناب مفتی عبد اللطیف صاحب مقرر ہوئے، (بندہ کو انکی
بھی تلمذ کی نسبت ہے) یہ فقہ حنفی کے بہت بڑے ماہر تھے، اور اس مین اُن کو بڑا غلو اور مزاج مین بے حد تقشف
تھا، ان کو بہت کم کسی نے مسکراتے ہوئے دیکھا، احکام کی تعمیل کرانے مین اس قدر سخت تھے کہ عدول حکمی تو
بڑی بات ہے، تاخیر بھی روا نہ تھی، طلبہ ہی مین سے بعض کو انھون نے جاسوس بنا رکھا تھا، جن کے ذریعہ طلبہ کی
مخفی باتین اُن کو معلوم ہو جاتین، اُن کی حکومت مین معافی کی کوئی دفعہ ہی نہ تھی، وہ شخصی حکومت کا مکمل نمونہ
تھے، طلبہ اُن کے نام سے تھراتے تھے، بعض طلبہ سمجھتے تھے کہ جن اُن کے تابع ہے، جو طلبہ کے پرائیوٹ حالات سے
اُن کو باخبر کر دیتا ہے، ایک دن معلوم ہوا کہ مفتی صاحب کہین باہر جانے والے ہین، یہ خبر سُن کر طلبہ نے ڈرامہ
کی تیاری شروع کر دی، اور ان طلبہ کو خاص طور سے شریک کیا گیا، جنکی نسبت جاسوسی کا خیال تھا، چنانچہ
رات کو کھیل شروع ہوا، علامہ موصوف انگریز جج بنے، اور مولوی ضیاء الحسن علوی اُن کی لیڈی، مقدمہ شروع
ہوا، ڈرامہ کا قصہ مجھے یاد نہین رہا،

ڈرامہ ختم ہونے کے قریب تھا کہ غُل مچا، مفتی صاحب آگئے، ہر شخص اپنے اپنے کمرہ مین پہنچ گیا، اس ذکر کا اصل
منشا یہ ہے کہ اس ڈرامہ مین بھی علامہ موصوف کا انتخاب ایک اعلیٰ عہدہ کے لئے کیا گیا، جس کے لئے اعلیٰ قابلیت کی
ضرورت تھی، اس انتخاب سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت بھی وہ اپنے ہم عصرون مین اتنے ممتاز تھے کہ سب کی
نگاہ اُن ہی پر پڑی، دوسری قابل تعریف بات یہ ہوئی کہ مفتی صاحب کو اس کی بھنک لگ گئی تھی، مگر وہ مجرمون
کو گرفتار نہ کر سکے، جس کے سرغنہ سید سلیمان تھے،

استاذ محترم علامہ شبلی نعمانی کی تشریف آوری کے بعد ان کا رنگ ہی بدل گیا، دار الاخبار، دار المطالعہ وغیرہ
سے دست بردار ہوگئے، ہفتہ وار ادبی انجمن مین بھی بہت کم حصہ لیتے، اور اب ان کا زیادہ وقت استاذ محترم کی
خدمت مین گذرتا، خصوصاً عصر سے مغرب تک، اردو کی ادبی کتابون کا شوق سرد پڑ گیا، اب زیادہ تر عربی

کتابون کا مطالعہ ہوتا جس مین تاریخ وادب کا حصہ زیادہ تھا، مضامین بھی علمی اور تاریخی ہونے لگے،
استاذ محترم علامہ شبلی نعمانی نے تربیت کے لئے چند ہونہار طلبہ کو منتخب کیا تھا جس مین سید سلیمان، عبد السلام،
حافظ عبد الصمد، عبد الواجد، قمر الدین وغیرہ تھے، یہ لوگ بعد عصر وہان پہنچ جاتے، علامہ شبلی کے پاس عربی کے متعدد اخبارات
ورسائل اللواء، المؤید، الہلال، المقتطف وغیرہ آتے تھے، وہ کسی ایک طالب علم سے کوئی مقالہ پڑھوا کر
پھر اخبار دے دیتے، اور فرماتے کہ تم اپنی عربی مین اس کو بیان کرو، جہان تک مجھے یاد ہے، اس مین علامہ سید سلیمان
اور عبد الواجد صاحب زیادہ ممتاز رہتے،

استاذ محترم کی صحبت کا اثر یہ ہوا کہ ان مین تلاش اور تحقیق کا مادہ پیدا ہوتا گیا، اور مضامین مین گہرائی آنے لگی،
اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ متقدمین کی معصومیت کا جو رعب ان پر چھایا تھا، وہ اٹھ گیا، چنانچہ متعدد کتابون پر تنقید
بھی، اس سلسلہ مین ہندوستان کے بعض قدیم مشاہیر علماء کی غلطیان نکالین جس سے اُن کے حلقہ مین ایک شور مچ گیا،
علامہ موصوف بہت ذہین تھے، اُن کا حافظہ بھی بہت قوی تھا، پشاور سے لیکر چین کی سرحد تک خاکسار
کو جن جن اصحاب علم سے ملنے کا اتفاق ہوا، اُن مین مولانا انور شاہ کشمیری دیوبندی (محدث) مولانا ابو الکلام آزاد اور
علامہ سید سلیمان ندوی کو قوت حافظہ مین بے نظیر پایا،

ایک دفعہ مین نے ابن بطوطہ کے سفرنامہ کے حوالہ سے مالابار کے حالات لکھے، نظر ثانی کے وقت علامہ موصوف
نے مجھ سے کہا تم نے غلط لکھا ہے، مین نے سفرنامہ کا اردو ترجمہ لاکر پیش کر دیا، دیکھ کر فرمایا صحیح نہین ہے، عربی اڈیشن
مین دیکھو، اس کو دیکھ کر فرمایا، دیکھو مترجم نے ضمیر کا مرجع غلط قرار دے کر ترجمہ کیا ہے، غور کیا تو واقعی صحیح تھا،

استاذ محترم شمس العلماء مولانا ابو الفضل حفیظ اللہ صاحب اس جماعت کو جس مین علامہ موصوف تھے، درس قرآن
دے رہے تھے، اسی اثنا مین آنریبل سید شرف الدین جج کلکتہ ہائی کورٹ تشریف لے آئے، اور درجہ مین بیٹھ گئے، آیۂ
وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ کی ایسی تفسیر کی خواہش کی جس سے لفظ "ضالًّا" سے جو شبہہ پیدا ہوتا ہے وہ دور ہو جائے
جہان تک مجھے یاد ہے، درجہ مین صرف سید سلیمان ایسے تھے جنھون نے لغت، محاورہ اور ربط کے لحاظ سے ایسا ترجمہ

یا تشریح کی جس سے جج صاحب موصوف کو تسکین ہوگئی،

ایک دفعہ پٹنہ میں خدا بخش خان مرحوم چیف جسٹس حیدرآباد سے ملنے کے لئے گئے، خاکسار بھی ساتھ تھا، اپنے مشہور کتب خانہ (پبلک اورنٹیل لائبریری) کے اس سائبان میں بیٹھے تھے جس سے متصل بازار کی سڑک تھی، اس وقت موجودہ بلڈنگ تیار نہیں ہوئی تھی، میز پر کچھ کتابیں تھیں، اور وہ کسی خاص کام میں مصروف تھے، ہم لوگ کرسی پر بیٹھ گئے، اور باتیں ہونے لگیں، اثنائے گفتگو میں آیۃ الکرسی کے متعلق گفتگو ہونے لگی، ایسا یاد نہیں ہے کہ آیۃ الکرسی کی ایک تفسیر فیضی کی تھی، یا خود اُن کی تھی، یا کسی مفسر نے کسی کتاب میں لکھی تھی، علامۂ موصوف کو سُنائی، انھوں نے جو اصلاح دی، یا جو بات کہی، اُسے سُن کر جج صاحب پھڑک اُٹھے، اور دیر تک تعریف کی،

علامۂ موصوف اردو فارسی، عربی کے علاوہ عبرانی زبان سے بھی واقف تھے، وہ جب دکن کالج پونہ میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے تو ایک یہودی سے اس کو سیکھا تھا، اور ارض القرآن لکھنے میں اس سے مدد لی تھی، انگریزی لکھ اور بول نہیں سکتے تھے لیکن اخبار اور کتابیں پڑھ لیتے تھے،

ندوہ سے فارغ ہونے کے بعد علامۂ موصوف بڑی کشمکش میں مبتلا ہوگئے، اُن کے والد ماجد اُن کے خسر اور بڑے بھائی کی خواہش تھی کہ وہ خاندانی پیشہ یعنی طب کی تعلیم حاصل کریں، لیکن خود اُن کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی، استاذ محترم علامہ شبلی کی بھی یہی رائے تھی کہ طب کی تعلیم کے بجائے وہ علمی کاموں میں مصروف ہوں، چنانچہ انھوں نے استاد سے جب اس کا تذکرہ کیا، تو استاد نے اُن کے خسر کو ایک خط لکھا کہ سید سلیمان کو اُن کی علمی تحقیقات میں مصروف رہنے دو،

پھر اتفاق ایسا ہوا کہ استاذ محترم کسی ضرورت سے پٹنہ تشریف لے گئے، اور مولوی ابو یوسف صاحب (سید سلیمان صاحب کے خسر) اُن سے ملنے گئے، اس مسئلہ پر دونوں کی گفتگو ہوئی، آخر میں استاذ محترم نے فرمایا کہ اُن کے والد سے کہہ دو کہ سید سلیمان کو ہمیں دیدیں، والد کو یہ پیغام ملا تو استاد کی شفقت کو دیکھ کر خاموش ہوگئے، لیکن طب اور تصوف دونوں لائنوں سے علاحدہ ہو جانے کو خاندانی روایات کے خلاف سمجھ کر آخر عمر تک

پسند نہیں کیا، اس میں شبہ نہیں کہ اگر وہ طب کی تعلیم حاصل کرتے تو بھی اپنی ذہانت اور قوتِ حافظہ کی بدولت بہترین طبیب ہوتے لیکن ضلع پٹنہ کے باشندوں کے علاوہ اُن کو کوئی نہ جانتا، اور عالمِ اسلامی اُن کی بہترین تصانیف سے محروم رہ جاتا،

انھوں نے سب سے پہلی ملازمت ندوہ ہی میں کی، ایک ادیب کی حیثیت سے اُن کا تقرر ہوا، الندوہ کے نائب اڈیٹر بھی رہے، اسی زمانہ میں آسی مدراسی مرحوم کے بڑے صاحبزادے قاری عبدالولی عربی زبان میں ایک ماہوار رسالہ "البیان" نکالتے تھے، علامہ اس کے بھی اڈیٹر تھے، اور ابتدا میں اسی کے ذریعہ حجاز، عراق، شام اور مصر وغیرہ میں اُن کا تعارف ہوا،

ان کی پہلی شادی اُن کے چھوٹے چچا کی لڑکی سے ہوئی تھی جس سے تین بچے پیدا ہوئے، دوسری سے کوئی اولاد نہیں تھی، اور تیسری سے متعدد اولادیں ہوئیں جن میں اس وقت چار لڑکیاں، اور ایک لڑکا سلمان سلمہ موجود ہیں، [illegible] سال کی عمر میں بمقام کراچی وفات ہوئی، اور ان کی وفات سے نہ صرف ضلع پٹنہ (بہار) کا گوشہ سونا ہوگیا، بلکہ ہندوستان و پاکستان کی علمی دنیا اس کی ضیاباری سے محروم ہوگئی،

اخلاق و سیرت کے کچھ جلوے

از

سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب

حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ اخلاق و سیرت کے لحاظ سے خلق عظیم کا نمونہ تھے، اُن کے حسن اخلاق کے جلوے اتنے گوناگون ہین کہ ایک مختصر سے مضمون مین ان کا احاطہ دشوار ہے، ذیل کی سطور مین صرف اُن کی ایک ایک جھلک دکھانے کی کوشش کی گئی ہے،

حب وطن اپنے وطن دیسنہ سے بڑی محبت رکھتے، جب گھر آتے اور یہان سے رخصت ہونے لگتے، تو اشک بار ہو جاتے، طالب علمی کے زمانے سے آخر عمر تک اس کے اجتماعی کامون مین سے پوری دلچسپی لیتے رہے، وہان کے باشندون نے ۱۸۹۶ء مین اپنی معاشرتی و علمی اصلاح و ترقی کے لئے ایک انجمن قائم کی تھی، جس کے ماتحت اردو کا ایک شاندار کتب خانہ بھی ہے، اس کی ترقی مین ہر قسم کی امداد کرتے رہے، انجمن کے سالانہ جلسون مین کبھی اپنی نظم سُناتے، کبھی مقالہ پڑھتے، اور کبھی تقریر کرتے، اس کے بعض جلسون کی صدارت بھی کی، فرمایا کرتے تھے کہ یون تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے بہت سی کانفرنسون کی صدارت کا شرف عطا کیا، لیکن جو لذت وطن کی انجمن الاصلاح کی صدارت مین محسوس ہوئی، وہ کسی اور مین نہین ہوئی،

انجمن کا سالانہ اور وقتاً فوقتاً بڑا وقتی چندہ پابندی سے ادا کرتے تھے، اپنے جد بزرگوار کی ایک تصنیف نور محمدی کا اپنے خرچ سے چھپوائی، اور اس کے سارے نسخے انجمن کے کتب خانہ کو دیدیے کہ اس کی فروخت کی آمدنی کتب خانہ کی ضروریات مین خرچ ہو، اسی طرح اپنی تصنیف خطبات مدراس کی پانچ سو جلدین اس کتب خانہ کو دین جن کی

قیمت ۵۵۰ روپے تھی،

قدیم آبائی مکان کے علاوہ ایک پرفضا مقام پر ایک شاندار بنگلہ بنوایا تھا، اُس مین اپنے اہل وطن کے ساتھ بیٹھ کر بڑی راحت محسوس کرتے، زندگی کے آخری دن اسی مین گذارنے کی تمنا اُن کو تھی، لیکن مشیت کو کچھ اور ہی منظور تھا،

اپنے ایک ہم مکتب دوست کو ایک مکتوب مورخہ ۱۷ جون ۱۹۴۷ء مین لکھتے ہین:۔

"خلوت خانۂ حق کے سوا کہین آرام نہین، ع جز بخلوت گاہِ حق آرام نیست"........

.....دیسنہ کا اس پیری مین قیام کا خیال ہمیشہ سے تھا، اسی لئے وہان سب کچھ لگایا مگر افسوس کہ انقلاب زمانہ نے سارے منصوبے خاک مین ملا دیے، اب تو یہ بھی معلوم نہین کہ بقیہ ایام عمر کہان گذرین گے؛......"

اہل وطن سے لگاؤ تمام اہل وطن سے بڑا اُنس رکھتے تھے، ۱۹۱۵ء مین اُن کے ایک محبوب ہم وطن مظفر امام محمد وحید ڈپٹی کلکٹر کا انتقال ہوا تو بیحد مغموم ہوئے، ان سے صرف ہم وطنی کا رشتہ تھا، لیکن اُن کی وفات پر ایک عزیز کو تحریر فرمایا:۔

"آہ! نہ صرف دیسنہ کا چراغ بجھ گیا، بلکہ ہمارے دلون کا بھی چراغ گل ہو گیا، ہماری زندگی کا نشاط جاتا رہا، وطن کی یاد فراموش ہو گئی، اور اس کی محبت سرد، خدا کی قسم میری زندگی مین سب سے بڑی مصیبت ہو گی، اگر میرے دونون بچے مرجاتے، تو اتنا غم نہ ہوتا بس اب ہو چکا

غریبان را دل از بہر تو خون است   دلِ خویشان نمی دانم کہ چون است

۱۹۳۳ء مین دیسنہ کی ایک جوان خاتون کی حسرتناک موت ہوئی، سید صاحب اس وقت وطن ہی مین تھے، مرحومہ سے دور کا رشتہ تھا، لیکن ان کا جنازہ اٹھا تو اس کے پیچھے وہ زار و قطار رو رہے تھے، اور جب جنازہ کی نماز پڑھانے لگے تو چہرہ آنسوؤن سے بالکل تر ہو گیا،

جناب سید عبدالحکیم صاحب، جو اب بھی بقید حیات ہیں، اُن کے رشتہ کے چچا ہوتے ہیں، عمر میں وہ سید صاحب سے تو بارہ تیرہ برس بڑے ہیں، اُن سے تمام عمر اپنے حقیقی چچا سے زیادہ محبت کرتے رہے، ایک خط مورخہ ۲۸ اکتوبر ۱۹۳۸ء میں اُن کو لکھتے ہیں :-

"آپکے دل کو مجھ سے، اور مجھے آپکے دل سے جو لگاؤ ہے، وہ سوال اور استدلال سے باہر ہے یقیناً آپنے اپنے دل کو بہت دکھ رکھا اور یہاں بھی ہر روز آپ کو خط نہ لکھنے اور آپکے خط نہ آنے کا خیال رہا،"

پھر کراچی سے ۱۵ جنوری ۱۹۵۳ء کو اُن کو تحریر فرماتے ہیں :-

"آپ کو اس ناکارہ سے جو رابطہ قلبی ہے اس کا میرے دل پر اثر ہمیشہ رہا، اور وہ اب تک اسی طرح ہے"

ع حقا کہ بر آن نام و نشان است کہ بود

......افسوس ہے کہ وطن کا شیرازہ اور احباب و اعزہ ایسے متفرق ہوئے کہ ان کے دیدار سے محرومی رہے گی، اور اس کا اپنے قلب پر بڑا اثر پاتا ہوں، یہاں کیا آیا کہ دنیا ہی بدل گئی، ہندوستان بھلانے سے بھی نہیں بھولتا، ......خدا جانے چمن پر کیا گذری"

سید عبدالحکیم صاحب کو بھی اُن سے بڑی شیفتگی رہی، یوں تو وہ عمر میں بڑے ہیں، لیکن آخر میں وہ اُن سے روحانی استفادہ بھی کرنے لگے تھے، سید صاحب کی طالب علمی کے زمانہ سے اُن کے آخر عمر تک دونوں میں برابر خط و کتابت قائم رہی جس کو سید عبدالحکیم صاحب نے حرز جان بنائے رکھا ہے، یہ خطوط ایسی قیمتی دستاویز ہیں جن سے سید صاحب کے سوانح حیات مرتب کرنے میں بڑی مدد ملے گی۔

آخر زمانہ میں جب کبھی سید صاحب کا قیام وطن میں رہتا، تو اُن کا معمول تھا کہ روزانہ فجر کی نماز کے بعد مسجد میں کلام پاک کا درس دیتے جمعہ کے روز خطبہ بھی دیتے، اپنے ایک مکتوب میں سید عبدالحکیم صاحب کو لکھتے ہیں کہ وطن کی ہر ٹھیکری میرے نزدیک لعل و گوہر سے زیادہ عزیز ہے، حب الوطن من الایمان لیکن اس لگاؤ کے باوجود گاؤں کی

نزاعی باتوں میں پڑنے سے حتی الوسع پرہیز کرتے، فرماتے کہ قیام وطن کے زمانہ میں جذبات میں تین دور آتے ہیں پہلے دور میں خیال ہوتا ہے، میرے ہم وطن چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھ کر خواہ مخواہ تضیع اوقات کرتے رہتے ہیں، دوسرے دور میں خود ان چھوٹی چھوٹی باتوں کے سننے کا جی چاہتا ہے، تیسرے دور میں نفس ان باتوں میں حصہ لینے کو آمادہ کرتا ہے، اس وقت رخت سفر باندھ لیتا ہوں جب کسی اہل وطن سے کوئی شکایت ہوتی، تو درگذر کرکے خاموش ہو جاتے اور فرماتے میرا تو یہ مسلک ہے

ع تو خصم باش و زما دوستی تماشا کن

اہل و عیال سے محبت

اُن کی خانگی زندگی شفقت و محبت کے مناظر سے معمور ہے، پہلی اہلیہ کے مرض الموت میں بڑی دل سوزی اور تن دہی سے تیمارداری کی، اُن کو اعظم گڈھ سے لکھنؤ علاج کے لئے لے گئے، اور قرض لیکر علاج کراتے رہے، مگر وہ تیرہ سال کی رفاقت کے بعد ۱۹۱۴ء میں جنت کو سدھاریں، رفیقۂ حیات کی جدائی کا بڑا غیر معمولی اثر ہوا جس کا اظہار ایک نظم "فراق یار" میں کیا، اُن کے غم و الم کی خبر اکبر الہ آبادی کو ہوئی تو انھوں نے خطوط میں اشعار لکھ لکھ کر اُن کو تسلی دی، پہلے خط میں یہ شعر لکھ کر تلقین کی،

اگرچہ تلخ ملا جام عمر فانی کا
مگر محل نہیں ساقی سے بدگمانی کا

دوسرے خط میں یہ رباعی لکھ کر دلجوئی کی،

جس سے میری زندگی تھی مر گیا کیوں کر سکا
چرخ نے مجھ پر ستم یا رب! کیا کیوں کر سکا
واقعات جانگزا کا کیوں ہوا ایسا وقوع
کیوں نہ میری آہ سے قانون فطرت ڈر سکا

پھر اور دوسرے خطوط میں یہ متفرق اشعار تھے،

مدتوں فلاسفی کی چنان اور چنین رہی
لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی

ساتھی جو تھے رنج و راحت کے اس موقع پہ ہاتھوں چھوٹ گئے،
اب یاس گرائے دیتی ہے، سب دل کے سہارے ٹوٹ گئے

مرنے والا مرچکا، اور رونے والا رو چکا،
وائے بر ہستی اگر مقصود ہستی ہو چکا،

پہلی اہلیہ نے دو اولادیں چھوڑی تھیں، سیدہ مرحومہ، اور ابو سہیل سلمہ اللہ (کسٹم آفیسر مشرقی پاکستان) ان ہی سے دل بہلا کر بقیہ زندگی تجرد میں گذار دینے کا تہیہ کیا تھا، لیکن اپنے والد بزرگوار کے اصرار پر ۱۹۲۰ء میں دوسرا عقد کیا، یہ اہلیہ بھی مشکل سے ڈیڑھ سال زندہ رہیں، اُن کی وفات پر پرانا غم تازہ ہو گیا، وطن اور اہلیہ ثانی کے گھر کو یاد کرکے مغموم اور بےچین رہتے تھے، چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں،

"دیسنہ اور اس کے مکان کی ایک کوٹھری میرے لئے تاریخی غم کی یادگار بن گئی ہے، اور میرے احساس کو صدمہ پہنچاتا رہتا ہے"،

تیسرا نکاح، رجنوری ۱۹۲۳ء عیسوی میں ہوا، ان اہلیہ سے ایک لڑکا عزیزی سلمان سلمہ اور چار لڑکیاں ہیں، شمیمہ (اہلیہ ابو عاصم صاحب ایڈوکیٹ کراچی) شکیلہ (اہلیہ سید حسن صاحب، اڈیشنل کمشنر، بریلی ڈویژن)، اور دو ابھی ناکتخدا ہیں، اپنے تمام بچوں سے بڑی محبت رکھتے تھے، سب سے چھوٹی اولاد کو برابر اپنی گود میں بٹھائے رکھتے، حتی کہ کبھی کبھی سفر میں بھی اس کو ساتھ لے جاتے، ان سب کو آپ ہی کہکر مخاطب کرتے جب ان سے کسی بات پر ناراض ہوتے، تو ڈانٹنے اور جھڑکنے کے بجائے صرف یہ کہتے کہ یہ فلانی حرکت مجھ کو پسند نہیں، کئی بچے بچپن ہی میں فوت ہو گئے، ایک داماد اور ایک لڑکی کی جوانمرگی کا بھی غم اٹھانا پڑا، لیکن اُن کی اکلوتی اولاد سید نقی اشرف سلمہ اللہ (اسٹیٹ بینک پاکستان) کو اپنی آغوش شفقت میں لیکر ان دونوں کا غم غلط کرتے رہے،

ہمدرسوں سے تعلق اپنے مکتب اور درس کے ساتھیوں سے انکو ہمیشہ لگاؤ رہا، انکے ایک ہم مکتب جناب شیخ محمد حنیف تھے جو تعلیم ختم کرنے کے بعد مختار ہوئے، لیکن وارستگی مزاج کی بنا پر مختاری چھوڑ دی، اور اپنے وطن دیسنہ سے منتقل ہو کر اپنی سسرال گیلانی میں سکونت پذیر ہو گئے، وہ غایت سادگی میں کھڑاؤں استعمال کرتے ہیں، اور ناس برابر پیتے رہتے ہیں، ایک بار سید صاحب کو دیسنہ سے گیلانی جانے کا اتفاق ہوا، یہ وہ زمانہ تھا جبکہ انکی علمی شہرت بہت زیا

ہو چکی تھی، گیلانی پہنچ کر دریافت کیا کہ میرے پرانے ساتھی اور بھائی کھڑاؤں الناس کہاں ہیں، اُن کو تلاش کرکے بڑے اخلاق، محبت اور بے تکلفی سے ملے، سید محمد حنیف صاحب ۱۳۵۵ھ میں حج کے لئے گئے تو مکہ معظمہ میں سید صاحب سے ملاقات ہوئی، اتفاق سے سید محمد حنیف صاحب وہاں سخت علیل ہو گئے، اُن کی علالت کی خبر سید صاحب کو ہوئی تو عیادت کرنے گئے، اور ہر طرح اُن کو تسلی دی، سید محمد حنیف صاحب اس واقعہ کو جب یاد کرتے ہیں تو یہ کہکر آبدیدہ ہو جاتے ہیں کہ کہاں میں ایک لاابالی آدمی جو کس مپرسی میں پڑا ہوا تھا، اور کہاں سید صاحب کی ذات والاقدر جن کی تعظیم کے لئے حکومت سعودی کے بڑے بڑے حکام سرو قد کھڑے ہو جاتے تھے، وہ میری عیادت کے لئے آئے، اور اپنی تسلی و تشفی سے سرفراز کرتے رہے،

سید صاحب کے ایک دوسرے ہم مکتب مولانا محمد قاسم صاحب دیوبندی تھے، مکتب کی تعلیم ختم کرنے کے بعد یہ دونوں دارالعلوم ندوہ میں تعلیم پائی، پھر دیوبند میں تکمیل کی، مختلف مدرسوں میں ملازمت کرنے کے بعد آخر میں مدرسہ شمس الہدی پٹنہ میں مدرس ہوئے، سید صاحب ندوہ سے اپنی طالب علمی کے زمانہ میں ان کو دیوبند ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"دو سہ دن کے نام آپکے خط پر خط آئے اور میں آپکے خط دیکھنے کو ترسوں، مجھے یاد نہیں کہ آپنے کبھی خط لکھنے میں سبقت فرمائی، صاحب چاہ مشکل نہیں نباہ مشکل ہے"

اور یہ بے تکلفی آخر وقت تک قائم رہی، دار المصنفین کے دور قیام میں اُن کو ایک خط میں لکھتے ہیں:-

اللہ رے ناز حسن کہ بدلیں بھی وہ تو یوں — ہاں وہ کہاں ہے در پہ جو میرے پڑا رہا

بھولے دوست اچھے ہیں کبھی نہ یاد آؤں، آپ کو دار المصنفین کا خیال آیا، تو خیر سے استفسار کی کیا حاجت تھی شاید وہ منزل آداب خطاب نہ تھا"

ندوہ کے ساتھیوں میں مولوی ضیاء الحسن علوی ندوی مرحوم کو بہت عزیز رکھتے تھے، ان کی وفات پر بے حد ملول ہو کر ماہنامہ معارف کے ایک مضمون میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا،

"افسوس کہ میرے رفیقِ قدیم اور صدیقِ حمیم مولوی ضیاء الحسن صاحب علوی ندوی نے ایک مختصر علالت کے بعد ۱۴ رجون ۱۹۴۵ء کو الہ آباد میں جہاں وہ عربی مدرسوں کے انسپکٹر اور مشرقی امتحانوں کے رجسٹرار تھے، ستاون برس کی عمر میں وفات پائی، اس حادثہ کی اطلاع مجھے ۱۰ رجون کو لکھنؤ میں اسی مدرسہ میں ملی، جہاں میں اور مرحوم مل کر ایک جان دو قالب تھے، افسوس کہ ایک قالب خالی ہوگیا، اور دوسرا نیم جان موجود ہے، مرحوم مجھ سے عمر میں تقریباً پانچ برس چھوٹے تھے گو تعلیم کے درجہ میں دو ایک سال بڑے تھے، اس لئے بظاہر یہی امید تھی کہ ان ہی کو میری جدائی کا صدمہ برداشت کرنا پڑے گا، مگر تقدیر یہی تھی کہ مجھے اُن کے فراق کا غم سہنا پڑے گا، اسی لئے امید غلط ثابت ہوئی، اور تقدیر کا فرمان نافذ ہو کر رہا،

ع: اکنون چہ توان کرد تقدیر چنین بود"

مولوی ضیاء الحسن مرحوم تعلیم میں اُن سے دو ایک سال سینیر تھے، اس لئے آخر وقت تک سید صاحب کو تم کر کر مخاطب کرتے تھے، ایک بار ضیاء الحسن صاحب مرحوم اُنکو اپنی ایک تحریر پڑھ کر سنا رہے تھے، سید صاحب نے اُن کو ایک جگہ ٹوکا، وہ بولے "سلیمان! تم اردو کیا جانو" اس فقرہ سے سید صاحب بہت محظوظ ہوئے، اور کئی بار اپنی نجی صحبتوں میں اس کا ذکر کیا،

معاصرین سے محبت

اپنے معاصرین اہلِ علم میں ڈاکٹر اقبال سے بڑا گہرا لگاؤ رکھتے تھے، نجی مجلسوں میں کہا کرتے کہ عالم اسلام میں ایک عرصہ کے بعد ڈاکٹر اقبال جیسا مفکر اعظم پیدا ہوا ہے، ان کو موحدِ خالص، رسول کا شیدائی، دین کا علمبردار، فلسفۂ اسلام کا ترجمان، اور تجدیدِ ملت کا طلب گار کہا کرتے، جب اُن کی رحلت کی خبر ملی تو معارف میں بڑا دردناک ماتم کیا، جس کے بعض ٹکڑے یہ ہیں:-

"صفر کی انیسویں اور اپریل کی اکیسویں کی بیچ کو عمر کی اکسٹھ بہاریں دیکھ کر اور شاعری کی دنیا میں چالیس برس چہچہا کر یہ بلبلِ ہزار داستان اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا، وہ ہندوستان کی آبرو، مشرق کی عزت اور اسلام کا فخر تھا، آج دنیا ان ساری عزتوں سے محروم ہوگئی، اور دنیا عارف فلسفی، عاشقِ رسول شاعر

فلسفۂ اسلام کا ترجمان اور کاروانِ ملت کا حدی خوان صدیوں کے بعد پیدا ہوا تھا، اور شاید صدیوں کے بعد پیدا ہو، اس کے ذہن کا ہر ترانہ بانگِ درا، اُس کی جانِ حزین کی ہر آواز زبورِ عجم، اس کے دل کی ہر فریاد پیامِ مشرق، اس کے شعر کا ہر پرِ پرواز بالِ جبریل تھا، اس کی فانی عمر گو ختم ہوگئی، لیکن اُس کی زندگی کا ہر کارنامہ جاوید نامہ بن کر ان شاء اللہ باقی رہے گا، امید ہے کہ ملت کا یہ غم خوار شاعر عرشِ الٰہی کے سایہ میں ہوگا، اور قبول و مغفرت کے پھول اس پر برسائے جا رہے ہوں گے، خداوندا! اس کے دلِ شکستہ کو جو ملت کے غم سے رنجور تھا، غم خواری فرما، اور اپنی ربانی نوازشوں سے اس کے قبرِ حزین کو معمور کر"

سر شیخ عبدالقادر سے بھی متاثر تھے، ان کو پہلی دفعہ ۱۹۱۰ء میں پٹنہ میں ندوۃ العلماء کے جلسہ میں دیکھا تھا، اس موقع پر انھوں نے ایسی دلچسپ تقریر کی تھی جس سے حاضرینِ جلسہ کے ساتھ سید صاحب بھی محوِ حیرت ہو گئے، ان کے بیان کے مطابق اس کا یہ اثر ہوا کہ

"دل میں ایسی ہی تقریر کرنے کا جذبہ پیدا کر دیا جس کی مشق بعد کو ہوئی"

بعد میں اُن سے اچھے خاصے مراسم پیدا ہو گئے تھے، اور جب اُن کا انتقال ہوا، تو اُن کی یاد میں لکھا،

"مرحوم کی شخصیت گوناگوں اوصاف کی حامل تھی اور ہر مجلس و محفل میں ان کی یکساں قدر و منزلت تھی، وہ نیک طینت، نرم مزاج، متواضع، اور ملنسار تھے، اُن کی مختلف النوع خدمات میں میرے نزدیک سب سے بڑی خدمت اُن کی ادبی خدمت ہے، اور وہ بھی خاص نوع کی، یعنی لکھنے والے تو بیسیوں ہیں، مگر ان کا کارنامہ ہے کہ انھوں نے بیسیوں کو ادیب، انشا پرداز، اہلِ قلم، مصنف، اور شاعر بنا دیا، اور حق یہ ہے کہ ان ہی نے ہندوستان کو اقبال بخشا"

سیاسی دوستوں میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری سے قلبی تعلق رکھتے تھے، ۱۹۳۶ء کے موسم گرما میں دہرہ دون میں تھے، ۹ مئی کی شام کو وہاں کی ایک سڑک پر دور سے ڈاکٹر انصاری کو موٹر پر جاتے دیکھا، صبح اُن کی قیامگاہ کی

تلاش کی کوشش کی، معلوم ہوا کہ وہ رات ہی دہلی چلے گئے، اور شام کو اطلاع ملی کہ وہ راستہ ہی میں جنت کو سدھار گئے، یہ خبر سن کر سید صاحب کا دل دھڑکنے لگا، آنکھیں اشکبار ہوگئیں، سینہ سے آہوں کے شعلے اٹھنے لگے، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُن کے صبر و تمکین کی ساری متاع جل کر خاکستر ہو رہی ہے، ڈاکٹروں نے اُن کو لکھنے پڑھنے کی ممانعت کی تھی، لیکن اُن کی طبیعت نہ مانی، اور ڈاکٹر صاحب کا ماتم لکھنا شروع کر دیا جس کا آخری ٹکڑا یہ ہے:

"طرابلس اور بلقان کے ہنگاموں نے ہمارے چند جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کو دفعۃً سوتے سے بیدار کر دیا تھا، محمد علی مرحوم اس قافلہ کے سالار تھے، اور ڈاکٹر انصاری اس کے سب سے پرجوش رہبر تھے، افسوس کہ ان دونوں دردمندوں نے دل ہی کے آزار میں وفات پائی، دل کا درد مجاز بن کر نمودار ہوا، اور اُن کی قومی زندگی کا باعث ہوا، اور وہی حقیقت بن کر اُن کی موت کا سبب ہوا"

محمد علی نے داغِ مفارقت دیا، اور اب

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

صلحاء و علماء کا احترام مکتبی تعلیم ختم کرنے کے بعد اپنے وطن دیسنہ سے نکلے تو کچھ دنوں جناب شاہ محی الدین صاحب پھلواروی کے سامنے بھی زانوے تلمذ تہ کیا تھا، انکی قدر و منزلت سید صاحب کے دل میں آخر وقت تک قائم رہی، ایک تحریر میں فرماتے ہیں:-

"مجھے خانقاہ میں خاص حضرت شاہ محی الدین صاحب مرحوم کے قرب قیام کی، اور ایک ساتھ طعام کی، اور زیر درس کتابوں میں شاگردی کی سعادت حاصل ہوئی، مجھے اس نسبت پر فخر، اور انہیں اس پر مسرت تھی"

جناب شاہ سلیمان صاحب پھلواروی سے ان کا کوئی رشتہ تو نہ تھا لیکن سید صاحب کے والد مرحوم اُن کے پیر بھائی اور اُن کے خسر کے مرید تھے، اس لئے سید صاحب اُن کو اپنا بزرگ سمجھتے رہے، اور خود شاہ صاحب ان کو اپنے عزیز سے کم نہیں سمجھتے تھے، جب شاہ صاحب کا وصال ہوا تو سید صاحب نے

اُن کے صاحبزادے مولانا سید شاہ غلام حسین صاحب پھلواروی کو ایک خط مورخہ ۱۹ راگست ۳۳ء میں لکھا:

"شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو مجھ ذرۂ بے مقدار کے ساتھ جو شفقت تھی، وہ مجھے ہمیشہ یاد رہی، ......بنارس کے جلسہ ندوہ میں شاہ صاحب نے مولانا شبلی کی تحریک پر مجھ کو اپنی ایک عبا بطور امتحان و انعام دینا منظور فرمایا تھا، میں ہمیشہ اس کا تقاضا کرتا، اور اس تقاضے میں اب بھی، اور اس عمر میں بھی، مجھے کیا لطف آتا تھا، ایک دفعہ میں نے جب ہنوز عمر کی پختگی اور عقل کی تکمیل نہیں ہوئی تھی ایک عریضہ لکھا، اس میں جدید انشار پردازی کی پیروی میں السلام علیکم نہیں لکھا تھا، اس پر اُن کی بزرگانہ ڈانٹ مجھے اب تک یاد ہے"

مولانا سید محمد علی مونگیری قدس سرہ العزیز سے بھی بہت متاثر تھے، جس زمانہ میں وہ ندوہ میں تعلیم پاتے تھے، مولانا مرحوم ندوہ کے ناظم تھے، ایک روز انھوں نے سید صاحب کو بلا کر پوچھا تم کو کس فن سے ذوق ہے؟ سید صاحب نے جواب دیا "عربی ادب اور منطق سے" پھر پوچھا "کیوں"؟ سید صاحب نے کہا کہ "اس لئے کہ یہ دونوں اصل مقصود یعنی علوم کے خادم اور ذریعہ ہیں، مولانا نے فرمایا کہ آخر ان اصل علوم کی طرف کب توجہ ہوگی، سید صاحب نے کہا کہ جب ان میں کمال پیدا ہو جائے گا، یہ سن کر مولانا نے فرمایا تو اسی خادم اور ذریعۂ علوم میں تو ہمارے علماء کی پوری عمریں بسر ہو جاتی ہیں، اور اصل مقصود کی نوبت نہیں آتی، اس کے بعد انھوں نے یہ حکایت بیان کی کہ ایک صاحب کو تصنیف کا شوق پیدا ہوا، تو وہ قلم بنا بنا کر رکھنے لگے، یہاں تک کہ تمام کمرہ قلموں سے بھر گیا، کسی نے ان سے پوچھا کہ حضرت آپ اتنے قلم بنا بنا کر کیوں رکھ رہے ہیں، تو متانت سے بولے کہ میرا ارادہ تصنیف کا ہے، پوچھنے والے نے کہا کہ پھر وہ کب شروع ہوگی، جواب دیا جب ان قلموں سے فرصت ملے گی، یہ تمثیل اس بات کی تھی، کہ عربی نصاب کا بڑا حصہ دینی علوم کی تمہید اور ذریعہ کے طور پر پڑھایا جاتا ہے، مگر ہوتا یہ ہے کہ یہ ذریعہ تعلیم اصل تعلیم کی جگہ لے لیتا ہے، سید صاحب کا بیان ہے کہ مولانا کی یہ حکایت میرے لئے اس درجہ موثر ہوئی کہ میں نے پھر تمام عمر ذریعۂ علوم اور مقصدِ علوم کے درمیان کبھی مغالطہ نہیں کھایا، اور عین وقت پر میری ایسی رہبری ہوئی کہ جس نے میرے خیالات کی دنیا پلٹ دی"

مولانا حمید الدین فراہی بی اے کا بھی بہت احترام کرتے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں "ان سے قرآن پاک، اور فلسفہ جدیدہ کے سبق تو کم ہی پڑھے، مگر صحبت بار بار اٹھائی، اور مشکلات میں مشورے بار بار کئے، سیرت کی تیسری جلد میں جو معجزات پر ہے، اُن ہی کے فلسفہ کی تقلید کی ہے"۔

مولانا عبد الباری فرنگی محلی کے اخلاق، جود و سخا، تواضع و انکسار، ارشاد و ہدایت، وعظ و نصیحت، تلاش و مطالعہ اور قومی درد کے بیحد مداح تھے، سیاسی کاموں میں ایک عرصہ تک اُن کے ساتھ رہے، اور جب ۴۸ سال کی عمر میں اُن کی وفات کا دردناک حادثہ پیش آیا، تو اُن کے اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرمایا "جدید تعلیم یافتوں کی سیاسی جدوجہد کو مذہبی تحریک بنا دینا، ان ہی کا کارنامہ شمار کیا جائے گا، اس لئے اُن کی یہ غیر متوقع موت صرف فرنگی محل کا نہیں بلکہ اسلام کا سانحہ ہے، اور بنا برین اُن کی جوانامرگی ہمیشہ کے لئے تاریخ اسلام کا ایک دردناک واقعہ شمار کیا جائے گا"۔

مولانا سجاد نائب امیر شریعت بہار کی رحلت کی خبر پائی، تو بے حد ملول رہے، ایک نجی خط میں اپنے ایک ندوی عزیز مولانا مسعود عالم کو لکھتے ہیں:۔

"ہاں بھائی! تمہارے دونوں خطوں میں مولانا سجاد مرحوم کے تاثرات کا عکس تھا ع اک تیر تھا جو ہائے کلیجہ کے پار تھا، ۲۰ دسمبر کو خط سے اطلاع ملی وہ دن ہے اور آج کا دن ہے کہ کوئی رات ان کی یاد و تصور ذہنی سے خالی نہیں، معارف میں ماتم لکھنے بیٹھا تو زبان و قلم نے ساتھ دینے سے انکار کیا مجبوراً چار سطریں لکھ کر چھوڑ دیں، ہمارا صوبہ خالی ہو گیا، اور کیا کہوں ع اک عالی دماغ تھا نہ رہا،"

مولانا حسین احمد صاحب مدنی سے بھی بڑی عقیدت رکھتے تھے، جب ان میں تصوف و سلوک کا ذوق پیدا ہوا، تو پہلے مولانا حسین احمد ہی کے جانب اُن کا میلان ہوا، اور ان ہی سے بیعت کا ارادہ رکھتے تھے لیکن ایک روز خواب میں دیکھا کہ ایک پلنگ پر حضرت مولانا اشرف علی تھانوی تشریف فرما ہیں، اور اسی کے پاس ایک دوسرے پلنگ پر وہ خود مولانا حسین احمد صاحب کے ساتھ بیٹھے ہیں، یکایک مولانا حسین احمد اپنی جگہ سے اٹھے اور سید صاحب

کا ہاتھ پکڑ کر مولانا اشرف علی کے سامنے پیش کر کے فرمایا، "ان کو میری طرف سے قبول فرمالیں" اسی خواب کے بعد وہ مولانا تھانوی کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے،

وہ اپنی زندگی کے آخر زمانے میں بقول اُن ہی کے "روح کی الجھن" میں مبتلا ہو گئے، اور اسی سے نجات کے لئے حضرت مولانا اشرف علی کی طرف رجوع فرمایا تھا، اس انقلاب کے بعد اُن کے پاس بہت سے خطوط آئے کہ ان کے جیسے فاضل اجل اور محقق کو ایک پرانے طرز کے عالم کے سامنے سر جھکانے کی کیا ضرورت تھی، اس کے جواب میں اکثر نجی صحبتوں میں فرماتے تھے کہ یہ لوگ مجھکو زبان سے تو فاضل اور محقق کہتے ہیں، مگر درحقیقت مجھ کو بے عقل جانتے ہیں، آخر اس بات پر کیوں نہیں غور کرتے ہیں کہ ان کے خیال کے مطابق اگر واقعی محقق اور علامۂ دہر ہوں، تو کیا بلا وجہ میں نے مولانا تھانوی کا دامن تھاما، ؟ ان لوگوں کو سمجھنا چاہئے کہ میں نے اپنے اندر کوئی تو کمی پائی جس کی تکمیل کے لئے وہاں گیا، اسی سلسلہ میں اپنے ایک نجی خط مورخہ ۲۱ دسمبر ۱۹۴۱ء میں سید عبد الحکیم صاحب کو لکھتے ہیں،

"آپ اپنی محبت سے مجھے سب کچھ سمجھتے ہیں لیکن من آنم کہ من دانم، علماء پر فرائض کا بار عام مسلمانوں سے زیادہ ہے اس لئے اگر وہ درست نہ ہوں تو ان پر عذاب دو مردوں سے زیادہ ہے، معاملہ دماغ کا نہیں، قلب سلیم اور قلب منیب کا ہے، نفس کا نہیں، روح کا ہے، میری اتنی زندگی بندوں میں گذری اب کچھ اس زندگی کے لئے بھی کرنا چاہئے، جو باقی ہے، علم اور قوم کی خدمت بہت کچھ ہو چکی، ..... ابھی میری منزل مقصود بہت دور ہے، ..... صرف تسبیح اور مراتبہ سے کچھ نہیں ملتا، جب تک دل کا تعلق دل والے سے نہ ہو، ہم تو بندوں کی رضامندی، اور ناراضی میں گرفتار ہیں، مالک کی رضامندی، و ناراضمندی کی کس کو فکر ہے، دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے صحیح راستہ پر چلائے"

وہ نوافل کے پابند اور بدعات سے نفور تو شروع زندگی سے رہے لیکن آخر میں "استقامت و تثبیت" "رغبت الی الطاعات" "اصلاح دل" اور "حصول اخلاص" کے خواستگار ہو گئے تھے،

انکسار

طبیعت میں انتہا درجہ کی متانت و سنجیدگی تھی، اس لئے دور سے دیکھنے والے اُن کی خاموشی اور کم آمیزی کو

اُن کے غرور اور پندار علم پر محمول کرتے تھے، ایک بار دہلی کے ایک رسالہ نے اُن کے خلاف کچھ لکھنا شروع کیا، اس رسالہ کے اڈیٹر سے منشی ذکاء اللہ مرحوم کے نامور فرزند جناب عنایت اللہ صاحب (سابق ناظم دارالترجمہ حیدرآباد دکن) کے گہرے مراسم تھے، سید صاحب نے عنایت اللہ صاحب کو لکھا کہ رسالہ مذکور کے اڈیٹر سے دریافت فرمائیں کہ مجھ سے ان کو کیا شکایت ہے، جو میرے پیچھے پڑ گئے ہیں، عنایت اللہ صاحب نے اڈیٹر مذکور کو ایک خط لکھا، انھوں نے جواب دیا کہ سید سلیمان بڑے مغرور آدمی ہیں، اُن کے غرور کو توڑنا چاہتا ہوں، عنایت اللہ صاحب نے اپنی طرف سے اُن کو جواب دیا کہ میں بھی سید صاحب سے ملتا رہا ہوں اُن کو کسی حال میں مغرور نہیں پایا، البتہ عالم اور بہت بڑے عالم ہیں، اگر وہ علم کے پندار کو قائم رکھنا چاہتے ہیں، تو یہ تو اُن کا بڑا وصف ہے،

وہ تحریر میں بھی مغرور نہ تھے، معارف کے شذرات لکھتے وقت برابر یہ خیال رکھتے کہ کہیں سے انکی بڑائی نہ آئے، اکثر ایسا ہوا کہ اگر کہیں "میں" لکھ جاتے، تو اس کو کاٹ کر اڈیٹر معارف یا خاکسار یا ہیچمدان بنا دیتے، اپنے نام کی رعایت سے ہیچمدان ہی لکھنا زیادہ پسند کرتے تھے، اپنی تحریر کے مسودے اکثر اپنے شاگردوں کو نظر ثانی کرنے کیلئے بلا تکلف دیدیتے، اور اُن کے مشوروں کو قبول کرنے میں مطلق تامل نہ کرتے، نجی صحبتوں میں دوستوں اور شاگردوں سے بہت بے تکلف رہتے، اگر ذہن میں کوئی اچھا فقرہ آجاتا، تو بلا تکلف کہہ ڈالتے، بعض اوقات ان فقروں سے اُن کے شاگردوں کو آنکھیں نیچی کر لینی پڑتیں،

اُن کے فطری انکسار کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا کہ ایک بار حیدرآباد دکن تشریف لے گئے، تو وہاں کے مشہور شاعر جناب امجد صاحب حیدرآبادی سے ملنے اُن کے مکان پر گئے، امجد صاحب نے اس کے شکریہ میں اشعار لکھ کر بھیجے،

کروں شکر کس منھ سے تیرا خدایا — سلیمانِ اعظم میرے گھر میں آیا

از جلوۂ حسن خویش حیران کردی — کافر دل را مگر مسلمان کردی

بنواختی از قدوم خود امجد را — این مور ضعیف را سلیمان کردی

سید صاحب نے اس کے جواب میں یہ رباعی لکھ کر بھیجی،

امجد تو اسیر زلف احسان کردی — وز زور سخن دلم درخشان کردی

منت بہ غریب شہر چندان کردی — کان مور ضعیف را سلیمان کردی

ن ومروت

طبیعت میں لینت ونرمی اور حلم ومروت اس قدر غالب تھی، کہ کسی معاملہ میں سختی ودرشتی جانتے ہی نہ تھے، حتیٰ کہ گھر کے ملازموں اور بچوں پر بھی سختی نہ کر سکتے تھے، اُن کی زبان کبھی کسی درشت کلمہ سے آلودہ نہ ہوتی، اُن سے کبھی کسی کو کوئی نقصان نہیں پہونچا، اور نہ کسی کی دل شکنی کی، اگر کسی بات سے ان کے شاگردوں کو آزردگی ہو جاتی تھی، تو طرح طرح سے اس کی تلافی کی کوشش کرتے تھے، اس وصف کا یہ نتیجہ تھا کہ جو شخص ان پر حاوی ہو جاتا، وہ اُن سے جو کام چاہتا لے لیتا تھا، اور بعض اوقات اپنی طبیعت کے خلاف ایک کام کرنے پر مجبور ہو جاتے،

تحمل اور برداشت کے پہاڑ تھے، دوسروں کی تلخ سے تلخ باتوں کو پی جاتے، اور ناگوار سے ناگوار واقعات میں ان کے ابرو پر شکن نہ آتی، اس راہ میں انھوں نے اپنی ہستی فنا کر دی تھی، اُن کے دل پر کچھ بھی گذر جائے، مگر زبان پر کبھی شکوہ نہ لاتے تھے، انھوں نے مظلوم بننا گوارا کر لیا، مگر ظالم بننا گوارا نہ کیا، وہ نسلاً سید تو تھے ہی عملاً بھی سید تھے،

وہ اپنی سیاسی زندگی میں بھی شرافت اور مروت کے پیکر بنکر کام کرتے رہے، کسی سے سبقت لے جانے کی کوشش کو بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے، چنانچہ ایک مکتوب مورخہ ۲۴ جنوری سنہ ۲۶ء میں ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے سید عبد الحکیم صاحب کو تحریر فرماتے ہیں،

"......... میں نے بعد کو مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی دونوں سے الگ کہا کہ مجھے چھوڑ دیجئے، مجھے دوسرے کو دھکا دے کر آگے بڑھنا پسند نہیں لیکن دونوں نے نامنظور کیا،"

۱۹۲۶ء میں ہندوستان کی طرف سے جو وفد حجاز گیا تھا، سید صاحب اس کے صدر، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی اور شعیب قریشی اس کے ارکین تھے، سلطان ابن سعود کی بادشاہت کے بارہ میں سید صاحب کی رائے دوسرے ارکین سے مختلف تھی لیکن انھوں نے کھلم کھلا اختلاف کرنے کے بجائے سیاسیات سے کنارہ کشی اختیار

کر لی، مولانا محمد علی مرحوم نے اس سلسلہ میں بعض ایسے مضامین لکھے، اور بیانات دیئے جن سے سید صاحب کو اتفاق نہ تھا، لیکن ان کا جواب دینے کے بجائے، وہ خاموش رہے، اسی زمانہ میں وہ دہلی تشریف لے گئے، تو مولانا محمد علی سے ملاقات ہوئی، سید صاحب نے اثنائے گفتگو میں اُن سے کہا کہ آپ چاہے جیسے بھی مضامین لکھیں یا بیانات دیں میں خاموش ہی رہوں گا، مولانا محمد علی کی حاضر جوابی تو مشہور ہے، انھوں نے برجستہ کہا کہ یہ مضامین اور بیانات آپ ہی کو خاموش کرنے ہی کے لئے شائع کئے جا رہے ہیں، اس حاضر جوابی سے سید صاحب خود بھی محظوظ ہوئے، اور کئی بار اپنی نجی صحبتوں میں اس کو دہرایا، لیکن اختلاف رائے کے باوجود مولانا محمد علی کے بے حد مداح اور بڑے گرویدہ تھے، اور جب اُن کے انتقال کی خبر ملی، تو دیر تک آبدیدہ رہے، اور غایت اضطراب میں تحمل کر سکیں پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے، اور معارف میں اُن کا بڑا دردانگیز ماتم کیا جس کے بعض ٹکڑے یہ ہیں،

"افسوس وہ پُر درد آواز جو ۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۰ء تک ہندوستان اور دنیائے اسلام کے ہر قیامت آفرین سانحہ میں صدائے صور بن کر بلند ہوتی رہی، ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی، وہ بیقرار دل جو مسلمانوں کی ہر مصیبت کے وقت بے تاب ہو جاتا تھا، اور اوروں کو بے تاب کرتا تھا، دنیا کہ قیامت تک کے لئے ساکن ہو گیا، وہ اشک آلود آنکھیں جو دین و ملت کے ہر ماتم میں آنسوؤں کا دریا بن جاتی تھیں، حسرت کہ ان کی روانی ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی، وہ مترنم لب جو ہر بزم میں خوش نوا بلبل بن کر چہکتے تھے، اُن کے ترانے اب ہمارے کان نہ سنیں گے، وہ آتشیں زبان جو ہر رزم میں تیغ براں بن کر چمکتی تھی، اُس کی تابش اب کسی معرکہ میں ہماری آنکھوں کو نظر نہ آئے گی، وہ پرجوش سینہ جو ہمارے مصائب کے پہاڑوں کو سیلاب بن کر بہالے جاتا تھا، اس کا تلاطم ہمیشہ کیلئے تھم گیا، اور وہ پر زور دست و بازو جو شب و روز کی خدمت گذاری اور ہنر آزمائی میں مصروف تھا، وہ اب ہمیشہ کے لئے بیٹھ گئے، اور افسوس کہ شکست خوردہ فوج کا وہ آخری سپاہی جو اعداء کے نرغہ میں تنہا لڑ رہا تھا، آخر زخموں سے چور ہو کر ایسا گرا کہ پھر کھڑا نہ ہو گا الوداع

والسلام الی یوم القیام،

پروفیسر محمود شیرانی مرحوم سے برابر علمی چشمک رہی لیکن اُن کی وفات پر بھی بہت ملول اور افسردہ ہوئے، اور اُن پر ایک پُر درد مضمون معارف میں شائع کیا، اور اُن کے اوصاف کا ذکر ان الفاظ میں کیا،

"مرحوم نیک مزاج، کم آمیز، سادگی پسند اور خاموش طبع تھے، اُن کی طبیعت میں تلاش، محنت، تحقیق و تدقیق کا مادہ بدرجۂ اتم موجود تھا، .... مرحوم کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کی شاندار روایات کا بڑا اثر تھا، .... حافظ قرآن تھے، یہ خود ایک بڑی نعمت ہے، اور وسیلۂ مغفرت"

وہ کسی کے متعلق بھی بُری رائے نہ رکھتے، اُن کا قول تھا کہ جب میں کسی سے ملتا ہوں تو اس کو اچھا ہی سمجھتا ہوں، اور اس وقت تک اچھا سمجھتا رہتا ہوں جب تک کہ وہ خود اپنے کو بُرا نہ ثابت کر دے، اپنے ایک ندوی عزیز کو ایک مکتوب میں لکھا کہ

"محبت، اعتماد، اور مسامحت میرا دستور العمل ہے، چنانچہ اس وقت تک اس میں کامیابی ہوئی ہے، جس دن یہ بات نہیں رہے گی، میں نہیں رہوں گا" (مورخہ ۹ اپریل ۱۹۴۱ء)

اشتعال انگیزی | البتہ مذہب اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب کوئی اہل قلم گستاخانہ اور نا روا حملہ کرتا، تو اُن کے اشتعال اور رنج کی کوئی حد نہ ہوتی، اور اس کے جواب میں اُن کی جو تحریر نکلتی، وہ بہت ہی زہرناک ہوتی، ایسے موقع پر فرماتے کہ میرے قلم میں ایسا زہر بھی ہوتا ہے کہ سات سمندر کا پانی بھی اس کے زہریلے اثرات کو دور نہیں کر سکتا،

کشادہ دستی | دار المصنفین میں اُن کی زندگی سو روپے ماہانہ وظیفہ سے شروع ہوئی، جو ۳۲ سال کی خدمت کے بعد ۲۵۰ روپے سے زیادہ نہ بڑھ سکا، آبائی جائداد سے اخیر عمر میں فائدہ اٹھانے لگے تھے، اس سے ساٹھ ستر من غلہ سالانہ مل جایا کرتا تھا، لیکن اس محدود آمدنی میں اللہ تعالیٰ نے اپنی برکت عطا فرمائی تھی کہ بڑی صاف ستھری زندگی بسر کرتے تھے، ضرورت کا ہر سامان اُن کے پاس موجود تھا، متعلقین کو اچھا کھلاتے اور پہناتے، بعض اوقات مصارف کی تنگی تو ضرور محسوس ہوئی لیکن کبھی کسی قسم کی تکلیف اٹھانے کی نوبت نہیں آئی، اعزہ و اقربا کی امداد بھی کرتے

رہتے تھے، اُن کے ایک عزیز چار سو روپیے کے مقروض تھے، قرضدار کا بڑا سخت تقاضا تھا، انھوں نے اپنی پریشانی کا حال سید صاحب کو لکھا، اُن کا خط پڑھ کر بہت متاثر ہوئے، اور حسب ذیل جواب دیا،

"آپ کا لفافہ ملا جس سے آپ کی پریشانیوں کا حال معلوم ہوا، دل مضبوط رکھیے، اور خدا پر بھروسہ کیجئے...... اس میں امداد کے لئے میں حاضر ہوں، چار سو قرض میں، یہ قرض آپ مجھ پر چھوڑیں، مجھ سے جہاں تک ہو سکے گا، اس کی صورت نکالوں گا، اگر سو روپیے سال وہ لینا منظور کریں تو میں آسانی سے انشاء اللہ دے سکوں گا، اور اگر وہ چار سو اسی وقت لینے پر مصر ہیں، تو یہ بھی بفضل خدا ہو سکتا ہے، مگر اچھا ہو کہ اکتوبر کی تعطیل تک آپ مہلت لیں، یہ اس لئے کہ ڈاک سے بھیجنے میں، لوگوں کو معلوم ہو جائے گا، اور یہ کچھ اچھا نہیں،

اور جب یہ قرض ادا ہو گیا تو وہ بے حد مسرور ہوئے، ایک بار ان کے ایک عزیز نے وطن کے قیام کے زمانہ میں ان سے کچھ قرض لیا، اور ایک دوسرے صاحب کو لکھا کہ یہ رقم اُن کو ادا کر دی جائے، جب وہ دینے لگے تو فرمایا یہ رقم قرض کے خیال سے دی ہی نہیں گئی تھی جس کی واپسی کا سوال ہو اور اس کے لینے سے انکار کر دیا،

ایک عزیزہ کی لڑکی کی شادی تھی، وہ خرچ کی کمی محسوس کر رہی تھیں، سید صاحب کو معلوم ہوا تو چپکے سے دو سو روپیے اُن کے پاس بھجوا دیئے، شادی ہو جانے پر ان عزیزہ نے اپنے بعض اعزہ سے اس رقم کا ذکر کیا، سید صاحب کو معلوم ہوا تو اس سے اُن کو بڑی آزردگی ہوئی،

قومی چندے پابندی سے ادا کرتے رہے، ایک مکتوب مورخہ ۸ مئی سنہ ۱۹۵۳ء میں سید عبدالحکیم صاحب کو تحریر فرماتے ہیں:

"اب میرے سالانہ چندوں کی فہرست سنیئے، جو سالانہ ادا ہوتے ہیں، اور امسال ہو چکے ہیں، یہ: سالانہ ندوہ دو سو روپیے، مدرسہ سرائے میر دس روپیے، مدرسہ اسلامیہ اعظم گڈھ بارہ روپیے، انجمن امداد غربا اعظم گڈھ بارہ روپیے، رکنیت ندوہ پانچ روپیے، رکنیت ایجوکیشنل کانفرنس پانچ روپیے،

امارت شرعیہ دس روپیے، انجمن تبلیغ الاسلام الٰہ آباد دس روپیے، انجمن تبلیغ صوبہ متحدہ چھ روپیے"

ان چندوں کے علاوہ وطن کی انجمن الاصلاح کو ۱۲ اور وہاں کی مسجد کو بھی ۶ سالانہ مستقل دیتے تھے، اس کے علاوہ عارضی چندے بھی دیتے رہتے تھے،

دارالمصنفین کی ۳۲ سال کی خدمت کے بعد جب بھوپال تشریف لے گئے تو ایک ہزار تنخواہ مقرر ہوئی، وہاں تقریباً چار سال رہے، لیکن اس زمانہ کی آمدنی کا بڑا حصہ بعض اعزہ کی شادی انجام دینے، متعلقین کی خاص خاص ضروریات پوری کرنے اور اہل و عیال کے ساتھ سفر حج کرنے میں صرف ہوا،

استغنا و بے نیازی

دارالمصنفین کے قیام کے زمانہ میں جب اُن کے فضل و کمال کا شہرہ ہوا تو مختلف جگہوں سے بڑی بڑی تنخواہوں کی ملازمتیں اُن کے سامنے پیش ہوئیں، مگر انھوں نے ہمیشہ اُن کے قبول کرنے سے انکار کیا، ۱۹۱۹ء میں ڈاکٹر اقبال نے پنجاب یونیورسٹی میں ایک جگہ پیش کی، اس کو قبول کرنے سے بھی معذوری ظاہر کی، اس پر ڈاکٹر اقبال نے ان کو لکھا کہ

"مجھے یہ معلوم تھا کہ آپ ملازمت کوئی قبول نہ کریں گے، لیکن سنڈیکیٹ کے بعض ممبروں کی تعمیل ارشاد میں آپ کو لکھنا ضروری تھا، کسی قدر خود غرضی کا شائبہ بھی میرے خط میں تھا، اور وہ یہ کہ میں چاہتا تھا کہ جس طرح پنجاب والوں کو صوبہ متحدہ کے علما و فضلا سے بیشتر فائدہ پہونچا ہے اب بھی وہ سلسلہ آپ کے یہاں رہنے سے بدستور جاری رہے......"

تقسیم ہند کے بعد پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات کی صدر نشینی جس کی تنخواہ ڈیڑھ ہزار ماہوار تھی پیش ہوئی، اس کو بھی قبول نہ کیا، اور دوسروں کے لئے سفارش کر دی،

ایک بار مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے شعبۂ دینیات کی پروفیسری قبول کرنے کے لئے اصرار کیا گیا، تو فرمایا کہ پھر دارالمصنفین کو کیا کروں گا، بعض ذمہ دار اشخاص نے تجویز کیا کہ یہ ادارہ بھی وہاں منتقل کر دیا جائے، سید صاحب نے جواب دیا کہ پھر استاذ مرحوم کا مزار کس کے حوالہ کر دوں گا،

ایک بار علماء کے ایک اجتماع میں شرکت کے لئے پشاور تشریف لے گئے، نواب زادہ سر عبدالقیوم خان نے
علماء کو اپنے یہاں مدعو کیا، اور دعوت کے بعد ہر ایک سے علیحدہ علیحدہ ملاقات کی، جب سید صاحب سے رخصت
ہونے لگے، تو مصافحہ کرتے وقت سو روپے کا ایک نوٹ ان کے ہاتھ میں دیدیا، مہمان نوازی کا یہ اخلاق سید صاحب
کو پسند نہ آیا، لیکن مروت میں خاموش رہے، اور نوٹ واپس نہ کر سکے، مگر لکھنؤ آکر یہ رقم دارالعلوم ندوہ کو دیدی، اور
اس کی باضابطہ رسید سر عبدالقیوم کے پاس بھجوادی۔

۳۵ء میں ذات الجنب کے مرض میں مبتلا ہوئے، تو کئی مہینے تک علیل رہے، علاج میں آٹھ سو روپے کے
مقروض ہوگئے، دارالمصنفین کی طرف سے یہ تجویز پیش ہوئی کہ علاج کے سارے اخراجات ادارہ کی طرف سے ادا
کئے جائیں لیکن انھوں نے اس کو گوارا نہ کیا، اور خود ہی قرض ادا کیا۔

پاکستان ہجرت کی تو آبائی مکانات، شاندار بنگلہ، باغ، جائداد، گھر کا سارا سامان، حضور نظام کا وظیفہ
اور بھوپال کے پروڈنٹ فنڈ کی رقم سب سے منھ موڑ لیا، اور ہجرت کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے، جولائی
۵۱ء میں اس راقم کو لکھا کہ ہجرت کی شان بہت بلند ہے، مہاجر صحابہ کی قدر اب معلوم ہوتی ہے، [illegible]
پنجاب سے بہار کے مہاجروں کو بہت کچھ سہولتیں دی گئیں، ان سے فائدہ اٹھانے کے لئے بار بار ان کی خدمت
میں گذارش کی گئی لیکن غایت استغنا، میں ۱۰ اگست ۵۲ء کو تحریر فرمایا:

"ہندوستان چھوٹنے پر جائداد و مکان کی محبت دل سے نکل گئی اور بقول شاعر

بلبل نے آشیانہ چمن سے اٹھا لیا — اس کی بلا سے بوم رہے یا ہما رہے

سلوک کی وہ منزل جو تصوف کی راہ سے شاید برسوں میں طے ہو سکتی ہے، اس ہجرت
میں دم کے دم میں طے ہو گئی۔"

پاکستان پہونچے تو ادارۂ تعلیمات اسلام کی صدارت پیش کی گئی، اس عہدہ کی بڑی تنخواہ تھی، یہ ادارہ دستور سازی میں
مدد دینے کے لئے قائم کیا گیا، لیکن پورے دو سال تک اس کو یہ کہکر قبول کرنے سے انکار کرتے رہے کہ جب تک قوانین

مروجہ اسلامی نہ بنائے جائیں گے، تنہا دستور سے کوئی مملکت اسلامی نہیں بن سکتی ہے، اور جب ان کو مروجہ قوانین پر نظرثانی
کرنے کی اجازت ملی، تو عہدہ قبول فرمایا، لیکن اس کی مدت ایک سال سے کچھ ہی زیادہ رہی، اس سے پہلے سوا دو سال
تک متوکلانہ زندگی بسر کی، اور معاشی صورت پیدا کرنے کے لئے بقول انہی کے اپنا پیشہ قدیم کتب فروشی اختیار کیا،
اور اسی لئے مکتبۃ الشرق قائم کیا،

دارالمصنفین سے ربط

دارالمصنفین کے لئے انھوں نے جیسی قربانیاں کیں، ان کی مثالیں اس زمانہ میں کم ملیں گی، اگرچہ
حالات نے ان کو آخر میں دارالمصنفین سے جدا کر دیا تھا لیکن اس کے ساتھ ان کی قلبی وابستگی آخر دم تک قائم رہی، اس کی
ہر لغزش پر بے چین ہو جاتے، اور اس کے ازالہ کی تدبیریں بتاتے، اور اس کی فلاح و بہبود کیلئے مفید مشورے دیتے رہتے،
ہندوستان ہی میں تھے کہ جون ۱۹۴۶ء میں بھوپال چلے گئے، دارالمصنفین سے ان کا ہٹنا کم اہم واقعہ نہ تھا، مگر
بھوپال کے زمانۂ قیام میں وہ بدستور دارالمصنفین کے ناظم رہے، وقتاً فوقتاً اس کی دیکھ بھال کے لئے آتے، اور ہدایتیں
بھیجتے رہتے، جس سے ان کی کمی محسوس نہ ہوتی لیکن وہاں کے قیام کے دوران میں شاہ معین الدین صاحب ندوی
نے دارالمصنفین کے مستقبل کے بارہ میں اپنی کسی تشویش کا اظہار کیا تو اس کے جواب میں دسمبر ۱۹۵۰ء میں ارقام فرمایا:

"میں دور ہوں مگر حالات سے قیاس کرتا ہوں کہ دارالمصنفین کا مستقبل خطرہ سے خالی نہیں، معلوم
نہیں اس کو کیا پیش آئے، یہ ظاہر ہے کہ اس کی تباہی میری تباہی ہے، اور مجھے اس سے کتنا رنج ہوگا،
آپ کا یہ کہنا کہ اگر آپ واپس نہیں آئے تو میرے لئے بھی کہیں فکر کیجئے، مناسب نہیں کیونکہ دیر سویر ایک
ضعیف العمر کو اس خاکدانِ فنا کو چھوڑنا ہی ہے، اور آپ لوگوں کو بہرحال اس ادارہ کو چلانا ہے،
یہی عزم ہونا چاہئے۔"

وہ جب کراچی چلے گئے، تو وہاں سے اپنے شاگردوں کو تحریر فرمایا گیا کہ

"پہلے دارالمصنفین ایک شخص (مولانا شبلی) کی یادگار تھا، اب اس کو دو کی یادگار سمجھ کر زندہ رکھو۔"

پھر علیحدہ علیحدہ خطوط لکھ کر شاگردوں کو تلقین کی کہ

"........آپ اسکو (یعنی دارالمصنفین) کو اپنی زندگی کا کام بنائیں، ورنہ لاکھوں کا سرمایہ اور عمروں کا حاصل تباہ ہوجائے گا"

اور جب دارالمصنفین کے پرانے نظام میں تبدیلی ہوئی، اور جناب شاہ معین الدین صاحب ندوی کو شعبۂ علمی کی نظامت سپرد کی گئی تو بڑی مسرت واطمینان کا اظہار فرمایا چنانچہ مارچ ۱۹۵۱ء کے ایک مکتوب میں اُن کو تحریر فرمایا:

"دارالمصنفین میں آپ لوگوں نے جو کچھ طے کیا، اس پر میں راضی اور درگاہِ الٰہی میں داعی ہوں کہ اس کو دارالمصنفین کے حق میں نافع فرمائے

سپردم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حسابِ کم وبیش را

آپکے ہونے کو میں اپنا ہی ہونا سمجھتا ہوں اور مجھ کو آپ کی قائم مقامی سے ویسی ہی خوشی اور طمانیت ہے جو کسی روحانی اور جسمانی خلف الصدق کی جانشینی سے ہوسکتی ہے خدا کا شکر ہے کہ میں نے اپنی زندگی ہی میں اپنی موت کے بعد کا نقشہ دیکھ لیا، اب آپ سے جہاں تک ہوسکے دین وملت کی خدمت سمجھ کر اس کام کو انجام دیں اور ساتھ ہی اپنے رفقار کی تیاری میں مصروف رہیں، تاکہ ایک چراغ سے دوسرا چراغ جلتا رہے۔" اور استاد مرحوم کا سلسلہ قائم رہے، الحمدللہ آپنے معارف اور شذرات کے معیار کو قائم رکھا، "اِدھر" اور "اُدھر" میں شاید ہی کسی کو فرق محسوس ہوتا ہو، وللہ الحمد"

خدا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را

سیرۃ السید کے کچھ نموال سبق

از

جناب مولانا عبدالباری صاحب ندوی

حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ "سید سلیمان" نام کے ایک طالب علم کی حیثیت سے دارالعلوم (ندوہ) میں سنہ ۱۳۱۸ھ کے آخر (غالباً ذی الحجہ) میں داخل ہوئے، اور راقم دوسرے ہی سال سنہ ۱۹ھ کے شوال میں، اس طرح بچپن اور زندگی کے ابتدائی سالوں کو چھوڑ کر اُن کی پوری زندگی کے ہر دور کو دور و نزدیک سے دیکھنے جاننے اور سمجھنے کے مواقع حاصل رہے، آخری دور۔ قیامِ پاکستان — میں بھی وہ فیضے کے قریب بہت قریب سے چشم و گوش دونوں کو دید و شنید کی سعادت میسر رہی، ڈھائی ہفتے تو کراچی میں خود اُن کا مہمان رہا، ملتان میں خیر المدارس کے سالانہ جلسۂ دستار بندی میں یکجائی کا شرف حاصل رہا، اور پانچ ہفتے کے لگ بھگ حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب مدظلہ[1] کی خدمت میں لاہور میں حاضری رہی، تو اس دوران میں کئی بار یونیورسٹی کی کمیٹی اور جامعۂ اشرفیہ کے سالانہ اجتماع کے سلسلہ میں تشریف لائے، اور خواجہ تاشی کے رشتہ سے مستقل حضرت ممدوحؒ کے وہ بھی مہمان ہوئے

ندوہ میں نہ صرف طالب علمانہ معیت ورفاقت رہی، بلکہ جب استاد مقرر ہوئے تو شاگردی کی دولت بھی ملی، استاذ مرحوم ومحترم علامہ نعمانی کی مجالس میں سالہاسال اُن کے پیچھے صفِ نعال میں شریک رہا، سب سے طویل دور اُن کا دارالعلوم (ندوہ) اور دارالمصنفین کی معتمدی ونظامت کا رہا، اس کم وبیش چوتھائی صدی کے دوران میں دونوں

---

[1] حضرت مفتی صاحب مجدد تھانوی علیہ الرحمۃ کے اجل خلفاء میں ہیں، متعنا اللہ بطول بقائہ۔

اداروں کے گوناگوں معاملات سے باضابطہ و بے ضابطہ خاکسار کو بھی تعلق رہا، "سیرت سلیمان" کے جلی و خفی نمایاں اور نیم نمایاں
نقوش سب سے زیادہ اسی عہد میں ثبت ہوتے رہے، مکاتبت میں مرحوم زیادہ مستعد نہ تھے، پیش قدمی تو بالضرورت شدہ
شاذ ہی فرماتے، جواب بھی بارہا ہفتوں میں مرحمت ہوتا، خود مجھ کو اپنے قلبی تغیرات کی بنا پر حفاظت مکتوبات کا کبھی کوئی
اور پورا اہتمام نہیں رہا، پھر بھی وفات کے بعد پرانے کاغذات جو اُلٹے تو "سید المکاتیب" کا ذخیرہ بھی ڈھائی سو سے زیادہ نکلا،

نصف صدی سے بھی زیادہ روابط کے اس تسلسل اور تنوع کی بنا پر اس میں شک نہیں کہ "سیرت السید" کا بڑا کثیر
مستند سرمایہ اس بے مایہ کے پاس ہونا چاہیے تھا، اسی توقع میں ہندوستان و پاکستان کے بعض ارباب رسائل کا حکم دوا
ہوا کہ اُن کے رسالوں کی خصوصی اشاعتوں اور مستقل سیرت کی تالیف میں کوئی بڑا اور خاص حصہ لے سکتا ہوں،

لیکن اس حسن ظن کے بدلنے پر اُن کو کس طرح آمادہ کروں، اور کیونکر یقین دلاؤں کہ خود زندگی کے جس عالم سے
گذر رہا، بلکہ جس پر زندگی ختم کر رہا ہوں، وہ بجھی ہوئی آگ کے ایک ڈھیر سے زیادہ نہیں خصوصاً جب سے اپنی سمجھ
کی سمجھ میں یہ آگیا ہے کہ اسلامیت اور انسانیت کسی کا بھی بیڑا کاغذی ناؤ سے پار نہیں لگ سکتا، اور زبان و قلم
کی رائج الوقت وبا سے ملک و ملت کے کاموں میں فلاح سے زیادہ فساد ہی کا مشاہدہ دن رات ہوتا رہتا ہے
اس وقت سے یقین فرمائیں کہ گو خود بھی اس وبا کے تعدیہ سے پوری طرح محفوظ نہیں تاہم مسلمان اور انسان روز
کے دن پر دن بگاڑ کو بناؤ سے بدلنے کی تدبیر اس کے سوا نظر نہیں آتی کہ خود مسلمان جن پر ساری دنیا کی ہدایت
و امامت کی ذمہ داری ہے، وہ زبان و قلم کم چلائیں، اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر چھوٹے بڑے شعبہ زندگی
میں مسلمان بن کر زیادہ دکھلائیں، یہ حقیقت اس بذات خود سراپا بیکار کے لئے دن دوپہر کے سورج سے
بھی بڑھ کر اتنی روشن و یقین ہو چکی ہے کہ لکھنا بولنا یوں ہی کیا آتا ہے، ایسی مواقع پر اور بھی زبان گنگ اور قلم کند ہو جاتا
خصوصاً تکلف و آورد سے ایک سطر بھی لکھنا پہاڑ ہوتا ہے،

اس کے علاوہ واقعاتی و تاریخی حافظہ پیدائشی طور پر حصہ میں بہت کم پڑا، اور اب تو ناپید ہونے کے برابر
نقلی روایت کسی بات کی گھنٹہ بھر بعد بھی مشکل ہی سے کر سکتا ہوں، کسی گذشتہ واقعہ و معاملہ کی جزئیات

و تفصیلات ذہن میں ڈھونڈھتا ہے نہیں ملتیں، زیادہ تر بس ایک معنوی، وہ بھی دھندلا سا خاکہ دماغ میں رہ جاتا ہے، خود
سید صاحب مرحوم کا قلم دینیات میں جیسی جیسی تاریخ وار جزئیات کے ساتھ متوفی کی مستعدی فرمایا کرتا تھا، کسی
موقع پر پاکستان ہی میں بڑی حیرت سے میں نے پوچھا کہ حضرت یہ آپ کے حافظہ کی کرامت ہے، یا کوئی یادداشت
روزنامچہ اس اہتمام سے ضبط فرماتے رہتے ہیں، ؟ جواب میں اُن کا محبوب مسکرانا تو یاد ہے لیکن جواب کیا ملا، یا
ہم سے کچھ ملا بھی؟ یہ بالکل یاد نہیں آرہا،

ایسی صورت میں دوستوں کے حکم پر معذرت و ندامت کے سوا بیش ہی کیا کر سکتا تھا، البتہ دارالمصنفین میں
حضرت مرحوم کے مسند نشین برادر عالی قدر شاہ معین الدین سلمہ کو یہ جیتے جی مرحوم "خدا جانے کیسے آشنا یاد آگیا کہ اُن کے
قلم پر قلم کا تار نہیں ٹوٹ رہا ہے، آخر جب یہاں تک نوبت پہنچی کہ سید صاحب کی بارگاہ میں آپ کا مضمون نہایت
ضروری ہے، خواہ اس کے انتظار میں پرچہ کی اشاعت میں تاخیر کرنا پڑے، تو ذہن پر دباؤ زیادہ پڑا، اور ان سطروں
تک پہنچا ہوں، والا تمام من اللہ،

سید صاحب کے علمی و عملی کمالات میں سب سے اونچا مقام اُن کی تصنیفی و قلمی یا ذہنی و دماغی خدمات کو حاصل ہے
ذہن و ذہانت میں اُن کی طالب علمی کے متعدد رفیق و معاصر متوقد الذہن اُن سے بڑھ چڑھ کر تھے، اور کہا جاتا تھا کہ اُن کے
سامنے سید صاحب کا چراغ جلنا مشکل ہے، لیکن ہر وصف کا کمال اس کا نقطۂ اعتدال ہوتا ہے، متوقد یا بھڑکتے ہوئے
ذہنوں کے علوم و افکار کو اکثر جھلس ہی جاتے دیکھا، ذہن کا کوئی متوازن تخلیقی کارنامہ ذہانت کی نرم و معتدل آنچ
ہی کا ہاتھ ہے، مرحوم کا سبق آموز ذہنی کمال اُن کا ذہنی توقد نہیں توازن تھا، چلتا اُن کا ذہن اُن کے جسم کی طرح
متانت ہی کی چال تھا، لیکن پڑتا ہر قدم مضبوط و ہموار زمین پر، بہت زیادہ ذہین، ذکی آدمی سخن کم کرتے ہیں
البتہ ذہانت کے زور سے اُگلتے زیادہ اور جلد ہیں،

سید صاحب کو طالب علمی ہی کے زمانہ سے پڑھنے اور کتب بینی کرتے اپنے ساتھیوں کے مقابلہ میں زیادہ پایا،

لہ مولانا سید ظہور احمد وحشی شاہجہان پوری،

ہر طرح کی چیزیں پڑھتے اور ایسا معلوم ہوتا کہ خوب چبا چبا کر ہضم کرتے، طلسم ہوش رُبا تک کو اس توجہ سے پڑھا
تھا کہ چند دو کے ایک وفد میں ساتھ تھا، یاد نہیں کیا صورت پیش آئی کہ کئی میل پیدل چلنا پڑا، غالباً کچھ پانی
بھی برس رہا تھا، اس عالم میں وہ طلسم ہوش ربا اس طرح سُناتے جا رہے تھے، جیسے کتاب پڑھ رہے ہوں،
راستہ تفریح کی سفر بن گیا، شاگردی کی سعادت کے بعد سے خدمت میں حاضری زیادہ ہونے لگی تھی، جب حاضر
ہوتا، کچھ نہ کچھ پڑھتے لکھتے ہی پایا، آخر تک یہ رنگ دیکھا کہ کوئی معمولی اخبار و رسالہ یا کوئی گری پڑی کتاب بھی سامنے
آگئی تو اُسی وقت اٹھا کر دیکھنے لگتے، ذرا بھی کوئی بات دلچسپی کی پاتے تو ایسا معلوم ہوتا، کہ خالی وقت گذاری کے لئے
نہیں توجہ کے ساتھ پڑھ رہے ہیں،

طبیعت اخاذ بہت تھی، ہر ادنیٰ و اعلیٰ کتاب و رسالہ اور ہر کہ و مہ کی باتوں سے مطلب کی بات اخذ کر لیتے، اور
حسب موقع کام لیتے، ذرا قابلِ قبول نہ نظر آتی، تو غور فرمانے پر جب جتنا جز بھی کسی کی بات کا ان کا دل و دماغ
قبول کرتا، تو قبول ہی نہیں، اعتراف بھی بڑی کشادہ دلی سے فرماتے، ایک آدھ مثال خود اپنے تجربہ کی یاد آگئی،
میں کہا کرتا ہوں کہ یقینی موت ہے یا زندگی؟ زندگی تو اتنی غیر یقینی کہ یقین پل بھر کا نہیں اور موت اتنی یقینی کہ
بن آئے نہ رہے "تیاری یقینی چیز کے لئے زیادہ کرنی چاہیے، یا غیر یقینی کے لئے؟ فرمایا کہ یہ بات تمھاری ایسی جی کو
لگ گئی کہ اس سے کام لیتا رہتا ہوں، حیدرآباد میں وجودی رنگ کے ایک بڑے صاحبِ حال و قال بزرگ
حضرت مولانا محمد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے، شیخ اکبر کے مسلک پر مخلوقات کی توجیہ معلوماتِ الٰہیہ کی تجلیاتی
نمود و ظہور سے بڑے جوش و خروش سے فرماتے، نئے پرانے دونوں طبیعتوں کے اہلِ علم بہت متاثر ہوتے تھے،
مولینا گیلانی اور ڈاکٹر میر ولی الدین جیسے مشہور معروف اصحابِ علم و قلم تک داخل ہیں، بلکہ دونوں، ماشاء اللہ مجاز و خلیفہ بھی ہیں،
زمانے کے خصوصاً بڑے حریص تھے اور چھاپہ تمام تر آیات و احادیث ہی سے مارتے، سید صاحب کا میلان ایک تو ابتدا میں اہلِ حدیث کی
طرف زیادہ رہا، دوسرے وہ زیر تربیت بھی ندوی مسلک کے بڑے بھائی کے رہے، اس لئے وجودیت کے نام ہی سے چوکنا ہوتے، تاہم جب آخری بار
حیدرآباد تشریف لے گئے، تو وہی اپنی اخذ و استفادہ کی طالب علمانہ صفت و سیرت کی بنا پر خاکسار اور مولانا

گیلانی کی ترغیب و تحریک سے کئی بار حضرت ممدوح سے ملے، اور ان کے حال و قال سے کافی متاثر ہوئے،
میں نے مولانا کی وجودیت کو سمجھنے کے لئے سید صاحب کو قرآن مجید کی اُن آیات کی طرف خاص طور سے توجہ
دلائی جن میں خلق و خلاقیت کو علم کے ساتھ غیر منفک طور پر وابستہ ٹھہرایا گیا ہے، مثلاً اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ بلٰی
وھو الخلاق العلیم وغیرہ، اور کچھ جدید فلسفیانہ و عقلی نظریات و رجحانات سے بھی اس کی تشریح کی، بڑی توجہ
دلچسپی سے سنا، پھر کچھ دن بعد فرمایا کہ بھائی ان آیات سے تم لوگوں کی وحدۃ الوجود تو ابھی سمجھ میں نہیں آتی
لیکن تمھاری گفتگو کے بعد سے علم و خلق کی وابستگی کی آیات پر غور کرتا رہا، اس میں شک نہیں ہے کہ دونوں کا ربط
بہت تفکر و تدبر کے لائق ہے (او کما قال)

غرض طالب علمی سے لے کر علمی شہرت و عظمت کے اوجِ کمال تک اشخاص اور کتابوں دونوں سے کھلے دل
و دماغ کے ساتھ اخذ و استفادہ کا یہی کمال کہنا چاہیے کہ اُن کو زندگی بھر لفظاً و معنیً سچا "طالب علم" بنائے رہا
لوگوں کمالات میں وہبی صلاحیتوں سے بہت زیادہ کسبی طور پر ان صلاحیتوں سے زیادہ سے زیادہ کام لینے کو
دخل رہا، فطری ذہانت و ذکاوت، طباعی و جودت والے دنیا میں کم نہیں ہوتے، ندوہ میں سید صاحب سے
پہلے اُن کے ساتھ اور بعد ایک سے ایک بڑھ کر ذہین و طباع داخل و فارغ ہوتے رہے لیکن "سید سلیمان ندوی" ہونے
میں سب پیچھے رہے، بڑا راز اس کا اُن کے کسبِ طلب کا کمال ہی تھا، اُن کی طالب علمانہ اور عالمانہ زندگی و
سیرت کا یہ بڑا قیمتی سبق ہے،

علمی ذوق و شوق کی عام فضا ندوہ میں اُستاذِ محترم (علامہ نعمانیؒ) کے دور میں پیدا ہوئی، لیکن سید صاحب
جہاں تک دیکھا سنا، اس سے پہلے بھی کتاب کے کیڑے تھے، کھیل کود میں کوئی نمایاں شرکت تو قطعاً
یاد نہیں آتی، نہ میل جول، اور سیر و تفریح کی زیادہ عادت تھی، یہی رنگ طبیعت کا آخر تک رہا، کہ خاص تعلق
کے لوگوں تک بھی وہ بھی بزور "بندش" ہی پہنچ پاتے، گویا یکسوئی ان کا طبعی امر تھا، جو علم و عمل کی ہر راہ میں کسبِ
کمال کی شرط ہے،

اعمال واخلاق کے اعتبار سے ایک دینی درسگاہ کے شایان شان تو دار العلوم (ندوہ) کا کوئی زمانہ نہیں
کہا جاسکتا، لیکن سید صاحب کی طالب علمی کا زمانہ خصوصیت کیساتھ بڑا مسموم تھا، طلبہ کیا بعض اساتذہ تک کی
حالت کچھ اچھی نہ تھی، طلبہ کا کمروں میں چھپ چھپ کر تاش کھیلنا، راتوں کو بھانگ بھاند کر پھیرنا
معمولی باتیں تھیں، پھر رات دن ساتھ رہنے والے طالب علموں میں ایک کا حال دوسرے سے کب تک چھپا رہ سکتا ہے
بایں ہمہ سید صاحب کی اس زہریلے ماحول سے تاثر کی کوئی بات دیکھنا کیا سننا بھی قطعاً یاد نہیں، بس ایک ہی بات کی
شہرت تھی کہ پیالہ اُن کا زیادہ بند رہتا، مراد بکرے کا گوشت، اور گھی کے تار والا پیالہ ہے، جو اس زمانہ میں
پانچ روپیہ ماہوار میں مستطیع، وغیر مستطیع سب ہی طالب علموں کو دو وقت ملتا تھا کسی کے پیالہ میں تار نہ ہوتا، تو سخت ہی
بے پر صدائے احتجاج بلند ہوتی، نماز کی غیر حاضری پر منتظمین نے سب کا، اگر سزا اس عزیز پیالہ کا بند کردینا ہی قرار دے
رکھی تھی، اور مسجد بہتوں کو اس تار والے پیالہ کی کشش ہی پہنچاتی،

ایک اور اصطلاح "پوستین" یعنی کابل کی چلی ہوئی تھی، غالباً بہار سے درآمد کی ہوئی اور بہاری طالب علموں کی
چلائی ہوئی۔ بے تکلف احباب آخر بیت سید صاحب پر اس کو خوب چست کرتے، اُن کے پیالہ کی قربانی کا زیادہ
زیادہ تر اسی کو خیال کیا جاتا، یہ چیز زندگی کی اکثر عادتوں میں کم و بیش زندگی بھر اُن کی رفیق رہی، خطوں کا مہینوں
جواب نہ دینا، کہیں جانے آنے یا سفر کا ارادہ کر کے بارہا پورا یا وقت پر پورا نہ ہونا، اکثر اس طبعی خصوصیت کا مظہر
ہوتا، "پوستینی" اور کتب بینی میں بھی کچھ طبعی مناسبت معلوم ہوتی ہے، جس کا تجربہ راقم "پوستین" کو خود اپنی آخر زندگی میں
خصوصاً ہو رہا ہے، اپنے مذاق کی کتابیں وغیرہ تو صبح سے رات تک پڑھتا رہ سکتا ہوں، کتاب و مضمون کی
صورت میں کچھ لکھتا بھی رہ سکتا ہوں لیکن عجیب بات ہے کہ خط کا ایک کارڈ بھی طبیعت پر جبر کر ہی کے لکھا جاتا ہے
جگہ سے حرکت کرنا، اس کا تو یہ حال ہو گیا ہے کہ صبح یا شام مشی کی عادت کم و بیش چالیس سال سے جاری ہے
تو عادت ہی کی بدولت چلی جاتی ہے، باقی کسی سے ملنے یا کسی اور کام سے کہیں جانا ہوتا ہے تو دونوں مہینوں
بار با مہینوں ٹالتا رہتا ہوں، اس ناکارہ کا تو ذکر ہی کیا، سید صاحب کی طرح بعض دوسرے اکابر علم و قلم کا بھی

یہی حال دیکھا تھا، مولانا عبد الحمید فراہی رحمۃ اللہ علیہ جید عالم اور اپنے رنگ کے یگانہ مفسر ہی نہ تھے، بڑے صاحب تقویٰ
و تقدس بزرگ تھے، اُن کے چھوٹے بھائی نے خود اپنی اور مولانا ممدوح کی اس "پوستینی" کی بڑی دلچسپ و مزہ دار توجیہ
سنائی، کہ ہم دونوں بھائیوں کے دو اصول ہیں، ایک کا یہ کہ جو کام کل ہو سکے، آج نہ کرو، اور دوسرے کا یہ کہ جو دوسرے
سے ہو سکے، خود نہ کرو، امزاج کی سنجیدگی بھی کچھ نہ کچھ سست روی کا رنگ اختیار کر لیتی ہے، سید صاحب کی غیر معمولی
سنجیدگی اُن کا بڑا نمایاں وصف تھا، جلد بازی سے کسی کام میں بھی ذہن و جسم کسی سے بھی کام لینا گویا جانتے ہی نہ تھے
اسی کی برکت تھی کہ ندوہ میں اعمال کے ساتھ عقائد کی سُستی کا جب ایک تیز سیلاب آیا، تو سید صاحب اپنی جگہ
سے اس سیلاب کی عین زد میں ہو کر بھی زیادہ نہ ہلے، راقم ہزار روشن خیالی میں اپنے کو اُن سے بہت آگے پاتا، عقل
کی کوئی بات عقل کی کسوٹی پر پوری اترے بغیر مان لینا بڑی بے عقلی جانتا تھا، پھر بھی سید صاحب کے علم و عقل کا اتنا
قائل تھا کہ اپنے شکوک و شبہات اُن ہی کے سامنے زیادہ پیش کرتا، ایک مرتبہ جبر و قدر کے متعلق اچھی طرح یاد ہے
کہ اُن کی تفہیم و توجیہ سے خوب تشفی ہو گئی، گو بعد میں شرح صدر الحمد للہ کہ خود کتاب اللہ سے نصیب ہوا، کہنا یہ ہے کہ سید صاحب
ندوہ کے دور روشن خیالی و عقل پرستی میں بھی عقل پرست کبھی نہیں ہوئے،

"نقد ہر سود درجیب زیان انداختہ" گو عقائد و ایمانیات کی سُستی و کمزوری سے بڑھ کر کوئی ضرر و زیان نہیں
تاہم ندوہ میں علم و قلم کا ذوق و شوق اور دور دورہ اسی دور کی یادگار ہے، اس ذوق شوق کی بدولت نہ کہ
دینداری کے جذبہ سے اخلاقی مفاسد کا زور بھی کم ہوا، جن میں کچھ بھی صلاحیت ہوتی تقریر و تحریر ادب و انشاء اور
عربی یا دونوں کے میدان میں اتر پڑتا، بعض غریب صلاحیت و عقل دونوں سے کورے کچھ نہیں تو نخاس سے
ٹوٹی پھوٹی میز کرسی خرید کر روزانہ قلم کاغذ لے کر بیٹھ ضرور جاتے اور روزنامہ صفت نقالی ہی سے اپنی تشفی کرتے، زیادہ
ملن تاریخ اور ادب کا تھا، دونوں کی صلاحیت و مناسبت سے قطعاً محروم ہونے کے باوجود کتب خانہ جا کر ابن
خلدون و ابن خلکان خود میں بھی روزانہ دارہی دیکھا کرتا، عربی میں زبردستی مقرر بننے میں اتنی کامیابی حاصل کی
کہ ایک دن استاد محترم (علامہ نعمانی) نے خود اپنے سامنے تقریر کرائی، اور پسند فرمائی، تقریر کا موضوع بھی عجیب

و غریب — اب بالکل سمجھ مین نہین آتا، کہ کیون، — مینونسپلٹی اختیار کیا تھا، مگر صلاحیت کے خلاف زبردستی کے
دن چل سکتی تھی، نہ مورخ بن سکا، نہ ادیب نہ مقرر، نہ عربی کا نہ اردو کا، طبیعت کو نسبۃً عقلیات سے کچھ لگاؤ
پایا، وہ بھی زیادہ عقلیات جدیدہ سے، جس کی شُدبُد عربی رسائل خصوصاً المقتطف — سے شروع ہوئی، دینی
مذہب کا جوڑ عقلیات مین کلامیات سے زیادہ لگتا ہے، اور جس طرح الفاروق المامون کا مصنف تاریخ پر دینی
کا آئیڈیل بنا، اسی طرح الکلام، اور علم الکلام کا مصنف، اس عقل کے دیوانہ کا بن گیا تھا،

ہمارے سید العلماء کی قلمرو سے ماشاء اللہ کلامیات و عقلیات کی اقلیم بھی باہر نہ تھی، ضابطہ کا شاگرد تو یون
بھی اُن کا ہو چکا تھا کہ استاذ مقرر ہونے پر میری جماعت کا بھی ایک سبق اُن سے متعلق تھا، غالباً ادب کی کسی کتاب کا،
ساتھ ہی اس زمانہ مین جب وہ مدرسہ سے باہر مع اہل و عیال ایک چھوٹے سے مکان (موجودہ مرکز دعوت و تبلیغ
کے قریب) قیام فرما تھے، تو میری حاضریان زیادہ ہونے لگی تھین، ان حاضریون مین کس نوع کا استفادہ زیادہ
کرتا تھا، یہ بالکل یاد نہین، اپنی اُس وقت کی طلب و ذوق کو دیکھتے قرین قیاس یہی ہے کہ کلامی و عقلی چیزون مین زیادہ
مستفید ہوتا ہون گا،

ندوہ کی تاریخ کا یہی وہ دور ہے جس مین ایک طرف علامہ نعمانی جیسے صاحبِ علم و قلم کی تربیت مین
ہونے والے علامہ ندوی" کے علم و قلم کے ذہنی و کسبی جوہر روز بروز کھل رہے تھے، اور دوسری طرف حرف شناس
راقم ہذا کی نیازمندیان بھی اسی زمانہ سے سید صاحب کی خدمت مین بڑھین،

اس عہد مین مرحوم سے متعلق دہرانے والا وہی سبق برابر ہمتا رہا کہ ذہنی و وہبی صلاحیتون والے اور
بھی ندوہ مین اُن کے برابر کے یا بڑھتے ہوئے موجود تھے لیکن کسب، طلب، اخذ و استفادہ کی دھن اور لگن مین
ان کا ہمسر کوئی معلوم نہین، جب اُن کے قیام گاہ کے چھوٹے سے بیرونی کمرہ مین حاضر ہوتا، فرش پر لیٹے بیٹھے
کتاب یا قلم ہی سے مشغول پاتا، یا کبھی کبھی کسی بچہ کے ساتھ پدری شفقت کا حق ادا کرنے مین شبلوی مجالس مین
اور بھی بہت سے طلبہ و اساتذہ ہوتے تھے، لیکن سید صاحب کا شاید ہی کسی مجبوری مین کوئی دن ناغہ جاتا ہوگا

اور خاص طور پر عام مجلس کے علاوہ اپنے مضامین کی اصلاح وغیرہ کے سلسلہ مین دوسرے خاص اوقات مین بھی سب سے
زیادہ حاضر ہونے والون مین وہی تھے،

ملک مین چھوٹی بڑی سیکڑون دینی درسگاہون کے ہوتے ندوہ نے ایک نیا دارُالعلوم قائم کرکے دینی
تعلیم و تربیت کے جن نئے مقاصد کا بیڑا اٹھایا تھا، ان مین سب سے نمایان وقت کا ایک اہم دینی مطالبہ ایسے علماء کا
پیدا کرنا تھا، جو عصری تقاضون اور علوم و فنون سے آگاہ ہون، اور اُن کے مقابلہ مین دین کی علمی و عملی خدمات کا
فرض ادا کر سکین، اس مقصدِ عظیم خصوصاً جدید علوم و فنون کی تعلیم کے لئے جیسا سامان و سرمایہ درکار تھا، ندوہ کو
کبھی میسر نہ آیا، بے سروسامانی کے دیکھتے اپنے طلبہ مین نفسِ مقصد کی روح پھونکنے مین جتنی کامیابی حاصل
کی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ظاہری ساز و سامان بھی اگر کسی معتدبہ درجہ مین فراہم ہوتا، تو اسلامی نقطۂ نظر
سے دینی ہی نہین، دنیوی یا سیاسی و قومی قیادت کا مرکز ہندوستان کیا شاید سارے عالمِ اسلامی کیا آج
ندوہ ہی ہوتا،

پھر بھی بہت سے ندویون نے اس روح سے چونک کر ذاتی شوق و شغف اور کوششون سے جس حد
تک ندوہ کے مقصد کو پورا کر سکتے تھے کیا، اور جامعی حیثیت سے ندوی قلم نے جدید طبقات مین جو اعتبار پیدا کیا، اور
کم و کیف دونون طرح جو خدمات انجام دین کسی دوسرے مدرسہ و ادارہ مین اس کی مثالین شاذ و نادر افراد ہی
تک ملتی ہین، وہ بھی اعتراف کرنا چاہیئے کہ ندوہ ہی کی آواز بازگشت ہے، دارالمصنفین جیسے ایک مستقل و مستند تصنیفی
ادارہ اور تربیت گاہ کو ندویون ہی نے وجود بخشا، اور کون نہین جانتا کہ اس وجود کا آغاز و انجام سید صاحب
ہی کی ذات تھی، نری کتب فروشی یا کتب سازی کے علاوہ اب خالص تحقیقی و تصنیفی ذوق یا اُس کی تربیت
و تعلیم کے جو کچھ بچے کھچے آثار رہ گئے ہون، اُن کو اسی ذات والاصفات کے باقیات صالحات مین شمار کرنا چاہیئے

راقم سطور نے کسی کتاب کے دیباچہ یا مقدمہ مین مرحوم کے اس مرتبہ و مقام کے مد نظر اُن کو دارالمصنفین کا
"سید الطائفہ"[1] لکھا تھا، لیکن آج جب ماضی و مستقبل کی طرف نگاہ جاتی ہے، تو اُن کی ہستی دارالمصنفین ہی نہین، ندوہ

[1] (ملاحظہ ہو صفحہ آئندہ)

اور ندویت کی پوری ۹۰ سالہ تحریک و تاریخ کی سید الطائفہ نظر آتی ہے، ماضی مین تو ظاہر ہے کہ "ندویت" کے نام و کام مین اس مقام تک رسائی کسی نے نہین پائی، مستقبل مین بھی امید بخش آثار و علائم نہین، زبان خلق کا یہ خدائی نقارہ ہی معلوم ہوتا ہے کہ مطلق "علامہ ندوی" یا "مولانا ندوی" سے "ندویت" کا یہ فرد فرید "سید الطائفہ" مراد و مفہوم ہوتا رہے گا، بظاہر آیندہ ندوہ مین "سلیمان" کے نقش ثانی کے اُبھرنے کی توقع نہین[1]، والغیب عند اللہ

اسلام کی علمی و قلمی خدمات کا سب سے عظیم الشان و عالی مقام کارنامہ سید صاحب کا بالکل بجا طور پر سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قرار دیا جاتا ہے لیکن حضور کی سیرت کیا خود حضور کے دشمنون نے بزعم خود بڑی سے بڑی داد تحقیق کے ساتھ نہین لکھی، دشمنون کو جانے دیجئے، دوستون یا مسلمانون کے متعلق سوال ہے کہ دین کی کوئی چھوٹی بڑی خدمت اگر دل کے اخلاص اور ایمان کے قلبی داعیات و محرکات کے ساتھ انجام نہ دی گئی ہو، تو اسلام کے ترازو مین اس کا کیا وزن ہوگا ؟ وہان تو ہر چھوٹے بڑے عمل کی قیمت اُسی حساب سے لگے گی جس حساب سے وہ کفر و شرک ہی نہین، ریا و نفاق، مال و دولت، جاہ و شہرت کی گندگیون اور آلایشون سے پاک دل و دماغ سے کیا گیا ہوگا، خود اسلام کی کتاب نے حصر کے ساتھ اسی کا تو مطالبہ کیا، ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہان قبول صرف

(حاشیہ ص گذشتہ) [1] لطیفہ یاد آگیا، دار المصنفین کی کسی صحبت مین "سید الطائفہ" کے جوڑ پر مولانا مسعود علی صاحب کے لئے "شیخ الطائفہ" کا خطاب تجویز ہوا تو قدرۃً ایک تیسرے رکن رکین کے لئے اس وزن کی فکر ہوئی، مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "مطلق طائفہ"! ؟

[2] مولانا علی میان سلمہ کی غیر معمولی للّٰہیت کی بدولت دار العلوم (ندوہ) ان کے خاص رنگ و حال کے ایک "زاویۃ المبلغین" مین تبدیل ہو رہا ہے، اور تبلیغ کی خدمت بجائے خود دین کی ساری علمی و عملی خدمات کا مرکزی مقصد ہی نہین بلکہ ظاہراً انبیاءؑ کی بعثت کا واحد مقصد ہے، اور ندوہ کے خاص مقصد کے لئے اگر ایک ادارہ کی ضرورت ہو تو اس کے لئے بیرون کی، تاہم اگر ندوہ کی خصوصی تحریک بھی وقت کی کوئی قابل بحث دینی خدمت سمجھی جائے، تو دونون ایک ہی مرکز مین مخلوط کر دینے سے طلبہ و اساتذہ سب مین ایک ذہنی خلط و انتشار زیادہ مشاہدہ مین آرہا ہے والعلم عند اللہ

اس کو نصیب ہوگا، جو اس کی رضا و جزا یا آخرت کی فوز و فلاح کے سوا نام و نمود، مال و منال وغیرہ تمام ناپاکیون سے پاک و صاف دل لے کر حاضر ہوگا "الا من اتی اللہ بقلب سلیم"

تصوف کے نام کو بہت سے اچھے خاصے اہل علم افراد و جماعتون نے محض کسی خاص تعصب و توہم یا فراخی خشکی و تہذب کی بنا پر اپنی چڑھ بنا لی ہے، "ندویت" بھی اس سے مستثنیٰ نہین، حالانکہ تصوف کے اسم و عنوان کا مسمّی دمعنون قلب کو "قلب سلیم" بنانے یعنی اُس کی صحت و سلامتی یا باطنی رذائل سے صفائی کے سوا کیا ہے، قلب کی اسی تصفیہ و تزکیہ سے تقویٰ کی زندگی اور اللہ تعالیٰ سے احسانی نسبت پیدا ہو جاتی ہے، جب تک قلب دنیا کی ہوا و ہوس کا بت خانہ بنا ہوا ہے، اس وقت تک سچ یہ ہے کہ کفر و شرک ہی نے ہمارا پیچھا نہین چھوڑا اخلاقی و باطنی رذائل اکثر کفر و شرک ہی کے چھپے ہوئے شعبے ہوتے ہین، آخر خود قرآن ہی نے "ھوا" کو بھی "الٰہ" یا معبود کہا ہے، "من اتخذ الٰھہ ھواہ" — تو ہوا پرستی کے ساتھ خدا پرستی کیسے جمع ہو سکتی ہے، اگر ریا و نفاق کا روزہ نماز، روزہ نماز نہین تو تحریر و تقریر، تالیف و تصنیف کی نام نہاد دینی خدمات کی تہ مین بھی خدانخواستہ جاہ و جلال یا نفس و نفسانیت کے جذبات شریک ہون، تو خدا و رسول کی راہ مین یہ شرک کے سوا کیا ہوگا ؟

دین کے معروف و مسلم خدمت گذارون تک کو دیکھا جاتا ہے کہ جب اُن کا قلم کسی مسئلہ و معاملہ مین ایک دوسرے کی تردید و تنقید پر چلتا ہے، تو شاید ہی کوئی قلم باہمی بغض و حسد مین تنقیص و تحقیر کی ذاتیات تک نہ اترتا ہو، بلکہ اس نمک مرچ کے بغیر قلم مین زور ہی نہین آتا، حال ہی مین دیکھا کہ ایک دینی ہی جماعت کی کسی کتاب مین دوسری جماعت کی خدمات کا ذکر و اعتراف نہ تھا، بس پر قلم میدان مین آگیا کیسی چھوٹی اور اوچھی باتین دور و نزدیک سے بہت سے نئے پرانے اہل قلم کو جاننے پہچاننے کا موقع ملتا رہا، مگر اس طرح کی نفس و نفسانیت کے مظاہرون سے پاک ایک مثال بھی ذہن مین نہین، تھوڑی بہت اگر ہے تو اُنہی کی جنھون نے ع

"پیش مرد کاملے پامال شو"

کی تھوڑی بہت ہمت پائی، ورنہ عام طور پر تو خالص دینی مقاصد کے نام پر رسالے نکالنے والون، مضامین لکھنے والون

اور کتابیں تصنیف کرنے والوں کے دل میں تو یہ سوال بھی شاید پیدا ہوتا ہوگا کہ کسی خدمت و عمل کے دینی یا مقبول ہونے کی پہلی شرط مقصد و ارادہ یا قلب و نیت کی سلامتی و صحت ہے، صحیح نیت کے بغیر دین کی نگاہ میں کسی عمل کا اعتبار ہی نہیں، "انما الاعمال بالنیات" بخاری شریف کی پہلی حدیث ہے،

قلم والوں کا بڑا دعویٰ اپنے علم و فہم کا ہوتا ہے لیکن دین کی فہم بھی تقویٰ ہی سے پیدا ہوتی ہے، اور تقویٰ کا سرچشمہ قلب ہی ہے، حضور نے قلب ہی کی طرف اشارہ فرما کر تکرار و اصرار کے ساتھ فرمایا کہ تقویٰ یہاں ہے تقویٰ یہاں ہے، التقوی ھھنا التقوی ھھنا، خود قرآن مجید نے اپنے سے ہدایت پانے کی (کہ وہی صحیح فہم قرآن ہے) شرط پہلے قدم ہی پر جو لگائی وہ نہ قلم کا مردِ میدان ہونا نہ کتابوں کا حمال ہوتا، بلکہ متقی ہونا هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ،

ایک طرف اپنے علم و نظر کی حد تک ایک "تقی النفس" اور اُس کے علم و عمل، فہم و فراست کو سالہا سال دیکھ کر یہ حقیقت دل میں بیٹھ چکی تھی کہ دین خالی کتاب و قلم سے ہرگز نہیں پیدا ہوتا، نہ علم میں نہ عمل میں، دوسری طرف اس مرض کا شدید مریض ہوں کہ کسی شے یا شخص کی کوئی خرابی و خامی چھوٹی ہو یا بڑی دیکھی نہیں جاتی، راستہ میں اگر کوئی نل کھلا اور پانی ضائع ہوتا دیکھتا ہوں، تو جب تک اس کو بند نہ کر لوں، قدم آگے بڑھایا نہیں جاتا، تو پھر گھر باہر عزیزوں دوستوں ملنے جلنے والوں میں دین و دنیا کی کوئی کمی و کوتاہی دیکھ کر کیسے رہا جا سکتا ہے، خود علم و عمل، ظاہر و باطن ہر طرح کے نقائص و ذمائم کا مجسمہ ہوں، اور اُن کی دینی و دنیوی مضرتوں کو دن رات محسوس کرتا رہتا ہوں اس لئے[1] اور بھی ہمدردی کا احساس تیز ہو گیا ہے، بالکل جس طرح دمہ کا کم و بیش چالیس سال سے مریض ہوں، اور اس کی تکلیف میں راستہ چلتے بھی کسی کو مبتلا دیکھ لیتا ہوں تو یہاں تک ہوا کہ گھر لوٹ آیا اور عارضی افاقہ کی جو مشہور و مجرب دوائیں ہمیشہ پاس رہتی ہیں، لے جا کر پہلے کھلا دیا جب چین پڑا،

اپنا یہ مرض اس لئے عرض کر دینے کی ضرورت پڑی کہ سید صاحب کے علمی و قلمی کمالات ہی نہیں، بہت سے فطری و مذہبی اخلاقی و قلبی فضائل کا زندگی کے مختلف حالات و معاملات میں جو تجربہ سالہا سال ہوتا رہا تھا، اُن میں بس ایک ہی چیز کی کسر نظر آتی کہ کسی مردِ کامل "صاحبِ نظر" تک پہنچ جائیں، ایسے صاحب علم و فضل کے لئے

تو صرف تھانہ بھون میں نظر آئی، اور آخر اپنے اسی مرض "خیر خواہی" سے مضطر ہو کر دھیرے دھیرے ادھر توجہ کرنا شروع ہی کر دیا، ابتداءً غالباً تھانہ بھون ہی کی کسی حاضری کے دوران میں ہوئی، وہیں یہ تقاضا قلب میں تیز ہو جاتا تھا کہ میرے جیسے بے علموں سے زیادہ اور بہت زیادہ یہ آستانہ سید صاحب جیسے اکابر علم و قلم کے استفادہ کا ہے، کہ اُن کے افادات کا سونا یہاں کی ایک آنچ میں ان شاء اللہ کندن ہو جائے گا، الحمد للہ ویسا ہی ہوا،

بہتوں کو حیرانی رہی کہ مرحوم نے ایک ہی جست میں "ندوہ" سے "دیوبند" تک کا فاصلہ کیسے طے فرمایا، راز سننے سنانے و بتانے کا ہے، سید صاحب ماشاء اللہ صوفی پیدا ہی ہوئے تھے، خدا رسی سے مانع، کفر کے بعد، بلکہ کفر کی بھی جڑ کبر ہے، ابلیس کو ابلیس اباء و استکبار ہی نے بنایا، اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ، خصوصاً جو کبر علم اور اس سے بڑھ کر قلم کے زعم سے پیدا ہوتا ہے، اس کے "حجاب اکبر" کی مثالیں ایسی ایسی خود مشاہدہ میں آئیں کہ بس اللہ ایسے علم و قلم سے پناہ میں رکھے، اسی سے سمجھ میں آتا ہے کہ حضرات صوفیہ کے یہاں اس شیطانی خودی و خود رائی کے مٹانے پر اتنا زور کیوں ہے، حضرت حکیم الامت ہی فرمایا کرتے تھے کہ اس راہ کا حاصل بس خود کو مٹا دینا ہے، خدا و بندہ کے درمیان سب سے بڑا حجاب "خودی" ہے،

ع تو خود حجابِ خودی حافظ از میان برخیز

مرحوم معصوم نہ تھے، لیکن اُن کی زندگی کا جو رُخ طالب علمی سے لے کر آخر تک کم و بیش ہر نوع کے سابقہ میں سب سے زیادہ معصوم نظر آیا وہ یہی کہ خود رائی و خود پسندی دُور دُور نظر نہیں آئی، طالب علمی میں اُن کا شمار ممتاز اور آگے چل کر ممتاز ترین طلبہ میں رہا، لیکن نیچے نیچے درجہ کے طالب علموں کے ساتھ بھی کسی برتاؤ میں کوئی امتیاز ظاہر نہ ہوتا، عام طور پر دوسرے طلبہ ہم چشموں میں کچھ بھی امتیاز رکھتے، تو اس کے دبا نہ سکتے، چندہ کے وفد میں بارہا ساتھ ہوا، رئیس وفد سید صاحب ہی ہوتے، مگر یاد نہیں کہ کسی موقع پر کسی طور و طریق سے بھی دوسرے رفقا پر اپنا رئیس ہونا ظاہر ہونے دیتے،

---

[1] ظاہر و باطن کے اس سراپا مریض میں اس مرض کی تشخیص بھی حضرت علیہ الرحمۃ ہی کی تھی،

طالب علم سے جب استاد ہوئے تو خود اپنا ایک ایسا تجربہ سناتا ہوں کہ آج بھی اس کی شرم سے گڑا جاتا ہوں، ایک سبق میری جماعت کا بھی اُن سے متعلق ہوا، اب میرا شمار بھی کچھ اچھے طلبہ میں تھا، غالباً اسی کا غرور تھا کہ اُن کے سبق میں جانا چھوڑ دیا کہ کل تک جس سے طالب علمانہ ہمسری کا دعوی تھا آج اس کی استادانہ برتری کیسے قبول کروں، سید صاحب اس کم ظرفی کے جواب میں ضابطہ سے کام لیتے تو سزا دلوا سکتے تھے سرکشی سے باز نہ آتا تو مدرسے سے نکلوا سکتے مگر اُن کی عالی ظرفی نے اس سب کے بجائے کس طرح کہوں کہ کیا کیا، نئے استاد نہیں پرانے طالب علم بھائی بن کر اُنہوں نے خود ہی سمجھا بجھا کر کسی طرح منا لیا، مرحوم کی شفقت و محبت کا یہ پہلا بیج تھا، جو دل میں پڑا، پھر آخر تک بحمد اللہ پھلتا پھولتا ہی رہا، دخل اس میں اُن ہی کی بے نفسی کو زیادہ رہا،

آگے چل کر دارالمصنفین اور دارالعلوم ندوہ کے جب تک وہ ناظم و معتمد رہے، اور میری رکنیت یا ضابطہ کا کچھ تعلق رہا، ایک موقع بھی خیال میں نہیں کہ اپنے مزاج و مذاق کے خلاف بات کو بھی پوری توجہ سے نہ سنا ہو اور سمجھ میں آتے ہی بے تامل قبول نہ فرما لیا ہو، حالانکہ بعض دوسرے احباب جو ہر طرح مرحوم کے خورد نہیں احقر سے بھی عمر میں بہت کم، اُن کے مقابلہ میں کوئی بات میری مان لینا چاہتے، تو دیکھا کہ کبھی کبھی میرے ساتھ اُن کو بھی ہنس دیے اور بگڑ کر جواب دیتے بعض بڑے صاحب اور بہت کم عمر دوستوں بلکہ کبھی کے شاگردوں تک کا یہ تجربہ ہوا کہ اللہ تعالی نے اُن کو کوئی علمی و قلمی یا جماعتی و تحریکی بڑائی عطا فرما دی، تو اپنی رائے و رنگ کے خلاف بات کا قبول کرنا کیا سننا بھی توجہ سے گوارا نہیں کرتے،

جواب جاہلاں باشد خموشی

کا زبان حال سے اعلان کرتے ہیں، باقی اپنی کسی رائے سے خوشدلی سے رجوع کرتے، یا کسی کوتاہی کا برملا اعتراف و اعتذار اس کا تجربہ تو آج کے مشاہیر علم و قلم سے شاذ ہی ہوتا ہے،

لیکن سید صاحب کی روح ایسے مواقع پر کیسی بے چین ہو جاتی تھی، اس زیر تحریر مضمون ہی کے لئے کچھ پرانے محفوظ خطوط دیکھنے لگا، اُن میں ایک ایسا "معذرت نامہ" ملا کہ آج اُن کی روح عالم آب و گل میں ان جانی

آب آب ہو کر قدموں میں گر جانے کا جی چاہتا تھا، غالباً دارالمصنفین ہی کے کسی معاملہ میں میری نسبت کچھ غلط فہمیاں اُن کو پیدا ہو گئیں اُن سے ایسا متاثر ہوئے کہ خود مدعی علیہ کو صفائی کا موقع دیے بغیر ایک بڑا طویل شکایت نامہ تحریر فرما دیا، ذرا تأثر کے بعد نظر ثانی پر واللہ اعلم کیا محسوس فرمایا، اور کتنے بے قرار ہوئے کہ میرے جواب کا انتظار بھی نہ فرما سکے، معذرت نامہ بھیجیں اُن کی اخلاقی کرامت کا یہ بڑا یادگار "کرامت نامہ" ہے،

"پرسوں اترسوں میں نے آپ کو ایک طویل خط لکھا تھا، مقصود یہ تھا کہ مدت سے میرے دل پہ ایک بوجھ تھا، وہ ہلکا ہو جائے، مگر دیکھتا ہوں کہ اس خط کے لکھنے کے بعد دوسرے قسم کا بوجھ بڑھ گیا، میں نے رات اللہ تعالی سے دعا کی کہ میرے دل میں کسی مسلمان کی طرف سے غبار نہ پیدا ہو، اس وجہ جو کچھ میں نے لکھا تھا، اس کو ایک راز سربستہ کی طرح دفن فرما دیجئے، اور مجھے معاف کیجئے کہ میں گو اپنے جانتے صرف اخلاص سے اور آئندہ کے لئے حسن معاونت کی خاطر لکھا تھا، مگر میرا دل مجھے ملامت کرتا ہے کہ مجھ سے آخر صبر نہ ہو سکا، اب اس کی تلافی یہی ہے کہ آپ مجھے معاف کر دیں، اور میری اس تحریر کو بھی میرے گذشتہ اعمال بد کا ایک جز ہی سمجھ لیں، اس وقت مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں، اس وقت کا احساس یہی ہے، کوشش کروں گا، اور اللہ تعالی سے دعا کروں گا کہ میرا یہی احساس قائم رہے"

اس "می آرم اعتراف گناہ نبودہ" کے بعد بھی "سید القلوب" کو چین نہ آیا، آگے فرماتے ہیں کہ

"میں بے چینی سے آپ کے لطف آمیز و محبت آمیز خط کا انتظار کروں گا، آپ کا یہ بڑا بھائی کم ہمت ہے، اپنی کم ہمتی سے ایسا کر گزرا ہے، اور شاید عمر میں اس کا پہلا قصور ہے، آپ کا بڑا احسان ہوگا، اگر آپ اس تحریر کو نسیاً منسیاً سمجھیں ...... آپ کا مجھ پر بڑا کرم ہوگا"

اب یاد کیا آسکتا ہے کہ اس سراپا کرامت "کرامت نامہ" کا جواب کیا عرض کیا، مگر اپنے نفس کو ٹٹولتا ہوں تو اس کی موافقت سے خیال یہی ہوتا ہے کہ بہت زور لگانے اور تکلف و تصنع سے کام لینے پر بھی جواب میں اُن کی

"بے نفسی" کا مقابلہ ہرگز نہ ہوسکا ہوگا۔ اپنی نالائقیوں اور کوتاہیوں کی معافیاں اُن سے اور دوسروں سے مانگنے کی توفیق الحمد للہ بارہا ملی، اور ملتی رہتی ہے لیکن شکستگی اور فروتنی کے اس بلند مقام تک رسائی چھوٹوں کیا کسی برابر کے مقابلہ میں بھی باوجود سن و سال، علم و فضل، جاہ و مرتبت ہر لحاظ سے بڑے سے بڑے اور استاذ ہو کر اپنے "کم ہمت بڑا بھائی" ہونے کا جس طرح اظہار فرمایا ہے، ذرا کوئی چھوٹا سے چھوٹا بھی یہ ہمت کرکے دیکھے، تو حضرت مرحوم کی قدر و کرامت معلوم ہو۔!

سید صاحب کی "بے نفسی" کا بھی وہ فطری جوہر تھا جس نے اس راقم بے بساط" جیسے کی توجہ دلانے پر علم و فضل کی ساری ندوی" شہرت و عظمت کو ایک "خانقاہ نشین دیوبندی" کے قدموں پہ بے تکلف نثار کر دیا، کچھ غیبی کشش پہلے سے بھی تھی جس کا ایک والا نامہ میں اس طرح اظہار فرمایا کہ

"مولینا گیلانی نے مجھے لکھا ہے کہ سنا آپنے بھی ایک دیوبندی کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا ہے؟ میں لکھنے والا تھا کہ ہاتھ گو اب بھی دیا ہو نہ دیا ہو مگر دل تو اس کو دس بارہ برس پہلے دے چکا تھا پھر مجھے فخر یہ ہے کہ آپ لوگوں نے مولانا تھانوی کو اپنی طرف کھینچا اور مجھے خود مولانا تھانوی نے بارہا اپنی طرف کھینچا۔ (بحالہ رویا)"

اس بیعت و ارادت کی نہ خود حکیم الامت کے ہاں کوئی خاص اہمیت تھی، نہ میں نے کبھی "صلاح نیک" کے سلسلہ میں اس کی طرف کوئی اشارہ کیا، اشارہ و تصریح دو ہی باتوں کی باربار کرتا رہا، ایک تو یہ کہ فہم دین "بھی محض کتابی تعلیم و تعلم سے پیدا نہیں ہوتی، دوسرے یہ کہ بظاہر بڑی سے بڑی خدمتِ دین کا بھی صحیح معنی میں خدمتِ دین یا عنداللہ مقبول ہونا قلب و نیت کی سلامتی کے بغیر مشتبہ ہی رہتا ہے، اور تزکیۂ باطن کی یہ دولت کسی "مزکی" کی صحبت و تربیت کے بغیر میسر آنا الشاذ کالمعدوم ہے۔

سید صاحب ماشاء اللہ علمی و نظری طور پر اس حقیقت کی تصریح و تفصیل کے محتاج نہ تھے، منقولہ بالا والا نامہ ہی میں ہے کہ

میں آپ کا ممنون ہوں کہ مجھے ہر وقت صلاح نیک دیتے رہے، آخر وہ وقت آیا کہ دس بارہ برس سے جو چیز نظری طور سے سمجھ میں آتی تھی، وہ عملاً سمجھ میں آگئی، اور اب تلافی مافات میں مصروف ہوں، لعل اللہ یرزقنی صلاحًا"

اس دوران "صلاح کی صلاح نیک" کا تعلق زیادہ تر عملی قدم اٹھانے ہی کی طرف ملتفت کرنے سے رہا، تھانہ بھون کے دوران حاضری میں قدرۃً اس کا خیال زیادہ ہوتا، جولائی و اگست ۳۰ء کی حاضری میں کچھ طویل قیام کی سعادت حاصل تھی، تو ذرا کھل کر او اصرار سے لکھا کہ بس اب میری اس حاضری کے زمانہ میں ہمت فرما کر ہی جائیں، اصرار کی وجہ خصوصیت کے ساتھ یہ تھی کہ حضرت علیہ الرحمۃ کا سلسلۂ علالت طول پکڑتا جا رہا تھا، ڈر تھا کہ کہیں یہ آفتاب ارشاد و تربیت لب بام نہ ہو، مقامی اور باہر کے علاج اور معالجوں سے کوئی نمایاں نفع نہ ہو رہا تھا، بالآخر علاج کی غرض سے لکھنؤ آنا طے پایا، ۱۰ راگست کو تھانہ بھون سے روانہ ہو کر رات کو سہارنپور میں قیام فرمایا، اور دوسرے دن لکھنؤ تشریف فرما ہو گئے، زندگی میں پہلی اور آخری دفعہ ریل کے ایک ہی ڈبہ بلکہ ایک ہی بنچ پر معیت سفر کی سعادت بھی نصیب ہو گئی، آداب نو کے کتنے اور کیسے کیسے سبق ملے!

سید صاحب کی خدمت میں اس دفعہ میرا عریضہ خاص طور پر تفصیل و اصرار کا ضرور تھا، پھر بھی قبول کی امید کم تھی لیکن قلوب جس کے ہاتھ میں ہیں، اس کو پلٹتے کیا دیر لگتی ہے، تھانہ بھون پہونچ ہی گئے، البتہ ایک دن بعد ذوقِ طلب کو کچھ اور تیز ہونا تھا،

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک ۔۔۔ آتشِ عشق تیز تر گردد

میرے عریضہ کا جواب بھی تھانہ بھون ہوتا ہوا لکھنؤ میں ملا کہ

"لفافہ ملا۔ میں آپ کے حرف حرف سے متفق ہوں، کل صبح انشاء اللہ علی گڑھ کے لئے روانہ ہوتا ہوں، خوشی ہوئی کہ آپ ۲۵ راگست تک وہاں (تھانہ بھون) ہیں، بس گئیں میں انشاء اللہ شاہدرہ لائن ریلوے سے ۱۱ راگست کی شام کو پہنچتا ہوں، دو روز ٹھہرونگا اور بقدر ظرف فائدہ

اٹھاؤں گا۔"

تھانہ بھون میں "مطلوب" کو نہ پا کر سیدھے لکھنؤ کی راہ لی، ایک ہی آنچ کی تو کسر تھی، چار ہی دن میں
رُخ پلٹ گیا، واپسی پر تحریر فرمایا کہ

"لکھنؤ میں چار ہی روز صحبت رہی، مگر مولانا کی شفقت میری عقیدت کو بڑھاتی رہی، اور اب
اُن کی ہدایت کے بموجب، اور آپ کا مشورہ تو پہلے سے یہی تھا، باب مکاتبت وا ہے، اور اب
تو وہی وہ ہیں،

ع آتے ہیں نگاہوں میں خیالوں میں دلوں میں
معانقہ سے بڑھ کر تصور میں مکالمہ تک نوبت آتی ہے۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

"بہرحال اب اپنی طرف سے سفر شروع کر دیا ہے، منزل پر پہنچانا جس کا کام ہے وہ پہنچائے گا
دعا کیجئے......"

مولانا کے مواعظ و رسائل پڑھتا ہوں، اکثر علمی مسائل بھی اپنے ہی مذاق کے مطابق پائے،"
احوال و کیفیات میں اُن سے نئی نئی گرہیں کھلتی ہیں۔ افسوس کہ اتنے دنوں کیوں غافل و محروم رہا"
زیادہ تر یہی افسوس راقم کو بھی اپنے خوردانہ حدود سے تجاوز کر کے بار بار عرض و اصرار کا باعث ہوتا رہا
یہ بے علم و عمل نامہ سیاہ جو ہر تنکے کا سہارا ڈھونڈھتا ہے، اپنے حق میں اس کو رحمتِ حق کا ایک بڑا سہارا
جانتا ہے کہ حضرت مرحوم کی زندگی بھر کی خدمات علم و عمل کو مقبول و مقبول تر بنانے والا انشاء اللہ اُن کی زندگی
کے قلبی انقلاب کا یہی آخری دور یا حسن خاتم ثابت ہوگا،

صد کتاب و صد ورق در نار کن — جان و دل را جانب دلدار کن

کے عالم میں ایک مکتوب میں فرماتے ہیں،

"برادرِ مکرم! میری عمر اب ساٹھ کے قریب آگئی ہے، میں دنیا کو نہ چھوڑوں، دنیا خود
مجھے چھوڑ رہی ہے، اب نہ دارالمصنفین سے زیادہ دلچسپی ہے نہ ندوہ سے اور نہ علمی مقالات و تصانیف
سے، چونکہ میری روزی قلم سے وابستہ ہے، اور گھر میں اثاثہ بھی نہیں، اس لئے ناچار پڑا پھرتا ہوں، خدا
تعالیٰ ہمت دے کہ ترک تعلق کر سکوں، آپ بھی میرے لئے دعا فرمائیں۔"
دارالمصنفین میں تو فکر لوگوں کو اب خالی مصنف بنانے کی نہیں، احقر کی اس بارے میں ایک درخواست کے
جواب میں ارقام ہو کہ

"میں پوری کوشش کر رہا ہوں کہ رفقا میں وہ فضا پیدا ہو جس کی تمنا آپ کو ہے، مگر ظاہر ہے کہ
مجھی میں کیا ہے، جو دوسروں پر اثر ہو، حضرت کی باتیں اُن کو سُناتا ہوں، اور اُن کی تصنیفات کی طرف
متوجہ کرتا ہوں۔"

ہر بہانہ سے حضرت علیہ الرحمۃ کی کتابوں کی طرف رفقاء کو مائل فرمانا چاہتے ہیں، ایک ذرا آزاد مزاج رفیق
ندیم کا ذوق حضرت کی ادبیت کا ذائقہ چکھا کر اس طرح بدلنا چاہتے ہیں کہ اب وہ ادبیت کی تلاش میں اُن (حضرت)
کی تصنیفات پڑھیں گے، اور ممکن نہیں کہ یہ بالواسطہ مطالعہ اُن کے دل کے اندر گھر نہ کر جائے گا کیسے درد دل کی آواز ہے!

"برادرم! صمیم قلب سے دعا کیجئے کہ دارالمصنفین کی یہ چھوٹی سی برادری صراطِ مستقیم کو پا کر اس پر قائم رہے، اور
ہم لوگوں کی عمر بھر کی محنت ہمارے لئے وبالِ آخرت بننے کے بجائے باعثِ برکات و خیرات ہو!"

"یہ چھوٹی سی برادری" حضرت مرحوم کی پوری وفاداری کا حق جب ہی ادا کر سکتی ہے کہ اُن کی سب سے بڑی زندہ یادگار
دارالمصنفین میں ایمان و اخلاص کی وہی روح اپنے تمام نجی تعلقات اور ادارہ کی خدمات میں پیدا کرے جس کے خود حضرت مرحوم
اپنے دہان کے آخری دورِ قیام میں ساعی و متمنی تھے، قلب و باطن کی صلاح و سلامتی کی روح کے بغیر جب خالص دینی
اعمال تک جاہ و مال، ریا و نفاق وغیرہ سے آلودہ ہو کر خالص دنیا طلبی سے زیادہ ناپاک ہو جاتے ہیں، تو پھر علم و قلم کی
ظاہری سے اعلیٰ خدمات بھی اس روح کے بغیر محض دین کی چھاپ لگا دینے سے "وبالِ آخرت" کے سوا کیا بن سکتی ہیں،

اعاذنا اللہ منہ؛

الحمدللہ کہ سید صاحب رحمۃ اللہ کے اس انقلاب حال کی برکت سے دارالمصنفین کے بہت سے حضرات نظری طور پر قلب و قالب دونون کی صلاح و فلاح کی اہمیت سے خوب آشنا ہو چکے ہین، لیکن عملی طور پر نفس و شیطان سے زندگی کی آخری سانس تک بھی مامون و مطمئن نہ ہونا چاہیے، یہ غفلت انتہائی ہلاکت تک پہنچا دے سکتی ہے، ہر عمل و حرکت مین قلب کی نگرانی مرتے دم تک جاری رہنا ضروری ہے، پھر علم و قلم کی خدمت تالیف و تصنیف سے لے کر طباعت و اشاعت تک کے ہر چھوٹے بڑے خادم کے لئے "وبال آخرت" کے بجائے انشاء اللہ تمام تر باعث "خیر و برکت" ہی ہوگی اور خود حضرت مرحوم کی ایسی خیر جاری یادگار جو ان کی روح کے لئے ابدی سرور و سکون کا سرمایہ ہوگی،

سید صاحب "بطنی سید" ہی نہین ماشاء اللہ بڑے "بطنی سعید" تھے، بظاہر اُن کی روزی قلم سے وابستہ "ضرور" رہی، مگر اُنھون نے خالص روزگار بنا کر قلم شاید ہی کبھی چلایا ہو بطنی سعادت ہی کی بدولت علمی کبر و غرور کا بھی کوئی شائبہ ان مین مشکل ہی سے نظر آتا تھا، انتہا یہ کہ راقم الحروف کی علمی خصوصاً علوم دین کی بے بضاعتی سے ناواقف نہ تھے، پھر فن سیرت مین کسی فنی و علمی بصیرت سے اور بھی محروم ہی رہا، چہ جائیکہ خود سید صاحب جیسے اس فن کے مسلم ماہر و محقق کے سامنے، مگر سیرت کی پانچوین جلد نکلنے پر خصوصیت کے ساتھ کیا تحریر فرمایا کہ

"آپنے سیرت کی پانچوین جلد پڑھی بھی، آپ لوگون سے اس لئے نہین پوچھتا کہ تحسین مقصود ہے، بلکہ اس لئے کہ مین محسوس کرون کہ غلط نہین چل رہا ہون، سہارا چاہتا ہون، تعریف نہین؛"

جب تھانوی علم و عمل کی روشنی مین اس بے علم و عمل کی آنکھون پر سے بھی "جہل مرکب" کے کچھ پردے ہٹے تو زندگی ظاہری و باطنی گوناگون علمی و اخلاقی بیماریان علاج طلب نظر آئین، بلکہ "ندویت" اور "روشن خیالی" کے عہد کا ایمانی و اعتقادی اضمحلال بھی سامنے آیا، تو بعض ایسی تحریرین جن کا تعلق کچھ دینی مباحث سے تھا حضرت علیہ الرحمۃ کی خدمت مین اس درخواست کے ساتھ خود ہی پیش کر دین کہ ضلال و اضلال دونون کی ممکن تلافی و تدارک کی ہدایت فرمائی جائے،

سیرت ہی کی تیسری جلد مین معجزات پر میرا ایک مضمون شریک تھا جس مین کوئی بات حضرت کو اصلاح و رجوع کی نظر آئی

اور اس کے اعلان کا ایما فرمایا، میرے نفس نے تو خود الحمدللہ مطلق کشمکش نہین کی، اور معارف مین اشاعت کے لئے سید صاحب کو ایک تحریر بھیج دی،

وہی ایک آنچ کی کسر اپنی اس علمی بے نفسی کے باوجود جس کا اپنا ہی تجربہ ابھی اوپر ہی عرض کر چکا ہون، اس کے شائع کرنے مین لیت و لعل فرماتے رہے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دارالمصنفین خصوصاً سیرت کے علمی و تصنیفی وقار کا اس مین استخفاف محسوس فرما رہے ہین، بالآخر میرے اصرار پہ فرمایا کہ ایسا ہی ہے، تو دوسرے اڈیشن مین نظر ثانی کر لینا، مین نے عرض کیا کہ اس کی نوبت خدا جانے کب آئے، اور حضرت کا منشا فوری اصلاح و اعلان کا معلوم ہوتا ہے، تب بادل ناخواستہ وہ بھی میری خاطر سے شائع فرمایا؛

حضرت کے ہان اہل قلم کا یہ ایک بڑا امتحان ہوا کرتا تھا کہ اپنی قلمی غلطیون یا لغزشون کے اظہار مین نام نہاد علمی وقار شان تو مانع نہین ہوتی، نیز شیخ کے مقابلہ مین اپنی رائے کے فنا کرنے پر کہان تک آمادگی ہے، آج کل کلام مجید کی تحریفی تفسیرون کی جیسی گرم بازاری ہے، خصوصاً سیاست اور معاشیات کے مسائل مین، ایک ایسے ہی شیخ التفسیر اور تفسیری مصنف جو اپنی تربیت و اصلاح کے لئے مکاتبت شروع بھی کر چکے تھے، اس امتحان ہی کے سلسلہ مین نکل بھاگے، عام طور پر تو فنا کو آخر مقام کہا جاتا ہے، لیکن حکیم الامت کی حکیمانہ رائے مین فنا ہی اول مقام تھا، اور تائید مین عارف رومی کا یہ شعر پڑھا کرتے،

ہیچ کس را تا نہ گردد او فنا نیست رہ در بارگاہ کبریا

کوئی عقلمند مریض طبیب معالج کی تشخیص و تجویز کے مقابلہ مین اپنی رائے لگانا اور چلانا چاہے تو اُس کا علاج شروع ہی کیسے ہو سکتا ہے، اور آخر مقام "فنا" ہونے کی حکیمانہ توجیہ یہ فرماتے تھے، کہ اس سے مراد باطنی امراض کا فنا ہونا ہے کہ وہ علاج کے بعد آخر ہی مین فنا ہوتے ہین، بہرحال حضرت کے ہان اس راہ مین مجنون ہونا "شرط اول قدم" تھا،

سید صاحب ایک تو فطری طور پر خود رائی سے بہت دُور تھے، دوسرے اس حقیقت کو خوب سمجھ لیا تھا کہ

شیخ کا مقام نبی کے وارث و "قائم مقام" کا ہے، گو وہ نبی کی طرح معصوم نہیں ہوتا، تاہم اگر علم و عمل، زہد و تقویٰ، فہم و فراست، خوف و خشیت میں اس کا درجہ طالب سے بلند اور بہت بلند ہے، تو لازماً طالب کے مقابلہ میں خطا و لغزش سے محفوظ بھی زیادہ اور بہت زیادہ ہوگا،

جب کسی کو ہم نے اپنے سے علم اور تقویٰ و اصلح جان اور مان لیا، تو پھر اس کی رائے کو اس وقت تک نہ ماننا جب تک خود ہماری رائے کے موافق نہ ہو خود اپنی ہی رائے پر اصرار کے سوا کیا ہے، اسی کا نام خودرائی ہے، ورنہ پھر "مذموم خودرائی" کا مصداق ہی کیا رہتا ہے، حضرت کے نزدیک تو اس خودرائی کا رائی بھر بھی باقی رہنا ایک پہاڑ تھا، پھر دین کے مسائل و معاملات کا تعلق تو بواسطہ یا بلاواسطہ تمام تر عالم غیب کے غیبیات سے ہے، دنیا کے معاملات جن کا تعلق اسی عالم شہادت کے مشاہدات و تجربات سے ہے، ان میں بھی اگر زیادہ علم و بصیرت والے کے مقابلہ میں آدمی کو اپنی ہی رائے پر اڑے رہنے کا حق دے دیا جائے، تو عملاً زندگی کا سارا کارخانہ معطل اور نظم و ضبط درہم برہم ہو کر رہ جائے،

اس ذرا طویل جملہ معترضہ کا مدعا یہ ہے کہ سید صاحب رحمۃ اللہ میں قلب و باطن کے تزکیہ و ترقی کا بڑا قیمتی فطری جوہر ان کی یہی خوبی یہی تھی کہ بڑوں کیا چھوٹوں کی بات کو بھی قبول کرنے کی آمادگی میں جتنا ان کے ظرف کو عالی پایا، اتنا کم ہی کسی کے ظرف کو پایا، بڑی حد تک اسی استعدادی کمال نے ان کو گویا چاہیے کہ مرید ہوتے ہی پیر بنا دیا، اجازت و خلافت کے لئے ان کے پیر کا مسلک یہ تھا کہ خاص صورتوں میں بالفعل کمال کے بجائے متوقع کمال یا قوی استعداد ہی کو کافی تصور فرماتے تھے، اس راہ میں قدم رکھتے ہی حضرت مرحوم جو اس تیزی سے چل پڑے، اس کا بڑا راز یہی تھا کہ شیخ کے مقابلہ میں ان کو خودرائی یا انانیت کی ایک ٹھوکر بھی شاید ہی لگی ہو،

اندازہ فرمائیے کہ کہاں تو سیرت میں خاکسار کے صرف ایک ضمنی باب کی صرف چند سطروں کے رد و بدل ترمیم و تنسیخ میں جھجک تھی، اور کہاں مرشد تھانوی تک پہنچتے ہی ایسے بدلے کہ حضرت کے اشارہ ہی سے اپنی

تصنیفات کے ہزاروں صفحات کی نظر ثانی پر تل گئے، ۱۱ رمضان مبارک ۶۳ھ کے والا نامہ میں فرماتے ہیں،

"اور جب سے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کا ایما ہوا تھا جس سے متعلق اشعار معارف میں چھاپ دیئے ہیں، بخیال غالب، چاہا کہ اپنی تصنیفات پر نظر ثانی کر کے رکھ جاؤں، پھر جب چھپیں، چنانچہ سیرت جلد اول کی پر نظر ثانی آدھی سے زیادہ ہوگئی ہے، اور وہ چھپ بھی رہی ہے"

اس سے[1] بڑھ کر یہ کہ سیرت کا وہی احقر کا حصہ جس کی چند سطروں کے تغیر و تبدل میں تامل تھا، اب اس گرامی نامہ میں اس کی نظر ثانی کی کتنی تاکید پر تاکید ہے، اور کیوں نہ ہو کہ اب تقویٰ کی نظر مصنف اور امت دونوں کی آخرت پر ہے!

"اسی سلسلہ میں سیرت کی تیسری جلد معجزات والی بھی آتی ہے، اس میں جو حصہ آپ کا ہے اس کو آپ کے پاس بھیجتا ہوں، زبانی بھی کہہ چکا ہوں .... آپ مہربانی فرما کر اس پر نظر ثانی فرما کر بھیج دیں، لیت و لعل یا حوالہ غفلت نہ کریں"

آگے یاد رکھنے کی بات اس غفلت سے بچانے کی وجہ ہے کہ "اس میں آپ کا فائدہ ہے، اور امت کا بھی" یعنی آخرت پر نظر کہ مصنف خدانخواستہ اپنے اور امت کے ضلال و اضلال کا باعث نہ بنا رہے،

یہ امت کے سید المصنفین کی خاص تصنیفی و علمی کایا پلٹ کی ایک جھلک تھی، کچھ عام قلبی انقلاب کا بھی نظارہ ہو جائے

---

[1] اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ "مرشد کے ارشاد سے بر ملا بہت سے معتقدات سے رجوع کیا، اور اس خود سپردگی سے کیا کہ سنا جاتا ہے حضرت تھانوی سید صاحب کی اس والہانہ انداز عقیدت پر وجد کیا کرتے تھے"

یہ شہادت صاحب "برہان" مولانا عتیق الرحمن صاحب عثمانی سلمہ نے تازہ برہان (رجب ۷۳ھ) میں ادا فرمائی، راقم ہذا کے علم میں نہ تھی، آگے مولانا سلمہ خود اپنی نسبت لکھتے ہیں کہ "حضرت سید صاحب کی جگہ میں ہوتا تو شاید اتنے بڑے ایثار کے لئے تیار نہ ہوتا" وہ کیا کسی کے لئے بھی اپنے زعم علم سے ایسی دست برداری آسان نہیں! اسی سے تو مرشد تھانوی کے ہاں ان کی اتنی قدر و قیمت تھی!

باطنی انقلاب نمایشی نہیں ہوا کرتا، اس کا اثر سب سے زیادہ ذاتی وخانگی زندگی پر پڑا کرتا ہے...... اچھے اچھے خاندانی علما و مشائخ کو دیکھا کہ اپنی اولاد کے معاملات میں دنیا کے سامنے دین کو بے تکلف نظر انداز کر جاتے ہیں، لڑکی لڑکوں کا رشتہ تلاش کرنے میں بھی نظر دین سے زیادہ کیا کہنا چاہیے کہ تمام تر دنیا ہی پر رہتی ہے لیکن حضرت مرحوم کا دل بدلنے کے ساتھ نظر بھی ایسی بدلی کہ اپنی صاحبزادی سلمہا کی نسبت کی خبر دیتے ہوئے سب سے پہلی خوشخبری یہ سناتے ہیں کہ "آپ یہ سن کر خوش ہوں گے کہ میں اپنی منجھلی لڑکی کی نسبت ایک ایسے نوجوان صالح سے کر رہا ہوں جو حضرت مولانا تھانوی کے متوسلین میں ہیں"، پھر اس سلسلہ میں نکاح و رخصتی وغیرہ سے فراغت اور وطن (دسنہ) سے اعظم گڈھ واپسی کے ارادہ پر ارقام ہے،

"تھانہ بھون کا بھی قصد ہے، حضرت میرے ہر معاملہ حتی کہ ذاتی معاملہ سے بھی خبردار ہیں، یہ میرا جوش محبت ہے کہ والد شفیق کی طرح اُن کو ہر معاملہ لکھے بغیر چین نہیں ملتا"،

حرف حرف راقم نالائق کی ترجمانی فرمادی، اس کا بھی حضرت کی زندگی بھر یہی حال رہا کہ ذاتی وخانگی معاملات کی چھوٹی سے چھوٹی...... باتوں کی بھی اطلاع دیئے بغیر رہا نہیں جاتا تھا، حدیہ کہ ایک مرتبہ مہترانی نے اسٹرائک کر دی تو وہ بھی لکھ بھیجا، پھر جس معاملہ میں جو ایما وارشاد ہوتا تھا، اس کے خلاف ایک قدم اٹھانے کا جی ہی نہ چاہتا، پورے انشراح کے ساتھ اتباع کی توفیق ملتی، اس کا راز بھی سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رازشناس سے معلوم کریں،

"میرا مذاق یہ ہے کہ شیخ وقت قائم مقام نبی ہے، ان امور میں جو مختص بالنبوۃ نہیں"،

سیرت نبوی کے مسلم محقق و ماہر دانا واقف اس سے بڑھ کر "وقت کے قائم مقام نبیؐ" کو پہچاننے کا دعوی کون کر سکتا ہے، یاد رہے کہ مرحوم صرف اپنا شیخ نہیں، شیخ وقت فرما رہے ہیں، پھر تمام ذاتی و خانگی امور تک میں جو اتباعی و دینی وابستگی ہے، اس کی وجہ بیان فرماتے ہیں کہ

"جس طرح نبی کی یہ شان ہے کہ لا یومن احدکم حتی اکون احب الیہ من

والدہ وولدہ ونفسہ[۱] (او کما قال) اس کا عکس شیخ کے ساتھ معاملہ میں بھی ہونا چاہیے" آپ نے حضرت عمرؓ والی روایت خوب لکھی، آپنے کہاں دیکھی[۲]"

اس گرامی نامہ کی پشت پر اپنے اس حال کا کچھ تازہ فال دو غزلیں بھی نقل فرمائی ہیں، ایک کا عنوان "زبان شیخ" ہے، اور دوسری کا "انتظار جواب"، اہل ذوق شریک کیف ہوں،

دل میں کیا کیا آرزوئے دید ہو   مومنوں کو انتظار عید ہے

میکدہ، مسجد میں یاد آیا کیا   روز افزوں نشۂ توحید ہو

حضرت "جامع المجددین" علیہ الرحمۃ کی تجدیدی جامعیت تو ایک دن دوپہر کا واقعہ ہے آج بھی جو چاہے حضرت کے کارناموں کو کتابی صورت میں مطالعہ کرکے خود معلوم کر لے سکتا ہے، پھر بھی بعض قلوب پر "جامع المجددین" کا عنوان گراں تھا، وہ حضرت سید صاحب جیسے دین کے دیدہ ور کی زبان سے اسی غزل میں "خاتم المجددین" ہونے کی شہادت سن لیں،

اس سے پایا رد بدعت نے فروغ   ختم اس پر دورۂ تجدید ہے"

"انتظار جواب" کا پورا لطف اُن کو آئے گا جن کو "خاتم المجددین" کی خدمت میں مکاتبت کی کچھ سعادت حاصل رہی ہے،

دن گنے جاتے ہیں قاصد کیلئے   انتظار نامہ محبوب ہے،

شعر کی شعریت تو شعر و شاعری والے جانیں، لیکن واقعہ کی واقعیت کا اگلا شعر بلفظ دکھاتا ہے کہ مشکل ہی سے کوئی علمی وعملی اشکال یا ظاہری وباطنی مرض کا سوال ہوتا ہوگا، جس کا جواب تیر بہدف "نسخۂ اکسیر"

۱؎ کوئی شخص تم سے ایمان (کا حق ادا کرنے والا) نہ ہوگا، جب تک وہ مجھ کو اپنے والد، اولاد، اور خود اپنی ذات سے زیادہ دوست و محبوب نہ رکھے،

۲؎ یاد نہیں آرہا، کیا روایت تھی، شاید اس کا تعلق نبی کی اتباع و محبت ہی سے رہا ہوگا،

ثابت نہ ہوتا"

نسخۂ اکسیر و داروے شفا — تیرے ہاتھون کا لکھا مکتوب ہو

بقول مولانا دریابادی سلمہ کے بس جی چاہتا تھا کہ لکھنے والے کی انگلیان چوم لے" ایک اور شعر "شرف المجالس" کے بادہ خوارون کے لئے،

مہر ہو یا قہر ہو جو کچھ بھی ہو — ہر ادا محبوب کی محبوب ہے

سب سے آخر کے شعر "من کوئی سالک ہے" کے نیچے اس بدنام کا نام سوالیہ نشان کے ساتھ تحریر ہے،

اندرونِ حلقۂ پیر مغان — کوئی سالک ہے کوئی مجذوب ہے،
(کیا عبد الماجد دریابادی؟)

۲۰ مارچ کو اس میخانہ (تھانہ بھون) میں ایک عشرہ کی سرمستیون کے بعد واپسی کی اطلاع ایک کارڈ پر صرف اس شعر سے فرمائی،

نہ من تنہا درین میخانہ مستم — جنید و شبلی و عطار شد مست

راقم احقر کو "علامہ ندوی" نہین بلکہ "جنید و شبلی" کے "یار میخانہ" کی "مستی" کے کچھ یادگار سبق سنا دینا پیش نظر تھا، یہ نشہ ان کی علمی و تصنیفی زندگی سے لے کر خانگی و ذاتی معاملات تک پر بھی جس درجہ چھا گیا تھا، اس کا ہر سبق مستقل درس ہے، اور سب سے بڑھ کر بڑا درس علم و قلم والون کے لئے،

"علامہ ندوی" نہ صرف عام علوم دین کے علامہ بلکہ فن سیرت کے خاص طور پر وقت کے سب سے بڑے علامہ تھے جن کی "سیرۃ النبی" کا کوئی جواب تو کیا ہوتا، اس کے بعد سے "سید الاولین والآخرین" علیہ التحیۃ والتسلیم کا کوئی چھوٹا بڑا سیرت نگار اس سے مستغنی نہین رہ سکا، اور نہ آیندہ رہ سکتا ہے، پھر سوچنے کی بات ہے کہ "جنید و شبلی" والے "میخانہ" میں پہونچ کر کوئی تو بات اُن کو ایسی ملی کہ اپنے سارے تصنیفی دفتر کے ساتھ اس سیرت تک کو نظر ثانی سے مستغنی نہ پا سکے،

باقی رنج کی زندگی مین تو اس مستی کا رنگ یہان تک دیکھا کہ ایک رفیق کی سالہا سال رفاقت مین لباس اور رہن سہن مین کچھ تکلف و تنعم آ گیا تھا، وہ بھی اب اتنا ختم ہو گیا تھا کہ لاہور مین ایک بڑی محبت والے عزیز شناگرد دوست نے میری دعوت کی، سید صاحب بھی لاہور مین موجود تھے، میری ہی وساطت سے اُن سے درخواست کی، پہلے کی اُن سے کوئی بے تکلفی کیا شاید شناسائی تک نہ تھی، مگر جب وہ لینے آئے، تو جس طرح محض کرتے ٹوپی مین بیٹھے تھے، اسی طرح بے تکلف ساتھ ہو لئے ورنہ عادۃً ایسے مواقع پر صافہ و شروانی پہن لیا کرتے تھے، اور بھی کراچی و لاہور وغیرہ مین اس سے بھی زیادہ تکلف کے مواقع جلسون وغیرہ تک مین اُن کی ذاتی زندگی نمود و نمایش آرایش و زیبایش سے دُور و نفور ہو چکی تھی، بلکہ بعض دوسرے علم و دین کا نام لینے والون مین جاہی و نمایشی عادات و تکلفات دیکھ کر بہت متاسف ہوتے تھے کہ بناؤ سنگار تم کی شان ہے نہ دین کی، پاکستان مین بہت سے شروع شروع مین پہنچ جانے والون کو جہان ملازمت اور معاشی کاروبار وغیرہ کے اموال غنیمت ہاتھ آئے، وہان بعض مولانا ؤن کو "لیڈری" کی دولت ہاتھ لگی، ایسے ہی ایک "مولانا لیڈر" کا بر سبیل تذکرہ کسی سفر مین، رفاقت کا خود اپنا یہ تجربہ نہایت تاسف کے ساتھ بیان فرمایا کہ ریل مین پہلے صبح صبح بعد غسل روزانہ کا لباس تبدیل کر لیتے، تب اسٹیشن پر منتظر استقبال و مشتاق دید مجمع مین نمودار ہوتے، علم و دین کا نام لگا کر وہ تو قطعاً بنفیث الحرکاتی، بڑی شرمناک معلوم ہوتی ہے، علماء کو تو طالب علمانہ وضع ہی زیب دیتی ہے،

بات وہی ہے کہ نفس کا تزکیہ، "وَیُزَکِّیْھِمْ" کتابی تعلیم و تعلم پر بھی مقدم ہے، اور یہ کسی ایسے "مُزکّی" "وارث نبی" کی صحبت و تربیت کے بغیر عملاً ناممکن ہے، جو خود "مزکّٰی" یا تربیت یافتہ نہ ہو، بلا ایسی صحبت و تربیت کے نفس و نفسیات کی بیماریون کا علاج کیا ہو گا، ان کو بیماریان سمجھنے والے ہی نام نہاد علماء و مشائخ تک مین کتنے ہوتے ہین! تعجب کی بات درحقیقت نفس و نفسانیات کا وبائی عموم نہین، بلکہ تزکیہ و تربیت سے غفلت کا عوام ہی نہین خواص تک مین عموم ہے، خالص علمی و دینی ہی نہین، دنیوی و سیاسی خدمت گزارون کے لئے بھی دوسرون کی خدمت سے پہلے اور ساتھ ساتھ خود اپنی اصلاح اور تزکیۂ نفس کی فکر ناگزیر ہے، ون رات کا مشاہدہ ہے کہ

دین و دنیا دونون کے "خیر صالح" "مصلحین کے ہاتھون اصلاح سے کہین زیادہ افساد کی خدمات انجام پا رہی ہین"

دین کی بنیادی حقیقت "یوم دین" یا آخرت کا ایمان و یقین ہے، آخرت کو پیش نظر رکھے بغیر عمل

کے کسی انفرادی کمال یا اصلاحی خدمت کا دین کی میزان مین قطعاً کوئی وزن نہین، "وہان" پوچھ نہ

تہذیب و تمدن کی ترقیون کی ہوگی، نہ حکومت و سیاست کی ہنگامہ آرائیون کی، نہ علوم و فنون کے کمالات

کی، نہ خطابت و مقرری کی زبان آوریون کی، نہ انشا و قلم کی زور آزمائیون کی اور نہ تصنیف و تالیف کے انبار

کی، "وہان" تو ہر ہر فرد کے ظاہر و باطن کے ہر ہر قول و عمل، ہر ہر فکر و نظر، ہر ہر ارادہ و نیت کے متعلق سب

سے پہلے پوچھا اور دیکھا یہ جائے گا کہ اس مین خدا کی رضا و آخرت کا کیا اور کتنا حصہ تھا، وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ

وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا۝

علامہ "سلیمان" کو آخر آخر مین جس فکر و نظر نے "حضرت سلیمان" بنایا، وہ "یہان" کی نہین "وہان" کی فکر

تھی، حقیقت دین کی یہی یافت اُن کی ساری علمی و عملی یادگارون کو قابل یاد بنا سکتی ہے، اس کو بھول کر

اُن کی ہر یادگار اُن کو یاد کرنا نہین "بھلانا" ہوگا، اس یافت کو خود اُن ہی کے اس "یادگار انقلاب" کے سیدھے

سادے دو مصرعون مین یاد رکھین،

ہم ایسے رہے یا کہ ویسے رہے،

"وہان" دیکھنا ہے کہ کیسے رہے،

"وہان" کے ساتھ "یہان" کے لئے بھی جو بات سب سے زیادہ یاد رکھنے کی ہے، آگے ہی وہ بھی سُن لین کہ "کن

فی الدنیا کانک غریب"

حیاتِ دو روزہ کا کیا عیش و غم | سفر کا بھی کیا جیسے تیسے رہے

بس اللہ تعالیٰ اُن کے اس حال و قال کو اُمت کے عوام و خواص کا بھی حال و قال بنا دین، اسی مین

دین و دنیا دونون کا بناؤ ہے، اور یہی اُن کی علمی و عملی زندگی کے آخری انقلاب کا سب سے گراں قدر

سبق ہے،

حال کے کسی صدق مین صاحب صدق "نے ایک بڑی سچی بات کہہ ڈالی" تلخ ہو یا شیرین لیکن در حقیقت

یہی کہ ادھر دس بارہ سال سے سید صاحب "خالص ندوی" نہ رہے تھے، مگر اس "نالائق ندوی" کی سمجھ مین تو ان ہی ۱۰

۱۲ سال مین سید صاحب پورے ندوی "بنے، ندوہ کے اصل بانیون نے علوم دین کا ایک نیا دار العلوم اس لئے ہرگز

نہین کھڑا کیا تھا کہ اس کے علماء کی تقریر و تحریر، خطابت، و صحافت مین زور و کمال پیدا ہو کر ایمان و عمل صالح کی

ظاہری و باطنی زندگی مین ضعف و اضمحلال پیدا ہو جائے، اور دین کا سارا زور سمٹ سمٹا کر زبان و قلم مین رہ جائے

بلکہ ان کا مقصد علم کے ساتھ اعمال کی تحسین بھی تھا،

مرحوم نے اپنی زندگی کے آخری ۱۰، ۱۲ سال مین "ندویت" کی اس خلا و خامی کی تلافی و تدارک فرمایا

ندوی برادری بھی اگر اپنے سب سے بڑے "فخر ندویت" بھائی کے اس یادگار انقلاب باطن سے سبق لے، تو اس

کے علم و قلم کی داد مخلوق سے ملے یا نہ ملے لیکن خالق سے انشاء اللہ بھر پور ملکر رہے گی، دین نام ہی اس باطنی

انقلاب کا ہے کہ ہر چھوٹے بڑے علمی و عملی انفرادی و اجتماعی کام مین نظر مخلوق و دنیا سے ہٹ کر خالق و آخرت

پر ہو جائے، ندوہ کے "سید الطائفہ" نے یہ نظر پیدا کر کے "ندویت" ہی کی تکمیل نہین فرمائی، بلکہ دین کا نام

لے کر سارے قلم چلانے والون کو سب سے بڑا سبق دے کر گئے ہین، اسلام اپنی تعلیمات کی خالی زبان و قلم سے

داد لینے نہین آیا، زبان سے بڑھ کر دلون کو بدلنے یا قالب سے زیادہ قلب کے انقلاب کی دعوت لیکر

آیا ہے، الہ آباد کے عارف اکبر نے زبان و قلم کی اس بیداد پر اپنے رنگ مین کس لطف و خوبی کے ساتھ

متنبہ فرمایا ہے،

داد قرآن کی نہ دو بھائی عمل اس پر کرو

پیش درگاہِ خدا واہ کی حاجت نہین

زبان و قلم سے تو اپنی فاسد تعلیمات کی داد دینے مین اہل باطل بھی، خصوصاً آج کل کے، ہم سے پیچھے نہین

آگے اور اتنے آگے ہیں کہ اس محاذ پر اُن سے بازی لے جانا ناممکن ہی ہے ” اسلام کا اصل محاذ عمل صالح کی زبان کا ہے، جس کے سامنے قلم کی زبان کا کوئی طلسم نہیں ٹھہر سکتا ” اور عمل صالح ” صالح “ جب ہی ہوتا ہے جب کہ اس کا سرچشمہ قلب باطن کی طہارت ہو، اگر قلب صالح و درست نہیں تو پھر عمل صالح کی ہر سعی و سرگرمی فساد ہی فساد ثابت ہوتی ہے، اذا فسد فسد الجسد کلہ ” دلوں کے اس فساد کا آج سے بڑھ کر ہمہ گیر فسادات کی صورت میں دنیا کی تاریخ نے شاید ہی پہلے کبھی ثبوت فراہم کیا ہو،

تسلیم دل بز در سخن نمی شود
این فتح بے شکست میسر نمی شود

———— ……○⁂○…… ————

مولانا عبد الماجد صاحب دریا بادی کا حکم تھا کہ مرحوم کی سیرت کے سلسلہ میں اُن کی طالب علمی کے رنگ ڈھنگ روش کی تفصیل خصوصیت کے ساتھ کروں، اپنی نالائقی اس معاملہ میں اوپر ابتدا ہی میں عرض کر چکا ہوں اتفاق سے اسی زمانہ میں مولوی جواد علی خان صاحب عالی راقم الحروف کے قریب ہی ٹھہرے ہوئے تھے، وہ سید صاحب کے نہ صرف ہم مدرسہ بلکہ بہت بے تکلف ہم درس اور ہم سبق رہے ہیں، قلم میں بھی کچھ قدم ساتھ چلے، پھر:

او بصحرا رفت وما در کوچہا رسوا شدیم

بہرحال مولانا دریا بادی کی فرمائش میں نے اپنے پورے اصرار کے ساتھ خان عالیؔ کی طرف منتقل کر دی کہ وہ پورا حق ادا کر سکیں گے، مگر جواب ان کا بھی اس مضمون کے ختم ہونے پر اس عذر ہی کا آیا کہ مرحوم و مغفور کے متعلق حافظہ کی معذوری سے سوچ بچار کے باوجود کوئی مواد حاصل نہ کر سکا، بجز ان معمولی باتوں کے کہ

” اگر کوئی ہم سبق کبھی سختی سے گفتگو کرتا، تو اس کا جواب نرم الفاظ میں دیتے اور خاموش ہو جاتے، کبھی سخت کلام یا لب و لہجہ سخت نہ ہوتا، درسی کتابوں کی تکرار میں لب و لہجہ زوردار البتہ ہوتا، اور بیان کی قوت روانی سے شرکا کے دل پر متکلم کا رعب بیٹھ جاتا،

” متانت ہر انداز پر غالب رہتی، کبھی ٹھٹھا مار کر ہنستے نہ تھے، بے تکلفی میں ظرافت سے باز نہ آتے، اس میں بھی متانت قائم رہتی، کوئی ناگواری ہوتی تو اس کی غمازی چشم و ابرو ضرور کرتے، مگر زبان پر قابو رہتا “

آپ نے دیکھا کہ نوجوانی اور طالب علمی کے اس چند سطری آئینہ میں خد و خال کی وہی جھلک موجود ہے، جو آگے چل کر پوری سیرت کے قد آدم آئینہ میں اُبھر کر گھر باہر اپنے پرائے سب کے سامنے جلوت و خلوت میں آتی رہی،

اللّٰھم صلّ علیٰ سیدنا محمد و من آلہ علیٰ سیدنا سلیمان بارک وسلّم،

———— ……○⁂○…… ————

گنجِ گرانمایہ

از

پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی

"رشید صاحب نے اس مضمون کا کوئی عنوان نہیں لکھا تھا، اور اس کو میری رائے پر چھوڑ دیا تھا، مجھے اُن کے مجموعہ مضامین گنجہائے گرانمایہ کی مناسبت سے جو انھون نے وفیات پر لکھے ہین، گنج گرانمایہ زیادہ مناسب معلوم ہوا" (م)

سید صاحب سے پہلے پہل اعظم گڈھ مین ملاقات ہوئی تھی، مولینا سُہیل کی معرفت، بہت دن ہوئے، شاید ۲۰ ۲۴ برس، تعطیلون مین تنہا مولینا اور دو عزیز دوستون سے ملنے اعظم گڈھ گیا تھا، سہیل صاحب کو علامہ شبلی مرحوم سے بڑا شغف ہے، شبلی کے سامنے وہ سب کو بے حقیقت سمجھتے ہین، حد یہ ہے کہ کبھی کبھی اپنے آپ کو بھی! کبھی کبھی یون کہ اس بارہ خاص میں مولینا کے بیانات مین اکثر تضاد رہا ہے!!

فرمایا چلیئے تم کو حضرت مرحوم کے جانشین سے ملا لاؤن، مین نے کہا مولانا آپکے ہوتے کون جانشین ہوگیا؟ آپ کی عالی ظرفی ہے کہ آپ کسی اور کو مرحوم کا جانشین مانتے ہین، آپ اپنے حاشیہ نشینون کا ایمان کیون پرکھتے ہین جواب کہ حضرت مرحوم کا صدق دل سے جانشین سمجھتے آئے ہین، اور اس پر یقین رکھتے ہین کہ آپکے بعد نہ حضرت مرحوم کا کوئی جانشین رہے گا، اور نہ خود آپ کا!

مولانا اس پر مسکرائے اس طور پر کہ پان کی پیک جو دہن کے گوشہ سے باہر سرک آئی تھی، اس کو ہاتھ

اس طرح پوچھا کہ اُس کی سُرخی کچھ ڈاڑھی مونچھون پر رہ گئی، اور کچھ ہتھیلی پر آئی، اور وہان سے اس بچے کے کرتے پر منتقل ہوئی جو پہلو مین بیٹھا ہوا تھا، لوگون نے شور مچایا، تو بولے ارے یہ کہان سے آگیا مین تو سمجھ رہا تھا کہ منشی جی مقدمہ کے کاغذات رکھ گئے ہین!!

شام کو مولانا کے ہمراہ شبلی منزل گیا، سید صاحب سے ملاقات ہوئی سہیل صاحب نے تعارف کرایا، شبلی منزل کے اور احباب و بزرگون سے بھی ملاقات ہوئی، سید صاحب بڑی شفقت سے ملے، ابھی لطف و مرحمت کی باتین ختم نہین کی تھین کہ سہیل صاحب نے کوئی ادبی یا فقہی مسئلہ چھیڑ دیا، جسے معارف کے اوراق مین کبھی دیکھ چکے تھے" سید صاحب نے ہان نہین مین بات ٹال دی، شبلی منزل مین کسی اور کی ہمت نہ ہوئی کہ مولانا سے الجھے، مولانا کو دلائل سے زیر کرنا ناممکن تھا، طالب علمی مین ہم سب کا طریقہ یہ تھا کہ بحث کی آخری منزل پر پہنچتے پہنچتے مولانا سے زبردستی کچھ رقم لے کر چل دیئے، اور مولینا کسی اور سے بحث کرنے کسی اور طرف چلے گئے!!

اس دن کے بعد سے آخر زمانہ تک جب وہ پاکستان تشریف لے گئے، اور پھر جوار رحمت مین پہنچ گئے، سید صاحب سے ملنے اور اُن کی محبت و مروت سے بہرہ مند ہونے کے بے شمار مواقع ملے، علی گڈھ آنا ہوتا، تو ہمیشہ میرے ہان قیام کرتے، میرا، میرے بچون کا، میرے عزیز دوستون کا بڑا خیال کرتے تھے، اتنا خیال کہ کبھی کبھی مین اپنے سے شرمندہ ہونے لگتا، یونیورسٹی کورٹ کا معرکہ کا کوئی جلسہ ہونے والا ہوتا تو عمائد قوم کا اچھا خاصہ اجتماع ہو جاتا، ایسے مواقع پر یونیورسٹی کے طلبہ یونین مین کوئی مباحثہ یا مشاعرہ منعقد کرتے، علی گڈھ مین اکابر شعرا مجتمع ہو جاتے وہ ایک دن بڑی رونق کے گذرتے، میرے ہان مختلف الخیال حضرات یکجا ہو جاتے مثلاً سید صاحب، اصغر صاحب ذاکر صاحب، مولینا عبد الماجد صاحب، سید الطاف حسین صاحب، ان مین کچھ ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم کی حمایت مین تشریف لاتے تھے، کچھ ذاکر صاحب کا ساتھ دینے کے لئے،

میرے ہان وہ مسائل نہین چھیڑے جاتے تھے، جو کورٹ مین پیش ہونے والے ہوتے، اس لئے کہ شریک ہونے والون مین کوئی ایسا نہ تھا، جو پہلے سے رائے قائم نہ کر چکا ہوتا تھا، اس وقت کورٹ کا یہی رنگ تھا،"

دو دو مختلف گروہوں میں بٹ گئی تھی، البتہ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب کا کوئی عزیز قریب یا حکومت کا
کوئی بڑا عہدہ دار زیادہ سرگرمی دکھانے کے لئے مرحوم کی حمایت میں بحث کرنے آجاتا، یہ موقع بڑا پر لطف ہوتا تھا
ذاکر صاحب بھی موجود ہوتے تھے، اور ڈاکٹر صاحب کے حامیوں کے دلائل اس سنجیدگی اور ہمدردی سے سنتے، اور
کہیں کہیں ہمت افزائی کے طور پر ایسا لقمہ دے جاتے کہ بولنے والا اور بڑھ بڑھ کر باتیں کرنے لگتا، ڈاکٹر صاحب
مرحوم کے سمجھدار ساتھی بڑی دقت میں مبتلا ہوجاتے، اور چاہتے کہ یہ بحث کسی نہ کسی طرح ختم ہوجائے،

سید صاحب کا مسلم یونیورسٹی سے برابر بڑا اور گہرا تعلق رہا، جہاں تک میرا خیال ہے مرحوم ۲۳-۱۹۲۲ء سے علیگڈھ
آنے جانے لگے تھے، کورٹ کے مسلسل ممبر رہنے کے علاوہ مرحوم ان کمیٹیوں اور شعبوں کے ممبر منتخب یا مقرر ہوتے رہے
جو علوم شرقیہ یا مذہبی اور ادبی مسائل سے متعلق ہوتے، یہ سلسلہ تقسیم ملک تک قائم رہا، تقسیم کے پہلے یونیورسٹی پر طرح
طرح کے دور آئے، سید صاحب کسی نہ کسی حیثیت سے برابر ارباب یونیورسٹی کے شریک کار رہے، اور اکثر اہم مواقع
پر سید صاحب کی اصابت رائے سے یونیورسٹی کو بڑا فائدہ پہنچا،

سید صاحب اور مولانا سلیمان اشرف صاحب ہم وطن تھے، دونوں کے سیاسی معتقدات جداگانہ تھے
بعض مذہبی امور میں بھی ذہنی یگانگت نہ تھی، مولانا سلیمان اشرف صاحب بڑے ٹھٹے کے آدمی تھے جس کے بارے
میں جو خیال رکھتے تھے، اس کا اظہار برملا کرتے تھے، اور کوئی جھگڑا آن پڑے تو مزاحمت کرنے پر مشکل ہی سے آمادہ کئے
جاسکتے تھے، علامہ شبلی مرحوم کے کچھ زیادہ قائل نہ تھے، دارالمصنفین کے بھی کچھ ایسے معترف نہ تھے، جس کسی کو اپنی طبیعت کا
نہیں پاتے تھے، نہ اس کے قریب جاتے تھے، نہ اسے قریب آنے دیتے تھے،

لیکن سید صاحب جب کبھی علی گڈھ آتے تو مولانا سلیمان اشرف صاحب کے ہاں ضرور جاتے، دونوں
ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوتے، اور نہایت خلوص اور بے تکلفی سے گفتگو کرتے، اور میں جانتا ہوں کہ
اس میں اس کا مطلق کوئی دخل نہ تھا کہ سید صاحب سلیمان اشرف کے ہم وطن یا دارالمصنفین کے کرتا دھرتا تھے
یا ملک میں اُن کی بڑی مان دان تھی، ان دونوں بزرگوں کے باہمی خوشگوار تعلقات کا موجب ایک طرح پر مولانا

ابوبکر محمد شیث فاروقی صاحب جونپوری ناظم دینیات تھے، جن کے سید سلیمان صاحب سے بڑے پرانے اور مخلصانہ تعلقات
تھے، اور خود مولانا سلیمان اشرف صاحب مولانا ابوبکر صاحب کی بڑی عزت کرتے تھے، اور ان سے بڑی محبت
سے پیش آتے تھے،

سید صاحب کا مزاج مولانا سلیمان اشرف کے مزاج سے بالکل مختلف تھا، سید صاحب کو کوئی مشتعل
نہیں کرسکتا تھا، وہ کسی حال میں برہم یا بے اختیار نہیں ہوتے تھے، سید صاحب خود علامہ شبلی سے طبعاً مختلف تھے
میں نے علامہ شبلی مرحوم کو نہیں دیکھا لیکن اُن کی تصانیف پڑھی ہیں، جن لوگوں نے ان کو قریب سے دیکھا تھا، ان
سے ملا ہوں، خود شبلی پر جو کچھ لکھا گیا، اُس سے بھی تھوڑا بہت آشنا ہوں، علامہ شبلی جتنے ذہین اور جذباتی تھے
(ذہین اکثر جذباتی ہوتے ہیں) شعر کہنے اور پرکھنے کا جیسا ملکہ ان میں تھا، اُن کی شاعری، اُن کی نثر
اُن کے خطوط سب میں "حسن طبیعت" اور "سوز دروں" کی جیسی دل آویز مثالیں ملتی ہیں، اور دنیوی معاملات میں جس
سوجھ بوجھ سے وہ کام لیتے پائے گئے تھے، سید صاحب ان سب سے عاری تھے،

سید صاحب کی جس بات کا میں گرویدہ تھا وہ ان کا علمی تبحر ہی نہیں، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ علمی دیانت
بھی تھی، وہ کبھی علم کو کسی ادنیٰ مقصد کے حصول کے لئے کام میں نہیں لاتے تھے، علم نہایت ہی خطرناک چیز ہے
کم ذی علم ایسے پائے گئے ہیں جنہوں نے علم سے لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے ساتھ ہی نقصان نہ پہنچایا ہو، جس کی
ایک مثال مذہب کا غلط استعمال ہے، میں بطور کلیہ تو کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن اپنی ہوش کی زندگی میں اب تک یہی
دیکھتا آیا ہوں کہ جہاں کہیں لوگوں کو اپنے ادنیٰ مقاصد میں کامیابی نظر نہ آئی، انہوں نے مذہب کو آڑ بنالیا، اور
پھر جو آفتیں نازل ہوتی ہیں، وہ سب جانتے ہیں، میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ علم، مذہب اور آزادی باوجود بہترین نعمت
ہونے کے نااہل سوسائٹی میں بڑے خطرناک عناصر ہیں،

بات کہاں پہنچی کہنا یہ شروع کیا تھا کہ سید صاحب کا علم کیا تھا، اور کیسا تھا، وہ علم ہی سے واقف نہ تھے
علم کی بزرگی کا بھی احساس رکھتے تھے، اور اس کو کبھی ہاتھ سے نہ دیتے، اکثر ایسے عالم دیکھے گئے ہیں، جو صرف

علم کا بیوپار یا بیوپار کرنا جانتے ہیں، علم کا مفہوم میرے نزدیک جاننا پہچاننا ہی نہیں، جاننے پہچاننے کی ذمہ داری بھی ہے، جب تک کوئی معلم علم کی برگزیدگی کو ماننے اور منوانے کی اہمیت نہ رکھتا ہو، اس کو علم کا کاروبار نہ کرنا چاہیئے، آج کل دنیا میں جو جہل، افراتفری یا بے دلی، اور بیزاری پھیلی ہوئی ہے، اس کا ایک بڑا سبب میرے نزدیک یہ بھی ہے کہ علوم اور ان علوم کو پھیلانے کے وسائل تو بہت بڑھ گئے ہیں لیکن اچھے معلم تقریباً ناپید ہیں جس کی وجہ سے علم اور زیادہ خطرناک بن گیا ہے، دنیا میں ہر مرض کی تیر بہدف دوائیں کیوں نہ ایجاد کر دی گئی ہوں اگر اچھے اطبا میسر نہ ہوں تو یہ دوائیں خطرہ کا موجب بن سکتی ہیں، یہی حال علوم کا ہے!

سید صاحب جن علوم سے بہرہ مند تھے، ان پر ان کی نظر پیشہ ورانہ نہ تھی محرمانہ تھی، وہ محض فنی اصول پر کسی مسئلہ کو ناپ تول کر ختم نہیں کر دیتے تھے، بلکہ اس کی کوشش کرتے تھے، کہ اس مسئلہ کے رد یا قبول میں دماغ اور دل دونوں متفق ہو جائیں، سید صاحب نے اسلامی عقائد اور اسلامی مسائل سے (خواہ وہ معاش سے متعلق ہوں یا معاد سے) طرح طرح سے بحث کی ہے لیکن مجھے کوئی ایسا موقع نہ ملا جہاں یہ محسوس ہوا ہو کہ مصنف نے اپنی بات دھوکے ڈھنگ سے یا خطابت اور شاعری کے زور سے یا منطق اور فلسفہ کا چکر دے کر یا جلی کٹی سنا کر یا رو پیٹ کر منوانے کی کوشش کی ہو جیسا کہ بعض نام کے مولوی اور اشتراکی بالعموم کیا کرتے ہیں، سید صاحب نے ہمیشہ بات متانت اور دیانت سے کہی نپی تلی کہی، اور اس طرح کہی اور اس لئے کہی کہ ان کو ایک بیش بہا بات معلوم ہوئی تھی، جس پر انھوں نے بڑی محنت قابلیت اور دقت صرف کیا تھا، اور چاہتے تھے کہ اسے ان لوگوں تک پہنچائیں، جو اس سے فائدہ اٹھا سکتے تھے، علم و معلم سے یہی تقاضا ہے!

سید صاحب کی تصانیف میں سے جس تصنیف نے مجھے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ ان کے خطبات مدراس ہیں، میرا خیال ہے کہ شاید سب سے پہلے میں نے ہی سید صاحب کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ ان خطبات کا اچھی انگریزی میں ترجمہ ہو جائے، تو بہت مفید ہوگا، سید صاحب نے اس تجویز کو پسند کیا تھا، بعض عزیز دوستوں نے اس پر کچھ کام کرنا شروع بھی کر دیا تھا، لیکن پھر کیا ہوا مجھے اس کا علم نہیں، مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے

کہ اسلامی عقائد اور شعائر سے متعلق اتنی اچھی اور مختصر کتاب شاید اسلامی ممالک میں بھی نہیں لکھی گئی ہے، یہی نہیں بلکہ اکثر یہ خیال بھی ہوتا ہے کہ اسلام اور اسلامیات سے متعلق جتنی مفید اور معیاری تصانیف ہندوستان کے مسلمان ارباب فکر و نظر نے پیش کی ہیں، اسلامی ممالک میں اس پایہ کی کتابیں شاید نہیں تصنیف ہوئی ہیں، دور جانے کی ضرورت نہیں، صرف دارالمصنفین اعظم گڈھ کی گذشتہ چالیس سال کی مطبوعات کا جائزہ لیا جائے، تو اس بات کا آسانی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے، یہ گمان اور قوی ہو جاتا ہے، جب ہم اس امر کو بھی مد نظر رکھیں کہ دارالمصنفین جیسے چھوٹے بڑے ادارے ہندوستان میں اور بھی ہیں!

یہاں ایک واقعہ یاد آ گیا۔ دس بارہ سال ہوئے یا شاید اس سے بھی زیادہ، ایک بار سید صاحب سے اس مسئلہ پر گفتگو آئی کہ مذہبی، اخلاقی اور ذہنی اعتبار سے ہندوستان کے مسلمانوں کا ہندوستان سے باہر کے مسلمانوں سے موازنہ کیا جائے، تو کیا نتیجہ نکلے گا، سید صاحب نے بتایا کہ تینوں اعتبار سے ہندوستان کے مسلمانوں کا پایہ باہر کے مسلمانوں سے بلند ملے گا، اثنائے گفتگو میں یہ بھی فرمایا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہئے، باہر کے مسلمانوں کی عام حالت بحیثیت مجموعی ایسی نہیں ہے کہ جس پر یہاں کے مسلمان بھروسہ یا ان کے رہن سہن اور طور طریقوں کی تقلید کریں۔

خیام کے بارے میں مغربی مصنفین نے جو کچھ لکھا تھا اور اُن کی دیکھا دیکھی یا سنی سنائی ہم ہندوستانی جو کچھ کہنے لگے تھے، وہ میرے پیش نظر تھا، لیکن خیام پر سید صاحب کی تصنیف سامنے آئی تو دل باغ باغ ہو گیا کہ معرکہ کی ایک تصنیف اردو میں دیکھنے میں آئی، جو کسی زبان کے بڑے سے بڑے تحقیقی کارناموں کے ساتھ رکھی جا سکتی ہے، اس کتاب کی تصنیف میں سید صاحب کے حیرت انگیز طالب علمانہ شغف، مورخانہ ژرف نگاہی، ادبی پرکھ اور عالمانہ بصیرت کا پورے طور پر اندازہ کیا جا سکتا ہے، معمولی سے معمولی دعوی کو مستند سے مستند ماخذوں سے مستحکم کیا ہے، ماخذات کے لئے کس کس بے کنار صحرا و سنسان اور دشوار گذار جنگل اور گھاٹیوں سے گذرنا پڑا ہوگا تب کہیں جا کر کسی رہرو کے نقش قدم ملے ہوں گے، اور جادہ و منزل کے متعین کرنے کا امکان پیدا ہوا ہوگا، معلوم نہیں

اس تصنیف پر سید صاحب کو گیا دا دبی حکومت سے، قوم سے یا کسی اکیڈمی سے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسی ملک کی بڑی سے بڑی یونیورسٹی یا اکیڈمی سید صاحب کو اس کتاب پر بڑے فخر اور خوشی سے اعلیٰ علمی ڈگری دے سکتی ہے!

سید صاحب کو اپنے استاد علامہ شبلی مرحوم سے بڑی عقیدت تھی، سیرت شبلی لکھ کر سید صاحب نے اس کا حق بھی ادا کر دیا ہے، اس کتاب میں جہاں کوئی کمی ملتی ہے وہ سید صاحب کے فنی شعور کی کوتاہی کے سبب اتنی نہیں، ہے جتنی اس شغف کے بنا پر ہے، جو ایک نہایت درجہ شریف اور سعید شاگرد کو اپنے شفیق اور محترم استاد سے ہو سکتا ہے، یہ وہ مقام ہے جہاں مصنف اپنے ہیرو میں کوئی خامی دیکھنا نہیں چاہتا، یہ بات ٹھیک ہو یا نہیں سمجھ میں آسانی سے آجاتی ہے!

باوصف اس عقیدت کے سید صاحب کی شخصیت اور ان کا "اسلوب تحریر" بھی شبلی سے مختلف ہے، شبلی کے قلم میں بڑی رعنائی اور برنائی ہے تخئیل میں رنگینی اور جذبہ میں حرارت اور تململاہٹ ملتی ہے، جذباتی اور تخئیلی فنون کے یہ خاص صفات ہیں، یہ صفات فنون لطیفہ کے لئے جتنے کارآمد ہو سکتے ہیں، تاریخ تحقیق یا تنقید کے لئے نہیں! شبلی کی طرح سید صاحب کو بھی تاریخ سے بڑا لگاؤ تھا، بہت زیادہ لگاؤ، کوئی مسئلہ ہو سید صاحب اس کے موجود کو اس کے ماضی میں تلاش کئے اور پرکھے بغیر نہیں رہتے تھے، سید صاحب کی کسی قسم کی تحریر ہو تاریخ کے حوالے اس میں ضرور ملیں گے، اور شاید یہ اسی کا فیضان تھا کہ واقعہ کچھ ہو شخصیت کسی کی ہو سید صاحب کا قلم کترو بغیر چلتا تھا، اپنے ہی راستہ پر، اور اپنی ہی رفتار سے! جس میں ثابت قدمی اور ہمواری ملتی ہے،

سید صاحب تاریخی دیانت و امانت کا اس درجہ لحاظ کرتے تھے کہ ان کو اپنی تصانیف میں شاعری کرنے کی بہت کم فرصت یا مواقع ملتے تھے، وہ تحقیق اور تنقید میں جتنی احتیاط برتتے تھے، اور محنت کرتے تھے اتنی ہی مطالعہ کرنے والے کے جذبات یا تخئیل کو بے ضرورت مہمیز کرنے سے پرہیز کرتے تھے، تصانیف میں شبلی کا انداز مشرقی ہے، سید صاحب کا مغربی، دونوں کی ادبی شخصیت میں بھی یہ امتیاز نمایاں ہے بحیثیت طالب علم میں شبلی سے متاثر ہوا اور بحیثیت معلم سید صاحب سے!

یہاں سید صاحب کی تصانیف اور مقالات پر تبصرہ مقصود نہیں ہے، یہ کام بڑا طویل اور مشکل ہے اور ایک آدمی کے بس کا ہے بھی نہیں. کہنا یہ ہے کہ علمی تدقیقات کے جدید طور طریقوں سے ناآشنا ہونے کے باوجود ان کے آداب سید صاحب اپنی تصانیف میں بڑی خوبی اور پابندی سے ملحوظ رکھتے تھے، کتنے مستند حوالے کہاں کہاں سے فراہم کرتے تھے، اور تقسیم ابواب اور ترتیب مضامین میں کس سلیقہ سے کام لیتے تھے کہ معمولی سے معمولی طالب علم بھی پوری تحقیقات سے پورے طور پر آشنا ہو جاتا تھا،

سید صاحب کا حافظہ بڑا قوی اور ذہن بڑا مرتب تھا، ان کے ذہن میں تنقیحات بڑی واضح اور مکمل ہوتی تھیں، کام کی باتیں ضخیم سے ضخیم کتاب اور پیچیدہ سے پیچیدہ بحث سے بہت جلد اخذ کر لیتے تھے، اور ان کو ان کا صحیح مقام دینے میں خاص ملکہ رکھتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنے ذخیرہ معلومات کی ذہنی فہرست اتنی ہی واضح اور مکمل رکھتے ہوں، جتنی کسی اچھی لائبریری کی فہرست کتب جو جدید ترین اصولوں پر مرتب کی گئی ہو، میں نے سید صاحب کو مطالعہ کرتے یا کتاب لکھتے نہیں دیکھا ہے لیکن ان کی تصانیف پڑھنے اور ان سے بعض مسائل پر گفتگو کرنے سے جن باتوں کا اندازہ لگا سکا ہوں، وہ بیان کر دی ہیں، ممکن ہے استنباط نتائج میں مجھ سے غلطی سرزد ہوئی ہو!

حسب نسب، علم و فضل، اخلاق و عادات، خدمت ملک و ملت کے اعتبار سے سید صاحب کا درجہ بہت اونچا اور پورے طور پر مسلم ہے، جہاں تک میری معلومات ہیں، سید صاحب کی تعلیم و تربیت پرانے طریقوں پر پرانے استادوں، اور بزرگوں کے سایۂ شفقت اور پرانی فضاؤں میں ہوئی تھی، جدید علوم و فنون سے براہ راست انھوں نے کسی سے استفادہ نہیں کیا تھا، لیکن نئے افکار اور نئے طور طریقوں سے انھوں نے اپنے آپ کو اس خوبی اور خاموشی سے آشنا کر لیا تھا کہ وہ کہیں اجنبی نہیں معلوم ہوتے تھے، چاہے وہ اہل علم کا حلقہ ہو، چاہے ارباب سیاست کی مجلس، خواہ طالب علموں کی جماعت ہو، خواہ عامۃ الناس کا اجتماع، جدید افکار اور رجحانات سے کوئی کتنا ہی آشنا کیوں نہ ہوتا، سید صاحب سے تبادلہ خیال کرنے میں اسے کبھی یہ محسوس ہوتا

کہ وہ ایک ایسے شخص سے گفتگو کر رہا ہے جس کی معلومات روایتی ہیں، یا جس کا ذہن بندھے ٹکے خانوں میں اسیر ہو،
جس کے فکر و نظر کا دائرہ تنگ ہے۔ علی گڑھ میں جدید ترین افکار و اطوار سے مسلح اور مرصع نوجوانوں کو میں نے
دیکھا کہ خالص علمی اور ذہنی سطح پر مولٰنا کی ہم سری نہ کر سکتے تھے، اور ہمیشہ یہ ہوا کہ وہ سید صاحب سے کچھ سیکھ کر
ہی واپس گئے،

نوجوانوں کے ذہنی رجحانات کے بارے میں ایک بار سید صاحب سے مفصل گفتگو آئی تھی، فرماتے تھے کہ عربی
فارسی ماخذات پر عام نوجوان طالب علموں کو عبور نہیں، ان ماخذات سے متفرق، ناکمل باتیں جو یورپ میں تصانیف
میں نظر آجاتی ہیں، وہ اُن کو غلط راستہ پر لگا دیتی ہیں۔ یہ نوجوان ذہین اور اپنے افکار کے اعتبار سے مخلص ہوتے
ہیں، یہ قیاس صحیح نہیں ہے کہ وہ طبعاً دین کی باتوں سے بیزار اور تاریخ و روایات سے بیگانہ ہوتے ہیں لیکن
اس کو کیا کیا جائے کہ ان کو صحیح ماخذ، صحیح مفہوم اور صحیح سیاق و سباق بتانے والا کوئی نہیں، بات کچھ اور آگے بڑھی
تو فرمانے لگے، اس صورتِ حال کی ذمہ دار ایک تاریخی حقیقت بھی ہے،

بات یہ ہے کہ صلیبی محاربات نے مغرب میں مسلمانوں کے خلاف ہر طرح کی قوتوں کو ابھارا، سیاسی، اعتقادی
اور اخلاقی اعتبار سے یورپ میں تا حال مسلمانوں کو جس جس طرح مطعون و مغلوب کیا گیا، وہ کوئی چھپی ہوئی بات
نہیں ہے، اس کے ساتھ ساتھ یورپ کے اہلِ فکر و نظر بالخصوص وہ جن کی ذہنی افتاد مذہبی تھی، انھوں نے اسلامی
تصانیف سے جہاں تہاں سے ایسے اقتباسات لئے جو اُن کے تبلیغی تصنیفی پروگرام کے لئے مفید تھے، ہر ملک میں
علوم کی ابتدائی تاریخ تقریباً یکساں رہی ہے، یعنی مذہبی طبقہ تصنیف و تبلیغ کا اجارہ دار رہا ہے، اور بعض مصنفین
کا یہ طبقہ اکثر دانستہ اور کبھی کبھی نادانستہ طور پر اپنی غرض کو زیادہ پیشِ نظر رکھتا ہے حقیقت کو کم، پھر کچھ بتلاتے
رہے کہ کس طرح کے اقتباسات کہاں سے لے کر کس طرح کے فتنے اٹھائے جا سکتے ہیں، یا اٹھائے گئے ہیں، اور
انگریزی سلطنت اور انگریزی زبان کے عروج کے ساتھ یہ غلط بیانیاں کہاں کہاں پہنچیں، اور کیا رنگ لائیں،
ایک بار کسی کمیٹی یا شعبہ کی میٹنگ میں شرکت کرنے تشریف لائے تھے، یونیورسٹی اسٹاف کلب کے ممبران نے

سید صاحب سے درخواست کی کہ موصوف کلب میں تشریف لاکر کسی موضوع پر تقریر فرمائیں، اسٹاف کلب اس
طرح کی فرمایش کسی سے بہت کم کرتا ہے، تقریر کا موضوع غالباً فنِ تاریخ پر مسلمانوں کا احسان یا اس سے
ملتا جلتا کوئی اور موضوع تھا، سید صاحب نے سوا گھنٹے سے اوپر تقریر فرمائی، وہ لوگ جن کو اس موضوع سے خاص
ذوق تھا، بیان کرتے تھے کہ سید صاحب کی نظر اس موضوع پر جتنی وسیع اور واضح ہے، اور جتنے متنوع اور مستند
ماخذ سید صاحب کے علم میں ہیں، اتنے شاید ہی کسی اور کے علم میں ہوں، جس طرح بچے آٹوگراف لینے مشاہیر پر گرتے ہیں،
اسی طرح سید صاحب سے لوگوں نے ماخذات نوٹ کئے،

سید صاحب تقریر کرنے میں چہرہ باندھنے یعنی تمہید اٹھانے یا کسی نہ کسی معذرت کے بیان کرنے میں مطلق
وقت نہ صرف کرتے جیسا کہ عام طور پر پیشہ ور مقرروں کا دستور ہے، کچھ گلے اور سینے کی تکالیف، کچھ سفر کی صعوبت
کچھ ملک و ملت کی ابتری یا اپنی نااہلی کا تذکرہ کیا، اس کے بعد تقریر شروع کی۔ سید صاحب کبھی اس طرح
کی باتیں نہ کرتے، اپنی جگہ سے اُٹھے تقریر کرنے کی جگہ پر آ کھڑے ہوئے، سلام علیکم کہا، مذہبی موضوع ہوا تو بسم اللہ
پڑھی، کلام پاک کی کوئی آیت نہایت سادگی اور احترام سے تلاوت فرمائی، اور تقریر شروع کر دی،

آواز میں اتار چڑھاؤ نہ ہوتا، چہرے پر جذبات کی دھوپ چھاؤں نہ طاری ہونے دیتے، ہاتھ پاؤں نہ
پٹختے، نہ پھینکتے، کوئی بلند یا بلیغ فقرہ کہہ کر اس کے متوقع نہ رہتے کہ حاضرین سے شورِ تحسین اٹھے، جیسا کہ اکثر لوگ
کرتے ہیں، باتیں بڑی واضح کہتے، الفاظ و عبارت کی دھوم دھام نہ ہوتی، البتہ کبھی کبھی ایک آدھ فقرے
رعایت لفظی کے ساتھ کہہ جاتے لیکن یہ رعایت لفظی صرف تفریح ہی نہ ہوتی، بلکہ اس کے پیچھے کوئی بھید ہوتا، سید
صاحب جس بات کو چھپا کر اجاگر کرنا چاہتے تھے، یا اجاگر کو چھپا کر کہنا چاہتے تھے، وہاں اس طرح کی مناسبات
لفظی سے کام لیتے، سید صاحب کو رعایت لفظی سے تفریح ضرور ہوتی، بے تکلف اور مخلص لوگوں کی صحبت میں
تھوڑی دیر تک ضلع جگت کا التزام رہتا، یہ مشغلہ رعایات اور مناسبات سے بھی بڑھنے لگتا، تو اور زیادہ
محظوظ ہوتے!

سید صاحب تقریر کرنے میں کہیں اٹکتے نہ تھے۔ اچھے سے اچھے مقرر بھی کبھی کبھی جملہ میں مبتدا اور خبر کو مربوط نہیں کر پاتے تو ذرا دیر اٹکتے الجھتے ہیں، سید صاحب کی تقریروں میں شاید کبھی کوئی ایسا موقع آیا ہو، ایسا معلوم ہوتا جیسے پوری تقریر قلم بند ہو جسے وہ اطمینان و اعتماد سے دہراتے جا رہے ہوں، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ سید صاحب کی تقریر کیسے ختم ہوئی کیسی تو لمبی تقریر کرتے تھے، تقریر کے کچھ ایسے ماہر بھی نہ تھے لیکن تعجب یہ ہے کہ اُن کی تقریر سے دل اکتاتا نہ تھا، ہر مجمع میں کچھ نہ کچھ ایسے بے فکرے ضرور ہوتے ہیں، جو زیادہ دیر تک خاموش اور سنجیدہ نہیں بیٹھ سکتے، کوئی جادو بیان مقرر ہو اور موضوع دلچسپ تو مجمع دیر تک خاموش رہ سکتا ہے، اور لطف اندوز بھی ہوتا ہے لیکن سید صاحب یقیناً مقرروں کے اس زمرہ میں نہیں آتے تھے جن کو جادو بیان تو کیا غیر معمولی بھی کہا جا سکے، وہ تقریر کے فن و فسون سے بے نیاز تھے لیکن اُن کی باتوں میں اثر ہوتا تھا، اور ذہن کے کسی نہ کسی حصہ میں اتر جاتی تھیں۔

ان تقریروں میں بڑا خلوص بڑا وزن اور بڑی سادگی ہوتی تھی، سننے والوں کو اس پر اعتماد ہوتا کہ سید صاحب کوئی ایسی بات نہ کہیں گے جس کے ثبوت میں قوی سے قوی سند نہ پیش کر سکتے ہوں، سید صاحب سے اختلاف کرنا بڑا مشکل تھا خواہ معاملہ علمی ہو یا اجتماعی ہو، وہ بڑی جچی تلی اور شریفانہ رائے دیتے تھے، مجھے تقریر سننے کا بالکل شوق نہیں لیکن بعض لوگوں کی تقریر ضرور سنتا ہوں اس لئے کہ اس کا یقین ہوتا ہے کہ یہ کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور کہیں گے جس سے میں فائدہ اٹھاؤں گا، ان میں سے سید صاحب ایک تھے۔!

مذہب کی بات ہو یا سیاست کی، علمی مسائل ہوں، یا کوئی اور بحث، سید صاحب بڑی سنجیدگی سے اظہار خیال کرتے تھے، اور دوسروں کا نقطۂ نظر سننے میں بڑے تحمل سے کام لیتے تھے، بحث میں وہ کبھی جز بز نہ ہوتے، بلند آواز سے گفتگو نہ کرتے، کسی کی بات نہیں کاٹتے تھے، کوئی چبھتی فقرہ یا دل آزاری کی بات نہ کہتے، گفتگو میں کوئی کتنا ہی ناواجب لب و لہجہ کیوں نہ اختیار کرتا، سید صاحب کے رکھ رکھاؤ میں ذرا فرق نہ آتا تھا،

سید صاحب کا تعلق دارالمصنفین سے تقریباً ۳۰-۳۲ سال تک رہا، ان کی قیادت میں اس ادارہ کا پایہ علمی اور کارگزاری کے اعتبار سے بڑا شاندار رہا، مجھے یقین نہیں ہے کہ مستقبل قریب میں دارالمصنفین کو یہ درجہ حاصل ہو سکے گا

کیوں اور کیسے سید صاحب نے کچھ دنوں کے لئے دارالمصنفین سے علیحدہ ہو کر بھوپال میں ملازمت کر لی، جو بات سید صاحب خود ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے، اس کو اُن کے سامنے میں کسی شکل میں نہیں چھیڑتا تھا، نہ اس ٹوہ میں رہتا کہ کیا ہوا اور کیوں ہوا، میرا یہ رویہ سید صاحب ہی کے ساتھ نہیں اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ بھی تمام عمر رہا تا وقتیکہ مجھے اس کا یقین نہ ہو جاتا کہ وہ اپنی دشواری میرے سامنے اس لئے نہیں پیش کرتے تھے کہ اُن کے خیال میں اس سے میری زحمات میں اضافہ ہونے کا امکان تھا، ایسی صورت میں اُن کے فکر و پریشانی کا پتہ لگانے کی ضرور کوشش کرتا ہوں،

سید صاحب بھوپال تشریف لے گئے تو وہاں سے ایک خط لکھا جس میں اس کا بالکل تذکرہ نہیں کیا تھا کہ انہوں نے دارالمصنفین کیوں چھوڑا، اور بھوپال کی ملازمت اختیار کرنے کا باعث کیا ہوا، بلکہ کچھ اس طرح کی باتیں تھیں کہ بھوپال میں وقت کس طرح کٹتا تھا، کام کرنے کے امکانات کیا تھے، آیندہ کا پروگرام کیا ہوگا، وغیرہ البتہ یہ بات ظاہر ہوتی تھی کہ بھوپال میں زیادہ دن قیام کرنے کا ارادہ نہ تھا،

بہت عرصہ ہوا میں نے ایک بار سید صاحب سے عرض کیا تھا، کہ وہ کسی طرح علی گڑھ آجائیں، جہاں اُن کی بڑی ضرورت تھی، پھر جب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب وائس چانسلر ہو کر علی گڑھ تشریف لائے تو موصوف بھی اس کے کوشاں ہوئے کہ سید صاحب علی گڑھ آجائیں لیکن یہ وہ زمانہ تھا، جب سید صاحب ارادہ کر چکے تھے کہ وہ پاکستان ضرور جائیں گے،

بھوپال کے قیام کے دوران میں میں نے عرض کیا تھا کہ جس طرح یا جس لئے سید صاحب نے اپنی پوری زندگی دارالمصنفین کے لئے وقف کر دی تھی، وہ مسلّم ہے لیکن مسلم یونیورسٹی میں رہ کر کام کرنا اور اس کی شہرت میں اضافہ کرنا، اس نصب العین کے خلاف نہ تھا، جو اُن کے سامنے تھا، کام کی نوعیت دونوں جگہ تقریباً یکساں تھی، علی گڑھ میں قیام کا مزید فائدہ یہ تھا کہ نوجوان طلبہ اُن کی تصنیف ہی سے نہیں اُن کی شخصیت سے بھی بہرہ مند ہوتے۔

ملک کی فضا ان دنوں کچھ ایسی ہو رہی تھی کہ سید صاحب کا بھوپال میں زیادہ دنوں تک قیام نہیں ہو سکتا تھا، میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ جب "میکدہ چھٹا تو پھر ہرج کیا مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو"! لیکن سید صاحب نہ مانے، یوں تو ہوتا وہی ہے جو اللہ کی مرضی ہوتی ہے لیکن یہ بات دل میں بار بار آتی رہی کہ سید صاحب مستقل علی گڑھ

آگے ہوتے تو بحیثیت مجموعی اس سے بہتر ہوتا جو بعد میں پیش آیا !

سید صاحب بڑے سمجھدار شریف اور محبت کرنے والے انسان تھے، اُن کی خدمت و خاطر کرنے میں مجھے بڑی لذت اور بڑائی محسوس ہوتی تھی، کسی ذاتی معاملہ میں میرا ان کا کبھی سابقہ نہ ہوا، ہوتا تو مجھے اپنے اوپر تو اعتماد نہیں لیکن سید صاحب کے بارہ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ میری خاطر وہ سب کر ڈالتے جو شاید اپنے لئے نہ کرتے، سید صاحب اپنی بڑائی اشارۃً یا صراحۃً کبھی نہیں بیان کرتے تھے، اور دل کھول کر کسی اور کی بڑائی بھی کم ہی کرتے تھے!

فطرۃً سید صاحب خاموش، قناعت پسند اور عافیت جو تھے، وہ اپنے بچوں اور ساتھیوں کے ساتھ ہنس بول لینے میں زندگی کی تفریح پا لیتے تھے، اور خوش ہونے کے لئے کسی بڑی تقریب کے منتظر رہتے تھے، چھوٹی خوشیوں میں بڑی خوشیاں ڈھونڈھ لیتے اور پا لیتے، یہ بہت بڑی صفت اور نعمت ہے اور بہت کم لوگوں کے حصہ میں آتی ہے، میں نے اکثر یہ بھی محسوس کیا جیسے سید صاحب کسی قدر حزین رہتے ہوں، کیوں اور کیسے یہ نہیں بتا سکتا، یہ میں نے کبھی اُن سے پوچھا بھی نہیں لیکن یہ حزن ان میں طبعی نہ تھا، اس لئے کہ جب کبھی ملول نہ ہوتے تو صاف معلوم ہوتا کہ طبعاً شگفتہ مزاج ہیں، سید صاحب کے ہنسنے کا انداز ایسا تھا اور اس آسانی سے وہ ہنس پڑتے تھے کہ اُن کو کوئی الم پرست، خشک مزاج، یا کلم آمیز نہیں کہہ سکتا تھا، ممکن ہے یہ زندگی کے آخری دور کے تغیرات کا نتیجہ ہو، مذہب کا بیوپار کرنے والوں سے میں ذرا کم ہی یا واللہ رکھتا ہوں، ایسے لوگوں کو میں نے بالعموم احساس کمتری کا شکار پایا، اور یہ احساس انسان کے خصائل کو ایسا مسخ و ماؤف کر دیتا ہے کہ شرافت و شجاعت، درگذر، دردمندی اور اس طرح کی دوسری انسانی صفات جو مذہب و اخلاق کی روح میں اکثر ان لوگوں میں نہیں پائی جاتی ہیں، جو اپنے آپ کو مذہب کا اجارہ دار سمجھتے ہیں، اور ان اخلاقی خرابیوں میں ان کو مبتلا پایا، جن سے مذہب نے روکا ہے،

میرے ذہن میں اکثر یہ بات آتی ہے کہ مذہب بالخصوص اسلام جیسے مذہب کی پیروی کے لئے جس احساس ذمہ داری اور احترام انسانیت کی ضرورت ہے وہ ایسے لوگ کیسے پورا کر سکتے ہیں جو زندگی کی نہایت درجہ معمولی

ذمہ داریوں کو بھی سمجھنے اور نباہنے کی توفیق نہیں رکھتے، دنیا و عقبیٰ زمان و مکان کے اعتبار سے کتنے ہی مختلف ہوں لیکن یہ دونوں انسانی زندگی ہی کے دو رُخ ہیں اور انسان کے نتائج اعمال ہی کا نام عقبیٰ ہے، اس لئے ایک مسلمان کے لئے دنیا کا مرحلہ عقبیٰ سے بھی زیادہ سخت ہے، اور جو شخص دنیاوی ذمہ داریوں سے خوش اسلوبی سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا، وہ عقبیٰ میں بھی کامیاب نہیں ہو سکتا،

اس بحث کو میں پھیلانا نہیں چاہتا کہنا صرف یہ چاہتا تھا کہ ادھر کچھ عرصہ سے ہمارے طبقہ میں جس حال کو نفع یا نمود کی کہیں گنجایش نہیں نکلتی وہ اس مقصد کے لئے مذہب کو آلہ بنا کر ملک و ملت کا محسن بن جاتا ہے، سید صاحب کس درجہ مذہبی آدمی تھے لیکن کس طرح ان باتوں سے دور تھے، اس کا خیال کرتا ہوں تو اُس کی یاد سے دل تر و تازہ اور روح بالیدہ ہو جاتی ہے،

مذہب کے معاملہ میں سید صاحب کا رویہ نہایت شریفانہ، دانشمندانہ اور عالمانہ ہوتا، اُن کی ذاتی قومی تصنیفی، مذہبی زندگی اس پر گواہ ہے، کہ انھوں نے اسلام اور اسلامی زندگی کی حفاظت و حرمت میں اپنی بہترین صلاحیتیں بے دریغ صرف کیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے جہاں تک بن پڑا، مذہب کو خود غرض لوگوں کے ہاتھوں میں کھلونا بننے نہیں دیا، مجھے جس بات پر سب سے زیادہ حیرت ہوتی ہے، اور اسی اعتبار سے سید صاحب کی وقعت بڑھ جاتی ہے، وہ یہ کہ باوجود اس کے کہ سید صاحب کی تعلیم و تربیت کسی ماڈرن یونیورسٹی میں نہیں ہوئی تھی، بلکہ کلیتہً قدیم طور طریقوں پر ہوئی تھی مگر وہ یونیورسٹی کے مقصد، معیار اور وقار کا کتنا احترام کرتے تھے[1] تفصیلات میں جانا نزاکت سے خالی نہیں لیکن اتنا کہنے میں مضائقہ بھی نہیں کہ انھوں نے اکثر مواقع پر یونیورسٹی اور اس کے خدمت گذاروں کی آبرو بڑی دلیری اور قابلیت سے بچائی !

یونیورسٹی میں رہ بس جانے کے سبب سے میں نے مسلمانوں کی گذشتہ ۲۰-۲۵ سال کی سیاسی اور مذہبی سرگرمیوں کا مشاہدہ بڑے اطمینان سے کیا ہے، اطمینان سے یوں کہ مجھے ازل سے ایمان عقل آرٹ وغیرہ

---

[1] دارالمصنفین تشریف لانے سے پہلے سید صاحب دکن کالج پونا میں پروفیسر تھے۔

کا جو حصہ ارزانی ہوا تھا، وہ ذرا واجبی ہی تھا، اس لیے کوئی تحریک یا تہلکہ کہیں اٹھتا کیا انھی اٹھتا، وہ اپنے بہرہ کو بچائے رکھنے کی فکر کرتا تھا، یعنی نہ ان تحریکوں اور تہلکوں سے کبھی آنکھ مچولی کی، نہ زور آزمائی، نتیجہ یہ ہوا کہ صحت آبرو سب بحال رہے، میرا خیال یہ ہے کہ قومی تحریکوں میں بیشتر سیاست دانوں نے عوام علما اور طلبا کو آنکھ بند کرکے اور جی کھول کر اپنے اغراض کے لئے استعمال کیا، پھر یہ ہوا کہ پانسہ پلٹا اور عوام علما، اور طلبا کے بھی دن پھرے، اب انھوں نے سیاست دانوں کی خبر لینی شروع کر دی ہے اور کا مجھے علم نہیں لیکن ہندوستان اور پاکستان میں یہی دیکھنے میں آرہا ہے کہیں کم کہیں زیادہ،

سید صاحب نے شروع سے سیاست میں حصہ لیا، اور جنگ بلقان سے لیکر تقسیم ہندوستان تک ہر کی سیاسی اور قومی تحریکوں کی نیچ اونچ میں شریک رہے، کم خوش نصیب ایسے ہوں گے جنھوں نے سید صاحب کی طرح سیاست میں مسلسل حصہ لیا ہو اور سیاست کی آلائشوں سے پاک رہے ہوں، سیاست کے وسیلے کسی منصب پر پہنچنے کے کبھی درپے نہ ہوئے، انھوں نے اپنے لئے جو بلند سطح پہلے دن اختیار کر لی تھی، اسی پر آخر دم تک قائم رہے، یہ سید صاحب کا بہت بڑا کارنامہ ہے، انھوں نے تمام عمر رائے عامہ کو صحیح تربیت دی، محض صرف کی معمولی طریق پر نہیں، بلکہ اپنی بلند پایہ تصانیف اور تقریر سے اور اپنی سیرت کی پختگی، اور پاکیزگی سے، سید صاحب ہماری قومی زندگی میں کس درجہ دخیل رہے ہیں، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے، اس کے ساتھ یہ کتنی بڑی بات ہے کہ اس قبیلہ سے تعلق رکھتے ہوئے جس سے وہ تعلق رکھتے تھے، سید صاحب کی تحریر، تقریر یا تصنیف سے کوئی فتنہ نہیں کھڑا ہوا،

کچھ عرصہ سے سید صاحب نے وفیات کے عنوان سے معارف کے صفحات پر اہم شناسا شخصیتوں کی وفات کا تذکرہ تفصیل سے لکھنا شروع کر دیا تھا، یہ مضامین ہر اعتبار سے بڑے مفید اور اہم ہوتے تھے، اور ہر حلقہ میں بڑی وقعت کی نظر سے دیکھے گئے، سید صاحب کو تاریخ اور سیرت میں جیسی بصیرت تھی، اس کی بڑی اچھی جھلک ان تحریروں میں ملتی ہے کس حسن ترتیب اور تفصیل سے ان مرحومین کے زندگی کے واضح نقوش ان صفحات پر کھنچے ہوئے

نظر آتے ہیں!

ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مرنے والوں کے سوانح زندگی کو سید صاحب کسی بیاض میں بڑی پابندی اور احتیاط سے قلم بند کرتے رہے ہوں، اور وقت آنے پر اُن کو معارف میں نقل کر دیتے ہوں، سید صاحب میں یہ بات مجھے نہایت غیر معمولی نظر آئی، یعنی اُن کا حافظہ کتنا قوی اور کس درجہ مرتب تھا کہ ہر سال کے واقعات بقید سال و ماہ و مقام بے تکلف اس طرح لکھتے جاتے، جیسے اُن کے سامنے وقوع میں آرہے ہوں، میں یہ اسلیے کہہ رہا ہوں کہ مجھے اس کا یقین ہے کہ مرنے والے کا وہ بہی کھاتہ نہ رکھتے ہوں گے، بلکہ ساری باتیں اُن کے حافظے میں جیتی جاگتی محفوظ ہوں گی!

ان مضامین کے لکھنے میں سید صاحب بہت زیادہ احتیاط ملحوظ رکھتے تھے، بہت کم ایسا ہوا ہے جہاں وہ موزخانہ حدود سے بے اختیارانہ تاثرات کے حدود میں چلے گئے ہوں، ان مضامین کے بارہ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں سید صاحب وہ فضا نہیں پیدا کر سکے، یا پیدا نہیں ہونے دیتے تھے، جس کے بغیر یہ مضامین اتنے موثر نہیں ہوتے، جتنا ہونا چاہیئے، اور جس کا اس طرح کے مضامین تقاضا بھی کرتے ہیں، اس نوعیت کے مضامین کی حیثیت تاریخی دستاویز کی اتنی نہیں ہوتی، جتنی ایک طرح کی نذر عقیدت کی، تاریخی دستاویز میں ذاتی تاثرات کا دخل نہ ہونا چاہیئے، لیکن جہاں ایک اعتبار سے نذر عقیدت پیش کی جارہی ہو، وہاں ذاتی تاثرات کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے، ان مضامین کو جہاں تاریخی دستاویز ہوکر نہ رہ جانا چاہیئے، وہاں خالص شاعری یا نری ہیں دبکا بھی نہ ہونا چاہیے، یہ تاریخ اور شاعری کے درمیان کی ایک چیز ہے، جو تاریخ نہ ہونے کے باوجود تاریخ کی جگہ لے سکتی ہے، اور شاعری نہ ہونے کے باوجود شاعری کے تقاضے پورا کرتی ہے،

یہاں میں ایک بار پھر اپنی عقیدت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ سید صاحب کا حافظہ کتنا قوی ذہن کتنا مرتب، تاریخی احساس کتنا بیدار اپنے اور بےگانوں سے تعلقات کتنے شریفانہ اور ان کی شخصیت انسانیت کا کیسا اچھا نمونہ تھی کہ وہ اتنے پاکیزہ اور متوازن مضامین وفیات کے تحت لکھتے تھے!

ایک زمانہ سید صاحب پر ایسا آیا، جب ان پر دواماندگی سی طاری رہنے لگی تھی، ذہنی اور جسمانی دونون اس زمانہ مین علی گڈھ وہ بہت کم تشریف لائے۔ علی گڈھ سے باہر بھی کبھی ملاقات ہوئی، تو مین نے ان کو تھکا تھکا سا پایا، غالباً یہی دور تھا جب وہ حضرت مولٰنا اشرف علی صاحب مرحوم ومغفور کے آستانہ مبارک پر اکثر حاضر ہوتے تھے، حضرت مرحوم سے شیفتگی بے اندازہ بڑھ گئی تھی، زیادہ وقت اوراد وظائف اور عزلت مین گزرنے لگا تھا، ممکن ہے یہی یا اس کے آس پاس کا وہ زمانہ بھی رہا ہو جب سید صاحب کو دل کی تکلیف ہوئی تھی، یہ بھی یاد آتا ہے کہ یہ زمانہ مسلمانون کی اجتماعی زندگی مین بڑے انتشار کا تھا، مجھے سید صاحب کے اس رجحان سے بڑا تردد ہوا، مین نے ایک موقع پر سید صاحب کو غالباً انہی کا ایک فقرہ یاد دلایا تھا کہ آپ کیا کر رہے ہیں، جب جہاد کی صف کو مرتب اور مضبوط کرنے کا وقت آیا تو آپ خانقاہ کی آبادی بڑھانے لگے،

سید صاحب میرے اس طرح کے فقرون یا خطوط کا جواب نہین دیتے تھے، دوستون اور عزیزون سے اُن کی خیریت دریافت کرتا تو یہی معلوم ہوتا کہ بے دلی اور افسردگی کا وہی عالم ہے، پھر خط لکھتا، کبھی کبھی لہجہ خشن بھی ہو جاتا، لیکن سید صاحب کے ہان سے کوئی جواب نہ آتا، ایک دفعہ علی گڈھ آگئے، طبیعت بحال تھی، میرا جی چاہا کہ اپنے پچھلے خطوط کی یاد دلاؤن، سید صاحب نے خود اس قصہ کو چھیڑا، مین نے اپنے رویہ کی معافی مانگی، کہنے لگے نہین نہین، باتین سب ٹھیک تھین، لیکن آپ کو کیا معلوم کہ مجھ پر کیا عالم گذرا، پھر مسکرا کر فرمایا

"دیوانگی ہم عالمے دارد"!

مین بھی ہنس پڑا اور سید صاحب کو کسی قدر شگفتہ پا کر عرض کیا، سید صاحب ایک بات آپ سے کہے بغیر نہ رہون گا وہ یہ کہ جو لوگ آپ کے منصب کو پہنچ چکے ہین، اُن پر کچھ ہی کیون نہ گذر جائے، وہ کسی حال مین اپنی پسپائی کا اظہار یا اعلان میرے جیسے گئے گذرے لوگون کی طرح اور اُن کے سامنے نہین کر سکتے، آپ کو تو ایسی جگہ کھڑا رہنا ہو جہان آپ کی اُمت آپ کو کھڑا دیکھنا چاہتی ہو! سوال یہ نہین ہو کہ آپ پر کیا گذرے گی، سوال یہ ہو کہ آپ کی اُمت کدھر جائے گی، سید صاحب نے بات ہنسی مین ٹال دی،

شکل صورت، وضع قطع، چال ڈھال، بات چیت ہر اعتبار سے سید صاحب کی شخصیت بڑی دل آویز اور قابل احترام تھی، اُن کو دیکھ اور پا کر ایک طرح کی تقویت محسوس ہوتی تھی کہ وہ شفقت کرین گے، رسوا نہ کرین گے، اُن کے ساتھ رہین گے، زندگی مین بڑائی اور حلاوت محسوس ہوگی، جیسے وہ اپنی طرح طرح کی ذمہ داریون کا احساس رکھتے ہین، اپنی ہی نہین، ہماری ذمہ داریون کا بھی احساس، وہ ہمیشہ صاف ستھرے رہتے تھے، ظاہری اور باطنی دونون اعتبار سے،

لباس، بستر، ساز وسامان صاف ستھرا، اور سجل رکھتے تھے، اور ہر ایک مین کوئی نہ کوئی نفاست بھی ہوتی، بستر بند کبھی پھٹا میلا کچیلا تڑا مڑا نہ ہوتا، ہینڈ بیگ چمڑے کا پرانا لیکن ستھرا اور پالش کیا ہوا، تکیہ کا غلاف اور چادر نہایت صاف، اوڑھنے بچھانے کا سامان آرام دہ اور خوشنما، لوٹا گلاس، ناشتہ دان صابون دان سب منجھا ہوا، تولیہ لمبا چوڑا دبیز اور بہت صاف دھلا ہوا، سفر کتنا ہی مختصر ہو، بکس مین پہننے اوڑھنے بچھانے کا کافی سامان رکھتے تھے، کلام پاک اور اوراد وظائف کی کتاب بڑے ستھرے اور خوبصورت جزدان مین ہوتی، عبادت ہمیشہ چھپ کر کرتے، جس کے مہمان ہوتے، اس کے لئے تحفہ ضرور لیجاتے، تشریف لاتے تو نام بنام سب کی خیریت پوچھتے، اور چونکہ وہ میرے ہی دیار سے آئے ہوتے، اس لئے میرے تمام دوستون، عزیزون اور بزرگون کی خیریت سناتے، کسی کا پیغام سناتے، کسی کا تحفہ اور کسی کی فرمایش پہنچاتے، فرمایش ساتھ کر دیجاتی، تو بڑی خوشی کے ساتھ لاتے، اور بڑی حفاظت سے پہنچا دیتے!

سفر مین نوکر ہمراہ نہ ہوتا، ہر کام خود کر لیا کرتے تھے، جہان ٹھہرتے وہان ہر شخص ہر خدمت کے لئے حاضر رہتا، مین نے یا تو ہمیشہ سپید عمامہ مین دیکھا، یا نجی صحبت مین سفید دوپلیہ ٹوپی مین جو مجھے سید صاحب پر خاص طور سے بڑی دلکش نظر آتی، کپڑا ہمیشہ بہت اچھا سلا ہوا پہنتے، اور دوسرے تیسرے ہی دن شاید بدل دیتے تھے، مین نے سید صاحب کے جسم پر میلا تو درکنار کبھی ملگجا لباس بھی نہین دیکھا، موزہ بالعموم پہنتے، جو ہمیشہ صاف وثابت ہوتا، رومال نہایت صاف رکھتے تھے، اور بہت جلد بدل دیتے تھے،

کھانا بڑے سلیقہ سے کھاتے تھے، اور دسترخوان کے آداب اس خوبی اور نفاست سے برتتے تھے کہ دل خوش ہو جاتا تھا، جو چیز جتنی چمچے میں آجاتی، اتنی ہی پلیٹ میں رکھ لیتے، کھانا کتنا ہی لذیذ یا ان کا مرغوب کیوں نہ ہوتا، بہت تھوڑا ہی، جی چاہتا تو تھوڑا سا دوسری بار بھی لے لیتے، جو چیز پسند آجاتی، اس کی بڑے شگفتہ اور شریفانہ انداز سے تعریف کرتے، دسترخوان پر زیادہ سے زیادہ آدمیوں کو مخاطب کرکے نرم لہجہ میں لطف و محبت کی باتیں کرتے، جن دوستوں نے شبلی منزل کی صحبتیں اور وہاں کی مہمان نوازی دیکھی ہے، وہ جانتے ہوں گے کہ دسترخوان پر سید صاحب کا رکھ رکھاؤ کوئی نئی یا تعجب کی بات نہ تھی!

سید صاحب میں ایک خوبی ایسی تھی جس کی میں دل سے قدر کرتا ہوں یعنی مہمان ہو کر وہ میزبان کے ارادے غصب کرکے اپنی ضیافت و حکم برداری میں نہیں لے لیتے تھے، جیسا کہ اکثر نہایت درجہ سرگرم اور مخلص مہمان کیا کرتے ہیں یعنی خود ہر کھانا میزبان کے سامنے پیش کرنا، اور اصرار کرنا کہ وہ ضرور کھائے اور نہ کھائے تو وجہ بتائے، اور وجہ بتائے تو یہ تعزیت کا رزولیشن پاس کریں، یا کوئی جرمانہ تجویز کریں!!

اس طرح کی باتیں بیان کرنا ضروری نہ تھا، لیکن میں کسی آدمی کی سیرت اور شخصیت کا اس سے بھی اندازہ لگاتا ہوں کہ وہ میزبان یا مہمان کی ذمہ داریوں سے کس طرح عہدہ برآ ہوتا ہے اور کس حد تک دسترخوان کے آداب ملحوظ رکھتا ہے، میں اپنے مہمانوں سے خواہ ان میں محترم خواتین ہی کیوں نہ ہوں، حتی الوسع اصرار نہیں کرتا کہ وہ فلاں چیز ضرور کھائیں، یا کتنی کھائیں، کھانا سامنے ہے، اور انہی کے لئے ہے، بڑے شوق اور اخلاص سے پیش کیا جا رہا ہے، اب اگر وہ اس درجہ شرمیلے شاندار اور سادہ لوح واقع ہوئے ہیں کہ بغیر قول قسم یا منت سماجت کے کچھ نہیں کھانا چاہتے، تو ذمہ داری اُن کی ہے، میری نہیں، میں مہمان کا خیر مقدم کرتا ہوں، اس لئے کہ میں اُس کی طرح طرح سے خدمت اور خاطر کروں گا، اور اپنے طور پر اپنے لئے خوش ہوں گا اس لئے کہ مہمان کو کھانا کھلانے سے ثواب ملتا ہے، اور عاقبت سنورتی ہے!

میں سمجھتا ہوں کہ ہم میں بہت کم لوگ ایسے ہیں خواہ وہ کتنے ہی پڑھے لکھے یا ملک و ملت میں مقتدر کیوں نہ

ہوں جو دسترخوان کے آداب سے واقف ہوں اور اُن کو برت سکتے ہوں، کھانے پر کھانے سے یا کھانے والوں کے ساتھ تکلف، بے جا تکلف یا بے تکلفی برتنا بڑی کم سمجھی کی بات ہے جس کو لوگ بے تکلفی سمجھتے ہیں، وہ بڑا نازک مرحلہ ہے، اس نزاکت کو سمجھنا اور نباہنا بڑا مشکل کام ہے، بے تکلفی کا تعلق فن سے نہیں تہذیب سے ہے! کھیل میں کھانے پر اور سفر میں ہر شخص کا عیب و ہنر کھل جاتا ہے، خواہ وہ اس کے چھپانے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرے، میں نے سید صاحب کو میزبان اور مہمان دونوں حیثیتوں سے برتا ہے، اور دونوں اعتبار سے وہ میری میزان پر پورے اُترے ہیں، سید صاحب کی جو بڑائی میرے دل میں ہے، اس میں سید صاحب کی اس خوبی کا خاصہ اونچا درجہ ہے!

سید صاحب نے دارالمصنفین کا کام غالباً ۱۹۱۵ء میں سنبھالا، اس وقت سے لیکر تقسیم ملک تک کم و بیش ۳۲ سال وہ اس ادارہ میں یا یہ ادارہ سید صاحب میں اس طرح گھلے ملے رہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے تمیز کرنا مشکل تھا، دارالمصنفین کا خیال کیجئے تو ذہن فی الفور سید صاحب کی طرف منتقل ہوتا تھا، اور سید صاحب کو دیکھئے تو دارالمصنفین سامنے آجاتا تھا، کسی ادارہ کی روایت و شخصیت اسی طرح وجود میں آتی اور برگ و بار لاتی ہے،

شبلی منزل ایک خالص علمی ادارہ ہونے کے علاوہ زندگی کی بہت سی دوسری اعلیٰ و صحت مند سرگرمیوں کا بھی گہوارہ تھا، کتنے دانایانِ سیاست، اربابِ فضیلت، اور شیدائیانِ شعر و ادب وہاں سے نسبت رکھنا اپنے لئے ایک امتیاز سمجھتے تھے، جن دوستوں کو شبلی منزل میں قیام کا اتفاق ہوا ہے، اور جنہوں نے وہاں کی مدارات و مہمان نوازی رفقا کا آپس کا میل محبت اور کام کرنے کا شغف دیکھا ہے، وہ بتا سکیں گے کہ اعظم گڈھ کا یہ مختصر سا خطہ جو کسی طرح ایک اوسط درجہ کے باغ کے رقبہ سے زیادہ نہیں ہے، شمالی ہند کی روایتی تہذیب و دانش و بینش کی نہ صرف نمائندگی کرتا رہا، بلکہ اس میں خاطر خواہ اضافے کرتا رہا!

کوئی مہمان عزیز آجاتا تو دارالمصنفین کے سارے لوگ ایک دسترخوان پر کھانا کھاتے، کھانے متنوع اور بہت اچھے پکے ہوئے، نیچے پایہ کی ہموار اور یکساں چوکیوں پر نہایت تکلف سے اعلیٰ درجہ کا سفید دسترخوان بچھایا جاتا جس پر بڑے خوبصورت اور ستھرے برتنوں میں یہ کھانے چنے جاتے، لوگ حسب مراتب قالین اور چاندنی پر

چوکیوں کے گرد بیٹھ جاتے، سید صاحب میزبانی کے فرائض انجام دیتے، یہ تقریب اور اس طرح کی تقریب محض کھانے پینے کی نہ ہوتی، بلکہ اس سے آدمی کی بہت سی ذہنی گتھیاں سلجھ جاتیں، اور زندگی کی جد وجہد میں حصہ لینے کا حوصلہ پیدا ہو جاتا !

مل جل کر بیٹھنے کھانے پینے اور بات چیت کرنے کے فوائد کا اندازہ بہت کم لوگ کر سکتے ہیں، علی گڑھ کی جن خصوصیات اور خوبیوں کو متفقہ طور پر سراہا گیا ہے، ان کو بروئے کار لانے میں علی گڈہ کی اس روایت کو بڑا دخل ہے کہ یہاں ساتھ کھانا کھانے اور دسترخوان کے پورے آداب برتنے کا خاص طور پر التزام رکھا جاتا ہے !

رات میں میرے ہاں جب کھانا ختم ہو لیتا اور سید صاحب کے معتقدین اپنے گھروں کو چلے جاتے تو بعض مسائل پر اطمینان سے دیر تک گفتگو ہوتی، کوئی اور نہ ہوتا، اس لئے سید صاحب سے بات کرنے میں میں ذرا بے تکلفی و بے باکی کو بھی دخل دے جاتا، سید صاحب بڑی توجہ سے تمام باتیں سنتے، کبھی کبھی کوئی فقرہ بڑے لطف کا، و کبھی ایک آدھ بڑی حسرت سے کہہ جاتے !

ایک رات زیادہ دیر تک اسی طرح کے مسائل پر گفتگو ہوتی رہی، سید صاحب نے ان تمام تعلیمی طریقوں کا ذکر کیا، جو گذشتہ عہد کے مسلمانوں میں رائج تھے، پھر موجودہ حالات پر تبصرہ کرتے رہے، سید صاحب کی اس رات کی گفتگو بڑی عالمانہ اور دلنشین تھی، وہ رہ رہ کر اس پر زور دیتے کہ جب تک تعلیم بطور شرف و سعادت حاصل نہ کی جائے گی، معاشرہ کا قوام اعتدال پر نہ آئے گا، محض روٹی کمانے یا دولت جمع کرنے کی نیت سے تعلیم دینا یا تعلیم حاصل کرنا ہمیشہ بے برکتی کا موجب ہوگا،

میں نے عرض کیا سید صاحب آج کل معمولی سے معمولی کام بھی مخصوص تعلیم و تربیت حاصل کئے بغیر [illegible] نہیں کیا جا سکتا، اور دنیا میں کاموں کی نوعیت اتنی بڑھ گئی ہے، اور تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے کہ اب محض تعلیم کی خاطر تعلیم کون حاصل کرے، یہ تو نہ ممکن ہے نہ مناسب، سید صاحب نے اس سے اتفاق کیا، لیکن فرمایا کہ ان کا مطلب تعلیم کے ابتدائی مدارج سے تھا، مثلاً آٹھویں نویں جماعت تک جہاں پہنچ کر بچوں کی اخلاقی بنیاد ایک حد

تک استوار ہو جاتی ہے، پھر فرمانے لگے ہمارے ہاں بچوں کو تعلیم دینے اور ان کا اخلاق سدھارنے کا کام یا تو ماسٹر کے سپرد ہے، یا ملّا کے، اور دونوں ایسی معاشی زبوں حالی اور اس کے عواقب میں مبتلا ہوتے ہیں کہ وہ ایسی اہم خدمات کو خوبی سے انجام نہیں دے سکتے، جہاں سب سے زیادہ ذمہ داری کا کام سب سے معذور ہاتھوں میں دیا جائے گا، وہاں اصلاح و فلاح کی کیا صورت نکل سکتی ہے،

یہ رات مجھے خاص طور پر یاد رہ گئی ہے، وقت زیادہ گذر گیا تھا، اور سید صاحب تہجد کی تیاری کرنا چاہتے تھے، میں اٹھ کھڑا ہوا، تو فرمانے لگے،

"رشید صاحب! شب آخر گشت و افسانہ از افسانہ می خیزد"! زندگی کا بھی عجیب ڈھنگ ہے جب کچھ باتیں قابو میں آنے لگتی ہیں، اور حوصلہ ہوتا ہے کہ اب انہیں پیش کریں گے تو رخصت ہونے کا پیغام آ جاتا ہے، جس شوق اور محنت سے جو کچھ دیکھا، سیکھا، پڑھا تھا، اب وہ برگ و بار لانے والا تھا کہ عمر کا آفتاب غروب ہونے لگا، اس برگ و بار کا کیا ہوگا، جب سے تمدن کا آغاز ہوا، اور جب تک دنیا کا کارخانہ قائم رہے گا، اس طرح کے کتنے حسرتناک سانحے پیش آتے رہے ہیں، اور آتے رہیں گے،!!"

میں گھبرا سا گیا، سید صاحب کے اس موڈ (کیفیت ذہنی) سے میں خود بچنا چاہتا تھا، اور سید صاحب کو بھی بچانا چاہتا تھا، میں نے کہا سید صاحب آپ کے دل میں جو بات آئی ہے کون ایسا شریف اور صاحب علم و فن ہے جس کے دل میں نہ آئی ہوگی، عظیم شخصیت اور عظیم فن کار اس کیفیت میں مبتلا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، لیکن آپ تو اللہ کی مشیت و مصلحت کے مجھ سے زیادہ قائل ہیں، یہی نہیں بلکہ مجھے اس کا بھی یقین ہے کہ آپ بہتوں سے زیادہ اس کے مقرب بندوں میں ہیں، آپ اس کا غم کیوں کریں کہ آپ جو [illegible] دیکھتے تھے، وہ نہ ہو سکے، غم اسے ہو جس نے ایسا ہونے نہ دیا !

"جب تک ارادہ اور عمل آپ کے بس میں رہا، آپ نے فرائض کے ادا کرنے میں کوتاہی نہ کی، بلکہ فرض سے زیادہ کر دکھانے کے آرزو مند رہے، جب آپ کو یا مجھے کارآمد و کارآفریں رکھنے کے بجائے معطل و معزول کر دیا گیا (موت

واقع ہوئی) تو ہمارا کیا قصور، اور جب ہمارا قصور نہیں تو انجام کچھ ہی ہو، زندگی کی جہم میں فتح ہماری ہی رہی،!

سید صاحب مسکرائے لیکن یہ مسکرانا کسی اور سبب سے آشنا نہ تھا، جتنا شاید میرے اظہار قابلیت، بلاغت لسانی پر، لیکن میں بھی نہ جھجکا، بلکہ دل ہی دل میں کسی قدر جھنجلا کر بولا، سید صاحب مایوسی اور مصائب کا علاج منطق فلسفہ الٰہیات وغیرہ میں ڈھونڈنے سے علامہ لوگوں کو مل جاتا ہو، تو مل جاتا ہو اس خاکسار کو تو آج تک نہیں ملا،

سید صاحب نے میرے لہجے کی تلخی یا بے باکی کو غالباً محسوس کر لیا تھا، مسکرا کر بولے، اور کیوں جناب آپنے "علامہ" اور خاکسار میں کوئی خاص رعایت تو مد نظر نہیں رکھی ہے،! مجھے بے اختیار ہنسی آگئی، میں نے کہا سید صاحب جب تک آپ کا ذہن ایسے موقعوں آپ کا ساتھ دیتا رہے گا، آپ کو اپنی طرف سے اطمینان ہو یا نہیں، مجھے آپ کی طرف سے اطمینان رہے گا،!

پھر میں نے کہا سید صاحب آپنے جو بات کہی وہ مجھ سے اٹھائے تو نہیں اٹھتی لیکن مجھے تو اس مسلمان جنرل کی ادا پسند آئی جس نے یہ عہد کر لیا تھا کہ جہاں تک خشکی ملے گی، وہ خدا کے نام پر فتح کرتا چلا جائے گا، فتح کرتے کرتے خشکی کا حصہ ختم ہو کر سمندر آگیا، تو اس نے گھوڑے کو پانی میں ڈال دیا، اور کہا بار خدایا خشکی ختم ہو گئی، میرا عہد بھی ختم ہوتا ہے، تو سید صاحب اللہ کے ساتھ اس کے سپاہیوں کا یہی معاہدہ ہوتا ہے، اس کے بعد نام اللہ کا،!

سید صاحب پھر مسکرائے اور فرمایا، اب جا کر آرام کیجئے، آج بڑی دیر ہو گئی !

بالآخر یہ ہوا کہ سید صاحب پاکستان تشریف لے گئے، میں یہ جانتا تھا کہ سید صاحب جائیں گے ضرور گو معلوم نہیں کیوں یہ بھی محسوس کرتا تھا کہ سید صاحب وہاں خوش نہ رہیں گے، تقسیم ملک کے بعد سید صاحب سے ایک بار کسی قصاطنیان کی ملاقات ہوئی، اثنائے گفتگو میں فرمایا، رشید صاحب عجب بے بسی کا عالم ہے، بن بیاہی لڑکیاں اور بوڑھے ماں باپ تو یہاں رہ گئے نوجوان پاکستان چلے گئے، کیا کیا جائے کیا ہو گا، اس طرح کی بعض دوسری مصیبتوں کا ذکر بھی بڑی مایوسی سے کیا، سید صاحب کی اس گفتگو سے میرا دل بھر آیا، اس لئے اور کہ سید صاحب اس طرح کی باتیں اکثر نہیں کرتے تھے، معلوم نہیں کیوں اور کیسے، میرے دل میں وسوسہ سا پیدا ہوا کہ دیکھئے آئندہ

سید صاحب پر کیا گذرتی ہے،

سید صاحب پاکستان گئے تو دنوں خبر نہ آئی ایک دن اخبار میں پڑھا کہ اردو کے مسئلہ پر تقریر کرنے کے دوران میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبہ نے سید صاحب کو تکلیف پہنچائی، بڑا قلق ہوا، سید صاحب کے لئے یوں کہ کس منزلت کا آدمی کہاں جا کر کس بنا پر رسوا ہوا، اور طلبہ کے لئے یوں کہ طالب علم بالخصوص یونیورسٹی کے طالب علم سے بڑھ کر قیمتی متاع کسی قوم اور ملک کی کیا ہو گی، اس نے یہ سلوک سید صاحب سے کیا جن کی علمی، مذہبی، قومی، تہذیبی خدمات اس عہد میں اتنی زیادہ اور اتنی گرانمایہ تھیں کہ کسی ایک شخص کی نہ تھیں، پھر علماء کی رسوائی سلاطین کے ہاتھوں تو سنی تھی، طلبہ کے ہاتھوں کبھی سننے میں نہیں آئی تھی،

اگر ایک عالم کی موت عالم کی موت ہے تو ایک عالم کی بے حرمتی کیا ہوتی ہو گی !

استاذ مرحوم

(نقوش اور تاثرات)

از مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم

"دنیا کی بے ثباتی اور ناپائداری کا یہ منظر بھی کس قدر عبرت آموز ہے کہ شفیق و محبوب استاذ کی یادگار مین ایک عزیز اور سعادتمند شاگرد کا مضمون اس وقت شائع ہو رہا ہے، جب وہ خود دوسرون کے لئے یادگار بن چکا ہے، جب یہ مضمون لکھا گیا ہے اس وقت کس کو یہ گمان ہو سکتا تھا کہ اس کی اشاعت سے پہلے ہی شاگرد خود استاذ کے حضور مین پہنچ جائے گا"

"م"

ٹھیک ٹھیک یاد نہین پڑتا کہ پہلے پہل نام کب سُنا ؟ حافظہ پر زور دینے سے اتنا خیال آتا ہے کہ ایک روز اپنی طالب علمی کے آغاز مین، غالباً گیارہ بارہ سال سے زیادہ عمر نہ ہوگی - ایک ہم سبق دوست محمد شمیم[1] دسنوی کے گھر پہنچا تو دیکھا وہ ایک اردو کتاب پڑھ رہے ہین، پوچھا کیا پڑھتے ہو ؟ بولے "تم نہین جانتے ؟ مولوی سلیمان صاحب کی سیرۃ النبی ہے" یہ ۲۲ء کا ذکر ہے، اس کے کچھ ہی دن بعد ہمارے مدرسہ[2] مین اردو اخبارات اور رسالون کا چرچا ہونے لگا، ایک انجمن قائم ہوئی اور رسالے اور اخبار جاری کرائے گئے، اسی سلسلہ مین پہلی مرتبہ رسالہ المعارف کا نام سننے مین آیا، بڑی ردوکد کے بعد جاری ہوا، تو وہ المعارف کے بجائے **معارف** نکلا، سب سے پہلا پرچہ جو ہماری نگاہون سے گذرا وہ نومبر ۲۵ء کا شمارہ تھا، اس کا سپید غلاف اب تک نگاہون کے سامنے ہے، اس مین ایک مقالہ "مستشرقین

---

[1] ڈاکٹر سید محمد شمیم ام، بی، بی، ایس [2] مدرسہ عزیزیہ، بہار شریف پٹنہ،

واعدہ" پر ایک اچھائی مگر غائر نظر تھا، جو گو ہم نے پڑھا، مگر پلے کچھ نہ پڑا، ایک مضمون شاید مولانا عبدالعزیز میمن کا بھی تھا، وہ بھی ہماری استعداد سے بلند تھا، مگر اس کے باوجود بڑے ذوق و شوق سے رسالے کا حرف حرف پڑھا گیا اور اڈیٹر کی وقعت و عزت دل مین گھر کرتی گئی، اور دو چار نمبر دن کے بعد تو اُن کے علم کا سکہ دلون پر بیٹھ گیا، یہ تاثر راقم اور اس کے اکثر احباب کا تھا،

اس کے بعد **معارف** کے علاوہ مدیر معارف کی ایک دو کتابین اور پڑھین، ان مین خطبات مدراس کی یاد تازہ ہے، بڑے ذوق و شوق اور عقیدت کے ساتھ پڑھی گئی، اور مصنف سے ملنے کا خیال دل مین چٹکیان لینے لگا، پھر قدرت کا کرنا کچھ ایسا ہوا کہ ۲۷ء کے اکتوبر مین مصر کے کچھ عربی رسالے نظر سے گذرے، اور ایک دوست کی عنایت سے الهلال (مصر) کی متعدد جلدین مل گئین، راقم بے سوچے سمجھے اُن کی تلاوت مین لگ گیا، ان دنون الهلال مین طٰہٰ حسین کے مضامین اکثر شائع ہوتے تھے، یہ ناآشنائے کوچہ ادب پہلے پہل اُن سے بہت متاثر ہوا اور جی مین آنے لگا کہ "مصر چل کر ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیجئے"،

اس خام خیالی مین ایک اور دوست[1] بھی ہم نوا تھے، انھون نے تو راست خط و کتابت بھی شروع کر دی، راقم نے مولانا سید سلیمان ندوی (یہ اس وقت کی زبان نقل کر رہا ہون) سے مراسلت کی طرح ڈالی، پہلا خط گھنٹون کی محنت کے بعد ٹوٹی پھوٹی عربی مین غالباً میری زندگی کا یہ پہلا عربی خط تھا، اعظم گڈھ کے پتہ پر لکھا، اتفاق سے مولانا رمضان گذارنے کے لئے دیسنہ آئے ہوئے تھے، جواب دہین سے ملا، اور بہت حوصلہ افزا - مصری درسگاہون کے متعلق استفسار کے جواب مین ارشاد ہوا، "بہتر ہوگا کہ تم سال دو سال کے لئے ندوہ مین داخلہ لے لو"، جواب بالکل سادہ عربی مین تھا، زبان دل کو لگ گئی، پڑھتے پڑھاتے خط ازبر ہو گیا، اب کیون چوکتا ؟ دوسرا خط فوراً ہی دیسنہ کے پتہ پر حاضر کیا، اس کا جواب بھی بروقت ملا، اس مین حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ طٰہٰ حسین اور اس کی نظریات پر سخت تنقید بھی تھی، غالباً راقم نے خط مین اس کی ثنا خوانی کی تھی، ساتھ ہی ساتھ یہ خوشخبری بھی تھی "مین دوسری

---

[1] حکیم حافظ قاری یوسف حسن خان صاحب، بہار شریف (پٹنہ) ۲ جون مرگ ابو یوسف ندوی مرحوم (ف ۱۹۳۲ء)

شوال کو اعظم گڈھ جا رہا ہوں" بس، پھر کیا تھا، دن گننے لگا، روانگی تو بہر حال بہار شریف ہی کے اسٹیشن سے ہوگی، پھر تجھے
کیوں ضائع کیا جائے؟ یہ دوسرا مکتوب بھی اُسی سہل ممتنع زبان میں تھا، یہ بھی دوستوں کو پڑھتے پڑھاتے یاد ہو گیا
اور آج ۴۶ سال گذرنے کے بعد بھی یہ دونوں خطاب تک حرف بحرف یاد ہیں، نوجوانی کا شوق اسی کو کہتے ہیں
یہ مارچ ۱۹۲۶ء (رمضان ۱۳۴۴ھ) کا ذکر ہے،

۔۔ شوال ۱۳۴۴ھ کو وقت سے پہلے اسٹیشن پہنچ گیا، ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو ایک وجیہ نورانی چہرہ نظر آیا، سفید
براق عمامہ قاعدے کی سلی ہوئی شیروانی، ہاتھ میں ایک خوبصورت چھڑی، اور پاؤں میں گوہ کے چمڑے کا سادہ لیکن
نفیس جوتہ، ہو نہ ہو یہی علامہ سید سلیمان ندوی ہیں یقین تھا، پر کسی سے تصدیق کر لوں تو آگے بڑھوں، حسن اتفاق
سے قریب ہی پٹنہ کے شہر کے طبیب حکیم عبدالقیوم صاحب ڈیانوی پر نظر پڑ گئی، اُن سے ڈرتے ڈرتے اپنے خیال
کی تصدیق کی، پھر آگے بڑھ کر سلام و مصافحہ کی سعادت حاصل کی، فرمایا "میں نے تمھیں نہیں پہچانا"، عرض کیا، خاکسار
کا یہ پہلا موقع ہے" پھر اپنے خطوط کا ذکر کیا، دریافت کیا، "کیا پڑھتے ہو، اور کس سے پڑھتے ہو؟" پھر ارشاد ہوا،
"درسی کتابوں کے علاوہ کیا پڑھتے ہو" "الہلال" اور دار الہلال کے ہفتہ وار اخباروں کا نام سُن کر فرمایا "یہ کیا پڑھنے
کی چیزیں ہیں؟ مقدمہ ابن خلدون اور المثل السائر (ابن اثیر) پڑھا کرو" مقدمہ ابن خلدون اور المثل السائر تو
اس وقت میرے بس کی نہیں تھیں، پر الہلال کے متعلق مولانا کا ارشاد نہیں بھولا،

دوسرے دن مدرسہ پہنچا، تو اپنے ہم جنسوں کو اسٹیشن کی داستان مزہ لے لے کر سُنائی، ہمارے مدرسہ کے
ادیب مولانا انوار الحق ہندی اعظمی مرحوم، دیوبند کے فارغ اور بڑے ذہین آدمی تھے جدید مصری ادب میں الہلال
کا ان پر گہرا اثر تھا، میں نے جب علامہ ندوی کی رائے سُنائی تو وہ جھنجھلا کر بولے: "معارف میں بھی الہلال
کے ترجمے کے سوا کیا ہوتا ہے؟ ایک تو علامہ کا علمی رعب، دوسرے معارف پر اپنے استاد کی نارو تنقید نے مجھے
اُن سے بدگمان کر دیا، آخر تین سال سے میں بھی معارف پڑھتا ہوں، الہلال کا ترجمہ کہاں ہوتا ہے؟ مولوی صاحب
یقیناً تعصب سے کام لے رہے ہیں" یہ خیال میرے دل میں جاگزیں ہو گیا، رسالہ الزہرا بھی قاہرہ سے آنے لگا تھا،

الہلال کے مقابلہ میں راقم اس کا داعی اور ثنا خوان بن گیا، انہی دنوں سیرۃ عائشہؓ پر الزہرا میں اس کے پختہ مغز اور
صاحب علم اڈیٹر محب الدین خطیب کے قلم سے ایک شاندار ریویو نکلا، اس سے علامہ ندوی کی وقعت دل میں اور بڑھ
گئی، "اللہ اللہ! مصر کے رسالوں میں ان کی تعریف چھپتی ہے"، دوستوں سے کہتا اور اپنے ہونے والے استاذ مخدوم
کے گن گایا کرتا،

(۲)

آخر یہ عقیدت و محبت ندوہ لے گئی، اور اس طرح لے گئی کہ وہیں کا ہو کر رہ گیا، پہلی نسبتیں معدوم ہو گئیں،
پہلی جولائی ۱۹۲۸ء کو لکھنؤ پہنچا، آٹھویں جماعت (جو اس وقت دار العلوم کی آخری جماعت تھی) میں داخلہ ہوا، اور
بڑے انہماک کے ساتھ اپنے کام میں لگ گیا، پورا سال تعلیمی انہماک میں گذرا، سید صاحب قبلہ معتمد تعلیم کی حیثیت سے
ہر ماہ تشریف لاتے، عام طور پر نواب علی حسن خان صاحب ناظم ندوۃ العلماء کے ہاں قیام ہوتا، ہم لوگ وہاں
پابندی کے ساتھ حاضر ہوتے، اور حضرۃ الاستاذ کے "متنوع" سوالات کا بوجھ سب مل کر برداشت کرتے، سید صاحب
طلبہ سے سوال بہت کیا کرتے، اس لئے بعض طالب علم اُن کی خدمت میں حاضر ہونے سے جھجکتے تھے، مگر ہم لوگ، اس
شرم و ندامت کے باوجود، جو معقول جواب نہ دینے پر محسوس ہوتی، برابر حاضر ہوتے اور استفادہ کا موقع کبھی ہاتھ سے
نہ جانے دیتے، یہ سلسلہ سال بھر جاری رہا، اس دوران میں ایک بات قابلِ ذکر پیش آئی، سیرۃ النبی جلد دوم میں
مولانا شبلیؒ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف (قبل تحریم) شراب پینے کی نسبت کی ہے، اور کچھ اپنی طرف سے نہیں،
بلکہ ابو داؤد کی ایک روایت کی بنا پر خلفائے راشدین (مؤلفہ حاجی معین الدین مرحوم) چھپی تو حاشیہ میں سید صاحب قبلہ
نے اس کی تردید کر دی، اس پر ہم لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں، اور آخر عبدالسلام صاحب قدوائی کے مشورہ سے (جو
اس وقت ساتویں جماعت میں پڑھتے تھے) راقم نے سید صاحب کو ایک خط لکھا جس میں اس "تردید" پر اپنے عدم اطمینان

۱؎ مولانا محب الدین خطیب کی نظر سے سیرت عائشہ کا ترکی ترجمہ گذرا ہوگا ۲؎ الزہرا، ہر لحاظ سے معارف یا معارف کا
مثنیٰ تھا ۳؎ ندوہ پہنچ کر اس محبوب لقب سے کان آشنا ہوئے،

کا انداز تھا جواب ڈاک کے بجائے زبانی ملا، وہ ان الفاظ میں۔

"تو کار زمین را نکو ساختی
کہ با آسمان نیز پرداختی"

اور پھر یہ لطیف فقرہ: آخر محققین حضرت علیؓ کے خلاف معرکہ آرائی کی ضرورت کیا پڑی تھی؟" مولانا عبد الودود صاحب جیراج پوری، مدرس دار العلوم (جو اس وقت سید صاحب کے ساتھ تھے) بولے: "جی ہاں! سادات کرام تو طبعاً مائل بہ اہل بیت ہوتے ہی ہیں"۔ ان فقروں کے بعد پھر تحقیقی طور پر اس روایت کی اصلیت[1] واضح کی۔

اسی دور کا ایک اور واقعہ بھی نہیں بھولتا، مئو ناتھ بھنجن ضلع اعظم گڈھ عربی مدرسوں کا مرکز ہے، وہیں ایک مدرسہ میں والد ماجد قبلہ بھی مدرس اول تھے، راقم اس مناسبت سے مئو گیا ہوا تھا، انہی دنوں مدرسہ فیض عام (اہل حدیث) اور مدرسہ مفتاح العلوم (حنفی) جس کے صدر مدرس مولانا حبیب الرحمن صاحب تھے، اور شاید اب بھی ہوں) میں سالانہ جلسے تھے، سید صاحب قبلہ دونوں طبقوں کے مرجع تھے، ایک ہی دن صبح شام دونوں جلسوں کی صدارت کی، مفتاح العلوم کے جلسے میں عاجز بھی ساتھ تھا، نماز کو جاتے ہوئے خادم نے استاذ کے جوتے اٹھالیے، استاذ نے مسکرا کر تمام حاضرین کے سامنے فرمایا: "یہ میرا باضابطہ شاگرد نہیں، مگر شاگردی کا حق ادا کر رہا ہے۔" خادم نے دبی زبان سے عرض کیا: "آخر شاگردی کی تعریف کیا ہے؟"

(۳)

جولائی سنہ ۲۹ء میں سالانہ امتحان ہوا، اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے خاکسار نے نمایاں کامیابی حاصل کی، اپنی جماعت میں اول رہا، سید صاحب قبلہ نے نتیجہ کے اعلان کے ساتھ حوصلہ افزا نوٹ لکھا، اور والد ماجد (مولانا حکیم محمد عبد الشکور صاحب مدظلہ؛ مولود سنہ ۱۲۹ھ) کو خط کے ذریعہ مبارک باد دی، اور تو اور انہی دنوں مولانا حمید الدین فراہی مرحوم و مغفور کسی تقریب سے ندوہ تشریف لائے، اور ہم لوگ اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے تو استاذ موصوف نے تعارف کے انداز میں (مولانا فراہی کی طرف مخاطب ہو کر) فرمایا:

[1] سیرۃ النبی جلد چہارم میں حضرت الاستاذؒ نے اس کی پوری تحقیق فرمادی ہے۔

"لوگ اس سے (میری طرف اشارہ کرتے ہوئے) امتحانی مانگ رہے ہیں، یہ اپنی جماعت میں اول آیا۔"

ان فقروں سے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی توجہ ہوئی، اور عجیب اتفاق کہ مولانا فراہیؒ کی مجلس میں یہ میری پہلی اور آخری حاضری تھی، مگر اس کی یاد اب تک باقی ہے۔

ستمبر سنہ ۲۹ء اور اس کے بعد کا ذکر ہے، اب میں درجہ تکمیل ادب کا طالب علم ہوں، یوں تو تکمیل کے پہلے سال میرے باقاعدہ استاذ مولانا عبد الحلیم صدیقی (استاذ تفسیر و ادب دار العلوم ندوۃ العلماء) تھے، لیکن مشورہ سید صاحب سے ضرور کرتا، اور مراسلت بھی ہوتی، مگر بسا اوقات جواب زبانی ملتا، یہ تحریر لکھنے بیٹھا ہوں تو اس زمانے کی بھولی بسری باتیں یاد آرہی ہیں، ایک آدھ بات تو بیان کر ہی دی جائے، راقم اور محمد ناظم صاحب[1] (جو اس وقت چھٹی جماعت میں پڑھتے تھے، مگر ادبی استعداد بہت بلند تھی) کو عربی کا جنون تھا، ندوہ میں بعض طلبہ جاری اصطلاح میں شعوبی یعنی عربی کے مخالف تھے، وہ اردو میں کمال پیدا کرنا ہی اپنا منتہائے نظر سمجھتے تھے، ہماری ان کی کشمکش رہتی تھی، محمد ناظم صاحب اپنی ذہانت اور علمی استعداد کے باوجود عزم کے کمزور ہیں، ان پر کبھی کبھی "شعوبیوں" کے طعنے کا اثر ہو جاتا، ایک شام کو ہم لوگ سید صاحب قبلہ کے ساتھ لال باغ[2] سے موتی محل کے پل کی طرف آرہے تھے کہ محمد ناظم صاحب نے کہا:-

"عربی پڑھتے تو ہیں مگر یہاں اس سکّے کی کیا قیمت؟"

سید صاحب نے یہ سن کر بڑی تسلی دی اور فرمایا:

"میرا بھی یہی خیال تھا، مگر جب وفد خلافت میں یورپ جانا ہوا، تو یہ عربی کام آئی، اور اس وقت دار العلوم کی ابتدائی مشق کا فائدہ معلوم ہوا، مولانا محمد علی نہ عربی بول سکتے تھے، نہ فرنچ، اور عرب ملکوں کے وفود عربی بول سکتے تھے، یا فرنچ --- ایسے تمام اہم موقعوں پر میری عربی کام آئی۔"

[1] مولانا محمد ناظم ندوی، شیخ الجامعہ، جامعہ عباسیہ، بہاولپور [2] لال باغ لکھنؤ کا ایک محلہ ہے، جہاں نواب علی حسن خان صاحب مرحوم کی کوٹھی تھی۔

"پھر دوسری مرتبہ موتمر اسلامی مکہ مکرمہ مین اس مشتی نے پورے ہندوستان کی لاج رکھ لی،

گھبراؤ نہین، جوہر ضائع نہین ہوتا"

کس قدر صائب رائے اور کتنی دوربین نظر تھی؟ آج ندوہ کے وہ طالب علم جو عربی لکھنے بولنے پر پوری قدرت رکھتے ہین، ہاتھون ہاتھ لئے جارہے ہین، خود محمد ناظم صاحب کو اس کا عملی تجربہ ہورہا ہے، اس سال کا ایک اہم واقعہ طلبۂ ندوہ کی اسٹرائک تھی، (مئی ۱۹۳۰ء)۔ بات معمولی تھی، بڑھ گئی، سید صاحب قبلہ نے بڑی کوشش کی، مگر نوعمر و پرجوش طالب علمون نے ایک نہ مانی، اسٹرائک ناکام رہی، اور جولائی ۱۹۳۰ء مین دارالعلوم کھلتے ہی دستخط بعض معافیان داخل ہونے لگین، اچھے طالب علم (جن پر قیادت کا الزام تھا) خارج کئے گئے، اور ندوہ کی اصطلاح مین ممنوع الادخال "قرار پائے، ان مین ایک راقم بھی تھا، گو میری حیثیت عام طالب علم کی نہین رہی تھی، لیکن یہ واقعہ ہے کہ دار کونسل یا مجلس عمل کا ممبر مین بھی تھا، اس لئے میرے باب مین اساتذہ کی رائے مختلف تھی، اور اسی اختلاف سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سید صاحب قبلہ نے میرا اخراج منسوخ کرادیا، باقی دوسرے پانچ نفر بین کے داخلہ سے بھی حضرۃ الاستاذ کو اختلاف نہین تھا، اور نواب صاحب بھی تیار تھے، مگر ندوہ کی مجلس انتظامی کے ایک ندوی رکن نے سید صاحب کی نہ چلنے دی، حالانکہ استاذ مرحوم معتمد تعلیم تھے، وہ چاہتے تو اپنے اختیار خاص کو استعمال کرکے معاف کردیتے، مگر سید صاحب قبلہ لڑنا نہین جانتے تھے، اور ان کے بعض رفیقون نے اُن کی اس نرم مزاجی سے ہمیشہ ناروا فائدہ اٹھایا جس کا اُن کی صحت پر بھی پڑتا رہا —

تیسیں اد کے دوسرے سال ہماری زندگی بدل گئی، ندوہ مین بہار کا موسم آیا، یعنی اگست ۱۹۳۰ء مین استاذ محترم شیخ تقی الدین محمد بن عبدالقادر الہلالی المغربی تشریف لائے، ندوہ کی تاریخ مین یہ پہلا موقع تھا کہ ایک چوٹی کے عرب ادیب و زبان دان نے کرسی تدریس کو زینت دی۔ — بس پھر کیا تھا، ہمارے مشاغل بدل گئے، عاق رفتگاں زبان و ادب کی تحصیل مین لگ گیا، علی میان[۵۱] (جنھین خلیل عرب[۵۲] صاحب کی صحبت مین زبان کا فاصا ذوق

۵۱ مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی (معتمد تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء) ۵۲ شیخ خلیل بن محمد بن حسین ندوی (یمنی الاصل)

پیدا ہوچکا تھا، اور اب زیادہ تر حدیث کے درس مین مشغول رہا کرتے تھے) بھی از سر نو نحو و ادب کی تجدید و تکمیل مین لگ گئے، اکثر ہم لوگون کا ساتھ رہتا، ہلالی صاحب بھی ہم لوگون سے بہت خوش تھے، ہمارے علاوہ محمد ناظم صاحب اور ابواللیث[۵۳] صاحب کا بھی، ہلالی صاحب کے خاص شاگردون مین شمار تھا، سید صاحب قبلہ جب بھی تشریف لاتے ہلالی صاحب سے ملتے، اور ان کا بڑا احترام کرتے، ہلالی صاحب ہم لوگون کی بہت تعریف کرتے، اور بار بار زور دیتے، ان لوگون سے ندوہ مین تدریس کا کام لیا جائے،

باتین بہت ہین، اس دوران مین ایک اور دلچسپ بات عرض کردی جائے، تو اچھا ہو، ہلالی صاحب کی آمد سے پہلے، راقم یکسو نہین تھا، طب کی تحصیل کا خیال بھی بار بار آتا، علی گڑھ سے دستور العمل منگوا کر تیاری بھی شروع کردی تھی، سید صاحب قبلہ سے مشورہ کیا، تو کچھ دیر خاموش رہے، پھر فرمایا،

"جو چاہو کرو، مگر طالب علمی کو پیشہ نہ بنانا،"

(۴)

ستمبر ۱۹۳۱ء مین تکمیل ادب کا امتحان ہوا، تاثیر الاسلام فی الشعر العربی (اسلام کے اثرات عربی شاعری پر) اطروحہ (Thesis.) کا عنوان تھا، اطروحہ منظور ہوا، اور راقم نے وطن کی راہ لی، اور انگریزی زبان کی تحصیل و تکمیل مین لگ گیا، ادھر ہلالی صاحب نے سید صاحب کو ایک عربی ماہنامہ نکالنے کی ترغیب دی اور راقم کا نام ادارت کے لئے پیش کیا، تجویز طے پاگئی، اور علی میان نے فرط مسرت سے فوراً اطلاع دی، اور راقم انگریزی پروگرام کی بساط الٹ، لکھنؤ پہنچ گیا، (مارچ ۱۹۳۲ء)۔ مئی ۱۹۳۲ء (محرم الحرام ۱۳۵۱ھ) سے الضیاء کا اجراء عمل مین آیا، عام طور پر زبان کی تصحیح ہلالی صاحب کرتے اور دوسرے امور کے متعلق سید صاحب قبلہ ہدایتین دیتے، یہ پہلا موقع تھا کہ حضرۃ الاستاذ کی راست نگرانی، اور سرپرستی مین کام کرنے کا موقع ملا، یہ سلسلہ تقریباً چار برس جاری رہا، پہلے دو سال ہلالی صاحب مدظلہ کے مشورے بھی رہنمائی کرتے تھے، ہلالی صاحب کے چلے جانے کے بعد

۵۳ مولانا ابواللیث ندوی اصلاحی اعظمی، امیر جماعت اسلامی ہند (رام پور)

دو برس صرف سید صاحب قبلہ کی نگرانی اور مشورے، اس ناتجربہ کار اڈیٹر کے لئے مشعلِ راہ بنے رہے، ان دو
سالوں میں بہت کچھ سیکھا، اور جس چیز کو زندگی کا تجربہ کہتے ہیں، وہ پہلی مرتبہ حاصل ہو رہا تھا، سید صاحب قدم
قدم پر ٹوکتے، معمولی زبان کی غلطیوں کی نشان دہی فرماتے، کتابت کے متعلق بھی مشورے دیتے، مضامین کی
سطحیت پر تنبیہ کرتے، اور ساتھ ساتھ کبھی حوصلہ افزائی بھی فرماتے، اور اپنے مخصوص انداز میں — اسی دور
میں راقم نے عربی اخباروں میں اسلامی ہند کی سیاسیات پر لکھنا شروع کیا، اس پر کبھی ٹوکتے، کبھی خاموش رہتے
اور کبھی حوصلہ افزائی فرماتے، یہ تاکید ہمیشہ رہتی کہ شہرت کے پیچھے نہ دوڑو، کبھی لکھتے "تمھیں عربی لکھنا آگئی، مجھے
یقین نہیں، معلوم، کیا لکھیں؟" الضیاء کا پہلا افتتاحیہ خود اپنے قلم سے لکھا تھا، اور خوب تھا، آج بھی پڑھا جا سکتا ہے،
لوگوں کو حیرت تھی کہ بیس برس کے بعد بھی حضرۃ الاستاذ کی عربی انشاء میں بانکپن باقی ہے، اپنا عربی کلام بھی عنایت
کر دیتے؛

تعلقات بڑھے تو چھٹیوں میں ایک آدھ بار دسنہ بھی ضرور حاضر ہوتا، استاذ مرحوم عام طور پر گرمیوں کے
دن دسنہ ہی میں گذارتے، ندوہ میں بھی چھٹیاں ہوتیں، راقم جب بھی دسنہ حاضر ہوتا، ایک دو مقامی دوست یا ندوہ
کے کوئی پردیسی[1] طالب علم ضرور ساتھ ہوتے، ۱۹۳۳ء کی گرمیوں کا ذکر ہے، ندوہ کے ایک طالب علم محمد حسن ان
کو لے کر دسنہ حاضر ہوا، طعام و کلام کے سلسلہ کے بعد دوپہر کو اوپر کی منزل میں (جو برادرم ابو سہیل[2] صاحب کا کمرہ
تھا،) آرام کرنے کا حکم ہوا، راقم دن کو سونے کا عادی نہیں، بستر پر پڑا رہا، نماز ظہر کے وقت خود حضرۃ الاستاذ
تشریف لائے، سلمان[3] میاں گود میں تھے، کمرے میں سہیل صاحب کی انگریزی ٹوپی (ہیٹ) لٹکی ہوئی تھی، اس
کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہنستے ہنستے تاثر کے ساتھ بولے "دیکھا آپ نے ندوہ میں شراب کی آمیزش" پھر مجھے سلمان

---

[1] ندوہ کی روایات میں داخل تھا کہ دور دراز کے طالب علم لمبی چھٹیوں میں اپنے دوستوں کے ساتھ ان کے گھر جاتے اور گھر کے افراد کی طرح وہیں چھٹیاں گذارتے۔ [2] حضرۃ الاستاذ کے بڑے صاحبزادے سید ابو سہیل عظیم آبادی، بی اے

[3] چھوٹے صاحبزادے سلمان میاں سلمہ اللہ،

کی طرف متوجہ ہو کر فرمانے لگے، "دیکھو بیٹا! صرف میرے نام کے نقطے نہ مٹایا کرنا"، اس لطیف فقرے کے بعد مجھ سے
فرمایا: "کچھ سمجھے؟" عرض کیا: جی ہاں! اللہ انھیں علمی میراث بھی عطا کرے"۔

۱۹۳۳ء کی گرمیوں کا ذکر تھا، اس سے چھ ماہ پہلے (دسمبر ۱۹۳۲ء - جنوری ۱۹۳۳ء) دارالمصنفین بھی حاضری
ہوئی تھی، اور رمضان المبارک کا پورا مہینہ وہیں گذرا تھا، باضابطہ شاگردی کا موقع بھی یہیں نصیب ہوا، الحمد
صاحب اور ابو اللیث صاحب بھی ساتھ تھے، ہم تینوں قرآن مجید اور حجۃ اللہ البالغہ کا درس لیتے، غالباً سورہ بقرہ
کا ایک ربع ہو سکا، اس کے نوٹ اب تک حسنِ اتفاق سے محفوظ ہیں، حجۃ اللہ کے ابتدائی ۲۵، ۲۰ صفحے ہو سکے تھے
دس بجے صبح کو سید صاحب کے کمرے میں درس ہوتا، اسی وقت ڈاک بھی آتی، اور بڑے لطیفے رہتے، ایک
روز ایک انگریزی خط آیا، مجھے پڑھنے کا حکم ہوا، میں نے ساتھ ساتھ ترجمہ بھی شروع کر دیا، فرمانے لگے، "میں انگریزی
سمجھتا ہوں، صرف اس خط کا عادی نہیں" بڑی ندامت ہوئی، ایک روز دفتر کا ملازم ایک پرزہ دے گیا، اور
سات آٹھ روپے، پہلے تو جیب میں رکھ لئے، پھر پرزہ اور روپے نکال کر گننے لگے۔

"تم لوگ خیال کرتے ہوگے کہ میں بہت کچھ کماتا ہوں گا، بس میرا حصہ اسی قدر ہے، اللہ
تعالیٰ کے انتظامات ہیں، اپنے بندے کے ہاتھ سے خرچ کراتا ہے، ملازموں عزیزوں، اور دوسروں
کو ان کا اپنا رزق ملتا ہے، میرے حصہ کے یہی چند روپے ہیں، اسے اچھی طرح سمجھ لو، تم لوگ بھی اسی
منزل سے گذرنے والے ہو۔"

اسی دور میں ندوہ میں پھر ایک ہنگامہ ہوا، (۱۹۳۵ء) طلبہ کی معاونت کا الزام ایسے تین افراد پر بھی
تھا جو کسی نہ کسی حد تک اسٹاف میں شمار کئے جاتے تھے، ان میں سب سے کمزور ابو اللیث صاحب تو فوراً الگ
کر دئے گئے، مفتی محمد سعید صاحب اور راقم کو دار العلوم سے باہر رہنے کا حکم ہوا، حالانکہ ابو اللیث صاحب میرے
مقابلے میں بہت نرم، بے زبان، اور مرنجان مرنج آدمی تھے، راقم کے متعلق مشہور تھا کہ اسے سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ
بہت مانتے ہیں، اور غالباً اسی لئے مجھ پر سخت وار کرنے کی ہمت نہیں پڑی، ورنہ ہنگامے میں میرا رویہ

حد درجہ غیر محتاط تھا، مفتی محمد سعید صاحب کا تکیہ بھی ایک بڑے ستون پر تھا، اور وہ بھی بال بال بچ گئے، اسی زمانہ میں
استاذ مرحوم کا ایک بڑا مفصل خط آیا، جس میں ذرا تند لہجے میں نصیحت کی گئی تھی، وہ خط آج بھی حکمت و موعظت سے
لبریز نظر آتا ہے، نیز دارالعلوم تشریف لائے، تو ابو اللیث صاحب اور خاکسار کو الگ برآمدے میں کھڑے کر کے
بڑی دردمندی اور دلسوزی کے ساتھ نصیحتیں کیں، حضرۃ الاستاذؒ ابو اللیث صاحب کو بہت مانتے تھے، یہ نام
(ابو اللیث) بھی انہی کا رکھا ہوا تھا، (ان کا اصل نام شیر محمد تھا) اور ندوہ کے لئے انہیں مغتنم سمجھتے تھے، اگر جب
ابو اللیث صاحب رخصت ہونے گئے، تو ان کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو تھے، بولے، تو صرف اس قدر...
صاحب معافی کر لو! سید صاحب صدمے سہنے کے خوگر تھے، اپنے اختیارات استعمال کرنا یا عام زبان میں بیچ کر
Tease کرنا جانتے ہی نہیں تھے۔ — اس واقعہ کے ہفتہ عشرہ بعد ہی ان پر امراض قلب کا
شدید حملہ ہوا جس سے مہینوں ذی فراش رہے، اور مہینوں موت و حیات کی کشمکش رہی، اور پہلی سی صحت
تو پھر نصیب ہی نہیں ہوئی،

"الضیاء" بھی اسی علالت کے دنوں میں بند کرنا پڑا، اور راقم کے ذمہ صرف تدریس کی خدمت رہ گئی،
فارغ وقت میں علمی تحقیق و مطالعہ کا شوق پیدا ہوا، اور اس کے لئے سید صاحب قبلہ سے برابر مشورہ کیا کرتا،
مراسلت کے ذریعہ اور زبانی بھی، اسی زمانے میں لغاتِ جدیدہ کی تکمیل کی، اور آغاز میں جدید اسالیب
بیان پر ایک مفصل مقدمہ کا اضافہ کیا، حضرۃ الاستاذؒ بہت خوش ہوئے، اور دریافت فرمایا:

"اپنی محنت کا معاوضہ کیا چاہتے ہو؟ نام یا دام؟"

خادم نے عرض کیا: "حضرت استاذ کی خوشنودی مزاج" — کتاب کے سات نسخے مرحمت ہوئے،"
ٹائٹل پر "مع اضافہ جدید از مسعود عالم ندوی" کا اضافہ ہوا، نیز دیباچہ میں ایک حوصلہ افزا نوٹ مزید تحریک عمل
کے لئے ثبت ہوا، ابھی ابھی سال دو سال ہوئے، پھر مزید اضافہ کا حکم ہوا تھا، تعمیلِ ارشاد میں کافی اضافہ ہو چکا تھا،
[illegible] کہ یہ کوشش استاذ کی نگاہِ ذرہ نوازی سے محروم رہی، اور رہے گی،

اسی دوران میں راقم نے بے اجازت مدینہ (بجنور) کے شعبۂ ادارت کی رکنیت قبول کر لی تھی، عتاب ہوا
اور حسب الحکم ڈیڑھ ماہ کے بعد ندوہ واپس آگیا (اگست ۳۷ء)

(۵)

دسمبر ۳۷ء میں حضرۃ الاستاذؒ کی تحریک اور مخدومی مولانا محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ کی کوشش و تائید سے خدا بخش
اورینٹل لائبریری میں میرا تقرر ہو گیا، اس علمی ماحول میں بھی میرا مرجع اعظم گڈھ ہی رہا، جو کچھ بھی لکھتا، پہلے حضرۃ
الاستاذ سے مشورہ لیتا، ادھر عربی سے تعلق کچھ کم ہوا، تو معارف میں لکھنا شروع کیا، بہت ڈرتے ڈرتے
ہمت ہوئی، مگر سید صاحب قبلہ کی حوصلہ افزائی نے یہ مرحلہ آسان کر دیا، ۳۸ء سے ۴۴ء تک معارف
کے لئے کچھ نہ کچھ لکھتا رہا، سید صاحب پٹنہ اکثر تشریف لاتے، مختلف سرکاری کمیٹیوں میں ان کی شرکت ضروری
خیال کی جاتی، مخدومی مولانا ریاض حسن خان صاحب خیال کی کوٹھی پر قیام ہوتا، استاذ مرحوم کے تشریف
لاتے ہی مولانا کا ملازم اطلاع کر جاتا، اور جب تک سید صاحب قیام فرما ہوتے، راقم روزانہ حاضر ہوتا، دو دو
گھنٹوں وہاں نشست رہتی، پٹنہ میں یہی ایک رئیس کا گھر تھا، جہاں یہ فقیر بے تکلف کھانے پینے میں شریک ہوتا،
مولانا ریاض حسن خان خیال استاذ الاستاذ مولانا شبلی کے ملنے والوں میں تھے، سید صاحبؒ بھی ان کا احترام
کرتے، اور ہم وابستگان سید و شبلیؒ کو تو وہ اپنا عزیز ہی سمجھتے، مولانا ریاض حسن خان صاحب اور ان کے بڑے بھائی
مرحوم مولانا اعجاز حسن خان صاحب خوب آدمی تھے، ہماری پچھلی تہذیب اور شائستگی کے زندہ نمونہ،

پٹنہ میں خاکسار تقریباً سات سال رہا، (دسمبر ۳۷ء تا ستمبر ۴۴ء) اس دوران میں بیسیوں ملاقاتیں
ہوئیں کبھی کبھی ندوہ میں بھی اجتماع کے موقع ملے، ایک آدھ بار شبلی منزل بھی حاضر ہوا، ویسے تو بار بار جانا ہوا،
باتیں بہت ہیں مگر اس تحریر کی محدود گنجائش میں کیا کیا بیان کیا جائے؟ بہر حال دو چار ضروری باتیں تو بیان
کرنا ہی پڑیں گی،

۴۴ء تک سید صاحب قبلہؒ سے کبھی کسی مسئلہ میں اختلاف نہیں ہوا تھا، مگر اس کے بعد ان کے افکار و

رجحان میں کچھ تبدیلی ہونے لگی جس سے پہلے پہل میرے بنے بنائے افکار و خیالات کو سخت جھٹکا لگا، سید صاحب کو خود بھی اس کا احساس تھا، پہلے تو یہ کہکر تسلی دی: کہ میں نے بعیت میں فقہی مسلک کو آزاد رکھا ہے" مگر انداز گفتگو بتا رہا تھا کہ فقہی مسلک میں بھی تبدیلی ہو رہی ہے، مگر بہت آہستہ، اس لئے قدرةً [illegible] اور اس کے بعد ایک عرصہ تک گفتگو اور خط و کتابت جو کچھ بھی ہوتی، وہ تصوف پر فقہی مسلک کو نہیں چھیڑتے، اس لئے کہ ذہنی طور پر وہ اپنے مسلکِ تحقیق پر قائم تھے، راقم گفتگو میں تو کیا جرأت کرتا، مگر خطوط میں خوب دل کھول کر لکھتا، وہ بڑے صبر و تحمل سے جواب دیتے، اس سلسلہ میں حضرة الاستاذ نے دو چار ایسے جامع اور مفصل خط لکھے ہیں، جو بعض حیثیتوں سے تصوف کی بڑی تصنیفات پر بھاری ہیں، ایک مرتبہ گفتگو اس حد تک پہنچی کہ "دلائل کا جواب دو یا بات مانو" میں نے عرض کیا: جواب تو دے نہیں سکتا، مگر دل میں بات نہیں اترتی"۔

فقہی مسلک کا ذکر آیا ہے تو چند لطیفے سُن لیجئے، راقم شیخ محمد بن عبد الوہاب نجدیؒ کی سیرت لکھ رہا تھا، اس کا پہلا باب **معارف** میں نمونہ کے طور پر "تازہ تازہ شائع ہوا تھا، (مئی - جون [illegible]) اتفاق سے انہی دنوں سید صاحبؒ پٹنہ تشریف لائے، دیکھتے ہی فرمایا "آج کل تمھیں نجدیات سے بڑا تعلق ہو گیا ہے" میں کیا عرض کرتا، نگاہیں نیچی کریں، پھر میری داڑھی کی طرف دیکھ کر فرمانے لگے "خیر اب داڑھی تو بڑھ گئی ہے"

اس سے تقریباً ایک برس پہلے ([illegible]) کا ذکر ہے، مدرسہ اکزامینیشن بورڈ (بہار) کی مجلس بھی، سید صاحب صدر نشین تھے، موضوع اصلاح نصاب تھا، صوبہ کے تمام مشہور علما موجود تھے، مخدومی مولانا محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ، مولانا مناظر احسن گیلانی، حاجی معین الدین ندوی مرحوم ان میں زیادہ نمایاں تھے، راقم بھی ایک ممبر کی حیثیت سے حاضر تھا، اسی دن شام کو پٹنہ سیٹی (پٹنہ کی قدیم آبادی - عظیم آباد) میں انجمن محمدیہ کے زیر اہتمام تبلیغی جلسہ تھا، مولانا سجادؒ نے سید صاحبؒ اور مولانا گیلانی کو دعوت دے دی، اور خاکسار کو بھی اُن کی معیت میں آنے کا حکم ہوا، وہاں پہنچے، تو مولانا ابو القاسم بنارسی سے ملاقات ہوئی، سب لوگ ڈائس کے قریب بیٹھ گئے، راقم وہیں مولانا بنارسی سے الگ باتیں کرنے لگا، سید صاحبؒ نے تعجب سے فرمایا، تمھارا ان سے کیا

تعلق؟ میں نے عرض کیا: "ہمارے اُن کے خاندانی تعلقات ہیں" بولے، اور میری داڑھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے (جو اس وقت چھوٹی تھی) "جی ہاں! اب تو داڑھی منڈے بھی اہل حدیث ہوتے ہیں" مولانا ابو القاسم صاحب سن کر بہت متاثر ہوئے، اور پھر دونوں زمانے کے انقلاب کا شکوہ کرنے لگے،

سیرت ابن عبد الوہاب کی تالیف میں بھی حضرة الاستاذؒ ہی سے مشورہ لیتا، چونکہ یہ میری پہلی علمی تصنیف تھی، اسلئے بڑی تمناؤں کے ساتھ سید صاحبؒ کے نام معنون کرنے کی جرأت کی،

انتساب

"اپنے استاذ، مربی اور مخدوم حضرت مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ العالی

کے نام

جن کے مفید مشوروں نے مجھ میں لکھنے پڑھنے کا مذاق پیدا کیا، اور جن کی پدرانہ شفقت میری زندگی کے اُتار چڑھاؤ کی نگہبان رہی ہے، اور اپنی طالب علمی کے گذشتہ بارہ تیرہ سالوں میں جن کے مشوروں کا یکسر پابند رہا ہوں،

اپنی اس حقیر علمی کوشش کو معنون کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں،

گر قبول افتد زہے عز و شرف

خاکسار

مسعود عالم ندوی"

---

[1] والد صاحب قبلہ کے پھوپھی زاد بھائی اور استاذ مولانا سید عبد الکبیر بہاری عمر بھر بنارس ہی میں مولانا ابو محمد ابراہیم کے دادا مولانا محمد سعید کتبی ہی بنارسی کے دست راست کی حیثیت سے کام کرتے رہے، مولانا سعید کے تمام صاحبزادوں نے انہی سے تعلیم پائی، اور وہ انھیں "چچا" کہتے تھے، اور مولانا عبد الکبیر صاحب کے صاحبزادے برادر محترم حافظ عبد القدیر صاحب مولانا ابو القاسم کو بڑے بھائی کہتے تھے،

اور عجب شومیٔ قسمت کہ یہ سفر نامہ اپنے وقت پر استاذ مرحوم کے ملاحظہ میں نہ آیا، یہ راز بھی کئی سال کے بعد مدینہ منورہ میں
کھلا، ایک شام کو سید صاحبؒ سلمان میاں کے ساتھ غربت کدہ پر تشریف لائے، (محرم ۱۳۶۹ھ، نومبر ۱۹۴۹ء)
دورانِ گفتگو میں دریافت فرمایا: "تمھاری محمد بن عبدالوہاب یہاں ہے؟" کتاب نکال کر پیش کی، سرنامہ پر
نگاہ ٹھٹک گئی، بہت متاثر ہوئے اور آنکھوں میں وہ آبدار موتی چمکتے نظر آئے، اور پھر بڑی محبت سے فرمایا: "یہ
جنسِ وفا عنقا ہے" وہ منظر اب تک نہیں بھولتا، اور نہ بھولنے کی چیز ہے ـــ عرب ملکوں میں امیر شکیب ارسلان
(ف ۱۳۶۶ھ / ۱۹۴۶ء) "امام الادباء" کہے جاتے ہیں، سید رشید رضا مرحوم (ف ۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۴ء) نے بھی اپنے استاذ محمد عبدہ
کے ساتھ "حق وفا" تو خوب نباہا، ہمارے ملک میں یہ جنسِ گراں بہت نایاب ہے، حضرت سید صاحبؒ اسلامی ہند
کے "امام الادباء" کہے جا سکتے ہیں، استاذؒ کی رفاقت و اطاعت سے لے کر استاذ کے ہم نشینوں اور دوستوں تک
جس ذاتِ گرامی نے عہدِ وفا کو نباہا، وہ وفا شعاروں کا قافلہ سالار نہ ہو تو کون ہو؟ اب دیکھیں کہ اس کے خوانِ کرم
کے زلہ ربا اس عہدِ وفا کو کس طرح نباہتے ہیں؟

تصوف اور فقہی مسلک کے علاوہ ایک دوسرا مسئلہ بھی اس دور میں ہمارے لئے پریشانی کا موجب
رہا، ۱۹۳۰ء ہی سے اسلامی ہند میں ایک نئی فکر بیدار ہو رہی تھی، جس نے ۱۹۴۱ء (۱۳۶۰ھ) میں ایک منظم
تحریک کی صورت اختیار کر لی، اور راقم بھی پورے ذوق و شوق اور انشراحِ صدر کے ساتھ اس میں شریک ہو گیا
اصولی اتفاق کے باوجود حضرت سید صاحبؒ کو اس کے متعلق کچھ شکوک و شبہات تھے، جس کو ہم جیسے عقیدتمندوں
کے لئے بڑی مشکل کا سامنا تھا، بہرحال اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے، کہ یہ مشکل سدِ راہ نہ بنی اور جناب استاذ
مرحوم کی محبت و عقیدت اور ان کی طرف سے شفقت و محبت کا تعلق ہے، اس میں بھی کوئی فرق نہ آیا، اور راقم
اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتا رہا، اس سلسلہ میں سب سے بڑا مرحلہ ملازمت چھوڑ کر دار الاسلام پٹھان کوٹ
جانے کا تھا، پہلے والد ماجد مدظلہ سے اجازت لی، اس کے بعد سید صاحب قبلہؒ سے اجازت کا سوال تھا، اتفاق
سے سفر کے وقت لکھنؤ میں ملاقات کا پروگرام بن گیا، (اکتوبر ۴۲ء) شاہ معین الدین صاحب بھی اتفاق سے

وہیں موجود تھے، وہ اور دوسرے دوست سید صاحب سے کہتے "اسے جانے نہ دیں" وہ فرماتے "میں کس طرح روکوں؟"
اور میں خاموش اُن کے چہرے کی طرف دیکھا کرتا، "کہیں آزردہ تو نہیں؟" محبت اور فرض کی کش مکش بڑی سخت
ہوتی ہے، آخر الوداع کی ساعت آگئی، ہاتھوں میں ہاتھ لے کر فرمانے لگے "اب میں وہی ترکیب کروں گا، جو
مولانا الیاس صاحب نے علی میاں کے لئے کی تھی" میں نے کہا: "وہ کیا" فرمایا "الالتجاء الی اللہ" عرض کیا: "اس کو کون
روک سکتا ہے؟" فرمایا "اگر دعا قبول ہو گئی" تو عرض کیا "تو پھر کیا؟ خود بخود واپس چلا آؤں گا" ـــ ان لطیف
جملوں کے بعد دیدۂ پرنم کے ساتھ رخصت فرمایا، اور میں نے اسے اپنی بڑی کامیابی خیال کی، (۸ر اکتوبر ۴۲ء)

اس کے بعد ایک مدت تک اس سلسلہ میں خط و کتابت ہوتی رہی، موضوع زیادہ تر تصوف ہوتا، اور
کبھی کبھی جماعتِ اسلامی کے اخبارات اور بعض لکھنے والوں پر تنقید، خاکسار اپنی بساط بھر اس خلیج کے پاٹنے کی
کوشش کرتا رہتا، اور کون کہہ سکتا ہے کہ بالکل ناکام رہا؟

سید صاحبؒ قبلہ میں مہمان نوازی بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، اس کا صحیح اندازہ دیسنہ پہنچ کر ہوتا،
شبلی منزل میں وہ مصروف رہتے، دیسنہ میں نسبتۃً فرصت ہوتی، وہاں وہ اپنے شاگردوں اور چھوٹوں کی بھی
بڑی آؤ بھگت کرتے، حضرت الاستاذؒ کو آموں کا بہت شوق تھا، بڑے شوق سے اپنا باغ بھی لگایا تھا، ایک
مرتبہ آموں کے موسم میں دیسنہ حاضری ہوئی، تقی الدین نعمانی میرے پٹنہ کے رفیق بھی ساتھ تھے، سید صاحب اپنے
ہاتھ سے ایک ایک قاش کاٹ کر تقسیم فرماتے، ایک مرتبہ سید صاحب قبلہ کے ہاتھوں میں گٹھلی رہ گئی، تقی صاحب
نے ازراہِ تواضع گٹھلی طلب کی، فرمایا "آموں کے باب میں یہ تواضع نہیں"،

پٹنہ میں حضرۃ الاستاذؒ نے ایک مرتبہ راقم کے غربت کدہ پر بھی قیام فرمایا، (۴۳ء) اپنی تنگ دامانی اور
استاذ مرحوم کے معمولات کے پیشِ نظر کبھی اس تحریک کی خود جرأت نہ ہوئی، مگر اب کی سید صاحب قبلہ نے خود ہی
اطلاع دی، مدرسہ اکزامینیشن بورڈ کی مجلس منعقد ہو رہی تھی، گرمیوں کا موسم تھا، راقم کا مستقر اجتماع گاہ سے
بہت قریب تھا، شاید اسی وجہ سے غربت کدہ کا انتخاب ہوا ہو، بہرحال جونہی اطلاع ملی بڑی خوشی ہوئی،

مگر ساتھ ساتھ فکر بھی دامنگیر ہو گئی کہیں تکلیف نہ ہو، بہر حال اپنی سی ہر ممکن کوشش کی، مگر سچ یہ ہے کہ آرام و آسائش کا خاطر خواہ انتظام نہ ہو سکا، اسی موقع پر ایک دن ظہر کی نماز کے بعد کا ذکر ہے، —— سید صاحب قبلہ اوراد و وظائف میں مشغول تھے، خاکسار اُن کے قریب گذرا، فرمایا "ٹھہرو، تم بہت نکتہ چینی کیا کرتے ہو، یہ (اذکار کی) کتاب دیکھو اس میں کونسی چیز خلاف سنت ہے؟" الامر فوق الادب۔ عاجز نے چھوٹی سی مختصر کتاب (جس پر غالباً مناجات مقبول نام درج تھا) ہاتھ میں لی، اور درمیان سے ورق الٹا، تو ایک منظوم شجرہ پر نظر جم کر رہ گئی جس کی ردیف "کے واسطے" تھی اس گستاخ نے فوراً انگلی رکھ دی، "یہ ہے توسل بالاموات" فرمایا کوئی اور چیز بتاؤ، عرض کیا "میری کیا مجال کہ خوردہ گیری کروں؟ یہ تو صرف تعمیل ارشاد کی گئی۔"

اس حکایت کے بیان کرنے سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ حضرۃ الاستاذ کس قدر روادار تھے؟ مسلک و رجحان فکر کی تبدیلی کے باوجود اُن کے علم نے کبھی ان کا ساتھ نہ چھوڑا،

اسی طرح کا، لیکن اس سے بالکل الگ ایک واقعہ لکھنؤ میں پیش آیا، راقم ایک دن رباط بھوپال حاضر ہوا، خاص قسم کی مجلس تھی، اور مجذوب صاحب کی غزل پڑھی جارہی تھی، میں بھی بیٹھ گیا، کچھ دیر کے بعد سید صاحب نے فرمایا "تمہیں بھی شعر و شاعری کا ذوق ہے؟" عرض کیا اور ذرا جرأت کے ساتھ: "ذوق تو آپ ہی کا پیدا کیا ہوا ہے، مگر خادم تو کسی اور چیز کی طلب میں حاضر ہوا کرتا ہے" اس پر میں نے طواف سے متعلق ایک سوال کیا، جس میں ہنوز الجھا ہوا تھا، اور حنفی مسلک کی تائید حدیث سے نہیں ہوتی تھی، سید صاحب قبلہ کچھ دیر غور فرماتے رہے، پھر مختلف کتابوں کی مراجعت کا مشورہ دیا، نیز مولانا عبدالوہاب دہلوی سے پوچھنے کو کہا، اتنے میں وہ صاحب جو ابھی ابھی غزل سنا رہے تھے، بولے "تم تو حنفی ہو، فقہائے حنفیہ کا مسلک معلوم ہو جانے کے بعد اتنی چھان بین کی کیا ضرورت" میرا جی جل گیا، اور عرض کیا "معاف کیجئے گا میں حنفی نہیں ہوں" سید صاحب قبلہ مسکرائے اور اشاروں میں تبسم اس مخلصانہ بیباکانہ جواب کی داد دی،

غزل خوانی کا ذکر چھڑ گیا ہے تو ایک واقعہ مدینہ منورہ کا بھی سنا دوں، شاید اس کم سواد تحریر میں جان

کے تذکرے سے کچھ آب و تاب پیدا ہو جائے، مدینہ منورہ میں بھی استاذ علیہ الرحمۃ کا قیام رباط بھوپال میں تھا، ایک دن نو بجے صبح کو (اپنے ہاں کے وقت سے) حاضر ہوا، تو کیا دیکھتا ہوں، غزل خوانی ہو رہی ہے، اور کلام خود استاذ کا ہے، دلچسپی سے سننے لگا، اتنے میں کسی صاحب نے دریافت کیا، یہ کلام کس دور کا ہے؟ سید صاحب قبلہ میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے: "یہ نہیں بتاؤں گا، میرے بعض عزیز ایک خاص دور کے بعد کا میرا کلام قبول نہیں کرتے" اس پر وہ صاحب بولے "پھر تو آپ نے بتا ہی دیا" کلام کی مناسبت سے واقعات کی تاریخی ترتیب قائم نہیں رہ سکی، اور نہ اس تحریر میں اس اہتمام کی خاص ضرورت تھی،

اکتوبر ۴۴ء میں پنجاب آگیا تھا، دو تین ماہ چکر لگانے کے بعد جالندھر کی آب و ہوا، ساز گار نظر آئی اور وہیں اپنے کام کی طرح ڈال دی، اس دوران میں خط و کتابت برابر جاری رہی، شرف نیاز صرف ایک مرتبہ لکھنؤ میں حاصل ہوا، (جولائی ۴۵ء) راقم گھر جاتے ہوئے، مہینہ ڈیڑھ مہینہ کے لئے ندوہ ٹھہر گیا تھا، کچھ خیال بھی تھا کہ عربی لٹریچر کی تیاری کا کام یہیں رہ کر کیا جائے، پورے برصغیر پاک و ہند میں عربی زبان کا کام کرنے کے لئے ندوہ سے اچھا ماحول اور بیش قیمت کتاب خانہ نہیں مل سکتا، سید صاحب نے مستقل قیام کی اجازت بھی دے دی تھی، مگر پھر ارادہ بدل گیا، اور تقسیم کے بعد تو اس کا کوئی امکان ہی نہیں رہا۔

(۶)

تقسیم کے بعد مدتوں حالات سے بے خبری رہی، اعزا و احباب میری زندگی سے مایوس ہو چکے تھے، عرصہ کے بعد استاذ محترم کو میری سلامتی کی خبر ملی، اور مراسلت شروع ہوئی، اس دور کے خطوط میں زیادہ تر اپنی مملکت اور اس کی ہمسایہ ریاست کا حال پوچھتے، خاص طور پر ہر خط میں برادرم سید مظفر حسین ندوی اور ان کے اعزا و اقربا کی خیریت دریافت کرتے، بعض بعض خطوط کا انداز بیان بڑا لطیف ہوتا تھا، ان کے جواب بھی رمز و کنایہ کی زبان میں دیے جاتے تھے،

اللہ تعالیٰ کی شان کریمی کے قربان جائیے چار سال کے بعد ملاقات ہوئی تو ارض حرم میں پہلے سے کوئی

خبر بھی نہیں تھی، راقم عراق و نجد کا چکر لگا کر مکہ مکرمہ پہنچا، (ذی قعدہ ۱۳۶۸ھ) تو ہمارے معلم شیخ عبدالرحمن مظہر نے سب سے پہلے خوشخبری سید صاحبؒ کی سنائی، اُن کے ایک معاون نے اس پر دریافت کیا "ندوی کسی خاندان کا نام ہے؟" میں نے کہا جی ہاں! بہت بڑا خاندان ہے" دوسرے تیسرے روز علی الصباح رباط بھوپال حاضر ہوا، اور دیارِ حرم کی اس ملاقات سے بڑی مسرت ہوئی، پھر تو برابر حاضری ہوتی،

وہیں معلوم ہوا کہ سید صاحب کو پاکستان بلایا جا رہا ہے، پوچھنے ہی والا تھا کہ ایک روز خاص طور پر مجھے الگ بٹھا کر کچھ سرکاری کاغذات دکھائے، یہ حکومت پاکستان کی طرف سے تعلیمات اسلامی بورڈ کی صدارت قبول کرنے کی دعوت تھی، اس کے بعد میری رائے دریافت کی، عرض کیا: "ذاتی طور پر تو مجھے بہر حال آپ کی آمد سے خوشی ہوگی لیکن ڈر لگتا ہے کہیں آپ کے انتقالِ مکان سے ندوہ اور دارالمصنفین کو نقصان نہ پہنچ جائے" اس پر وہ سوچ میں پڑ گئے پھر فرمانے لگے "تمہاری جماعت کا رویہ کیا ہوگا"؟ اس کا جواب میرے لئے بہت مشکل تھا، بہر حال اچھی طرح غور کرنے کے بعد عرض کیا: "جماعت کی پالیسی تو امیر اور اس کی شوریٰ کے ہاتھ میں ہے لیکن جہاں تک میں جماعت کے موقف کو سمجھا ہوں اسے آپ کی آمد اور صدارت قبول کرنے سے خوشی ہی ہوگی، اس طرح پر بورڈ کے اندر بھی ایک صحیح مسلک کی توضیح ہو سکے گی، اور حکومت کو من مانی کارروائیاں کرنے کا موقع نہیں مل سکے گا۔ — البتہ اگر آپ کی صدارت میں بورڈ نے کہیں کوئی ایسی سفارش کی جو جماعت کی نگاہ میں قابلِ قبول نہ ہوئی تو پھر ظاہر ہے کہ جماعت مخالفت کرے گی، "آپ کی شخصی نہیں، بلکہ بورڈ کے فیصلے کی" کوئی نصف گھنٹہ گفتگو رہی اور رازداری کا عہد لے کر اجازت دی، (اور یہ پہلا موقع ہے کہ یہ گفتگو کھول کر بیان کر رہا ہوں)

اتفاق سے اسی سال (۱۳۶۸ھ/۱۹۴۹ء) خواجہ شہاب الدین صاحب وزیر داخلہ (حال گورنر صوبہ سرحد) بھی حج کو آئے ہوئے تھے، وہ نماز عشاء سے پہلے اور بعد حنفی مصلیٰ کے پاس سید صاحبؒ کے پہلو میں بیٹھتے، اور دونوں میں روزانہ گفتگو ہوتی، خواجہ صاحب اوراد و اذکار قسم کی خالص مذہبی باتیں پوچھتے، اور حضرۃ الاستاذ ملک اور زندگی کے دوسرے مسائل چھیڑتے، یہ شعوری اور مہذب مناظرہ دونوں کے درمیان برابر جاری رہا، سید صاحب

کا اپنا تاثر یہ تھا کہ "یہ لوگ معذور ہیں، اور اپنی مخصوص تعلیم و تربیت کی وجہ سے سمجھ نہیں سکتے کہ دین ایک نظامِ زندگی کا نام ہے" خواجہ صاحب چاہتے تھے کہ مجلس تعلیمات اسلامی کی صدارت قبول کرنے پر انہیں راضی کر لیں، سید صاحب نے انکار تو نہ کیا، مگر خواجہ شہاب الدین جیسا ہوشیار انسان بھی سید صاحب سے زبان نہ لے سکا، یا عام زبان میں کوئی (Commitment) نہ کرا سکا، ہمارے بعض احباب حضرۃ الاستاذؒ کو سادہ لوح سمجھتے تھے، یہ خیال خود سادہ لوحی پر مبنی تھا، اُن کی سب سے بڑی خوبی یا کمزوری صرف اُن کی حد سے بڑھی ہوئی شرافت اور مروت تھی، معاملہ فہمی میں وہ کسی بڑے ذہین سے ذہین اور تجربہ کار سے تجربہ کار آدمی سے کسی طرح کم نہیں تھے،

یہ پاکستان آنے کی تمہید تھی، حسن اتفاق کہ جس دن حضرت سید صاحب قبلہؒ دہلی سے لاہور تشریف لائے ہیں، راقم لاہور میں موجود تھا لیکن ان کے اس پروگرام سے بالکل بے خبر۔ مولانا مودودی، اور اُن کے رفقاء مولانا امین احسن اصلاحی اور میاں طفیل محمد صاحب بیس ماہ کی نظر بندی کے بعد تازہ تازہ رہا ہوئے تھے، (اواخر مئی ۵۰ء) اور جماعت کی مجلس شوریٰ منعقد ہو رہی تھی، (جون ۵۰ء/اواخر شعبان ۱۳۶۹ھ) — انہی دنوں ایک روز مغرب کے بعد ہم لوگ دفتر جماعت اسلامی (مرکز) کے باہر کھلے صحن میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے کہ دفتر "کوثر" سے فون پر اطلاع ملی، "مولانا سید سلیمان آئے ہوئے ہیں، اور کل صبح مولانا مودودی، مولانا اصلاحی اور مسعود عالم سے ملنے کے لئے آئیں گے" خبر پا کر جو مسرت ہوئی، اس کا کیا پوچھنا؟ مگر فکر یہ ہوئی کہ کسی طرح اُڑ کر دفتر کوثر پہنچ جاؤں، مگر رات کو چار میل کی مسافت کس طرح طے کی جائے؟ آخر علی الصباح اپنے ایک رفیق رانا اللہ داد خان کی موٹر پر مولانا اصلاحی کو اُن کے گھر سے لیتے ہوئے، دفتر کوثر پہنچے، سید صاحب قبلہ ابھی چائے سے فارغ ہوئے تھے، اور انتظار ہی کر رہے تھے، تھوڑی دیر میں اچھرہ واپس آگئے، مولانا مودودی کے دفتر میں نشست ہوئی، اندر صرف ہم چار آدمی تھے[1]، اور تمام ارکان شوریٰ اور رفقائے مرکز باہر برآمدے میں بیٹھے رہے باتیں دیر تک ہوتی رہیں، سید صاحبؒ نے مولانا مودودی کو عرصہ کے بعد دیکھا تھا، کہنے لگے "اب تو ماشاء اللہ

[1] سید صاحب قبلہ، مولانا مودودی، مولانا اصلاحی اور خاکسار،

آپ کی داڑھی خوب بڑھ گئی ہے؟" پھر نعیم صاحب کو دریافت کیا، وہ بلائے گئے، اور ان کی پیٹھ ٹھونکی، اور دینی شوق
کی انجام دہی پر مبارک باد دی، اتنے مین، رفقاء کا تقاضا ہوا کہ باہر تشریف لائین، تاکہ سب لوگ نیاز حاصل
کرسکین، باہر برآمدے مین بھی دیر تک نشست رہی، وہان سید نقی علی صاحب علوی (جو ان دنون تسنیم کے ایڈ
یٹر مقرر ہوئے تھے، اور آج کل سنٹرل جیل مین نو سال کی قید کاٹ رہے ہین) نے کچھ سوالات کئے، اور تسنیم کو
اچھا خاصا انٹرویو تیار کرلیا،

اس وقت تو سید صاحب قبلہ خیر سگالی کے وفد مین آئے تھے، واپسی کا عزم مصمم تھا، مگر کراچی جاکر کچھ ایسی
صورتِ حال پیدا ہوئی یا کردی گئی کہ وطنِ مالوف کو نہ لوٹ سکے،

پاکستان نے حضرت الاستاذؒ کی آؤ بھگت مین کمی نہین کی، سرکاری اور غیر سرکاری، ہر حلقہ مین ہاتھون
ہاتھ لئے گئے، حکومت کی ہر ایسی چھوٹی بڑی کمیٹی جس مین اسلامی نگاہ کی نمایندگی مطلوب ہوتی، اس کی رکنیت ان کو
پیش کی جاتی، اور وہ اس مین شریک ہوتے، اپنے مفید مشورون اور تجربون سے کمیٹی کی مدد کرتے، دستور ساز اسمبلی
کی مجلس تعلیمات اسلامی سے پہلے تو الگ رہے، لیاقت علی خان مرحوم نے بہت ترغیب دی، مگر سید صاحب ضمانت
(assurance) چاہتے تھے کہ بورڈ کے مشورے قبول کئے جائین گے، مگر حالات نے ایسا پلٹا کھایا
کہ بورڈ کی صدارت قبول کرلی، اور ہمارے نقطۂ نظر سے بھی ان کا قبول کرنا اچھا رہا، "ہمارے نقطۂ نظر" سے مراد
پاکستان مین اسلامی دستور کیلئے جدوجہد کرنے والون کا نقطۂ نظر ہے،

سید صاحب کبھی کبھی ندوہ بھی تشریف لاتے، دو مرتبہ دار العروبہ کی بھی عزت افزائی ہوئی، ایک مرتبہ
استاذ محترم ڈاکٹر تقی الدین ہلالی[1] (حال پروفیسر بون یونیورسٹی جرمنی) کی موجودگی مین، جب کہ وہ عراق سے کچھ
دنون تفریح کے لئے پاکستان تشریف لائے تھے، (اگست ۱۹۵۱ء)

میرا بھی کبھی کبھی کراچی جانا ہوتا، اور سید صاحب کے دولت کدہ پر دلچسپ صحبتین رہتین، اس موقع پر ۵۱ء کی

[1] ہلالی صاحب کا مستقل قیام بغداد ہی تھا، دس سال بون یونیورسٹی نے عراقی حکومت سے ان کی خدمات مستعار لی ہین،

کی ایک دعوت نہین بھولتی، بہار کی قبولی اور سیخ کباب کا مزا کبھی بھولنے ہی کا نہین، حکیم نصیر الدین صاحب
ندوی اور خاکسار نے خاص طور پر کبابون ہی پر اپنی توجہ مرکوز رکھی، حضرۃ الاستاذؒ ہماری اس بے تکلفی اور طفلانہ
حرکت سے بہت محظوظ ہوئے،

مارچ ۵۳ء مین اس گنہگار کو بھی بے گناہون کے ساتھ سرکاری مہمان خانہ کی ضیافت نصیب
ہوئی، حضرۃ الاستاذ پر اس کا بہت اثر ہوا، بار بار عزیزی محمد عاصم صاحب رفیق دار العروبہ سے خیریت دریافت
کرتے، جیل مین بھی دو والا نامے ملے جن سے بڑی مسرت اور طمانیت حاصل ہوئی، پر افسوس کہ رہائی کے بعد
(اگست ۵۳ء) پھر نیاز نہ حاصل ہوسکا، اور اس سے زیادہ افسوس کہ آخری دنون مین حضرۃ الاستاذ کی علالت
سے بھی بے خبر رہا، اسے قسمت کی ستم ظریفی کے سوا اور کیا کہا جائے کہ جیل مین اچھا خاصا رہا، مگر رہائی کے بعد
مرض (دمہ) کے مسلسل اور سخت حملے ہونے لگے، اور نومبر (۵۳ء) کے آغاز مین تو ایسا حملہ ہوا کہ اپنی بیماری
کی پچیس سالہ زندگی مین کبھی ایسا حملہ نہین ہوا تھا، دو تین ماہ ذی فراش رہا، ایک دوست کو کراچی لکھا کہ استاذ
محترم کی خدمت مین حاضر ہوکر دعا کی درخواست کیجئے، (۱۳ نومبر ۵۳ء) مگر ہونا کچھ اور لکھا تھا، مین بستر علالت
پر روزانہ کراچی سے جواب کی راہ دیکھ رہا تھا کہ ۲۲ نومبر کی شب (۱۴ ربیع الاول ۷۳ھ) کو ۹½ بجے ایک اخباری
نمایندے نے آکر وفات حسرت آیات کی اطلاع دی، انا للہ وانا الیہ راجعون،

أَيَّتُهَا النَّفْسُ اجْمِلِي جَزَعاً إِنَّ مَا تَحْذَرِينَ قَدْ وَقَعَا

تعزیت کے لئے بھی کراچی نہ جاسکتا تھا، چلنے پھرنے کی سکت بھی نہین تھی، کئی ہفتون کے بعد جاکر
سفر کے قابل ہوا، دسمبر کی ۲۶ کو کراچی پہنچا، اور برادرم ابو عاصم صاحب اور سلمان میان سلمہ اللہ کی معیت مین
اس قطعۂ ارض کی زیارت کی، جہان استاذ مرحوم کا جسدِ خاکی مدفونِ استراحت ہے، اللہ تعالیٰ ان کی تربت پر رحمت
کے پھول برسائے اور انھین اعلیٰ علیین مین جگہ دے،

اب ہمارے نصیبون مین ماتم ہی ماتم ہے، جو جگہ خالی ہوتی ہے، وہ پر نہین ہوتی، ہائے شبلی منزل کی

وہ دو گز زمین جسے استاذ مرحوم نے اپنی آرام گاہ کے لئے پسند فرمایا تھا، وہ اپنے استاذ کے پہلو میں استراحت کرنا چاہتے تھے، مگر قدرت، انہیں ایسی جگہ لے آئی، جہاں ساحل عرب کی ٹھنڈی ہوائیں، صبح و شام آیا کرتی ہیں، شاید اُن کے تحت الشعور میں کوئی ایسی آرزو رہی ہو،

"یہ نقوش اور تاثرات" نہایت عجلت میں اور قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں، اس سے اپنی تعریف مقصود نہیں، دلوں کا حال اللہ بہتر جانتا ہے، مطلوب یہ ہے کہ غلطیوں اور فروگذاشتوں سے درگذر کیا جائے، اس تحریر میں جو سنین اور تاریخیں درج کی گئی ہیں، یا جو واقعات بیان کئے گئے ہیں، وہ سب اپنے کمزور حافظے کے سہارے، ان میں غلطی کا بہت کچھ امکان ہے، اگر کسی دوست کو ایسی فروگذاشت محسوس ہو، تو ضرور مطلع کریں، عنایت ہوگی، اسی طرح جہاں جہاں حضرۃ الاستاذ کے اقوال نقل کئے گئے ہیں وہ اکثر و بیشتر روایت بالمعنی ہیں، اصلی الفاظ یاد رکھنا میرے بس سے باہر تھا، البتہ واقعات و اقوال کی صحت کا پورا اطمینان ہے،

واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

دلفگار

"مسعود عالم ندوی"

مولانا سید سلیمان ندوی میری نظر میں

از

جناب مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی ایم اے پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت یہ کہنا کہ وہ ایک بہت بڑے محقق، نامور مصنف، بلند پایہ عالم اور صاحب طرز انشاپرداز تھے، ایک عام اور معمولی پیرایۂ بیان ہے، جس سے مولانا کا اصل مقام اور رتبہ متعین نہیں ہوتا، اور نہ اُن کا صحیح حق ادا ہوتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی میں ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی کے ذہن و فکر، اور یہاں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں خواہ وہ طرز قدیم کا ہو، یا طرز جدید کا، نصف صدی کے اندر اندر تصنیف و تالیف، طرز فکر و استدلال اور تہذیبی اعمال و عواطف کے اعتبار سے جو عظیم الشان انقلاب ہوا ہے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اور اُن کے علمی و عملی کارناموں کو اس میں بڑا دخل ہے، اور یہ انقلاب جس طرح پیدا ہوا، اور اُس نے ذہنی و فکری دنیا میں قدیم تعلیم یافتہ طبقہ کو جو سیادت بخشی ہے، اس کی نظیر آج پورے عالم اسلام میں کہیں نظر نہیں آئے گی، اس کی اصل حقیقت معلوم کرنے کے لئے ضروری یہ ہے کہ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل کے علمی و تصنیفی حالات پر ایک نگاہ ڈال لی جائے،

مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے نامور استاذ مولانا شبلی کے زیر سایۂ عاطفت جب تصنیف و تالیف کا قلم سنبھالا، تو یہ وہ زمانہ تھا جب کہ تعلیم یافتہ مسلمان دو طبقوں میں بٹے ہوئے تھے، ایک قدیم تعلیم یافتہ یعنی علماء اور دوسرا جدید انگریزی تعلیم یافتہ گروہ، دونوں کا دائرۂ عمل ایک دوسرے سے الگ تھا، اور صرف اتنا ہی نہیں

بلکہ دونوں میں رقابت تھی، ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھتا تھا، علماء کی علمی کوششوں اور تحریری وتصنیفی سرگرمیوں کا دائرہ چند فروعی اور جزئیاتی مسائل، یا متون درسیہ کے شروح و حواشی تک محدود تھا، تصنیف وتالیف کی زبان صاف، دلچسپ اور رواں نہیں تھی، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ تعلیم یافتہ طبقہ کو اُن کے ساتھ نہ کوئی دلچسپی تھی، اور نہ اس کی نگاہ میں ان مسائل ومباحث کی کوئی اہمیت تھی، مغربی علوم وفنون اور انگریزی تعلیم نے اسلامی مسائل سے متعلق طرزِ فکر وبحث میں جو تبدیلی پیدا کردی تھی، علماء کو نہ اس تبدیلی کا احساس تھا، نہ اس تبدیلی کے اسباب سے ان کو واقفیت تھی، اور نہ ان کی زبان وقلم کے جدید طرزِ سخن سے آشنا تھی،

دوسری جانب انگریزی تعلیم یافتہ گروہ کا حال یہ تھا کہ وہ چونکہ سرسید کی آخری عمر کی پالیسی جو مسٹر بیک پرنسپل مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے زیر اثر تھی، اوس سے کافی متاثر تھا، اس بنا پر اس کے دل ودماغ پر انگریزوں کی نقالی اور ان کی تہذیبی وتمدنی تقلید کی دھن سوار تھی، اس جنون میں اوس کو نہ مذہب سے لگاؤ تھا، نہ دینی اور قومی روایات سے دلچسپی تھی، اور نہ قومی تہذیب اور کلچر کی اس کے دل میں عظمت تھی، اسلام کی تاریخ سے متعلق اگر اسے تھوڑی بہت کچھ واقفیت تھی بھی، تو اس کی معلومات کا ذریعہ خود مسلمان مصنفین کی کتابوں کے بجائے یورپ کے مشرقی مصنفین یا مستشرقین کی تصنیفات تھیں، جو علمی تحقیق اور ریسرچ کے پردہ میں اسلام کی روایات حسنہ کو بھی اسی طرح پیش کرتے تھے کہ ایک مسلمان اسے پڑھکر شرم سے گردن جھکا لیتا تھا، اور خود اس کے دل میں اپنی تاریخ سے نفرت پیدا ہوجاتی تھی، اس طرح دونوں گروہوں کی راہ منزل مقصود اور سمت ایک دوسرے سے بالکل الگ تھی، ایک دوسرے کا مذاق اڑاتا تھا، طنز وتعریض کرتا تھا، اور دونوں میں اختلاف وافتراق کی ایسی وسیع خلیج حائل تھی جس کا دور کرنا آسان نہیں تھا،

وقت کی ملی اور قومی ضرورتوں کا تقاضا تھا کہ دونوں طبقوں کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے، اُن میں صلح کرا کے مصافحہ کرایا جائے، تاکہ دونوں باہمی اشتراک عمل سے وقت کے جدید تقاضوں کو پورا کرسکیں،

اس کی صورت بجز اس کے کچھ اور نہیں ہوسکتی تھی کہ ایک طرف تعلیم قدیم کے نصاب میں تغیر وتبدل کرکے ایسے علماء پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی، جو صرف فروعی اور جزئیاتی مسائل میں ہی وقت صرف کرنے کو دین کی سب سے بڑی خدمت نہ سمجھتے ہوں، بلکہ تعلیم جدید نے اسلام اور اسکی تعلیمات وروایات سے متعلق جو صدہا نئے قسم کے سوالات ومباحث پیدا کردیئے تھے، اون پر وقت کی زبان میں گفتگو کرسکتے، اور اسلام کے نمایندہ کی حیثیت سے بزم وقت کے ارکان کو خطاب کرسکتے ہوں، اور دوسری طرف ضرورت تھی کہ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کے دل ودماغ پر مغربی علوم وفنون اور انگریزی تعلیم سے جو مرعوبیت چھائی ہوئی تھی، اور جس کے باعث وہ خود اپنی تاریخ، کلچر، تہذیب وتمدن اور روایات سے متعلق احساس کمتری میں مبتلا تھا، اوس کو دور کرنے کی کوشش کی جاتی، اس سلسلہ میں کرنے کے اصل کام دو تھے، ایک یہ کہ علی گڑھ کے نصاب تعلیم میں عربی فارسی، اردو، اسلامی تاریخ، اسلامی فلسفہ و دینیات، یہ مضامین بھی شامل کرائے جاتے، اور دوسرا کام یہ تھا کہ صاف ستھرے، اور دلچسپ ودلنشین انداز بیان وزبان میں مغربی مذاق تحقیق وتصنیف کے مطابق اسلامی مسائل ومباحث اور اسلامی تاریخ وتمدن پر کتابیں لکھ کر شائع کی جاتیں تاکہ یہ انگریزی تعلیم یافتہ گروہ بھی ان کو پڑھ کر فائدہ حاصل کرسکتا،

مولانا شبلی جو قدرت کی طرف سے ایک بڑا حساس دل اور بیدار دماغ لے کر پیدا ہوئے تھے، انھوں نے ان دو گونہ ضرورتوں کو محسوس کیا، اور علی گڑھ کو خیرباد کہکر ہمہ تن اس کام میں لگ گئے، تقاضائے وقت کے مطابق علماء پیدا کرنے کی غرض سے وہ ندوۃ العلماء سے وابستہ ہوگئے، جو خاص اسی غرض سے قائم ہوا تھا، اور تعلیم یافتگان سرسید کی خصوصاً اور عام مسلمانوں کی عموماً ذہنی اصلاح کے لئے انھوں نے تاریخ وفلسفہ اسلام کو اپنا خاص موضوع بنا کر کتابیں لکھنی شروع کیں، اس سلسلہ میں اور سب چیزوں سے قطع نظر، مولانا نے اردو پر جو احسان عظیم کیا ہے، وہ کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا، جو زبان اب تک صرف شعر وشاعری یا افسانہ خوانی و داستان طرازی کی زبان تھی، اس کو ایک نہایت باوقار، مگر ساتھ ہی دلچسپ وشگفتہ علمی زبان بنادیا، اور بحث وتحقیق، تنقید اور جمع وترتیب معلومات کے اعتبار سے اردو اب تک جس جدید مغربی انداز تصنیف سے ناآشنا تھی،

مولانا نے اس کو اس سے مالا مال کر دیا،

مولانا شبلی نے جو پودا لگایا اور جس درخت کا بیج بویا تھا، اگرچہ ان کی زندگی میں برگ و بار لانے لگا اور اس کے ثمرات ظاہر ہونے لگے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس پودے کو ایک تناور درخت بنانے میں سب سے بڑا حصہ انہی کے جانشین و تلمیذ خاص مولانا سید سلیمان ندوی کا ہے، انھوں نے جس طرح اس تحریک کو چلایا، اور اس کو مقبول بنانے کے لئے جو راہ (مصنوعی طور پر نہیں بلکہ فطری اور طبعی طور پر) اختیار کی، سچ یہ ہے کہ وہ مولانا شبلی کے بس کی بات بھی نہیں تھی،

اس میں شبہ نہیں کہ مولانا شبلی کی شخصیت بڑی جامع اور ہمہ گیر تھی، انھوں نے مجتہدانہ طور پر علمی کام بھی کئے، اور عملی بھی، انھوں نے نثر کے میدان میں بھی گوہر لٹائے، اور نظم کے سبزہ زار میں حسن تخیل لطافت بیان اور جذبات و اثر کے پھول کھلائے، انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنی معاشرتی یہاں تک کہ سیاسی اور تعلیمی زندگی کے ہر پہلو اور ہر گوشہ کو متاثر کیا، اور سب پر کچھ نہ کچھ اپنا نقش چھوڑا، اور آج ہم واضح طور پر ان وسیع اثرات و نقوش کو ہر جگہ محسوس کر سکتے ہیں، لیکن بہر حال یہ ماننا پڑے گا کہ بعض خاص اسباب کی بنا پر جن میں سے بعض کا تعلق ضرور مولانا کی اپنی طبیعت اور افتاد مزاج سے تھا، مولانا شبلی کو نہ قدیم الخیال علما کا پورا اعتماد حاصل ہو سکا، اور نہ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کا، مولانا نے الکلام، علم الکلام اور سیرت النبی میں بعض خاص بحثیں اپنے نقطۂ نظر سے لکھی تھیں، علماء کا طبقہ ان کو برداشت نہ کر سکا، یہاں تک کہ خود ان کے سب سے بڑے قدر دان اور مداح نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی بھی اُن کی تحریک ندوہ کے مخالفوں میں ہو گئے[1]، اور اس پر جو طوفان برپا ہوا، اور مولانا پر جس طرح اس طبقہ کی طرف سے حملے ہوئے وہ باخبر اصحاب سے پوشیدہ نہیں ہیں،

رہا تعلیم جدید کا گروہ، تو چونکہ یہ گروہ سرسید کے زیر اثر تھا، اور مولانا شبلی سرسید کی سیاسی بلکہ ایک حد تک تعلیمی پالیسی کے مخالف تھے، اور اس مخالفت کا برملا اظہار بھی کرتے تھے، اس بنا پر ظاہر ہے کہ ان کو

[1] معارف مولانا شروانی کے متعلق یہ بیان صحیح نہیں ہے، سیرت تو اس وقت چھپی بھی نہیں تھی،

اس طبقہ کا پورا اعتماد حاصل نہیں ہو سکتا تھا، علاوہ بریں بعض کوتاہ نظروں نے خواہ مخواہ مولانا شبلی کو خواجہ حالی سے ٹکرا دیا، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم جدید کے لوگوں میں ایک مستقل گروہ ایسا پیدا ہو گیا جس کا سب سے محبوب ادبی مشغلہ خواجہ حالی کی جا و بیجا مدح سرائی اور منقبت کرنا، اور ساتھ ہی مولانا شبلی پر مختلف دروازوں سے حملے کرتے رہنا تھا، چنانچہ تنقید شعر العجم، عطیہ فیضی کے نام مولانا شبلی کے خطوط وغیرہ کتابوں اور ان جیسے مضامین و مقالات کی اشاعت اسی طبقہ کی اندرونی کوششوں اور سرگرمیوں کی رہین منت ہے،

ان حالات اور اس ماحول میں مولانا شبلی کی سب سے بڑی خوش نصیبی یہ تھی کہ ان کو مولانا سید سلیمان ندوی کی شکل میں ایک ایسا شاگرد مل گیا جو وسعت مطالعہ، ذوق تحقیق، دقیقہ رسی، اور علم و فضل میں استاد کا صحیح جانشین تھا، اور ساتھ ہی اپنے اندر بہت سی ایسی خوبیاں اور کمالات رکھتا تھا، جو اسی کا اپنا حصہ تھے، اس کا قلم بجائے گرم مزاج ہونے کے نرم رو اور سبک خرام تھا، جو تنقید کے نازک سے نازک موقع پر بھی جادۂ احتیاط و اعتدال سے منحرف نہیں ہوتا تھا، اس کی طبیعت میں متانت و سنجیدگی اور علم و بردباری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، جس کی وجہ سے اس کے خامۂ گوہر فشاں کی پیشانی پر کبھی بھی جھنجھلاہٹ اور غیظ و غضب کے تیور ظاہر نہیں ہوتے تھے، تشرع، تدین، بلکہ تقشف اس کی قبائے علم کا تکمۂ زریں تھا، جس کے باعث کسی مسئلہ میں اختلاف کے باوجود جماعتِ علماء کو بھی اس پر نکتہ چینی کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی، پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے مزاج میں استقلال، طبیعت میں صلح پسندی، مزاج میں مسکنت تھی، فکر پر بجائے عقلیت اور تفلسف کے اشعریت بلکہ سلفیت غالب تھی، ان خداداد اوصاف و کمالات کے باعث وہ جس محفل میں بھی بیٹھا، صدر بزم ہو کر رہا، جس انجمن میں بھی شرکت کی شمع انجمن کہلایا،

مولانا سید سلیمان ندوی کے یہ وہ ذاتی اوصاف و کمالات تھے جن کے باعث جہاں مولانا شبلی کامیاب نہ ہو سکے وہ کامیاب ہوئے، اور جو عام اور ہمہ گیر اعتماد ان کو حاصل ہوا، وہ ان کے استاد کو حاصل نہیں ہو سکا تھا، علماء نے ان پر اپنے اعتماد کلی کا اظہار اس طرح کیا کہ وہ جمعیۃ علمائے ہند کے

سالانہ اجلاس منعقدہ کلکتہ کے صدر منتخب ہوئے، ایک عرصہ تک اوس کی مجلس عاملہ کے سربرآوردہ ممبر رہے،
جمعیۃ علماے ہند کے زیر اہتمام دلی میں آل انڈیا فلسطین کانفرنس ہوئی تو اس کے صدر بھی وہی ہوئے،
ندوۃ العلماء کی وہ سرزمین جو مولانا شبلی پر تنگ ہو گئی تھی، مولانا سید سلیمان ندوی کے لئے اُس نے عزت
واحترام کے ساتھ اپنی آغوش کھول دی، پھر علماء خواہ کسی مسلک و خیال کے ہوں مولانا کا ہر ایک مسلک کے
علماء میں بڑا وقار اور درجہ تھا، اور سب دل سے مولانا کے علم وفضل کے مداح ہونے کے ساتھ اُن کے تقویٰ
وفضائل کے قدردان تھے، دوسری طرف جس علی گڑھ کو مولانا شبلی نے حالات سے تنگ اور مجبور ہو کر خیرباد
کہا تھا، اُسی نے مولانا سید سلیمان ندوی کی علمی اور اسلامی خدمات کا اعتراف اس طرح کیا کہ مولانا کو
ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری دینے پر فخر کیا، علاوہ بریں وہ مسلم یونیورسٹی کی کورٹ کے اور اس کی
بعض اور مجلسوں کے رکن رکین ایک مدت تک ہوئے، انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کو مولانا کی ذات کے ساتھ جو عقیدت
وارادت تھی، اس کا اظہار مولانا محمد علی اور ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہما کے ان خطوط سے بھی ہوتا ہے جو ان
دونوں بزرگوں نے مولانا کو لکھے ہیں، مولانا محمد علی کے خطوط میں تو خیر نری عقیدت اور جوش ارادت کا ہی
اظہار ہے، لیکن ڈاکٹر اقبال کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی مسائل ومباحث پر غور کرتے وقت انھیں جب
کبھی کوئی الجھن اور دقت پیش آتی تھی، تو وہ فوراً مولانا کی طرف رجوع کرتے تھے، ڈاکٹر صاحب مرحوم کو
مولانا کے ساتھ جو گہری عقیدت تھی، اس کا عملی اظہار انھوں نے اس طرح بھی کیا کہ ادارہ معارف اسلامیہ
جس کے بانی خود ڈاکٹر صاحب تھے، اس کے اجلاس منعقدہ لاہور کی صدارت انھوں نے مولانا کو پیش کی، اور پھر
صدارت کی تحریک کرتے ہوئے انھوں نے جو الفاظ مولانا کی نسبت کہے تھے وہ اُن کے دلی جذبات ارادت
کے آئینہ دار تھے، انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کے اعتماد کا ایک اور واضح ثبوت یہ ہے کہ خلافت کا وفد انگلستان
گیا تو مولانا اوس کے رکن تھے، حجاز کی موتمر عالم اسلامی میں شرکت کرنے کے لئے ہندوستان سے خلافت
کا جو وفد گیا تھا جس میں مولانا محمد علی، شوکت علی، شعیب قریشی جیسے لوگ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کے

نمائندے تھے، مولانا اس وفد کے رئیس وامیر تھے، اُن کے علاوہ ہندوستان کی اور دوسری یونیورسٹیاں اور ان
یونیورسٹیوں کے مختلف علمی اور ادبی ادارے مولانا کو برابر بلاتے رہتے، اور اُن کے چشمۂ علم وفضل سے سیراب
ہوتے رہتے تھے،

اس اعتماد کے باعث مولانا کی تصنیفات وتالیفات، مضامین ومقالات، تقریریں اور خطبات
دونوں تعلیم یافتہ طبقوں میں مقبول وپسندیدہ تھے، ہر ایک اُن کی قدر کرتا، اور اُن سے فائدہ اٹھاتا تھا، اس
طرح مولانا شبلی کی تحریک کا جو اصل مقصد تھا، وہ باحسن وجوہ تکمیل کو پہنچا، یعنی ایک طرف علماے کرام نے
کتب درسیہ کے متون وحواشی اور منہیات وشروح کے دائرہ سے باہر نکل کر علماے سلف کے علمی کارناموں
کا جائزہ لینا شروع کیا، ان میں ذوق تحقیق وجستجو پیدا ہوا، تاریخ جس کو انھوں نے اپنے لئے شجر ممنوعہ بنا رکھا
تھا، اور اگر اس کی طرف توجہ بھی ہوتی، تو اس کا دار ومدار علامہ جلال الدین سیوطی کی تاریخ الخلفاء پر تھا، اس کی
طرف متوجہ ہوئے، فلسفہ تاریخ کا ذوق بڑھا، واقعات کی تحقیق وتنقید کا جذبہ ابھرا، اسلامی علوم وفنون
کے بہت سے گوشے تھے، جن کی طرف اب تک توجہ نہیں کی گئی تھی، اُن کی طرف بھی رجحان ہوا، اور پھر سب سے
بڑی بات یہ ہے کہ وقت کی زبان میں گفتگو کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی، دوسری جانب انگریزی تعلیم یافتہ
طبقہ کو اسلامیات سے دلچسپی ہوئی، قومی روایات کا احترام اور اُن کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا، مغربی مصنفین
کی غلط بیانیوں نے اسلامی تاریخ وثقافت سے متعلق جو نقوش بد ان کے دل و دماغ میں جما دیئے تھے، وہ
مٹنے لگے، اور اب خود ان میں مستند ذرائع معلومات کی روشنی میں اسلامیات پر ریسرچ کرنے کا ولولہ پیدا ہوا
اور اس طرح انھوں نے استادانِ مغرب کی اندھی پیروی سے نجات پائی، آج ہم میں کتنے ملکی اور غیر ملکی
یونیورسٹیوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات ہیں، جن کا موضوع تحقیق وتصنیف، اسلامی علوم وفنون، اسلامی دینیات
اور اسلامی ادبیات ہیں، کون کہہ سکتا ہے کہ اس عام فضا کے پیدا کرنے میں مولانا سید سلیمان ندوی کے علمی اور
اسلامی کارناموں کو بہت بڑا دخل نہیں ہے،

اس بنا پر کوئی شبہ نہیں کہ مولانا کے احسانات دونوں طبقوں پر ہیں، اور چونکہ ان دونوں کو مولانا نے
ایک دوسرے سے قریب کر دیا، اور ان میں علمی و دینی ارتباط و اتفاق پیدا کر کے انھیں اس قابل بنا دیا کہ وہ
باہمی اشتراک و تعاون سے اسلام کی اور مسلمانوں کی بیش از بیش مفید تر خدمات انجام دے سکیں، اس بنا پر
مولانا کا احسان تمام مسلمانوں پر بھی ہے، اس عام فیضان و احسان کے علاوہ اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا
چاہئے کہ مولانا طرز قدیم کے تعلیم یافتہ تھے، انھوں نے یونیورسٹیوں کے ایوانوں کے بجائے مدرسہ کی چٹائیوں
پر بیٹھ کر علم حاصل کیا تھا، اور وہ اپنی وضع قطع شکل و صورت، لباس اور عادات و اطوار ہر لحاظ سے طرز
تعلیم قدیم کے فرد تھے، اور اُن کو اس میں اتنا غلو تھا کہ تعلیم جدید کے حضرات کی بڑی بڑی انجمنوں میں بیٹھ کر
بھی اپنی مولویت کو چھپاتے نہیں، بلکہ اس پر فخر کرتے تھے، جب کبھی موقع ملتا تھا، ایک مخصوص لطیف پیرایہ
میں چٹکیاں بھی لے لیا کرتے تھے، چنانچہ راقم الحروف کو یاد ہے ندوۃ العلماء کا سالانہ جلسہ (غالباً ۱۹۲۶ء میں) امرتسر
میں منعقد ہو رہا تھا، میں اس زمانہ میں طالب علم تھا، اور لاہور میں مقیم تھا، لاہور سے میں اور ڈاکٹر محمد عبداللہ
چغتائی جو ڈاکٹر اقبال مرحوم سے خاص تقرب رکھتے، اور اُن کے ایڈیکانگ کی حیثیت رکھتے تھے، اس اجلاس میں
شرکت کرنے کے لئے امرتسر پہنچے، ڈاکٹر صاحب مرحوم کسی عذر کی بنا پر اس میں شرکت نہیں کر سکتے تھے، میں اور چغتائی
صاحب سفر کے بعد مولانا سید سلیمان ندوی کی قیامگاہ پر حاضر ہو کر مولانا سے ملے، تو مولانا نے علیک سلیک کے بعد
چغتائی صاحب سے خطاب کر کے پوچھا، کیوں ماسٹر صاحب! ڈاکٹر صاحب (ڈاکٹر اقبال) تشریف نہیں لائیں گے؟
چغتائی صاحب نے ڈاکٹر صاحب کی طرف سے عذر بیان کیا، تو مولانا نے فوراً اپنے خاص انداز میں مسکراتے ہوئے
فرمایا، اگر ڈاکٹر صاحب تشریف لے ہی آتے تو اچھا ہوتا، یہاں سب علماء جمع ہوں گے اُن کو سنانے کا
اس سے بہتر اور کیا موقع ہو سکتا، چغتائی صاحب نے معلوم نہیں سمجھے یا نہیں لیکن دہلی اور لکھنؤ کے جو حضرات اس
وقت وہاں موجود تھے، انھوں نے مولانا کے اس فقرہ سے بڑا لطف لیا،

غالباً ۳۹ء یا ۴۰ء کی بات ہے، ایک مرتبہ دہلی میں تشریف فرما تھے، اسی اثناء میں حسب معمول

ازراہ شفقت بزرگانہ ندوۃ المصنفین دہلی کے دفتر واقع قرول باغ میں ایک دن شام کے وقت تشریف لائے، ہم سب
بیٹھے چائے پی رہے تھے، اور مولانا کی شفقت آمیز باتوں اور مشوروں سے مستفید ہو رہے تھے کہ اتنے میں ایک
مشہور صاحب قلم جن کا رجحان تجدد کی طرف تھا، اور جن کا ایک مقالہ "برزخ" کی بحث پر حال میں ایک علمی مجلہ میں
شائع ہو چکا تھا، اچانک دفتر برہان میں آنکلے، مولانا نے انھیں دیکھا تو نیم استادہ ہو کر مصافحہ کے لئے ہاتھ
بڑھایا، اور مسکراتے ہوئے فرمایا "السلام علیکم یا اهل البرزخ" وہ تو یہ سن کر کچھ جھینپ سے گئے لیکن مولانا
مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی کے اس فقرہ نے کہا کہ دنیا میں جنت کہاں ہے؟ فضا کو صاف کر دیا، اسی
مجلس میں مولانا نے اپنی سیرت النبی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ بعض لوگ پوچھتے ہیں کہ سیرت پہلی، اور
دوسری جلد میں ختم ہو گئی، اب سیرت کہاں ہے؟ یہ تو سب اسلامی تعلیمات ہیں جن پر باقی جلدوں میں بحث
ہوئی ہے، تو بھئی اصل بات یہ ہے کہ انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کسی دینی کتاب کو پڑھتے ہی نہیں جس میں خالص دینی
اور مذہبی بحثیں ہوں، وہ صرف تاریخ اور سیرت سے مانوس ہیں، اس لئے میں نے دراصل عنوان سیرت کا ہی
رکھا ہے، اور اس بہانہ چاہتا ہوں کہ ان حضرات کو اسلام کی تمام دینی اور اخلاقی تعلیمات اور ان کے احکام و
مسائل سے واقف کر دوں، اس طرح گویا میں نے بچوں کی طرح اپنے اصل مقصد کے چہرہ پر ایک مٹی کا مصنوعی
چہرہ لگایا ہے، تاکہ ان حضرات کو توحش نہ ہو، اور وہ سیرت محمدیہ کے ساتھ ساتھ شریعت محمدیہ سے بھی واقف ہو جائیں

بہرحال اس گذارش کا مقصد یہ ہے کہ مولانا علماً و عملاً صورۃً و شکلاً ظاہراً و باطناً ایک عالم دین تھے، انھوں نے
جو کچھ کیا اسی حیثیت سے کیا، اور اپنے عالمانہ وقار کو ہر جگہ اور ہر موقع پر برقرار رکھا، اس بنا پر طبقۂ علماء کو ان کا
خاص طور پر ممنون و شکر گذار ہونا چاہئے کہ اُن کے ایک فرد فرید نے یونیورسٹیوں کی علمی مجلسوں ہسٹاریکل کانگرس
کے اجلاسوں اور ادبی و تحقیقاتی اداروں کے جلسوں کی صدارت کر کے اور اسلامی علوم و فنون کے علاوہ دوسرے
علمی، ادبی، تاریخی، اور سیاسی مسائل و مباحث پر محققانہ تصنیفات و مقالات لکھ کر صرف اپنے آپ کو سرفراز
و سربلند نہیں کیا، بلکہ تعلیم جدید کے حضرات کے دل و دماغ پر پورے طبقۂ علماء اور مدارس عربیہ کی علمی و تحقیقی سیادت

کی فہرست بھی ثبت کر دیا، ورنہ ظاہر ہے ان علمی مجلسوں میں علما کا گذر ہی کہاں تھا!

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی عظیم الشان خدمات علم و دین کا ایک بڑا روشن و تابناک پہلو یہ ہے کہ انھوں نے جو کچھ کیا خود ہی نہیں کیا، بلکہ ان ہی مدارس عربیہ کے پڑھے ہوئے اور بوریہ نشین علما میں سے ایک ایسی جماعت بنا کر دی، جو ارباب قلم بھی ہیں، اور علم و تحقیق کے میدان کے شہسوار بھی، اسلامیات کے مبصر بھی ہیں، اور ادبی مسائل و معاملات کے نکتہ دان و نکتہ سنج بھی، واقعہ یہ ہے کہ خود مصنف اور محقق ہونا اس قدر مشکل نہیں ہے جتنا کہ مصنف گر اور محقق ساز ہونا ہے، مولانا شبلی کی طرح مولانا سید سلیمان ندوی کو بھی قدرت نے اس کا خاص ذوق اور ملکہ عطا فرمایا تھا، اور اُن میں دوسروں کی علمی نگرانی و رہنمائی کا بڑا جذبہ تھا، دار المصنفین، مولانا جس کے ناظم اعلیٰ اور سرخیل و امام تھے، اس کا تو خیر قیام ہی اسی مقصد کے لئے ہوا تھا کہ ارباب قلم علما، اور محقق مصنفین پیدا ہوں، اس بنا پر اس ادارہ کے ارکان و رفقا کو تو مولانا کے فیضان تعلیم و تربیت سے بلاواسطہ اور براہ راست بہرہ مند ہونے کا شرف حاصل تھا ہی لیکن اس ادارہ سے باہر ملک کے دور دراز گوشوں میں جو نوجوان علمی ذوق رکھتے تھے، اور اس سلسلہ میں مولانا سے استفادہ کرنا چاہتے تھے، مولانا نے کبھی اُن کی امداد و اعانت میں دریغ نہیں فرمایا، اور بڑی خوشی سے جو علمی رہنمائی بھی وہ کر سکتے تھے، وہ کرتے تھے، خود راقم الحروف کو یاد ہے کہ ۲۶ء میں جب کہ میں دار العلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہونے والا تھا، میں نے مولانا کو ایک خط لکھا کہ میں کچھ تصنیف و تالیف کا ذوق رکھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ دو تین سال دار المصنفین میں آپکے زیر تربیت رہکر اپنے اس ذوق کی تکمیل کر دوں تو کیا یہ صورت ممکن ہے؟ مولانا نے بڑی شفقت اور محبت کے ساتھ دار المصنفین کے قواعد وضوابط کی ایک کاپی ارسال کر دی، اور افسوس کے ساتھ تحریر فرمایا کہ بالفعل کسی معاوضہ پر یہاں قیام کی کوئی صورت نہیں ہے، "ولعل اللہ یحدث بعد ذالک امراً" اس کے بعد لکھا کہ بہرحال آپ کو یہاں آنے کی ضرورت نہیں ہے، آپ مجھ سے جو فائدہ یہاں رہکر حاصل کرنا چاہتے ہیں، اپنی جگہ پر رہتے ہوے بھی کر سکتے ہیں، آپ جس عنوان پر لکھنا چاہیں، مجھکو اس سے مطلع کر دیں، میں بتا دوں گا کہ اس عنوان سے متعلق مواد کہاں

ملے گا، اسے کس طرح جمع اور کس طرح مرتب کرنا چاہئیے اور پھر جب آپ مقالہ تیار کر لیں، تو میرے پاس بھیج دیجئے میں اس میں اصلاح کر دیا کروں گا"

اس واقعہ کے دو تین سال بعد کا ذکر ہے، اس زمانہ میں میرے از ان قسم کے مضامین و مقالات پنجاب کے بعض ادبی رسالوں میں شائع ہوتے تھے لیکن مجلہ معارف کی جو عظمت میرے دل میں تھی، اس کی وجہ سے شوق تھا کہ کبھی معارف میں بھی میرے نام سے کوئی چیز شائع ہو، اس معیار کا کوئی مقالہ تو لکھا نہیں گیا، ایک نظم لکھی تھی جو بعد میں پنجاب کے ایک ادبی رسالہ میں شائع ہو گئی تھی، اس نظم کی نسبت خیال ہوا کہ معارف کے معیار کے مطابق ہے، فوراً مولانا کی خدمت میں ارسال کر دی، مولانا نے یہ نظم واپس کرتے ہوئے بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ تحریر فرمایا "آپ اس نظم نویسی کے چکر میں کہاں پڑ گئے ہیں آپکے مرتبہ سے گری ہوئی چیز ہے، کچھ محنت کیجئے، اور مقالہ نویسی پر توجہ کیجئے، قوم کو آپ سے اسی کی توقع ہو سکتی ہے، اور یہی ہونی چاہئے" مولانا کے اس گرامی نامہ کا میرے دل پر خاص اثر ہوا، اور مجھے اب تک یاد ہے کہ میں نے مولانا کے اس مکتوب گرامی کے جواب میں یہ شعر لکھا تھا،

کون ہوں کیا ہوں کہاں ہوں سب حقیقت کھل گئی
تو نے وہ ٹھوکر لگائی چشم غفلت کھل گئی

بہرحال حق یہ ہے کہ ارباب قلم و تحقیق علما کی ایک جماعت پیدا کر کے مولانا نے ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی میں جو انقلاب پیدا کیا ہے وہ آج پورے عالم اسلام میں اپنی نظیر آپ ہے ورنہ عہد حاضر کے ٹرکی، مصر، ایران، شام و بیروت، اور افغانستان پر نگاہ ڈالیے، تو معلوم ہوگا کہ مغربی طرز پر تحقیق و تصنیف کا جو کام بھی ہو رہا ہے، اسے جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہی انجام دے رہا ہے، طرز قدیم کی تعلیم کے حامل جو حضرات ہیں وہ اب تک اپنی اسی پرانی ڈگر پر چلے جا رہے ہیں اور دینیات و دینیات کے سولت کدہ سے باہر نکل کر نئی دنیا کی آب و ہوا سے زیادہ آشنا نہیں، اُس کا

نتیجہ یہ ہے کہ ان ملکوں کے جدید تعلیم یافتہ حضرات پر اسلامی تہذیب و ثقافت اور تمدن و معاشرت کا رنگ اتنا گہرا نہیں ہے، جتنا کہ ہندوستان کے اس طبقہ پر ہے، وہاں جدید و قدیم کا فرق و امتیاز اور ان کی باہمی بحث اور کشمکش اب تک قائم ہے، مصر میں جامعہ ازہر اور جامعہ فواد دونوں ایک دوسرے کے حریف ہیں لیکن ہمارے دیوبند علی گڑھ ندوۃ العلماء اور جامعہ ملیہ سب ایک دوسرے کے حلیف شریک اور متعاون ہیں، غور کیجئے اس انقلاب عظیم کا سرچشمہ کہاں ہے؟ اس میں شک نہیں کہ اس میں خلافت کی تحریک اور بعد میں کانگریس کی جدوجہد کو بھی دخل ہے لیکن جہاں تک اس انقلاب کے علمی پہلو کا تعلق ہے، کوئی شبہ نہیں، وہ بڑی حد تک سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کوششوں کا مرہون ہے۔

اب ایک اور پہلو سے دیکھئے خالص علمی اور تحقیقی کام اور پبلک لائف دونوں میں بیر ہے، دونوں کو نباہنا جام و سندان باختن سے کم مشکل نہیں ہے لیکن مولانا کو قدرت نے جو عجیب ہمہ گیر اور جامع طبیعت عطا فرمائی تھی، اس کی وجہ سے انہوں نے اس راہ کو بھی اپنے لئے آسان کرلیا تھا، تحریک خلافت اور اس کے بعد تحریک آزادی کے زمانہ میں وہ ان دونوں تحریکوں کے سرگرم زعماء کے دوش بدوش چلتے رہے، ملک کے دور دراز گوشوں کے اور ملک سے باہر بھی سفر ہو رہے ہیں، جلسوں میں تقریریں ہو رہی ہیں، اجلاس کا خطبہ صدارت پڑھا جا رہا ہے، مشاورتی کونسلوں میں شرکت ہو رہی ہے، قومی کارکنوں کی عملی نگرانی کی جا رہی ہے غرض کہ مسلمانوں کی قومی زندگی کا کوئی گوشہ تعلیمی ہو، یا سیاسی، مذہبی ہو یا معاشرتی، ادبی ہو یا علمی ایسا نہیں ہے جس میں مولانا عملاً شریک رہے ہوں اور اس کی سرگرمیوں میں حضور قلب و دماغ کے ساتھ حصہ نہ لیتے ہوں، اس بنا پر مولانا کی شہرت اور ان کی شخصیت کی عظمت کا احساس صرف طبقہ خواص تک محدود نہیں رہا بلکہ عام مسلمانوں اور ابنائے وطن نے بھی ان کی بندگی اور زعامت کے سامنے سر نیازمندی خم کر دیا،

علم و فضل کمال و ہنر اور عروج و ارتقاء کے یہ تمام منازل و مراحل طے کرنے کے بعد آخر وہ وقت بھی آگیا جب کہ علم کے حجابات ظاہری بھی اٹھ گئے، اور شاہد حقیقی کا جمال معنوی بلا کسی واسطہ و وسیلہ کے

جلوہ گر ہونے لگا، بعض کوتاہ نظر خواہ کچھ کہیں لیکن حق یہ ہے کہ آخر عمر میں مولانا کو جو روحانی مقام حاصل ہوا اور جس کی وجہ سے وہ علمی اور تحقیقی کاموں سے کنارہ کش ہو گئے تھے، وہ قرب و اتصال الٰہی کا ایک بلند مقام اور ایک انسان کے کمال کی معراج ہے، عشق کی فغان سنجی یا زمزمہ پیرائی ہجر و فراق کی مدت کے دراز ہونے تک باقی رہتی ہے لیکن جب حسن خود بے نقاب ہو کر سامنے آجائے، اور اپنی جلوہ طرازیوں سے عشق کی کائنات زندگی پر مستولی اور غالب ہو جائے تو عشق کی زبان گنگ ہو جاتی ہے، وہ مسحور و بےخود ہو کر قوت گفتار سے محروم ہو جاتا ہے، اور تجلیات میں گم ہو کر حیرت کی تصویر بن کر رہ جاتا ہے، علم کی مثال اس نقش پا کی سی ہے جس کے ذریعہ محبوب تک پہونچنے کی کوشش کی جائے لیکن جب محبوب خود سامنے آجائے تو اس وقت بھی اس نقش پا کی پیروی کرنا اور اسی کے اشاروں پر چلنا خود منزل مقصود سے دور ہونا نہیں تو اور کیا ہے؟ یہی وہ حقیقت ہے جس کو "العلم حجاب اکبر" میں بیان کیا گیا ہے،

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

حضرت سید صاحب کا آخر عمر میں روحانی لطائف و مزایا کی طرف مائل ہو جانا، اور اس میں غلو کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اب تک وہ جو کام کرتے رہے تھے، اس کو انہوں نے تکمیل کے آخری درجہ تک پہنچا دیا تھا، مولانا کی تخصیص نہیں بلکہ ہر صاحب کمال کا حال یہی ہوتا ہے کہ جب اس کا کمال عروج و ارتقاء کے آخری نقطہ تک پہنچ جاتا ہے، تو اب اس کو اس میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی، اور وہ اس سے منہ موڑ کر ایک ایسے مرغزار میں جا نکلتا ہے، جو زمان و مکان، این و آن اور زوال و فنا کے خرخشوں اور حد بندیوں سے ورا الورا ہوتا ہے، اور جہاں کسب کمال کی تشنگی کبھی نہیں بجھتی، خوب سے خوب تر تلاش کرنے والی نگاہ کو کبھی سیری نہیں ہوتی، جہاں دامان طلب کبھی پر نہیں ہوتا، جہاں قرب و اتصال کی ٹھنڈک شوق و اشتیاق کی آگ کو سرد نہیں کرتی، بلکہ اسے اور مشتعل کرتی ہے، آئزک نیوٹن جس نے عالم طبعیات میں ایک انقلاب عظیم

پیدا کر دیا، جب وہ سب کچھ کر چکا تو خود اس سے منحرف ہو کر گرجا سے وابستہ ہو گیا، اور اس کے قلب و روح
کو سکون وہین ملا، حضرتنا الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ الکشمیریؒ کا حال بھی یہی تھا، عمر بھر علم و تحقیق کے دیار
مین کونہ کونہ کی خاک چھانتے پھرے، اور ہزارون کو اپنے فیوضِ علمیہ سے باکمال بنا گئے، لیکن خود آخر عمر مین ذکر
و شغل اور مراقبہ و مناجات کی طرف حد سے زیادہ مائل ہو گئے تھے، اور فرماتے تھے کہ افسوس! ہم علم کے پیچھے لگے
رہے لیکن اصل کام جو کرنے کا تھا وہ نہ کیا !!

جس طرح آئزک نیوٹن اپنی لافانی تحقیقات و اکتشافات سے بیزار ہو کر ایک گوشہ مین جا بیٹھا، لیکن
دنیا آج تک اس سے فائدہ اٹھا رہی ہے، اور اٹھاتی رہے گی، اسی طرح اگرچہ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ خود
آخر مین اپنے عمر بھر کے کامون سے، ایک بلند تر و اعلیٰ تر مقصد کی خاطر، کنارہ کش ہو گئے تھے لیکن یہ انھون نے
اس وقت کیا تھا، جب اُن کی کوششون کا لگایا ہوا پودا پورے طور پر بار آور ہو چکا تھا، اور اُن کو یقین
تھا کہ اس سلسلہ مین انھین خود جو کام کرنا تھا، وہ اسے پورا کر چکے تھے، اور اب ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی
تھی، جو اُن کے نقشِ قدم پر چل کر اس کام کو برابر جاری رکھے گی اور فروغ دے گی، اس بنا پر اب آئندہ
اس راہ مین جو کام بھی ہوگا، وہ مولانا کی منت کشیِ احسان سے آزاد نہین ہو سکتا،

جیسا کہ مین نے اوپر کہا مجھکو مولانا سے براہِ راست تلمذ و استفادہ کا شرف حاصل نہین ہو سکا، لیکن واقعہ
یہ ہے کہ مین اپنے تئین مولانا کا تلمیذ معنوی سمجھتا ہون، کیونکہ مین نے مولانا شبلی، اور مولانا سید سلیمان ندوی اُن
کی کتابون سے کافی استفادہ کیا ہے، مجھکو ان دونون بزرگون کی کتابین اور بالالتزام مجلہ معارف پڑھنے کا
کا شوق اس وقت سے تھا جب کہ مین پورے طور پر ان کے مضامین سمجھنے کی استعداد بھی نہین رکھتا تھا،
دار العلوم دیوبند کی طالب علمی کے زمانہ مین مین اپنی اس خصوصیت کے اعتبار سے مشہور تھا، چنانچہ ایک مرتبہ
حضرت شاہ صاحب (مولانا سید محمد انور شاہ) کو یاجوج و ماجوج سے متعلق ایک بحث کا مطالعہ کرنے کے سلسلہ
مین ارض القرآن کو دیکھنے کا خیال پیدا ہوا تو ایک دن عشاء کی نماز کے بعد مسجد سے کمرہ کی طرف واپس

جاتے ہوئے، سیدھے میرے کمرہ مین تشریف لائے، اور کتاب طلب کی، جب مین نے افسوس کے ساتھ عرض
کیا کہ کتاب ہے مگر یہان نہین، اگرہ مین ہے، تو فرمایا، بس جب کتاب یہان تمہارے پاس بھی نہین تو اور کس کے پاس
ہوگی، دار المصنفین کی کتابین یہان اور پڑھتا کون ہے!"

تلمذ روحانی کی اس نسبت کی وجہ سے مجھکو سید صاحب کی ذات اور شخصیت کے ساتھ نہ صرف
ایک رسمی عقیدت تھی، بلکہ محبت بھی تھی، اور مجھکو یہ کہنے مین مسرت اور فخر دونون محسوس ہوتے ہین کہ حضرت
سید صاحب بھی مجھکو اسی بزرگانہ شفقت و کرم سے دیکھتے، اور اسی کے مطابق برتاؤ کرتے تھے، دلی جب کبھی
آتے تو ناممکن تھا کہ شرفِ ملاقات عنایت فرمائے بغیر واپس چلے جاتے، ایک مرتبہ مین نے برہان کے نظرات
مین اسلامی تعلیم گاہون کی خصوصیات بتاتے ہوئے ندوۃ العلماء کی نسبت "دینی مگر دنیوی" کا فقرہ لکھدیا،
یہ پرچہ حضرت سید صاحب کی نظر سے گذرا تو بڑا ملال ہوا، اسی اثنا مین کسی سفر مین کہین مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی
اور سید صاحب کی ملاقات ہو گئی، سید صاحب نے مولانا حفظ الرحمن سے فرمایا ہم لوگ تو مولوی سعید صاحب
کو اپنا ہی آدمی سمجھتے تھے، لیکن اب اُن کے قلم سے ندوہ کی نسبت یہ الفاظ پڑھ کر سخت صدمہ اور ملال
ہوا ہے،" مولانا سیوہاروی نے دہلی پہونچ کر مجھکو سید صاحب کی یہ شکایت پہنچا دی تو مجھکو خود اس کا بہت
افسوس اور ملال ہوا، کچھ دنون بعد لکھنؤ مین ایک جلسہ کے سلسلہ مین سید صاحب سے ملاقات ہو گئی تو
مین نے اس واقعہ کا ذکر کر کے عرض کیا کہ دراصل مجھ سے تعبیر مین کوتاہی ہو گئی، مجھکو ایک "بھی" کا لفظ اور لکھنا
چاہئے تھا، یعنی دینی مگر دنیوی بھی، تو میرا مطلب زیادہ واضح ہوتا، کیونکہ ظاہر ہے دین کے ساتھ دنیا جمع
کرنا عیب اور نقص نہین، بلکہ ہنر و کمال ہے،

"دین و دنیا بہم آمیز کہ اکسیر اینست"

اور درحقیقت ندوہ کے قیام کی ایک غرض یہ بھی تھی کہ ایسے علما پیدا کئے جائین جو علوم دینیہ کے ساتھ علوم
دنیویہ مین بھی کوتاہ نہ ہون، حضرت سید صاحب یہ سن کر غایت شفقت سے مسکرا دیئے، اور فرمایا، الآن

اصبت اور بات رفت وگذشت ہوگئی،

اب وہ شفقت ومحبت اور کرم وتوجہ یاد کرتا ہون تو دل تڑپ کے رہجاتا ہی، گویا میرتقی میرے مخدوم کے ساتھ!

مصائب اور تھے پر اُن کا جانا عجب اک سانحہ سا ہوگیا ہی!

میر کے اصل شعر مین بجائے "اُن" کے "دل" ہے،

فرحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً وطاب ثراہ

حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کے دینی وعلمی خدمات

(اُن کی تصانیف کی روشنی مین)

از

شاہ معین الدین احمد ندوی

حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی جیسی جامع کمالات شخصیتین کہین صدیون مین پیدا ہوتی ہین، وہ اپنے کمالات مین ائمہ سلف کی یادگار تھے، جملہ اسلامی علوم پر اُن کی نظر نہایت گہری اور وسیع تھی، اور بعض علوم مین امامت واجتہاد کا درجہ حاصل تھا، اور اُن مین اپنی علمی ودینی بصیرت اور تلاش وتحقیق کی ایسی یادگارین چھوڑ ین جو مدتون علمی دنیا کی رہنمائی کا کام دیتی رہین گی، ان کا علمی درجہ اتنا بلند اور اُن کے علمی ودینی خدمات کا دائرہ اتنا وسیع اور گوناگون اور اتنا متنوع ہے کہ اس کی تفصیل کے لئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہی، ایک مضمون مین اس کو سمیٹنا دریا کو کوزہ مین بند کرنے کی سعی لاحاصل کرنا ہے، اس لئے اس مضمون مین صرف اُن کی اہم تصانیف کی روشنی مین اُن کے علمی کمالات پر اجمالی تبصرہ کیا جائے گا، اور اُن کی تصنیفی خصوصیات دکھانے کی کوشش کیجائے گی جس سے اُن کے علمی درجہ اور ان کے دینی وعلمی خدمات کا سرسری اندازہ ہوسکے،

اُن کے علمی ودینی خدمات کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے اس کے پس منظر سے واقفیت ضروری ہے، اس کے بغیر اس کی قدر وقیمت کا صحیح اندازہ نہین ہوسکتا، اٹھارہوین خصوصًا انیسوین صدی مین مسلمانون کے سیاسی زوال کے ساتھ پوری اسلامی دنیا کے ہر شعبۂ زندگی مین ایک عام جمود وانحطاط طاری ہوگیا تھا، اور حکومت کیساتھ

دین و ملت، علم و اخلاق اور تہذیب و روایات بھی رخصت ہو رہے تھے، مغربی قوموں کی یلغار ایک طرف اسلامی حکومتوں کو ختم کر رہی تھی، دوسری طرف ان کے علوم و فنون اور نظر فریب تہذیب مسلمانوں کے مذہب و اخلاق اور تہذیب و تمدن کے قلعوں کو مسمار کر رہے تھے، اور مسلمان یورپ کی سیاسی غلامی کے ساتھ ساتھ اس کی ذہنی غلامی میں بھی مبتلا ہوتے جا رہے تھے، جو سیاسی غلامی سے بھی زیادہ سخت تھی،

یہی حال ہندوستان کے مسلمانوں کا بھی تھا خصوصاً ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد وہ اور بھی پست و پامال ہو کر رہ گئے تھے، عوام کو اس کا احساس نہیں تھا، اونچا طبقہ اس وقت بھی تعیش میں مبتلا اور خواب غفلت میں مدہوش تھا، علمائے کرام کا بڑا طبقہ اس انقلاب کے نتائج سے بے خبر پرانی بے روح مدرسی تعلیم فقہی جزئیات کے رد و قدح اور فروعی مسائل میں جنگ و مناظرے میں مشغول تھا، تاہم ان میں کچھ نفوس ایسے ضرور تھے جن میں مسلمانوں کی اس زبون حالی کا احساس اور ان کی سیاسی و مذہبی تجدید و اصلاح کا جذبہ موجود تھا، اور ان میں مجاہدانہ روح بھی تھی، مگر وہ بھی نئے حالات اور اس کے مقابلہ کے اسباب و ذرائع سے واقف نہ تھے اور صرف مذہبی تعلیم و مذہبی اصلاح کو مسلمانوں کی دینی اور دنیوی فلاح کا ذریعہ سمجھتے تھے، اور ان کی ساری کوششیں اسی دائرے کے اندر محدود رہیں، ان میں سے بعض مجاہدین قوت کے ذریعہ نئی حکومت کا تختہ الٹنا چاہتے تھے، مگر اس میں کامیابی کا کوئی امکان نہیں تھا،

اس کے مقابلہ میں ایک نیا گروہ تھا، اس کا مقصد بھی مسلمانوں کی فلاح تھا، وہ نئے حالات اور اس کے مقابلہ کے وسائل سے بھی واقف تھا، مگر نئی حکومت اس کے علوم و فنون اور اس کی تہذیب سے اس قدر مرعوب تھا کہ وہ محض جدید تعلیم اور مغربی تہذیب کی نقل و تقلید ہی کو مسلمانوں کی نجات کا ذریعہ سمجھتا تھا، اس لئے اس کی کوششیں زیادہ تر اسی دائرہ کے اندر محدود رہیں، اور ان دونوں کوششوں سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچا، اگر علماء کا طبقہ نہ ہوتا، تو ہندوستان سے دینی علوم اور دینی روح کا خاتمہ ہو جاتا، اور نئے طبقہ کی کوششیں نہ ہوتیں تو دنیاوی حیثیت سے مسلمانوں کا وجود ختم ہو جاتا، اس لئے ان دونوں کی کوششیں امت کے شکریہ کی مستحق ہیں

ان حالات میں سب سے سخت مرحلہ مسلمانوں کے مذہب اور ان کی تہذیب و روایات کی مدافعت اور ان کے تحفظ کا تھا، جن پر دو سمتوں سے حملے ہو رہے تھے، ایک عیسائی مشنریوں کا تبلیغی حملہ، دوسرے علم و تحقیق کی راہ سے مستشرقین کا، طریقہ تو پرانے بحث و مناظرے کا تھا، اس لئے اس دور کے علماء اور بعض نئے تعلیم یافتہ لوگوں نے اس کا پوری کامیابی سے مقابلہ کیا، اور ان کے خطرات کو بڑی حد تک روک دیا، مگر مشنریوں سے کہیں زیادہ خطرناک، اور ضرر رساں مستشرقین اور فضلائے مغرب کی جماعت تھی، جس نے پرانے طرز کے اعتراضات اور بحث و مناظرے کے بجائے جن کی اس عقل و دانش کے زمانہ میں کوئی قدر و قیمت نہ رہ گئی تھی، ایک نیا علمی اور سائنٹفک طریقہ اختیار کیا، انھوں نے عربی زبان سیکھی، اور اس کی نادر و نایاب کتابیں تلاش کر کے بڑی محنت سے تصحیح و تحشیہ کے ساتھ ان کو شائع کیا، اور خود مسلمانوں کی کتابوں سے غلط اور غیر معتبر واقعات و روایات ڈھونڈ کر، اور صحیح روایات میں تلبیس و ملمع سازی کر کے علم و تحقیق کے رنگ میں مذہب اسلام اور اسلامی تاریخ و تہذیب پر اعتراضات شروع کر دیئے، اور ان کو ایسی بدنما شکل میں پیش کیا، کہ انھیں پڑھ کر خود مسلمانوں کو شرم آنے لگی، ان مستشرقین میں ایسے بھی ہیں جو مذہب اسلام اور اسلامی تہذیب کے بڑے مداح ہیں، اور انھوں نے بڑی کشادہ دلی سے اسلام کی خوبیوں اور ساری دنیا خصوصاً یورپ پر مسلمانوں کے علمی و تمدنی احسانات کا اعتراف کیا ہے، اور اس پر مستقل کتابیں لکھی ہیں، لیکن ایسے کم ہیں جن کا دامن بالکل پاک ہو، اور انھوں نے کسی نہ کسی پہلو سے کوئی نہ کوئی زہر چکانی نہ کی ہو،

اس قسم کی تحریروں کا اثر نہ صرف دوسری قوموں بلکہ ان تعلیم یافتہ مسلمانوں پر بھی جو اپنے مذہب اور اپنی تاریخ سے واقفیت نہیں رکھتے، برا اثر پڑتا تھا، اور اسلام کے متعلق ایک عام غلط فہمی پھیل رہی تھی، اس حملہ کے مقابلہ کے لئے دینی علوم میں پوری مہارت اور دینی بصارت کے ساتھ اسلامی تاریخ میں وسعت نظر، تلاش و تحقیق کے جدید طریقوں، مغربی زبانوں، جدید افکار و تصورات، اور نئے رجحانات سے واقفیت ضروری تھی، اور ان تمام باتوں کا اجتماع نہ پرانے علماء میں تھا، اور نہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں، علماء کا بڑا طبقہ سرے سے ان حالات ہی سے بے خبر تھا، نیا طبقہ

جو باخبر تھا، اس میں صحیح دینی روح نہ تھی، تاہم سب سے پہلے اسی طبقہ کے فضلاء میں سر سید احمد خان، اور مولوی چراغ علی وغیرہ نے اپنی بساط کے مطابق اس فرض کو انجام دیا، اور مستشرقین کے اعتراضوں کے جواب میں مضامین اور کتابیں لکھیں، مگر یہ لوگ دینی علوم کے ماہر نہ تھے، اور نہ صحیح دینی بصیرت رکھتے تھے، اس کے علاوہ وہ مغربی علوم اور مغربی تہذیب سے اس قدر مرعوب تھے کہ ہر چیز میں اسی کو رد و قبول کا معیار سمجھتے تھے، اس لئے حسن نیت کے باوجود انھوں نے بھی وہی غلطی کی جو اسلام کی ابتدائی صدیوں میں یونانی فلسفہ کے اعتراضات کے جواب میں متکلمین بالخصوص معتزلہ اور باطنی کر چکے تھے، یعنی معترضین کے تمام اعتراضات کو صحیح مان کر اُن کے جوابات دینے کی کوشش کی، گو ان کے بعض جوابات محققانہ بھی تھے، لیکن جن اعتراضات کا جواب نہ بن پڑا ان میں خود اسلامی عقائد و تعلیمات میں ایسی تاویلیں کیں جن کو حقیقت سے کوئی علاقہ نہ تھا، تاہم انھوں نے حسن نیت سے اپنے مقدور بھر اس فرض کو انجام دیا، اور اس سے ایک طبقہ کو فائدہ بھی پہنچا،

علماء کی جماعت میں مولانا شبلی پہلے شخص ہیں، جن میں یورپین فضلاء کے اس علمی حملہ کے مقابلہ کے شرائط بڑی حد تک موجود تھے، وہ اسلامی علوم کے بھی ماہر تھے، اسلامی تاریخ پر بھی اُن کی نظر بہت وسیع تھی، نئے خیالات و رجحانات اور مستشرقین کے اعتراضات سے بھی ان کو ایک حد تک واقفیت تھی، اس لئے اُن کی نظر اس فتنہ کے تمام گوشوں تک پہنچی، اور ہر گوشہ سے انھوں نے اس کو روکنے کی کوشش کی، اور ان کے زمانہ میں جن اعتراضات کا زیادہ شہرہ تھا، اُن کے نہایت محققانہ جوابات دئے، الجزیہ، کتب خانہ اسکندریہ، اورنگ زیب عالمگیر، اور الانتقاد علی التمدن الاسلامی وغیرہ اس سلسلہ کے معرکۃ الآراء مضامین ہیں۔

اس سلسلہ میں اُن کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ متفرق اعتراضات کے جواب کے ساتھ انھوں نے مذہب اسلام، اسلامی تاریخ اور اسلامی تہذیب کو ایسے محققانہ اور دلنشین انداز میں پیش کرنے کا سلسلہ شروع کیا جس میں اعتراض کی گنجائش باقی نہ رہے، اور معترضین بھی اُن کی عظمت ماننے پر مجبور ہو جائیں، اور اس سلسلہ میں بکثرت مضامین اور مستقل کتابیں لکھیں، یہ مضامین مقالات شبلی میں موجود ہیں، اور اُن کی بیشتر تصانیف اسی سلسلہ کی

کڑیاں ہیں، اور اُن کی ساری تصانیف کا مرکز و محور ایک ہی نقطہ ہے، خواہ وہ کسی موضوع سے تعلق رکھتی ہوں، اس سے ایک نیا علم کلام پیدا ہوا جس کی بنیاد پرانے فلسفہ اور منطق کے بجائے عقل و درایت اور تنقید و تاریخ پر ہے، اور اس سلسلہ کی سب سے اہم کتاب سیرۃ النبی ہے،

بعض مستشرقین نے اسلام کے خلاف سب سے بڑا حربہ یہ اختیار کیا تھا کہ نعوذ باللہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہی کو اعتراضات کا نشانہ بنا کر مجروح کر دیا جائے، اس سے خود بخود اسلام کی پوری عمارت منہدم ہو جائے گی، چنانچہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر مختلف قسم کے اعتراضات کا سلسلہ شروع کیا، علامہ شبلی مرحوم نے ان متفرق اعتراضات کا جواب دینے کے ساتھ ساتھ سیرۃ النبی پر ایک مبسوط کتاب لکھنے کا ارادہ کیا جس میں سوانح نبوی کے ساتھ اسلام کے عقائد و احکام و اعمال کی بھی تفصیل آجائے، اور وہ سیرت پاک اور اسلام کا ایسا صحیح اور دلکش مرقع ہو جس میں کسی اعتراض کی گنجائش ہی باقی نہ رہے، اور جسے دیکھ کر مخالفین کو بھی آنحضرت صلعم، اور آپ کے لائے ہوئے مذہب کی حقانیت، صداقت اور عظمت و جلالت کا یقین ہو جائے، چنانچہ بڑے سر و سامان سے اس کتاب کی تالیف شروع کی، مگر ابھی اس کی دو جلدیں لکھی تھیں، اور وہ شائع بھی نہ ہوئی تھیں کہ اُن کا وقت آخر ہو گیا، اور وہ اس کام کی تکمیل اپنے لائق شاگرد مولانا سید سلیمان ندوی کے سپرد کر گئے، جنھوں نے نہ صرف اس عظیم الشان کام کو مکمل کیا، بلکہ اسلامی علوم و فنون میں تلاش و تحقیق اور اس کی تعبیر و ترجمانی کی نئی نئی راہیں نکالیں، اور اس کی مختلف شاخوں میں اپنے علم و نظر کی وسعت اور تحقیق و تلاش کے بے مثال نمونے چھوڑ گئے،

اُن کے علمی و دینی خدمات کا دائرہ نہایت وسیع ہے، مگر ان سب کی غرض و غایت تقریباً ایک ہے یعنی اسلامی احکام و تعلیمات کی صحیح اور دلنشین تعبیر و ترجمانی، اور اسلامی علوم و فنون، اسلامی تاریخ، اسلامی تہذیب و ثقافت اور مسلمانوں کے علمی تمدنی کارناموں کی محققانہ مرقع نگاری، یہ موضوع اتنا وسیع ہے کہ اس میں پوری اسلامی تاریخ آجاتی ہے، اور اُن کی بیشتر بلکہ تقریباً کل تصانیف اور مضامین کا محور و مرکز یہی نقطہ ہے، گو اُن کے ہمہ گیر علم و قلم کی عنان کبھی کبھی خالص علم و ادب کی جانب بھی مڑ جاتی تھی، اگر بہت کم مضامین ایسے نکلیں گے، جو کسی نہ کسی حیثیت

سے جس مرکزی مقصد سے تعلق نہ رکھتے ہون، ان کی نظر تمام اسلامی علوم پر یکسان تھی، مگر قرآن مجید، قدیم وجدید علم کلام، اسلامی تاریخ اُن کا خاص موضوع تھے، اور اُن کے بیشتر مضامین وتصانیف اسی سے تعلق رکھتے ہین، ان مین سیرۃ النبی شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے، اس مین اُن کے خاص فنون کا اجتماع ہے، اور ان کے علم وتحقیق کی تمام شانین ابھر نظر آتی ہین

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

یہ کتاب اپنی خصوصیات مین سیرۃ کے سارے ذخیرہ کتب مین خواہ وہ کسی زبان مین لکھی گئی ہون منفرد حیثیت رکھتی ہے، حتی کہ عربی مین بھی اس نوعیت کی ایسی جامع کوئی سیرت نہین لکھی گئی، سیرۃ النبی کی تالیف سے پہلے اردو مین سیرۃ نبوی پر جس قدر کتابین لکھی گئین، وہ زیادہ تر مغازی اخلاق وشمائل نبوی پر مشتمل ہین، اور ان مین روایات کی صحت اور تحقیق وتنقید کا کوئی اہتمام نہین کیا گیا اور وہ ہر قسم کی رطب ویابس روایات کا مجموعہ ہین صرف بعض کتابین مثلاً قاضی سلیمان صاحب منصورپوری کی رحمۃ للعالمین، اور اس قسم کی چند کتابین اس سے مستثنیٰ ہین مگر ان کا نقطۂ نظر بھی علامہ شبلی کی سیرۃ النبی سے مختلف تھا، اور وہ صرف دیندار مسلمان کے ذوق کی تھین، ان مین مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات اور جدید ذوق ورجحان کی تشفی کا کوئی سامان نہ تھا، اس لحاظ سے اردو مین یہ پہلی سیرت ہے جس مین ان تمام ضروریات کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے، اور جس مین سوانح اور شمائل نبوی اور اسلام کی تعلیمات کو ایسے محققانہ اور دلنشین انداز مین پیش کیا گیا ہے جس سے منکرین ومخالفین بھی اُن کی صداقت وعظمت ماننے پر مجبور ہوجائین، اس کی نمایان خصوصیات یہ ہین کہ وہ تنہا سوانح نبوی نہین ہے بلکہ اسمین اسلام کے عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق کا خلاصہ آگیا ہے، اور اس حیثیت سے وہ اسلامی تعلیمات کی دائرۃ المعارف کہی جاسکتی ہے، دوسری خصوصیت یہ ہے کہ روایات کے رد وقبول مین بڑی احتیاط برتی گئی ہے، اور ان کی تحقیق مین نقد وجرح اور روایت ودرایت کے تمام محدثانہ اور محققانہ اصولون کو کام مین لایا گیا ہے، اور صرف معتبر اور مستند روایتین لی گئی ہین، اس سلسلہ مین سیرۃ النبی کا مقدمہ جس مین سیرت نبوی کے عربی ماخذون اور روایت ودرایت کے اصولون پر بحث کی گئی ہے

نہایت اہم چیز ہے، تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ان تمام اعتراضون کو پیش نظر رکھا گیا ہے جو مخالفین کرتے ہین اور مناظرانہ بحث ومباحثہ اور اعتراض وجواب مین پڑنے کے بجائے نفس واقعہ کو ایسے محققانہ انداز مین پیش کیا گیا ہے کہ اعتراض خود بخود اٹھ جاتا ہے، اور جو اعتراضات غیر معتبر روایات پر مبنی ہین، وہ ان کی تنقید ہی سے دور ہوجاتے ہین، اسی کے ساتھ جدید دور کے سیرت نگارون اور متکلمین کی غلطیون سے پورا احتراز کیا گیا ہے، اور محض اعتراض سے بچنے کے لئے نہ کسی صحیح واقعہ کا انکار کیا گیا ہے، اور نہ غلط تاویل کی گئی ہے، بلکہ اعتراض سے بے محققانہ نگاہ ڈالی گئی ہے، جو اعتراضات غلط فہمی یا قصور نظر کا نتیجہ ہین اُن مین غلط فہمی کا ازالہ کیا گیا ہے، جو غیر معتبر روایات پر مبنی ہین، ان پر تنقید کرکے ان کی بے اعتباری ظاہر کردی گئی ہے، اور جو معترضین کے خود ساختہ نقطۂ نظر کا نتیجہ ہین، اُن مین نقطۂ نظر ہی کو غلط ثابت کیا گیا ہے، اور کسی مسئلہ مین صحیح اسلامی نقطۂ نظر سے قدم ہٹنے نہین پایا ہے، اور سارے مسائل کو قرآن مجید اور احادیث نبوی کی روشنی مین پیش کیا گیا ہے، اور کسی عقیدہ وخیال مین سلف صالحین کے عقیدہ سے انحراف نہین کیا گیا ہے،

یہ کتاب چونکہ اسلامی تعلیمات کا بھی خلاصہ ہے، اس لئے اس مین مذہبی عقائد، شرعی قوانین، اخلاقی اصول اور تاریخی واقعات ہر قسم کے مسائل زیر بحث آئے ہین، جن مین عالم غیب، وحی، ملائکہ، یوم آخرت، جزا وسزا، دلائل ومعجزات وغیرہ جیسے مابعد الطبیعی نازک مسائل بھی ہین جن کو ایمانی ذوق اور وجدان سلیم کے بغیر تنہا عقل اور مادی حواس کی مدد سے سمجھنا مشکل ہے، اور ایسے موقعون پر بڑے بڑون سے چوک ہوجاتی ہے مگر مصنف نے ادنیٰ لغزش کے بغیر اس خوبی سے ان نازک مراحل کو طے کیا ہے کہ کہین نقل وروایت اور کتاب وسنت کا دامن ہاتھ سے نہین چھوٹا ہے، اور کسی صحیح عقیدہ کی غلط تاویل نہین کی گئی ہے دوسری طرف ہر بحث عقل ودرایت کی حیثیت سے اس قدر مدلل، دلپذیر اور دلنشین ہے کہ عقل سلیم کے لئے اس مین کسی شک وشبہہ کی گنجائش باقی نہین رہتی، غرض سیرت نبوی علم ونظر کی وسعت، تحقیق وتنقید، دیدہ وری ونکتہ سنجی، دلائل کی دلنشینی اور اسلامی تعلیمات کی صحیح اور حکیمانہ تعبیر وترجمانی کا ایسا شاہکار ہے اور اس مین مصنف کے علمی کمالات کے ایسے

گوناگون جلوے ہین، کہ اُن کی ایک جھلک بھی اس مضمون مین دکھانا ممکن نہین، اگر سیرۃ النبی کے مباحث کی صرف
سرخیان نقل کیجائین تو بھی ایک ضخیم کتاب تیار ہوجائے گی، ایسی حالت مین ایک مختصر مضمون مین اس کی پوری
کی گنجایش کہان سے نکل سکتی ہے، اس لئے صرف ہر جلد کے موضوع اور اس کے مباحث کا اجمالی خاکہ پیش
کرنے پر اکتفا کیجائے گی، جس سے ان مباحث کی نوعیت کا اندازہ ہوسکے،

سیرۃ النبی چھ ضخیم مجلدات مین ہے، پہلے دو حصے علامہ شبلی کے قلم سے ہین، اور باقی چار مولانا سید سلیمان ندوی
کی تالیف ہین، پہلے حصہ مین فن سیرت پر ایک مبسوط مقدمہ ہے جس مین سیرۃ نبوی کی اہمیت و ضرورت اور اس کی
کی مختصر تاریخ، اور اس کے قدیم ماخذون کا محققانہ جائزہ لیا گیا ہے، اور سیرت سے متعلق حدیث، مغازی اور سیرت اور
تاریخ کی روایات کے رد و قبول کے بارہ مین محدثانہ اصول سے ناقدانہ بحث کی گئی ہے، اور آخر مین سیرت کے
یورپین مصنفین اور ان کی تصانیف پر مختصر تبصرہ کیا گیا ہے، یہ مقدمہ اپنے معلومات و مباحث کے لحاظ سے ایک مستقل
تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے، اس کے بعد دوسرے مقدمہ مین عرب کی قدیم سیاسی و مذہبی تاریخ ہے جس مین
خانۂ کعبہ کی تعمیر، حضرت اسمٰعیلؑ کے ذبیح ہونے کی بحث بھی آگئی ہے،

اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے، اس مین آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ولادت سے لے کر پہلے حج تک غزوات
و سرایا کے مفصل اور محققانہ حالات ہین، اس مین اسلامی جہاد، غزوات نبوی، یہود خیبر کی جلاوطنی، اور بعض ازواج
مطہرات سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح کے متعلق جو اعتراضات کئے جاتے ہین، ان کا محققانہ جواب
بھی دیا گیا ہے، آخر مین غزوات پر مجموعی تبصرہ ہے، جس سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ اسلام کا مقصود قتل و خونریزی
اور ملک گیری نہیں، بلکہ صرف اسلام کی پرامن تبلیغ اور عرب مین امن و امان کا قیام تھا، اور یہ لڑائیان محض کفار
و مشرکین کی مزاحمت اور ان کی زیادتیون کی وجہ سے پیش آئین، اس کے باوجود اسلام نے نہایت منصفانہ اصول
جنگ اختیار کئے اور پرانے وحشیانہ طریقون کا خاتمہ کرکے اسلامی جہاد کو عبادت اور خیر بنا دیا،

دوسرے حصہ مین نبوت کی پرامن زندگی یعنی اسلام کی تبلیغ و اشاعت قبائل عرب کا قبول اسلام،

مدینہ مین اسلامی حکومت کی تاسیس اس کے سادہ نظام، مذہبی تعلیمی و تبلیغی انتظامات، شریعت کی تکمیل، اس کے
یعنی عقائد، عبادات، معاملات حلال و حرام، حجۃ الوداع، خطبۃ الوداع، وفات نبوی، آپ کے شمائل و معمولات
اخلاق و سیرت، ازواج مطہرات، اولاد امجاد، اور اہل بیت کی زندگی کے حالات ہین، اور ان تمام حالات و
واقعات کو خواہ وہ تبلیغ اسلام سے تعلق رکھتے ہون، یا میدان جنگ سے خانگی زندگی سے متعلق ہون، یا پبلک
زندگی سے، پیغمبر کی حیثیت سے ہون، یا عام انسان کی حیثیت سے دشمنون سے متعلق ہون، یا دوستون سے، غرض
زندگی کے جس شعبہ سے بھی تعلق رکھتے ہون، اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ جس سے آپ کی پیغمبرانہ صداقت، اور
اخلاقی عظمت پوری طرح نمایان ہوجاتی ہے، اور آپ کے خلق کریم کو دیکھ کر مخالف بھی آپ کی عظمت ماننے پر
مجبور ہوجاتا ہے،

جہان تک خاص سیرت نبوی کا تعلق ہے، وہ ان دونون حصون پر ختم ہوجاتی ہے، مگر اس سیرت کی تالیف
کا مقصد محمد الرسول اللہ کے سوانح کے ساتھ آپ کے لائے ہوئے مذہب کو بھی پیش کرنا تھا، اس لئے باقی حصون مین
اسلامی تعلیمات کی تفصیلات ہین، اس مین سب سے اہم مسئلہ دلائل و معجزات کا ہے، اگرچہ معجزات اور خوارق عادات
تمام مذاہب مین مشترک ہیں، مگر عقل پرستون کے عقل کی سمائی سے سب سے زیادہ وہی باہر ہین، اس لئے تیسری جلد جو
دلائل و معجزات پر ہے، اس مین پہلے نفس معجزہ کی حقیقت، اور قرآن مجید، قدیم و جدید فلسفہ اور علم کلام کی روشنی مین
معجزہ کے امکان و وقوع پر بڑی مبسوط بحث کی گئی ہے، اور یہ دکھایا گیا ہے، کہ خود نوامیس فطرت کے لحاظ سے
بھی خوارق عادت یا معجزہ مین کوئی عقلی استبعاد نہین ہے، اس مین حسب ذیل بحثین ہین، دلائل و معجزات کی
حقیقت، دلائل و معجزات اور فلسفۂ قدیم و علم کلام، معجزات اور فلسفۂ جدید، معجزات کا امکان اور اس کا استبعاد،
معجزات کا یقین، اس کی غرض و غایت، آیات و دلائل اور قرآن مجید، ان مباحث کے بعد خصائص نبوت یعنی
وحی الٰہی، نزول ملائکہ، رؤیا اور معراج و شرح صدر کا بیان ہے، پھر ان آیات و معجزات کا ذکر ہے، جو قرآن
مجید اور معتبر روایات سے ثابت ہین، اس کے بعد غیر معتبر روایات پر تنقید کی گئی ہے، پھر بعثت نبوی کی ان [illegible] کو

کا تذکرہ ہے، جو قدیم الہامی صحیفوں میں ہیں، اور آخر میں خصائصِ محمدی کا ذکر ہے، ان مباحث میں اس جامعیت
اور استقصار کے ساتھ معجزات پر بحث کی گئی ہے کہ اس کا کوئی گوشہ اور کوئی رُخ چھوٹنے نہیں پایا ہے، اور ان کا
کا خلاصہ یہ ہے کہ معجزات کے صدور میں کوئی عقلی استحالہ نہیں ہے، اور نہ وہ نوامیس فطرت کے خلاف ہیں، دنیا
میں بہت سے ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں، جن کی کوئی عقلی توجیہ نہیں ہوسکتی، اس لئے اگر خالقِ کائنات دینِ
مطلق کسی حق کے اثبات اور کسی پیغمبر کی تائید کے لئے خرقِ عادت کا ظہور کر دے تو اس میں کوئی عقلی استحالہ،
اور معجزات کا مقصد صرف عوام کی تشفی ہوتا ہے خواص کے لئے اس کی ضرورت نہیں ہوتی،

چوتھی جلد اسلام کے بنیادی عقائد پر ہے، اور اس میں نبوت، وحی، ملائکہ، قیامت، سزا و جزا، اور جنت و
دوزخ وغیرہ جیسے مابعد الطبیعی مسائل پر بحث ہے، اس لئے وہ تیسری جلد سے بھی زیادہ اہم ہے، اس میں پہلے منصب
نبوت پر ایک مبسوط مقدمہ ہے، جس میں نبوت کی حقیقت، اس کی اہمیت و ضرورت پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس کے
لوازم و شرائط بیان کئے گئے ہیں، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت دنیا کی تمام قوموں کی مذہبی حالت،
اور اُن کی اخلاقی اور روحانی پستی کا نقشہ دکھایا گیا، خصوصاً عرب کے حالات زیادہ تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں، پھر آنحضرت
(صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت، اور عربوں کی اصلاح میں آپ کو جو گوناگوں دشواریاں پیش آئیں، اور بالآخر اسلام نے جو
عظیم الشان انقلاب پیدا کیا، اس کی تفصیل ہے، اس کے بعد اسلام کے بنیادی عقائد یعنی اللہ تعالیٰ پر ایمان،
فرشتوں، انبیاء و رسل، اور کتبِ سماوی پر ایمان کی تفصیل ہے، پھر عالمِ برزخ، جزا و سزا، دوزخ و جنت،
قضا و قدر کے مباحث ہیں، اور آخر میں ایمان کے نتائج کا ذکر ہے، اور ان تمام نازک اور دقیق مسائل کو
جن کا محض عقل و مادی حواس کے ذریعہ سمجھنا بہت دشوار ہے، ایسے حکیمانہ اور دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے
کہ قلب سلیم کی تشفی کے لئے بالکل کافی ہے

پانچواں حصہ عبادات پر ہے، اس میں پہلے اعمال صالحہ کی اہمیت دکھائی گئی ہے، اور اس کے اقسام بیان
کئے گئے ہیں، جن میں سب سے زیادہ اہم عبادت ہے، اس کے بعد اسلامی عبادات کی خصوصیات اور ان کے ارکان

وازن پر روشنی ڈالی گئی ہے، پھر جسمانی عبادات یعنی نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج اور جہاد کی تفصیل اور ان کی حکمتوں اور مصلحتوں کی
تشریح ہے، پھر قلبی عبادات جو جسمانی عبادات کی روح کی حیثیت رکھتی ہیں، مثلاً تقویٰ، اخلاص، توکل، اور صبر و
شکر وغیرہ کی تفصیل، اور ان کی ایسی حکیمانہ تشریح ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسانی اخلاق کے تزکیہ و تطہیر اور
تعلق مع اللہ کا سب سے بہتر وسیلہ اسلامی عبادات ہیں، اس سلسلہ میں دوسرے مذاہب کی عبادات سے اسلامی عبادات
کا موازنہ بھی آگیا ہے،

چھٹا حصہ اخلاق پر ہے، دنیا کا سارا نظام اور انسانیت کا سارا شرف اخلاق ہی سے وابستہ ہے، اسی لئے
تمام مذاہب میں اخلاق کی اہمیت ہے، اور اس حیثیت سے کہ اُن کا تعلق زیادہ تر حقوق العباد سے ہے، وہ عبادات سے
بھی زیادہ اہم ہیں، اور اسلام میں اُن کی سب سے زیادہ اہمیت ہے، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کا
مقصد ہی مکارمِ اخلاق کی تکمیل بتلایا ہے، اس حیثیت سے یہ حصہ بھی نہایت اہم ہے، اور اس میں فلسفۂ اخلاق
اور اس کی تمام جزئیات پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، اور اسلامی اخلاق کے امتیازی پہلوؤں کو نمایاں کیا
گیا ہے، اس میں پہلے اسلام اور اخلاقِ حسنہ کا تعلق ظاہر کیا گیا ہے، اور اسلام میں اس کی اہمیت دکھائی گئی ہے، پھر
دنیا کے تمام اخلاقی معلموں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز نمایاں کیا گیا ہے، پھر اسلام کے فلسفۂ اخلاق پر روشنی
ڈالی گئی ہے، اور دوسرے مذاہب کی اخلاقی تعلیمات کی خامیاں اور کمزوریاں اور اُن کے مقابلہ میں اسلام کی
اخلاقی تعلیمات کی جامعیت و کاملیت دکھلائی گئی ہے، پھر تعلیم اخلاق کے مختلف طریقوں کو بتلا کر آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کے طریقۂ تعلیم کی خوبی ظاہر کی گئی ہے، پھر انسانوں کے باہمی حقوق و فرائض اور اخلاقِ فاضلہ اور اخلاقِ رذیلہ
کی تفصیل ہے، آخر میں آدابِ معاشرت کا اجمالی ذکر ہے، اس طرح یہ کتاب اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا مرقع ہے،
اور اس سے اندازہ ہوتا ہے، کہ اسلام نے اخلاق کو کتنی اہمیت دی ہے، اور اس کی اخلاقی تعلیمات کس قدر
جامع کامل اور حکیمانہ ہیں،

اسلام درحقیقت کوئی نیا مذہب نہیں ہے، بلکہ قدیم الہامی مذاہب کی اصلاح شدہ ترقی یافتہ اور آخری تکمیلی

شکل ہے ان مذاہب مین دو قسم کی خامیان تھین، ایک انسانون کی پیدا کردہ دوسری فطری، انسانون کا پیدا کردہ
نقص یہ تھا کہ انھون نے ان مین اپنے حسب منشا، تصرفات کر کے اُن کی شکل اس قدر بدل دی تھی، اور اُن مین
اس قدر آمیزش کر دی تھی کہ اصل شکل کا پہچاننا مشکل تھا، اور ان کا اصل مقصد ہی فوت ہو گیا تھا، اسلام نے اُن کو اس
آمیزش سے پاک کر کے اصلی شکل مین جلوہ گر کیا،

فطری نقص یہ تھا کہ مذاہب درحقیقت انسانیت کی تکمیل کا نصاب ہین، اور نصاب تعلیم کی ترقی کے ساتھ
بدلتا رہتا ہے، اس لئے انسانی ارتقاء کے ساتھ مذاہب کی تعلیمات بھی بدلتی رہین، اور ہر دور کے انسانون
کی عقل و دانش، اُن کے حالات و ضروریات کے مطابق ان مین تغیر اور ترقی ہوتی رہی، قدیم انسانون کی ذہنی
ادراک و تعقل ادنی درجہ کی تھی، اور اُن کی ضروریات بھی سادہ اور محدود تھین، اور انکا دائرہ خاص خاص قومون
تک محدود تھا، ان مین عالمگیریت نہ تھی اسلئے اُنکے مذاہب بھی اسی کے مطابق تھے، پھر جیسے جیسے انسان عقل و شعور مین ترقی کرتا گیا
ضروریات بڑھتی گئین، اور انسانیت کا دائرہ پھیلتا گیا، اسی قدر اُن کے مذاہب مین بھی بلندی، وسعت، گہرائی
اور عالمگیریت آتی گئی، اور پرانے مذاہب کی وہ تعلیمات جو ترقی یافتہ دور کے انسانون کے لئے موزون نہ رہی تھین
منسوخ ہوتی گئین، اور اُن کی جگہ نئی موزون تعلیمات آتی گئین، اور مذہب کا یہ ارتقاء انسانی ارتقاء کیساتھ برابر جاری
رہا، تا آنکہ انسان عقل و دانش کے کمال تک پہنچ گیا، اور اس کے ساتھ اس کی ضرورتین بھی نہایت وسیع
ہو گئین، ایسے ترقی یافتہ انسانون کے لئے ایسے جامع کامل عالمگیر اور دائمی مذہب کی ضرورت تھی، جو اس کی
جملہ دینی و دنیوی ضروریات کا کفیل ہو، یہی آخری تکمیلی مذہب اسلام ہے، جو ایک مکمل نظام زندگی ہے، اور جس
کے دائرہ سے انسانی زندگی کا کوئی شعبہ بھی باہر نہین ہے، اور اس کی تعلیمات جملہ دینی و دنیوی اور مادی و روحانی
ضروریات پر حاوی ہین، سیرۃ النبی مین اسلام کی اسی جامعیت و کاملیت اور اسکی تعلیمات کے حکم و مصالح کو
اس طرح دکھایا گیا ہے کہ گذشتہ تمام مذاہب کے مقابلہ مین اسلام کا امتیاز نمایان ہو جاتا ہے، اور یہ ظاہر
ہو جاتا ہے کہ انسانیت کی فلاح و سعادت کا آخری جامع و کامل اور دائمی عالمگیر مذہب اسلام ہی ہے، اس

لحاظ سے سیرۃ النبی جدید علم کلام کی بڑی معرکۃ الآرا کتاب ہے، اور اسلام کا ایسا کامل مرقع ہے جس مین اس کے
سارے خط و خال نمایان ہین،

خطباتِ مدراس

اس سلسلہ کی دوسری اہم کتاب خطباتِ مدراس ہے، یہ وہ خطبات ہین، جو مدراس کے بعض دیندار
مسلمانون کی فرمایش پر اکتوبر ۱۹۲۵ء مین مدراس مین سیرۃ نبوی کے مختلف پہلوؤن پر دیئے گئے تھے، جنھین بعد
مین کتابی شکل مین شائع کر دیا گیا، یہ کل ڈیڑھ سو صفحون کی کتاب ہے، مگر اپنے معلومات کی وسعت، مباحث
کی ندرت اور افادہ کے لحاظ سے سیرت کی ضخیم کتابون پر بھاری، اور تنہا یہ کتاب مصنف کے فخر کے لئے کافی
ہے، اس مین ایک نئے نقطۂ نظر اور نئے اسلوب سے سیرۃ نبوی کے ان پہلوؤن پر بحث کی گئی ہے، جن کی جانب بہت کم
توجہ کی گئی ہے، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخی حیثیت، آپ کی جامعیت و کاملیت، اور آپ کی زندگی
کے عملی پہلو پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام مین ساری دنیا
کے لئے دائمی نمونۂ عمل آپ ہی کی ذاتِ مقدس ہو سکتی ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جس قدر بھی انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے، وہ سب اپنے زمانہ کے پیغمبر برحق
تھے، لیکن اُن کی بعثت کسی خاص قوم، خاص خطۂ زمین اور ایک محدود زمانہ تک اور ایک محدود مقصد کے لئے تھی،
اس لئے ان کی تعلیمات کا دائرہ بھی محدود تھا، اور وہ ان کے زمانہ کے بعد منسوخ ہو گئین، اس لئے انکے حالات اور ان کی تعلیم
مین آیندہ زمانہ کے لئے تاریخی استناد اور جامعیت و کمال کی ضرورت ہی نہ تھی، اس لئے قدرت کی جانب سے بھی
اس کا انتظام نہین کیا گیا، چنانچہ جن جن پیغمبرون کے نام معلوم ہین، اور جن کے مذاہب موجود ہین، ان مین سے
کسی کے مستند تاریخی حالات نہین معلوم، بلکہ بعضون کی شخصیت تک مشتبہ ہے، اور جن کے حالات کچھ معلوم ہین
وہ اتنے ناقص اور غیر معتبر ہین کہ اُن سے زندگی کے کسی شعبہ مین بھی رہنمائی نہین ہو سکتی، مگر خاتم النبیین صلی اللہ
علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی آنے والا نہین تھا، اور اسلام ساری دنیا کے لئے دائمی مذہب بنا کر بھیجا گیا تھا، اور آپکی

ذات جامع کمالات بنائی گئی تھی، اس لئے آپکے حالات کی حفاظت کے لئے قدرت کی جانب سے یہ اہتمام کیا گیا کہ آج تیرہ صدیاں گذر جانے کے بعد بھی آپ کی پوری زندگی کا ایک ایک واقعہ اور ہر ہر پہلو اس تفصیل اور اس تاریخی استناد کے ساتھ محفوظ ہے، کہ دنیا کی کوئی تاریخ بھی صحت و استناد میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی خطبات مدراس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی تاریخیت، آپکے حالات کی جامعیت اور آپ کی تعلیمات کی کاملیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے،

پہلے خطبہ میں دکھایا گیا ہے کہ انسانیت کی تکمیل صرف انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں سے ہو سکتی ہے، اور تاریخی شواہد سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ وہ سلاطین و کشور کشا جنھوں نے دنیا کا نقشہ بدل دیا، وہ مدبرین و ارباب سیاست جنھوں نے قوموں کی قسمتیں پلٹ دیں، وہ مقننین جنھوں نے بڑی بڑی حکومتوں کے دستور بنائے، اور وہ حکما و فلاسفہ جنھوں نے بہتر سے بہتر فلسفے پیدا کئے، انسانیت کے امراض کا مداوی، اور دلوں کی دنیا منور نہ کر سکے، اور آج دنیا میں جہاں کہیں بھی اخلاق و روحانیت کا نور نظر آتا ہے، وہ صرف انبیاء علیہم السلام کا فیض ہے،

دوسرے خطبہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے دائمی اور عالمگیر نمونۂ عمل ہونے پر بحث کی گئی ہے اور اس سلسلہ میں سیرت محمدی کے تاریخی و تکمیلی پہلوؤں اور اس کی جامعیت و عملیت پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور یہ دکھایا گیا ہے کہ آج ہم کو جن پیغمبروں کے نام معلوم ہیں، ان میں صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مستند تاریخی حالات کا علم ہے، اور اس جامعیت کے ساتھ کہ آپ کی پوری زندگی کا ہر پہلو پوری طرح محفوظ ہے، اور اس میں ہر شعبۂ زندگی کے لئے اسوۂ عمل موجود ہے، پھر آئندہ خطبات میں ان میں ہر ایک پہلو پر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے،

تیسرے خطبہ میں سیرت نبوی کے تاریخی پہلو پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے، اور یہ دکھایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر جس قدر تاریخی مواد موجود ہے، اتنا مواد دنیا کے کسی بڑے سے بڑے انسان کے حالات میں نہیں مل سکتا، اور اس سلسلہ میں سیرت کے تمام ماخذوں قرآن مجید، کتب حدیث، مغازی اور

تاریخ اور دلائل و شمائل نبوی کے پورے ذخیرہ کا جائزہ لیا گیا ہے، اس میں ان علوم کی اجمالی تاریخ آگئی ہے، اور پھر محدثانہ اصول سے اس ذخیرہ پر بحث و تنقید کی گئی ہے، ان بحثوں سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر جتنا مستند ذخیرۂ معلومات موجود ہے اس کے عشر عشیر غیر مستند حالات بھی کسی پیغمبر کے نہیں مل سکتے،

چوتھے اور پانچویں خطبہ میں آپ کی جامعیت و کاملیت پر بحث کی گئی ہے، یہ دونوں چیزیں درحقیقت ایک ہی چیز کے دو رخ ہیں، کاملیت سے یہ مراد ہے کہ شروع زندگی سے وفات نبوی تک آپ کی زندگی کا ہر واقعہ محفوظ ہے، مثلاً خاندان، آباؤ اجداد، پیدائش، شیرخوارگی، بچپن، سن شعور، جوانی، اس زمانہ کے مشاغل، پیشہ، شادی، احباب قبل از نبوت، قریش کے معاہدہ میں شرکت، امین کا خطاب، آثار نبوت، تنہائی پسندی، غار حرا کی خلوت نشینی، اور جلوہ گستری نبوت کا آغاز وحی، اسلام کا ظہور، اس کی دعوت، اس راہ کے مشکلات و مصائب، ہجرت، قیام مدینہ، غزوات کے حالات، دعوت اسلام کے خطوط، اسلام کی اشاعت و تکمیل، حجۃ الوداع، اور وفات وغیرہ کے تمام حالات محفوظ و معلوم ہیں، اسی طریقہ سے زندگی تمام معمولات، و عادات و خصائل کے حالات تمام تفصیل کی کتابوں میں موجود ہیں، جن سے آپ کی زندگی کے جزی سے جزی واقعہ کا علم ہو سکتا ہے، حتی کہ وہ واقعات بھی جن میں وحی کے ذریعہ آپ کو تنبیہ کی گئی ہو اور ایسے واقعات بھی جن پر مخالفین اعتراض کرتے ہیں بجنسہ محفوظ ہیں، یہ سیرت نبوی کا تکمیلی پہلو ہے

اس کا دوسرا پہلو اس کی جامعیت ہے، یعنی مختلف انسانی طبقات اور ان کی زندگی کے ہر پہلو اور ہر انسانی ضرورت کے متعلق آپ کی زندگی میں اسوۂ عمل موجود ہے، مثلاً شاہ و گدا، حاکم و محکوم، فاتح و مفتوح، امیر و غریب، تاجر و مزدور، عزیز اور دوست وغیرہ مختلف حالتوں اور حیثیتوں سے آپنے زندگی بسر کی ہے، اسلئے ان سب کی حیثیت اور ان کے تعلقات و فرائض کا سبق بھی ہم کو سیرت پاک سے مل سکتا ہے، پھر ہر انسان کے معمولات زندگی اور روزانہ کے کاروبار مثلاً اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، سونے جاگنے، ہنسنے بولنے، لین دین، تعلیم و تعلم، عبادات و ریاضت وغیرہ ان تمام معمولات و مشاغل کا سبق بھی جو روزانہ کی زندگی میں پیش آتے ہیں، ہم حیات طیبہ سے سیکھ سکتے ہیں، حتی کہ انسانی اوصاف، اور ان کے ذہنی و جذباتی کیفیات و احوال مثلاً خوشی و رضامندی، غم

غصہ، عزم و استقلال، صبر و توکل، شجاعت و شہامت، استغنا و قناعت، جود و سخا، تواضع و انکسار وغیرہ تک کی تعلیم بھی ہم کو اسوۂ نبی سے ملتی ہے، غرض انسانی زندگی کے ہر شعبہ اور ہر حالت اور اس کے سارے کاموں کا سبق ہم سیرتِ نبوی سے سیکھ سکتے ہیں،

چھٹے خطبہ میں سیرت نبوی کے عملی پہلو کو دکھایا گیا ہے، یعنی آپ نے جو اخلاقی تعلیمات دیں، آپ خود ان کا عملی نمونہ تھے، اس سلسلہ میں آپ کی زندگی سے ہر قسم کے اخلاقِ فاضلہ کے واقعات نقل کئے گئے ہیں،

ساتویں خطبہ میں دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں پیغام محمدی کی جامعیت و عالمگیریت اور اس کی پیدا کردہ اصلاحات اور دوسری انقلاب انگیز خصوصیات پر بحث کی گئی ہے، اور یہ دکھایا گیا ہے کہ جملہ مذاہب کی مشترک اور بنیادی تعلیمات یعنی ایمان و عمل صالح عقائد و عبادات اور اخلاق و معاملات وغیرہ کو اسلام ہی نے تکمیل تک پہنچایا، اور دوسرے مذاہب کی کتابیں اور ان کے صحیفے اس حیثیت سے بالکل ناقص ہیں چنانچہ توراۃ و انجیل میں عقائد و عبادات تک کی تعلیمات اتنی مبہم غیر واضح اور ناصاف ہیں کہ ان سے عیسوی اور یہودی مذہب کے عقائد و عبادات کی تفصیل نہیں معلوم ہو سکتی، توراۃ میں دنیاوی قوانین کسی قدر تفصیلی ہیں، مگر اولاً وہ نہایت سخت ہیں، جس کا تحمل انسانی طاقت کے لئے دشوار ہے، دوسرے بعض حیثیتوں سے ناقص بھی ہیں، پھر ان کا دائرہ بنی اسرائیل تک محدود ہے، اسلام نے ان کی سختی کو کم اور ان کی خامیوں کو دور کر کے ان کو معتدل اور عالمگیر بنایا، اسی طرح اخلاق کے ناقص حصہ کی تکمیل کی اسلام سے پہلے انسان ہر اس قوت کے سامنے جس سے اس کے وہم میں ضرر کا اندیشہ یا فائدہ کی امید ہوتی، سربسجود ہو جاتا تھا جس سے بے شمار دیوی اور دیوتا پیدا ہو گئے تھے، عیسائی اور یہودی مذہب میں اگرچہ اس قسم کے معبودان باطل کی پرستش نہیں ہوتی تھی، مگر ان میں قسیسوں اور رہبانوں کو خدائی کا درجہ حاصل تھا، اسلام پہلا مذہب ہے جس نے انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیکر اس کی عظمت نمایاں کی، اور یہ تبلایا کہ انسان کائنات کے لئے نہیں بنایا گیا ہے، بلکہ کائنات اس کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہے، اس لئے دنیا کی کوئی چیز بھی اوس کی

پرستش کے لائق نہیں ہے، توحید کا یہ پہلا سبق اسلام ہی نے پڑھایا، دنیا کے تقریباً تمام مذاہب نے انسان کو فطرۃً گنہ گار قرار دیا ہے، جس سے نجات پانا دشوار ہے، اسی سے آریائی مذاہب میں تناسخ کا اور عیسائیوں میں کفارہ کا عقیدہ پیدا ہوا، مگر اسلام نے انسان کو فطرۃً معصوم اور گنہ گاری کو برے اعمال کا نتیجہ قرار دیا، اور ہر انسان کے لئے نجات کی راہ کھلی رکھی، اسلام سے پہلے انسانیت نسلی اور جغرافی حدود میں بٹی ہوئی تھی، اسلام نے ان حدود کو توڑ کر عالمگیر انسانی برادری قائم کی، دوسرے تمام مذاہب میں درمیانی واسطوں کے بغیر خدا تک نہیں پہنچا جا سکتا تھا، اسلام نے ان واسطوں کو ختم کر کے براہ راست ہر انسان کا خدا سے تعلق قائم کیا، پیغمبروں اور صلحاء و احبار کے ساتھ فرط عقیدت نے شرکت و بت پرستی کی شکل اختیار کر لی تھی، اسلام نے ان کا صحیح درجہ متعین کر کے شرک کے ایک بڑے وسیلہ کو ختم کیا،

آٹھویں خطبہ میں پیغام محمدی کی بنیادی تعلیمات کو بتلایا اور یہ دکھایا گیا ہے کہ اسلام سے پہلے کسی مذہب میں بھی خالص توحید نہیں تھی، جن مذاہب میں کسی حد تک تھی بھی تو وہ خدا اور بندہ کے تعلق کی تشبیہ و تمثیل اور اس کی ذات و صفات میں التباس و اشتباہ اور افعالِ خداوندی کی نیرنگیوں کی غلط تعبیر کی وجہ سے شرک میں بدل گئی تھی، اسلام نے اس سارے التباس و اشتباہ کو دور کر کے شرک کا ہر دروازہ بند کر دیا، اور دنیا میں توحیدِ خالص کو پہلی مرتبہ پیش کیا، اسی طرح عبادت کے غلط مفہوم یعنی ترک دنیا، رہبانیت، اور جسمانی اذیت کو مٹا کر اس کی صحیح شکل تبلائی، اور اس کا اصلی مقصد و منشا واضح کیا،

اسلام سے پہلے انسانی جان کی کوئی قیمت نہ تھی، اور وہ دوسروں کی ملک کی سمجھی جاتی تھی، آقا غلام کو قتل کر سکتا تھا، دیوی اور دیوتاؤں پر انسانوں کی قربانی عام تھی، عورت شوہر کی لاش کے ساتھ ستی ہو جاتی تھی، لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیا جاتا تھا، اسلام نے انسانی جان کا احترام قائم کیا، اور کسی انسان کو خود اپنی جان تک بھی مالک نہیں بنایا، چنانچہ خودکشی تک حرام قرار دی، حسب و نسب کی تفریق کو مٹا کر تقوی کو معیار فضیلت اور اسلام کے عالمگیر تصور کے ماننے والوں کو آپس میں بھائی بھائی قرار دیا، اور اس قبیل کی دوسری

اصلاحات کین،

یہ خطبات مدراس کے مباحث کا اجمالی خلاصہ ہے جس سے اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، درحقیقت یہ تنہا کتاب اسلام اور پیغمبر اسلام کی صداقت و عظمت اور دوسرے مذاہب پر اس کی برتری کے ثبوت کے لئے کافی ہے،

سیرتِ عائشہؓ

سلسلہ سیرت کی تیسری کتاب سیرت عائشہ ہے، اگرچہ وہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی سوانح عمری ہے لیکن ایک حیثیت سے وہ بھی سیرت نبوی کا ضمیمہ ہے، انسان کی زندگی مین اس کی رفیقۂ حیات کو بڑا دخل ہوتا ہے خصوصاً اگر بیوی تعلیم یافتہ اور ہوشمند ہو تو شوہر کے کامون کی تکمیل مین اس سے بڑی مدد ملتی ہے، اور اس کے حالات سے شوہر کی زندگی کے مختلف رُخون پر روشنی پڑتی ہے، اس حیثیت سے ازواج مطہرات کے حالات بھی سوانح نبوی کا جزء ہین، یون تو بہت سی ازواج مطہرات تھین لیکن وہ بیویان جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج مین زیادہ دخل تھا، اور جنھون نے کسی نہ کسی حیثیت سے دین کی خدمت کی، اور جن سے اسلام کی تبلیغ و اشاعت مین مدد ملی، دو تھین، حضرت خدیجہؓ اور حضرت عائشہؓ، حضرت خدیجہؓ نے سب سے پہلے آپ کی نبوت کی تصدیق اور اس زمانہ مین آپ کی تشفی و دلدہی کی، جب مکہ کا ذرہ ذرہ آپ کا دشمن ہو رہا تھا، اور ان کی دولت و جاہ سے اسلام کی ابتدائی تبلیغ و اشاعت مین بڑی مدد ملی، مگر ان کا انتقال ہجرت نبویؐ سے کئی سال پہلے ہو گیا تھا اور اسلام کی ترقی کا زمانہ انھون نے نہین پایا، حضرت عائشہؓ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد مین آئین، اور وفاتِ نبوی تک برابر ساتھ رہا، اور اس کے بعد تقریباً نصف صدی تک زندہ رہین، اس طرح اسلام کے عروج و ترقی کا پورا زمانہ انھون نے آنکھون سے دیکھا، اور اس زمانہ کے بعض واقعات و حوادث مین بھی انھون نے حصہ لیا، وہ اپنی ذاتی صلاحیتون اور گوناگون اوصاف و خصوصیات کے اعتبار سے اپنے دور کی نسوانی دنیا مین امتیازی درجہ رکھتی تھین، اور اسلام کی ابتدائی تاریخ مین مختلف حیثیتون سے ان کا نمایان حصہ ہے،

وہ بڑی ذہین و ذکی اور ابتداء سے علم و تعلیم کی شائق تھین، اور اُن کے شعور کی آنکھین تعلیم و تربیت گاہ نبوت مین کھلین، جہان ہر وقت دینی تعلیم کا چشمہ اُبلتا رہتا تھا، اس لئے حضرت عائشہؓ پوری طرح اس چشمہ سے سیراب ہوئین، اور تعلیم کے جو مواقع بھی ان کو ملے، اُن سے انھون نے پورا فائدہ اٹھایا، اور اُن کو سب سے زیادہ اس کے مواقع حاصل تھے، اس لئے اُن کے ذوق و شوق اور تعلیم نبوی نے ان کو اپنے زمانہ کی بڑی عالمہ بنا دیا اور تفسیر و حدیث، فقہ و فتاویٰ وغیرہ دینی علوم مین اُن کو بڑی دستگاہ حاصل تھی، اور تفقہ کلام و عقائد اور اسرار دین تک پر اُن کی نگاہ بڑی گہری اور مجتہدانہ تھی، جس کا اندازہ ان کی روایات اور اُن کے فقہی مسائل سے ہوتا ہے، ان علوم مین وہ نہ صرف عورتون بلکہ جماعتِ صحابہ مین امتیازی درجہ رکھتی تھین، اور بڑے بڑے صحابہ، محدثین، اور ائمہ اُن سے استفادہ کرتے تھے، وہ باقاعدہ دینی علوم کا درس دیتی تھین جن مین بڑے بڑے علماء شریک ہوتے تھے، حج کے زمانہ مین جب مکہ مین ساری دنیائے اسلام کا اجتماع ہوتا تھا، اُن کا حلقۂ درس قائم ہوتا تھا، اُن کے پاس دور دراز سے فتاویٰ آتے تھے، خلفائے راشدین اور اکابر صحابہ تک ان مسائل مین جو ان کے علم مین نہ ہوتے تھے، اُن کی جانب رجوع کرتے تھے، اگر اُن کے فتاویٰ کو جمع کیا جائے، تو کئی ضخیم جلدون مین آئین گے، اُن کے تلامذہ کی فہرست بڑی طویل ہے، غرض حضرت عائشہؓ کے ذریعہ دینی علوم کی بڑی اشاعت ہوئی، خصوصاً عورتون سے متعلق بیشتر دینی احکام و مسائل انہی سے مروی ہین، دینی علوم کے علاوہ، وہ اس زمانہ کے دوسرے مروجہ علوم، انساب شعر و ادب اور تاریخ وغیرہ مین بھی مہارت رکھتی تھین،

انھون نے طویل عمر پائی، اور حضرت امیر معاویہ کے زمانہ تک زندہ رہین، حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جو انقلاب برپا ہوا، اور جس نے مسلمانون کی مرکزیت کا شیرازہ منتشر کر دیا، اور اُن کی تلوارین آپس ہی مین بے نیام ہو گئین تو اس نازک صورتِ حال کی اصلاح کے لئے حضرت عائشہؓ نے اس زمانہ کی سیاست مین بھی حصہ لیا، اور آخر تک اصلاحِ حال کی کوشش کرتی رہین، مگر فریقین کے فتنہ انگیز عناصر کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکین جس کا انھیں بعد مین بڑا افسوس رہا،

غرض دینی علوم کی مسند سے لیکر رزمگاہ سیاست تک حضرت عائشہؓ کے نہایت نمایان کارنامے ہین،
اور اسلام نے عورتون کو مدارج ترقی کے جو حقوق عطا کئے ہین، حضرت عائشہؓ کی ذات اس کا عملی نمونہ تھی،
انھون نے اپنی ذہانت و قابلیت سے جنس نسوانی کا درجہ بلند کر دیا، اور عملاً ثابت کر دکھایا کہ ایک مسلمان
عورت نسوانی حدود مین رہ کر بھی علمی، اجتماعی اور سیاسی کامون اور دنیا کے دوسرے حقوق و فرائض کی
ادائگی مین مردون کے دوش بدوش کام کر سکتی ہے، وہ عورت تھین اس لیے اسلام مین عورتون کے حقوق کی
تعیین و تصریح اُن کے تحفظ اور عورتون کی عظمت و وقار قائم کرنے مین اُن کا بڑا حصہ ہے، اور ان امور کے متعلق
اُن کی کثرت روایتین اور واقعات حدیث کی کتابون مین موجود ہین، اس لئے سیرت نبوی کے اس پہلو کی تکمیل و وضاحت
اسلام مین جنس نسوانی کے حقوق کی تعیین، اس کے تحفظ و نگہداشت اور اس کی عملی مثال کی حیثیت سے سیرت نگار
نبوی ہی کے قلم سے حضرت عائشہؓ کی سوانح نگاری کی ضرورت تھی، چنانچہ اسی نقطہ نظر سے سیرت عائشہؓ لکھی گئی،
جس مین اُن کے حالات، اُن کے اوصاف و کمالات، اُن کے علمی و دینی اور سیاسی خدمات کو بڑی تفصیل سے دکھایا
گیا ہے، اور ان کے اور حضرت علیؓ کے تعلقات اور جنگ جمل کے بارہ مین جو غلط واقعات مشہور ہین، اور اس سلسلہ مین
بعض اسلامی فرقے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی زندگی کے متعلق مستشرقین جو اعتراضات کرتے ہین اُن کی
پوری تنقید و تردید کی گئی ہے، اس سوانح عمری سے یہ پوری طرح نمایان ہو جاتا ہے کہ اسلام نے عورتون کو کتنے حقوق
عطا کئے ہین، اور اُن کا درجہ کتنا بلند کیا ہے، اور اس پہلو سے حضرت عائشہؓ نہ صرف اپنے زمانہ کے اعتبار سے
بلکہ موجودہ دور کے نسوانی ترقی کے صحیح اسلامی تصور کے لحاظ سے بھی کتنے بلند درجہ پر فائز تھین، اور آج بھی ایک
مسلمان عورت اُن کی تقلید کے ذریعہ صحیح اور مدارج ترقی کے بلند سے بلند مدارج تک پہنچ سکتی ہے،

ارض القرآن

اس سلسلہ کی تیسری کتاب ارض القرآن ہے، اگرچہ اس کا موضوع سیرت سے جدا ہے، مگر

بقول مصنف اس کو سیرۃ النبی کا دیباچہ سمجھنا چاہیے، اس کا مقصد کلام مجید کے بعض تاریخی اور جغرافی بیانات
پر مستشرقین کے اعتراضات کا جواب اور عرب کے قدیم جغرافیہ اور تاریخ کی تحقیق و تنقید ہے، اسلام سے پہلے عربون
مین لکھنے پڑھنے کا رواج محض برائے نام تھا، اور اُن کی پرانی تاریخ کا دار و مدار زیادہ تر زبانی روایات اور قومی
داستانون پر تھا جس مین غلط و صحیح کی آمیزش ناگزیر ہے، اس لئے ایک زمانہ تک عربون کی قدیم تاریخ پر پردہ
پڑا رہا، اسلامی عہد مین جب تاریخ نگاری شروع ہوئی تو عربون کی زبانی روایات کی بنا پر عرب قبل از اسلام
کی تاریخ کے بارہ مین صحیح و غلط ہر قسم کے واقعات شامل ہو گئے،

مستشرقین نے جب عربون کی تاریخ پر تحقیقات شروع کی، تو انھون نے قدیم یونانی اور رومی مورخین
و جغرافیہ نویسون کے بیانات اور جدید اثری اکتشافات اور پرانے کتبات وغیرہ سے ایسی معلومات حاصل کئے
جو عربون کی قدیم روایات کے خلاف تھے،

کلام مجید مین عبرت و بصیرت کے لئے عرب کی قدیم قومون، اُن کے انبیاء و رسل اور اُن کے اماکن و
آبادیون کا ذکر کیا گیا ہے، جس کے بعض بیانات مستشرقین کی تحقیقات سے مطابقت نہین کرتے، اس پر مستزاد
یہ ہوا کہ بے احتیاط مفسرین نے ان بیانات کی تفسیر مین عربون کی بہت سی زبانی روایات اور اسرائیلیات نقل
کر دین، اس سے مستشرقین کو اور بھی اعتراض کا موقع مل گیا، جس سے اُن کے نزدیک قرآن مجید کی صداقت مشتبہ
ہو جاتی تھی، ارض القرآن ان اعتراضات کے جوابات اور عرب کی قدیم تاریخ کی تحقیق مین لکھی گئی ہے، اگرچہ سیرت
نبوی کی طرح اس کا طرز بھی مناظرانہ کے بجائے تحقیقی و تنقیدی ہے، اس مین قدیم و جدید دونون ماخذون سے
قدیم عرب کی محققانہ تاریخ اور اس کا جغرافیہ پیش کیا گیا ہے، کلام مجید کے بیان کردہ واقعات پر مستشرقین کے
اعتراضات کی تنقید و تردید کا خصوصیت سے لحاظ رکھا گیا ہے، جس سے دونون مین مطابقت پیدا ہو جاتی
ہے یا مستشرقین کی تحقیقات کی غلطی اور کلام مجید کے بیان کی صداقت ظاہر ہو جاتی ہے، اگرچہ مصنف کی
ابتدائی تصنیف ہے مگر علم و نظر کی وسعت و تحقیق و تنقید کے لحاظ سے درجہ کمال کی تصانیف سے کم نہین ہے، اور اسکے شروع کا حصہ جسکو

کا منشد سمجھنا چاہو، اور جس میں عرب کی تاریخ و جغرافیہ کے قدیم و جدید ماخذ، یعنی قرآن مجید، تفسیری روایات، اسرائیلیات، تلمود،
عرب قدیم کی تاریخ کے اسلامی مصنفین، ان کی تاریخوں، کتب جغرافیہ، انساب عرب، اسرائیلی لٹریچر، رومی و یونانی
مصنفین کی کتابوں، عربوں کی قدیم روایات اور جدید اثری اکتشافات پر بحث و تنقید ہے، بڑا فاضلانہ اور محققانہ
ہے، اور اس بحث و تنقید ہی سے اعتراضات کا میدان بہت تنگ ہو جاتا ہے۔

اس مقدمہ کے بعد عرب قدیم کا مفصل جغرافیہ، اس کی قدیم تاریخ، اور کلام مجید میں جن اقوام و قبائل اور افراد
کا ذکر ہے، ان کی تاریخی و اثری تحقیق ہے، اور دوسرے حصہ میں قرآن مجید، توراۃ، یونانی و رومی مصنفین کے بیانات
اور اثری اکتشافات کی روشنی میں بنو ابراہیم کی تاریخ، عربوں کی قبل از اسلام تجارت، اور ان کے مذاہب پر
تفصیل کے ساتھ بحث، اور جدید ماخذوں سے کلام مجید کے بیانات کی تائید و توثیق کی گئی ہے اور مستشرقین
کے بیانات کا رد کیا گیا ہے، اس طرح یہ کتاب گویا عرب کی قدیم اقوام و ملل اور اماکن و مقامات کے متعلق
کلام مجید کے بیانات کی تاریخی، جغرافی اور اثری تفسیر ہے، اور اس کی روشنی میں اس کے بہت سے تاریخی
و جغرافی بیانات کی تائید و وضاحت ہو جاتی ہے۔

عرب و ہند کے تعلقات

مذکورۂ بالا علمی و مذہبی تصانیف کے علاوہ متعدد خالص وطنی تصانیف بھی ہیں، مگر وہ بھی تبلیغی
مقصد سے خالی نہیں ہیں، ان میں عرب و ہند کے تعلقات اور خیام زیادہ اہم ہیں، اور اپنے معلومات کی وسعت اور
تلاش و تحقیق میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں، اور ان کو یورپین زبانوں کی اعلیٰ سے اعلیٰ تصانیف کے مقابلہ میں
بلا تکلف پیش کیا جا سکتا ہے۔

ان دونوں میں عرب و ہند کے تعلقات امتیازی حیثیت رکھتی ہے، یہ کتاب اگرچہ خالص علمی و تاریخی ہے
مگر اس کا مقصد ہندو مسلمانوں کے تعلقات کے متعلق بعض غلط فہمیوں کا ازالہ اور ان دونوں کے تعلقات کی قدامت
اور اس کی خوشگواری دکھانا ہے، انگریزوں نے اپنے سیاسی مصالح کے لئے جو غلط فہمیاں پھیلائی ہیں ان میں

ایک یہ بھی ہے کہ ہندوؤں سے مسلمانوں کا تعلق محض فاتحانہ اور حاکمانہ رہا، اور وہ سندھ کی اسلامی حکومت کو چھوڑ کر
ہندوستان سے مسلمانوں کا تعلق غزنوی عہد سے شروع کرتے ہیں، جن کا مقصد ان کے نزدیک ہندوستان کی دولت
کا لوٹنا تھا اور اسی مقصد کے ماتحت بعد کے مسلمان حکمران خاندانوں نے ہندوستان کو فتح کیا، مگر حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان
سے عربوں کا تعلق اس کی فتح بلکہ اسلام کے ظہور سے بھی صدیوں پہلے سے تھا، عرب ایک تاجر قوم اور مشرق و مغرب کے
درمیان تجارتی کڑی تھے، وہ مصر و افریقہ اور شام و عراق کا تجارتی سامان ہندوستان، سیلون، برما، انڈونیشیا
اور چین تک لیجاتے تھے، اور ان ملکوں کی چیزیں مذکورۂ بالا ملکوں میں پہنچاتے تھے، پھر ظہور اسلام کے بعد ہندوستان
میں اسلامی حکومت کے قیام سے بہت پہلے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان علمی، مذہبی اور تمدنی ہر قسم کے تعلقات پیدا
ہو گئے تھے، اور ہندوستان کے جنوبی ساحلی علاقوں میں ان کی بڑی بڑی آبادیاں قائم ہو گئی تھیں، اور ان کے حسن
اخلاق کی وجہ سے ہندو راجہ ان کا بڑا لحاظ اور ان کے ساتھ بڑی رعایت کرتے تھے، جہاں ان کی زیادہ آبادی
تھی، وہاں ان کا مستقل مذہبی نظام قائم تھا، اور ان کے معاملات کے فیصلہ کے لئے قاضی مقرر تھے۔

عرب و ہند کے تعلقات میں تعلقات کے ان تمام پہلوؤں کو بڑی تفصیل سے دکھایا گیا ہے، یہ کتاب پانچ
ابواب میں منقسم ہے، پہلے باب میں ہندوستان سے عربوں کے تعلقات کی ابتدا پر بحث کی گئی ہے، اور تجارتی تعلقات
کی قدامت پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس سلسلہ میں یہ بھی ثابت کیا گیا ہے، کہ دنیا کی پہلی بحری تجارتی قوم فنیشین
عرب تھے، جو شام کے ساحل پر بس گئے تھے، اور ان کے علمی اثرات ظہور اسلام سے بہت پہلے ہندوستان پر پڑ چکے تھے
اس کے بعد ہندوستان پر مسلمانوں کے ابتدائی حملہ اور سندھ کی فتح کا مختصر تذکرہ ہے، پھر مسلمان جغرافیہ نویسوں
ابن خردادبہ سنہ ۲۵۰ھ، سلیمان تاجر سنہ ۲۳۷ھ، ابو زید حسن سیرافی سنہ ۲۶۴ھ، ابو دلف مسعر بن مہلہل سنہ ۳۳۱ھ، بزرگ بن
شہریار سنہ ۳۰۰ھ، مسعودی سنہ ۳۰۳ھ، اصطخری سنہ ۳۴۰ھ، ابن حوقل سنہ ۳۳۱ھ، بشاری مقدسی سنہ ۳۷۵ھ، البیرونی سنہ ۴۴۰ھ، ابن
بطوطہ سنہ ۷۷۹ھ وغیرہ کی کتابوں سے جو خود ہندوستان آئے تھے، اور اپنی کتابوں میں اس زمانہ کے ہندوستان کے
حالات لکھے ہیں، اور وہ ہند قدیم کی تاریخ کا سب سے بڑا ماخذ ہیں، ہندوستان کے حالات نقل کئے ہیں، اور یہ

دکھایا ہے کہ تاریخی حیثیت سے ان جغرافیہ نویسون نے ہندوستان کی کتنی بڑی خدمت انجام دی ہے، ان بیانات سے
ہندوستان کے عام حالات کے ساتھ ہندو مسلمانون کے تعلقات پر بھی روشنی پڑتی ہے، اس کے بعد ان جغرافیہ نویسون
اور مورخین کا تذکرہ ہے، جو خود تو ہندوستان نہین آئے مگر اپنی کتابون مین اس کے حالات لکھے ہین،

دوسرے باب مین تجارتی تعلقات پر بحث کی گئی ہے، اور اس سلسلہ مین ان تعلقات کی قدامت مشرق و مغرب
کے درمیان عرب تاجرون کی اہمیت، ان ملکون کے درمیان تجارتی راستون، ان کی درمیانی منزلون اور بندرگاہون
کی تفصیل، ہندوستان مین دوسری بیرونی قومون کی تجارت، ہندوستان کی پیداوار، مصنوعات اور دوسرے سامان
تجارت، تجارتی درآمد و برآمد، عرب کے ہندو بیوپاریون، بحر ہند مین چلنے والے جہازون کی وسعت، ہندوستان کی بحری
تجارت اور دولت و ثروت وغیرہ پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، اور آخر مین یہ ثابت کیا گیا ہے کہ بحر روم
کو چھوڑ کر افریقہ کی پشت سے بحر ہند مین آنے کے راستہ کے انکشاف کا سہرا پرتگالیون کے سر باندھا جاتا ہے
لیکن درحقیقت اس کے پہلے رہنما عرب تھے، اور پرتگالیون کو ہندوستان پہنچانے والا ایک عرب بحری ابن ماجد تھا

تیسرا باب علمی تعلقات پر ہے، اس مین یہ دکھایا گیا ہے کہ مسلمانون اور ہندوستان کے درمیان علمی تعلقات کا
کچھ نہ کچھ سلسلہ بنی امیہ کے آخری دور ہی سے شروع ہوگیا تھا، مگر خود مسلمانون کی اصل علمی تاریخ جب انھون نے دوسری
قومون کے علوم کی جانب توجہ کی عباسیون کے زمانہ سے شروع ہوتی ہے، اسی زمانہ سے مسلمانون نے دوسری علمی قومون کے
علوم سے فائدہ اٹھانا شروع کیا، اور یونانی، سریانی اور ایرانی علوم وغیرہ کی طرف توجہ کی تو اس سلسلہ مین انھون نے
ہندوستان سے بھی علمی روابط پیدا کئے، عباسی خلفاء خود بھی صاحب علم اور علم و فن کے بڑے قدردان اور سرپرست
تھے لیکن عباسی دور کی علمی ترقیون کا سہرا بڑی حد تک برمکی خاندان کے سر ہے، اس لئے اس کتاب مین ہندوستان
سے عربون کے علمی تعلقات کے باب کا آغاز برامکہ کی تاریخ سے کیا گیا ہے، ان کے متعلق عام شہرت تو یہی تھی
کہ وہ مجوسی تھے، مگر اس کتاب مین عقلی دلائل اور تاریخی شواہد سے ثابت کیا گیا ہے کہ برامکہ نسلاً ایرانی مگر مذہباً
بدھسٹ تھے، یہ محققانہ بحث دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، اس رشتہ سے ہندوستان سے ان کا مذہبی تعلق تھا، اور ہندوستان

اس زمانہ مین بہت سے علوم کا مرکز تھا، اس لئے برامکہ نے یہان کے مختلف علوم کے فضلاء کو بڑے اعزاز و اکرام
سے بغداد بلایا، ان کی بڑی قدردانی کی اور ان کے علوم سے پورا فائدہ اٹھایا، جس کا سلسلہ برامکہ کے زوال کے بعد
مامون کے عہد مین بھی قائم رہا، بلکہ مامون کی علم نوازی کی وجہ سے اور زیادہ بڑھ گیا، اس بحث مین طب، نجوم،
جوتش، ہیئت، ریاضی، بیطاری، موسیقی، جنگ و سیاست، منطق، کیمیا، جعفر و رق، قصص و حکایات، اور اخلاق
وغیرہ کی سنسکرت کی جو کتابین عربی مین ترجمہ ہوئین، اور ان ہندو علماء کا جنھون نے بغداد مین علمی خدمات
انجام دین مفصل تذکرہ ہے، اس باب کا خاتمہ البیرونی کے حالات پر کیا گیا ہے جس نے قدیم ہندوستانی علوم اور
ان کی تاریخ و تہذیب کی اتنی خدمت انجام دی، جو اس زمانہ کے کسی ہندو سے بھی نہین ہو سکی، اس نے ہندوستانی
علوم پر بہت سی کتابین لکھین، سنسکرت کی بعض کتابون کا عربی مین ترجمہ کیا، اس کی کتابین قدیم ہندوستانی علوم
اور ہندوستانی کلچر کی تاریخ کا بہت بڑا ماخذ ہین،

چوتھا باب مذہبی تعلقات پر ہے، ہندو مسلمانون کے مذہبی تعلقات کے سلسلہ مین ہم کو انگریزون کا پڑھایا
ہوا صرف یہ سبق یاد رہ گیا ہے، کہ مسلمان ہندوون کو کافر و مشرک سمجھتے تھے، ان کو تلوار کے زور سے مسلمان بناتے
تھے، ان سے جزیہ وصول کرتے تھے، ان کی عبادت گاہون کو ڈھاتے تھے، اور اس کے ثبوت مین ترک و افغان
اور مغل سلاطین کے کچھ واقعات بھی مل جاتے ہین، اس لئے اس باب مین پہلے اس شہرت عام پر بحث و تنقید کی
گئی ہے، اور یہ دکھایا گیا ہے کہ وسط ایشیا کے جن مسلمان خاندانون نے ہندوستان مین حکومت کی، ان کے بعض
سلاطین اور عہدہ دارون کو چھوڑ کر وہ قوم کی مجموعی حیثیت سے اسلام کے صحیح نمایندے نہ تھے، اور نہ ان کی حکومت کو
اسلامی نظام حکومت سے کوئی علاقہ تھا، اور ان کے افسرون کو جو زیادہ تر غیر مسلم یا بالکل جدید الاسلام تھے اسلام
کے صلح و جنگ اور حاکمیت و محکومیت کے قوانین ہی سے واقفیت نہ تھی، اور جس زمانہ مین ان خاندانون نے حکومت
کی، ان کی قوم مسلمان بھی نہ ہوئی تھی، اور اس مین ہزارون غیر مسلم تھے، جو لوگ مسلمان بھی تھے، وہ بھی اسلامی
روح سے نفس بیگانہ، اور اپنی قومی خصوصیات پر قائم تھے، اور انھون نے جو کچھ بھی کیا، خواہ وہ مذہب کے نام پر

کیا ہو، مگر درحقیقت اس کو مذہب سے کوئی علاقہ نہ تھا، اور محض سیاست کے لئے تھا، اس لئے اُن کے ذاتی اعمال کی ذمہ داری
اسلام پر رکھنا اور پوری مسلمان قوم کو ان پر قیاس کرنا کسی حیثیت سے بھی صحیح نہیں ہے،

اسلام کے اصل نمایندے عرب تھے، وہ حکمرانی میں اسلام کے مقرر کئے ہوئے حدود سے آگے نہ بڑھتے تھے، ان
کی حکومتوں میں محکوموں کے ساتھ زیادتی کی مثالیں شاذ ہی ملتی ہیں، جن سے دنیا کا کوئی حکمران خاندان بھی مستثنیٰ
نہیں ہے، مذہب کے معاملہ میں وہ بڑے روادار تھے، جن جن قوموں پر انھوں نے حکومت کی اُن کے مذہبی عقائد
و مذہبی نظام، بلکہ مذہبی رسم ورواج تک میں کوئی مداخلت نہیں کی، اور نہ اُن کی عبادت گاہوں میں ہاتھ لگایا،
اور جزیہ اور خراج کے ٹیکس لینے کے بعد انکو تمام حقوق میں مسلمانوں کے برابر قرار دیا، خود سندھ میں عربوں کی حکومت
اسی روش پر رہی، اور ہندوؤں کو شبہ اہل کتاب قرار دے کر ان کی عورتوں سے شادی اور ان کے ہاتھ کا ذبیحہ
کھانے کی ممانعت کے علاوہ ہر چیز میں اُن کو اہل کتاب کے برابر حقوق عطا کئے، مسلمانوں کے اس فیاضانہ
سلوک کا یہ نتیجہ تھا کہ سندھ کے ہندو مسلمان حکمرانوں کے گرویدہ ہوگئے، اس سلسلہ میں اہل کتاب، شبہ اہل کتاب
کا فرق مسلم اور جزیہ کے مسائل کی بحثیں بھی آگئی ہیں، جن سے ان امور کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں

اس کے بعد اصل بحث مذہبی تعلقات کی شروع ہوتی ہے، اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ہندوستان کے
ساتھ گوناگوں تعلقات کی بنا پر عربوں کو یہاں کے مذاہب کی تحقیقات کا شوق پیدا ہوا، اور انھوں نے
بڑی محنت سے اس کی تلاش و تحقیق کر کے اپنی کتابوں میں اُن کے حالات لکھے، اور ان مسلمان سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں
کے علاوہ جن کے نام اوپر گذر چکے ہیں، اور جنھوں نے اپنی کتابوں میں ہندوستان کے عام حالات کے ضمن میں
یہاں کے مذاہب کا بھی حال لکھا ہے، دوسرے مسلمان علما میں ابن ندیم، مطہر بن طاہر مقدسی، ابو العباس
ایرانشہری، عبدالکریم شہرستانی اور عبدالقاہر بغدادی نے خاص طور سے اپنی کتابوں میں ہندو مذاہب اُن کے فرقوں
اُن کے عقائد اور مذہبی رسوم کے تفصیلی حالات تحریر کئے ہیں، اور ان بیانات کو نقل بھی کیا ہے، اس سلسلہ میں
فرقہ سمنیہ یعنی بدھ مذہب کا عربی تاریخوں میں ذکر آتا ہے، بڑی محققانہ بحث کی گئی ہے، اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ

جنھیں تبلیغ کرتے تھے، ہندوستان میں ابتدائی اسلامی فتوحات کے زمانہ میں خصوصاً جن علاقوں سے مسلمانوں
کے تعلقات زیادہ تر بدھ آباد تھے، اس لئے وہی عربوں سے زیادہ متاثر ہوئے، اور اسلام کا اثر رفتہ رفتہ ہندوستان
میں پھیلنے لگا، بعض ہندو راجہ بھی مسلمان ہوئے، اور آج سے ایک ہزار سال پہلے سندھ کے ایک راجہ نے قرآن مجید کا
سندھی زبان میں ترجمہ کرایا، ہندوستان میں توحید خالص کا تصور بھی، اسلام کے اثرات کا نتیجہ ہے، گو ہندوؤں کے
بعض فرقوں میں ایک حد تک توحید پائی جاتی تھی، مگر تنزیہی اور کامل توحید اسلام کے اثرات کا نتیجہ ہے، اسی
طرح مسلمان بھی ہندوؤں سے متاثر ہوئے، اور اس بحث میں دونوں پر ایک دوسرے کے اثرات دکھائے گئے ہیں،

آخری اور پانچواں باب "ہندوستان میں اسلامی فتوحات سے پہلے یعنی غزنویوں سے قبل مسلمانوں
کی آبادی" پر ہے، یہ باب درحقیقت گذشتہ ابواب ومباحث کا نتیجہ اور ان کا حاصل ہے، اس میں دکھایا گیا ہے
کہ دکن اور جنوبی ہند میں جہاں مسلمانوں کی حکومت سب سے آخر میں قائم ہوئی، وہیں مسلمان سب سے پہلے آباد ہوئے
اور اس کا کوئی ساحلی علاقہ اور تجارتی شہر مسلمانوں سے خالی نہ تھا، بعض بعض شہروں میں اُن کی تعداد کئی کئی
ہزار تھی، اور یہاں کے ہندو راجاؤں پر ان کا بڑا اخلاقی اثر تھا، اور وہ ان کا بڑا لحاظ کرتے تھے، ان کو ہر طرح
کی سہولتیں دے رکھی تھیں، اُن کی تمام آبادیوں میں مسجدیں تھیں، اور جہاں اُن کی آبادی زیادہ تھی، وہاں
اُن کا مستقل مذہبی نظام قائم تھا، اور اُن کے معاملات کے فیصلے کیلئے ائمہ و قضاۃ مقرر تھے، ان مسلمانوں کے
اخلاقی اثر سے بعض ہندو راجہ مسلمان بھی ہوئے ۔

اس بحث میں ان علاقوں میں مسلمانوں کی آمد کی تاریخ اُن کی بڑی اور مرکزی آبادیوں، اور اُن کے حالات
کی پوری تفصیل آگئی ہے، اور مالدیپ، سراندیپ، ملیبار، کولم (ٹرانکور) کارومنڈل، چیمور (چیمور) تھانہ (بمبئی)
کھمبایت، گجرات، گندھار (بھڑوچ کے قریب) بیرم، گوگہ (بھاؤنگر کے پاس) چندا پور (گوا کے قریب)
ہنور (حاطہ بمبئی) ملیبار میں ابی سرور، باکنور (موجودہ برکور) منگلور، ہیلی (کنانور کے قریب) جرتن (موجودہ
سری کنداپورم) دہ فتن، بدھ فتن، پندرانی، کالی کٹ، چالیات، سیون، گاڑی، وداستمند (علاقہ میسور) کا

قدیم پایۂ تخت)، وغیرہ میں مسلمانوں کی آمد، ان کی آبادیوں، ان کے نظام، ہندوؤں سے ان کے تعلقات اور اس زمانہ کے ان علاقوں کے مختلف حالات لکھے گئے ہیں،

آخر میں سندھ و ملتان میں مسلمانوں کی تاریخ بیان کی گئی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمد بن قاسم کے دور سے بھی پہلے یہاں کئی سو مسلمان آباد تھے، سندھ کی فتح سے لیکر امویوں کے خاتمہ بلکہ عباسیوں کے ابتدائی دور تک سندھ میں مسلمانوں کی تاریخ بہت صاف ہے، مگر اس کے بعد سندھ کی طوائف الملوکی کے زمانہ کی تاریخ بڑی گنجلک اور پیچیدہ ہے، غزنویوں اور غوریوں سے پہلے یہاں کئی مسلمان خانوادوں نے حکومت کی، بلکہ ایک ایک وقت میں دو دو حکومتیں رہی ہیں، جن کے حالات تاریخوں میں بہت کم اور اتنے گنجلک ہیں کہ ان خاندانوں اور ان کے حکمرانوں کی تعیین مشکل ہے، اور بعض خاندانوں کے متعلق یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کی اصل و نسل کیا تھی، اور ان کا زمانہ کونسا ہے، اس باب میں ان تمام خاندانوں کی تحقیقات کر کے اس کی تعیین کی گئی ہے، اور ان کے حالات لکھے گئے ہیں جس سے سندھ کے حکمرانوں کا سلسلہ بڑی حد تک مکمل ہو جاتا ہے، یہ بحث بڑی محققانہ ہے، ان خاندانوں کے حالات کے ساتھ ان کے زمانہ کے سندھ کے بڑے بڑے شہروں کے مختلف قسم کے حالات لکھے ہیں اور ان پرانے شہروں کے جائے وقوع کی جن کے اب صرف نام تاریخوں میں باقی رہ گئے ہیں تعیین کی گئی ہے، اور اس بحث پر یہ اہم کتاب ختم ہو جاتی ہے، ان مباحث سے اس کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

خیام

علمی سلسلہ کی دوسری اہم کتاب خیام ہے، اس نامور حکیم اور جلیل القدر فاضل کو اہل یورپ نے ایک عیاش اور بدمست رند لاابالی کی شکل میں پیش کیا ہے، جو ہمہ تن شاہد و شراب میں غرق رہتا تھا، اور جس کا مقصد زندگی رندی و عیش پرستی کے سوا کچھ نہ تھا، اور اس مشرب کا وہ بہت بڑا مبلغ بھی تھا، مگر اس تصویر کو کم از کم اس کی اصل شکل سے کوئی علاقہ نہیں ہے، وہ اپنے زمانہ کا ایک بڑا فلسفی، ہیئت و نجوم اور ریاضیات کا [illegible]

عالم اور فلسفی قسم کا صوفی تھا، مذہبی حیثیت سے وہ ایک دیندار مسلمان تھا، اور مذہبی علوم میں پوری دستگاہ رکھتا تھا، اس کی زندگی زاہدانہ تھی، مگر اہل یورپ کا مذاق خود رندانہ ہے، اس لئے رباعیات خیام کے ظاہری آئینہ میں اس کی جو تصویر دیکھی وہ ہم مشربی کی بنا پر بڑی دلکش نظر آئی، چنانچہ اسی کو اصل سمجھکر اس کی اتنی تشہیر کی کہ عمر خیام اور بدمست شرابی ہم معنی بن گئے، حالانکہ کسی شاعر کے کلام سے اس کی عملی زندگی کا قیاس صحیح نہیں ہے، خصوصاً مشرقی شاعری میں تو سراسر غلط ہے، بڑے بڑے مسلّم صوفی شعراء کا کلام بھی شراب و شاہد کے ذکر سے خالی نہیں ہے، مولانا روم، شمس تبریز، ابو سعید ابو الخیر جیسے بزرگوں کے کلام میں بھی شراب و شاہد کی رنگینیاں نظر آتی ہیں، اور خواجہ حافظ کا کلام تو پورا میخانہ ہے، ممکن ہو بعض ظاہر بین حافظ کی شراب کو بھی شراب ناب ہی پر محمول کریں، لیکن ان کے علاوہ اور بزرگوں کو کون رند شاہد باز کہہ سکتا ہے، اس کو فارسی شاعری کا عیب سمجھا جائے یا ہنر، شراب و شاہد، چنگ و رباب، گل و بلبل، ہجر و وصال اس کے ایسے لوازم بن گئے ہیں کہ ان کے سہارے کے بغیر ایک قدم بھی شاعری کے میدان میں نہیں چلا جا سکتا، اور نہ ان کے بغیر اس میں حسن و دلکشی پیدا ہوتی ہے، اس لئے حکیم و فلسفی اور صوفی و صافی شعراء بھی ان کنایات و استعارات کے استعمال پر مجبور رہتے، اور غالب نے تو صاف صاف کہدیا ہے کہ

ہرچند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو　　　بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اس لئے خیام کے شاہد و شراب کو کیوں حقیقت پر محمول کیا جائے، اس کے علاوہ اس کی بہت سی رباعیاں فلسفیانہ اور اخلاقی بھی ہیں، ان کو کیوں نظر انداز کیا جائے، خصوصاً جب تاریخی حیثیت سے یہ معلوم و مسلّم ہو کہ وہ ایک بڑا عالم حکیم اور صوفی تھا جس پر اس کی تصانیف شاہد ہیں، مگر ظاہر پرست اہل یورپ نے اس کی رندانہ رباعیوں کے آئینہ میں اس کی ظاہری تصویر دیکھ کر اسی کو اصل سمجھ لیا، اگر انھوں نے رباعیوں کے بجائے تاریخ کے اوراق اور خود خیام کی فلسفیانہ تصانیف کے ذریعہ خیام کو سمجھنے کی کوشش کی ہوتی، تو اس کی اصلی شکل نظر پڑتی، کتاب خیام میں اس کی صحیح شکل پیش کی گئی ہے، اور یہ دکھایا گیا ہے کہ وہ رند شاہد باز نہیں

بلکہ بڑا عالم حکیم اور فلسفی قسم کا صوفی تھا،

خیام پر شرق سے زیادہ مغرب میں لکھا گیا ہے، مگر جس قدر لکھا گیا ہے، اسی قدر اس کے حالات و واقعاتِ زندگی میں مختلف قسم کی تاریخی پیچیدگیاں اور گتھیاں پیدا ہوگئی ہیں، مصنف نے اس کے سوانح کے تمام مشرقی و مغربی ماخذوں سے اُن پر تنقید کرکے ان گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے اور نہ صرف اردو بلکہ دوسری زبانوں کے مقابلہ میں بھی پہلی مرتبہ اس بسط و شرح اور تحقیق و تنقید کے ساتھ خیام کے حالات لکھے گئے ہیں، اور اس کے علمی کمالات اور علمی کارناموں پر مفصل تبصرہ کرکے دکھایا ہے کہ عمر خیام اپنے زمانہ کا بہت بڑا فاضل حکیم، ہیئت و نجوم اور ریاضیات کا بہت بڑا عالم اور صوفی مشرب فلسفی تھا، اور اس کے سوانح کے سلسلہ میں سلجوقیوں کے دور کے علمی اور خیام کے معاصر علماء کے حالات بھی آگئے ہیں،

بعض دوسرے شعراء کے کلام کی طرح عمر خیام کی رباعیاں بھی دوسرے شعراء کی رباعیوں سے خلط ملط ہوگئی ہیں اسلئے رباعیات کے مختلف قلمی اور مطبوعہ نسخوں کی مدد سے خیام کی رباعیات کی تعیین کی کوشش کی گئی ہے، اور رباعیات کے ایک قدیم اور صحیح قلمی نسخہ کی نقل بھی کتاب میں شامل کردی گئی ہے، اس کے علاوہ خیام کے سات نادر فلسفیانہ رسالوں کو جن میں سے چھ عربی میں ہیں، اور ایک فارسی میں تصحیح و ترجمہ کے ساتھ مرتب کرکے آخر میں شامل کر دیا گیا ہے، یہ اس کتاب کا اجمالی خاکہ ہے، مگر اس کے گوناگوں علمی مباحث مختلف النوع تاریخی معلومات، اور مصنف کی وسعت و دقتِ نظر اور تحقیق کا اندازہ کتاب کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے،

حیاتِ شبلی

ان کے علاوہ علمی سلسلہ کی دو اہم کتابیں اور ہیں، ایک حیاتِ شبلی اور دوسری عربوں کی جہاز رانی ان میں حیاتِ شبلی مختلف حیثیتوں سے زیادہ اہم ہے، وہ ایک جلیل القدر اور شفیق استاد کے حضور میں ایک فاضل شاگرد رشید کا نذرانۂ عقیدت ہے، اس لئے مصنف نے اس میں اپنا پورا تصنیفی کمال اور زورِ قلم صرف کردیا ہے، علامہ شبلی

کی زندگی میں جب کسی نے ان کی سوانح عمری لکھنے کا خیال ظاہر کیا، تو وہ اس کو ٹال گئے، اور اسی قسم کی ایک فرمایش کے سلسلہ میں انھوں نے ہونہار شاگرد کو لکھا تھا کہ دوسرے لوگ میری سوانح عمری کیا لکھیں گے تم ہی جب کبھی دنیا کے اور کاموں سے فرصت پانا تو اس کام کو انجام دینا،" اس لئے حیاتِ شبلی کی تالیف ہمیشہ مصنف کے پیشِ نظر رہی، مگر یہ اتفاق ہے کہ ان کو اسی وقت اس کی تالیف کا موقع ملا جب دنیا کے اور کاموں سے بڑی حد تک فرصت مل چکی تھی، چنانچہ حیاتِ شبلی ان کی آخری تصنیف ہے اور اسی پر ان کی تصنیفی زندگی کا خاتمہ ہوگیا،

مولانا شبلی کی ذات جامعِ کمالات تھی، وہ قدیم مذہبی علوم کے عالم بھی تھے، اور جدید افکار و خیالات کے واقف کار بھی، قدیم علماء کی صحبت بھی اٹھائی تھی، اور جدید طبقہ کے شریکِ بزم بھی رہے تھے، وہ مفکر و محقق بھی تھے اور ادیب و شاعر بھی، انشا پرداز بھی تھے، اور خطیب بھی، مورخ بھی تھے، اور متکلم بھی، مصلح بھی تھے، اور ماہر تعلیم بھی، اور سیاست کا ذوق بھی رکھتے تھے، اور ان سب میں اُن کے بڑے کارنامے ہیں، وہ محض پرانے طرز کے عالم نہ تھے، بلکہ زمانہ کے نئے حالات و ضروریات کی بنا پر بہت سے خیالات میں انقلابی تھے، اور قدیم بنیادوں پر جدید قصرِ ملت کی تعمیر کرانا چاہتے تھے، اس لئے اُن کے خیالات پُرانے اور نئے دونوں طبقوں سے مختلف تھے، اور دونوں ان سے کھنچے تھے، خصوصاً عربی تعلیم اور علماء کی مذہبی و تعلیمی اصلاح کے لئے انھوں نے جو انقلابی قدم اٹھایا، وہ بالکل نیا تھا، وہ ان دونوں کی اصلاح کرکے ان کو جدید دینی و ملی ضروریات کے مطابق بنانا چاہتے تھے، جس کا نمونہ دار العلوم ندوۃ العلماء ہے اور اسلامی علوم و معارف پر غور و فکر اس کی تعبیر و ترجمانی، اور علمی تلاش و تحقیق کا ایک نیا طریقہ اختیار کیا تھا، جس کا نمونہ دار المصنفین ہے، ان دونوں باتوں سے پرانے علماء بالکل نامانوس تھے، اس لئے علامہ شبلی کو طرح طرح کی بدگمانیوں کا شکار ہونا پڑا، لیکن بالآخر زمانہ کے حالات نے سب کو اس راستہ پر چلنے کے لئے مجبور کردیا، اور جو اس سے الگ رہے، اُن کے دینی خدمات کا دائرہ محدود ہو کر رہ گیا، یہ علامہ شبلی کا بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے اپنی عاقبت اندیشی اور ذہانت سے دینی علوم اور علماء کا بھرم قائم کر دیا، ورنہ قدیم اور جدید کی کشمکش میں ان کا وقار قائم رہنا مشکل ہوجاتا

مگر اسی کے ساتھ وہ جدید تعلیم وتہذیب سے مرعوب نہ تھے، اور اس کے بعض محاسن کے اعتراف کے ساتھ اس کی خامیوں کے ناقد بھی تھے، اور سیاسیات میں آزادانہ خیالات رکھتے تھے، اس لئے جدید تعلیم یافتہ طبقہ بھی ان سے مطمئن نہ تھا۔

اس کے علاوہ مسلمانوں کی جو تمام قومی و ملی تحریکیں خواہ وہ تعلیمی ہوں یا اصلاحی علمی ہوں یا سیاسی جو ان کے زمانہ میں اٹھیں، ان سب میں ان کا نمایاں حصہ رہا، اور بعض تحریکوں کے وہ خود بانی اور رہنما تھے، اور ان میں سے کسی میں وہ کسی کے مقلد نہ تھے، بلکہ خود مجتہد اور رہنما کی حیثیت رکھتے تھے، اسلئے اس زمانہ کے بعض اشخاص اور جماعتوں سے انکو اختلافات بھی پیش آئے، اس لئے ان کی سوانح کا اس طرح لکھنا کہ مولانا شبلی کے کمالات و کارنامے ان کی جدت و ندرت اور قائدانہ و مجتہدانہ حیثیت بھی نمایاں ہو جائے، اور کسی آبگینہ کو ٹھیس بھی نہ لگنے پائے، بڑا نازک کام تھا، مگر مصنف نے بڑی خوبی سے ان نازک مراحل کو طے کیا ہے، اور مولانا شبلی کے کمالات اور ان کے کارناموں کا ایسا دلکش مرقع تیار کیا جس میں ان کے سارے خط و خال نمایاں اور وہ اپنے تمام معاصرین میں ممتاز نظر آتے ہیں، اس کتاب میں ان کے ذاتی سوانح کے ساتھ ان کے علمی و تعلیمی، اصلاحی اور سیاسی کارناموں کی پوری تفصیل آگئی ہے، اور چونکہ ان کی پوری زندگی قومی و ملی کاموں میں گذری اور انھوں نے مسلمانوں کے گوناگون کام انجام دیئے، اور ان کی ہر تحریک میں سرگرم حصہ لیا، اس لئے ان کے سوانح کے سلسلہ میں ہندوستان کے مسلمانوں کی پچاس سالہ علمی سرگذشت بھی آگئی ہے، اس کتاب کا مقدمہ نہایت فاضلانہ اور اپنی جگہ پر ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتا ہے، اس میں پورے صوبہ اور خصوصاً اس کے مشرقی اضلاع کی کئی صدیوں کی علمی، دینی اور اخلاقی و روحانی تاریخ بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے جمع کی گئی ہے جو کسی ایک کتاب میں اس طرح مرتب اور یکجا نہیں مل سکتی، اس طرح یہ کتاب مولانا شبلی مرحوم کے حالات اور کارناموں کا مرقع بھی ہے اور ہندوستان کے مسلمانوں کی پچاس سالہ تاریخ بھی۔

عربوں کی جہازرانی

یہ ان خطبات کا مجموعہ ہے جو مارچ ۱۹۳۰ء میں اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن بمبئی کی فرمائش پر دیئے گئے تھے اور جنھیں کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا تھا، جیسا کہ اوپر عرب و ہند کے تعلقات پر تبصرہ کے سلسلہ میں لکھا جا چکا ہے کہ عرب قدیم الایام سے ایک تاجر قوم اور مشرق و مغرب کے درمیان تجارتی کڑی تھے، وہ مصر و افریقہ اور عرب و شام اور عراق کا تجارتی مال ہندوستان، سیلون، برما، انڈونیشیا اور چین لیجاتے تھے، اور ان ملکوں کا سامان مذکورہ ممالک میں پہنچاتے تھے، ظہور اسلام کے بہت پہلے سے اپنے زمانہ کے بڑے بحر پیما، اور جہاز ران تھے، اس کے بعد جب اسلامی فتوحات کا سیلاب عرب سے نکل کر افریقہ اور یورپ کی طرف بڑھا، تو ان کے سمندر عربوں کے بحری بیڑوں کا جولانگاہ بن گئے، اور ایک صدی کے اندر وہ بحر عرب خلیج فارس بحیرۂ اسود بحر قلزم اور بحر روم کے حکمران بن گئے، اور ان کی بحری حیثیت و اہمیت تقریباً وہی ہو گئی جو اس زمانہ میں برطانیہ کی ہے، اور اس سلسلہ میں انھوں نے علمی اور عملی دونوں حیثیتوں سے فن جہازرانی کو بڑی ترقی دی۔

ملک گیری کے بعد جب دوسری صدی سے ان کی علمی ترقی کا دور شروع ہوا تو علم و فن کے دوسرے شعبوں کے ساتھ سمندروں کے متعلق تحقیقات اور جغرانی اکتشافات کے سلسلہ میں انھوں نے اس زمانہ کے معلوم سمندروں کا چپہ چپہ چھان مارا، بعض نئے سمندروں کا پتہ چلایا، مختلف سمندروں کے راستے دریافت کئے، نامعلوم جزیروں کا اکتشاف کیا، یورپ، ایشیا اور افریقہ کے نامعلوم خطوں سے واقفیت پیدا کی، فن جہازرانی کو ترقی دی، اس کے بہت سے آلات ایجاد کئے، سمندروں کے حالات اور جہازرانی پر کتابیں لکھیں۔ عربوں کی جہازرانی میں ان سب کی پوری تفصیل بیان کی گئی ہے۔

پہلے لغات عرب اور کلام مجید سے عربوں کی بحری واقفیت اور ان کی جہازرانی کا ثبوت دیا گیا ہے، اس کے بعد عہد رسالت میں عربوں کے بحری سفروں کا حال لکھا ہے، پھر خلافت راشدہ

مین جہازرانی کی ترقی کا ذکر ہے، اس کا آغاز حضرت عثمانؓ کے عہد سے ہوا تھا، اور امیر معاویہ نے شام کی گورنری کے زمانہ مین بحرِ روم کے متعدد جزائر فتح کئے تھے، اور اسلامی بیڑے کو اتنا طاقتور بنا دیا تھا کہ ۳۴ھ مین جب قیصرِ روم نے چھ سو جہازون کے ساتھ شام کے سواحل پر حملہ کیا، تو اسلامی بیڑے نے اس کو نہایت فاش شکست دی،

لیکن عربون کی بحری ترقی کا اصل زمانہ اموی عہد ہے، اس زمانہ مین بحرِ روم اسلامی بیڑے کی ترکتاز کا جولانگاہ بن گیا، اور مسلمانون نے چند دنون کے اندر سسلی اور اسپین کا پورا جزیرہ اور اٹلی کے بعض حصے فتح کر لئے، اور یہ فرانس تک بڑھتے چلے گئے،

ان فتوحات کے سلسلہ مین مختلف حیثیتون سے جہازرانی کو بڑی ترقی ہوئی، اور امویون کا بحری بیڑا اس زمانہ کا سب سے زیادہ طاقتور بن گیا، اس کے بعد بنی عباس کے زمانہ مین اگرچہ مشرقی خلافت مین بحری سرگرمی کم ہو گئی تھی مگر مغرب مین بنی امیہ اندلس اور فاطمیہ مصر کے یہان اس کا سلسلہ برابر جاری رہا، اور عباسیون کے عہد مین علمی و فنی حیثیت سے جہازرانی کو بڑی ترقی ہوئی، اس لئے ان دونون زمانون کی ترقی کا حال کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھا گیا ہے، اور اس سلسلہ مین عرب اور عراق کی پرانی اور عربون کی قائم کردہ نئی بندرگاہون کا بھی ذکر کیا گیا ہے، اس کے بعد مشرقی ملکون مین عربون کی تجارت کے حالات ہین، اور اس سلسلہ مین مغربی ہند کی بندرگاہون سے لیکر سیلون، برہما، جاوا، سماٹرا، وغیرہ جزائر شرق الہند، اور چین تک کی بندرگاہون، یہان عربون کی تجارت اور ان کے اثرات کی تفصیل ہے، پھر افریقہ کے سواحل یعنی بحرِ روم کے جزائر، اس کے ساحلی ملکون اٹلی، اسپین، مصر اور شمالی افریقہ مین عربون کی جہازرانی اور اس کی بندرگاہون کے حالات ہین،

پھر بحر پیمائی اور فن جہازرانی کے متعلقات مین عربون کے علمی کارنامون اور ان کے ایجادات و اکتشافات کا ذکر ہے، اور اس سلسلہ مین سمندرون کے بارہ مین عربون کے علم اور ان کی پیمائش، بحرِ بیرنگ سے ان کی واقفیت عرب جہازرانون کی تحقیقات، بحرِ محیط (اٹلانٹک) کے جزائر مین انگلینڈ، آئرلینڈ، دوبارہ انگلستان، جزائر فا (فروجزنیس آئرلینڈ) بحرِ چین اور بحرِ الکاہل مین جاوا، سماٹرا، جاپان، فلپائن، مڈگاسکر اور کمورو سے ان کی واقفیت

اور عربی کی کتابون مین ان کے بارہ مین ان کے بیانات کی تفصیل ہے، اور یہ دکھایا گیا ہے کہ بحرِ روم اور بحرِ اٹلانٹک سے افریقہ کے سواحل پر گھوم کر بحرِ ہند مین آنے کا راستہ دریافت کرنے والا پہلا شخص ایک عرب ابن ماجد تھا، اور واسکو ڈی گاما اسی کے ذریعہ ہندوستان پہنچا تھا،

اس کے بعد عربون کے بنائے ہوئے بحری نقشون، ان کے تعمیر کردہ لائٹ ہاؤسز اور چنگی کے نشانات کا ذکر اور جہازرانون کے رہنما ستارون، سمندری ہواؤن اور ان کے جغرافیہ پر عربون کی تصانیف کا حال ہے، پھر قطب نما کی ایجاد اور ترقی کی بحث اور عربون کے ایجاد کردہ ان فلکی آلات کا ذکر ہے جن سے جہازرانی مین مدد ملتی ہے، پھر عربون کے قائم کردہ جہازرانی کے کارخانون، مصنوعی بحری لڑائیون، ڈوبے ہوئے جہازون کے نکالنے، جہاز و جہازسازون، جہازی سازوسامان وغیرہ جہاز کے مختلف متعلقات کی تفصیل، اور بحرِ ہند اور بحرِ عرب کے راستون کا تذکرہ ہے، اور مسلمانون کی بحری ترقی کے خاتمہ پر یہ داستان ختم کی گئی ہے، آخر مین عربون کی بحری تصانیف کا اجمالی تذکرہ ہے، یہ اس کتاب کے مباحث کا اجمالی خاکہ ہے، اور اس مین اس موضوع پر جو معلومات فراہم کئے گئے ہین، ان کا صحیح اندازہ اصل کتاب کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، ان کے علاوہ اور بھی متعدد چھوٹے چھوٹے رسالے ہین،

مضامین و مقالات و خطبات

ان تصانیف کے علاوہ انھون نے مختلف موضوعون پر سیکڑون مضامین لکھے، علم و ادب کا مشکل ہی سے کوئی گوشہ ایسا نکل سکتا ہے جو تشنۂ تحقیق رہا ہو، اور ان کی نظر سے چھوٹا ہو، انھون نے اسلامی علوم و فنون کے بہت سے مستور گوشے بے نقاب کئے، علمی و مذہبی مباحث پر لکھا، ادبی و لسانی مسائل پر بحث و تنقید کی، مختلف اعتراضات کے جواب دیئے، تاریخی گتھیون کو سلجھایا، قومی و ملی مسائل پر اظہار خیال کیا، مسلمانون کے علمی و تمدنی کارنامون کو اس طرح پیش کیا کہ اسلامی تاریخ علم و فن اور تہذیب و تمدن کا تماشاگاہ نظر آنے لگی، غرض اسلامی علوم و ادب کی ہر شاخ، اور ہر پہلو پر معلومات کا ایک دفتر جمع کر دیا، اور جس موضوع پر قلم اٹھایا اس کو

اس تحقیق و جامعیت کے ساتھ لکھا کہ پھر اس پر اضافہ کی گنجایش نہ چھوڑی،

صرف ایک موضوع اردو زبان و ادب پر ان کے مضامین کی تعداد اتنی ہے کہ ان کا مجموعہ کئی سو صفحات
مین نقوشِ سلیمانی کے نام سے شائع ہوا ہے، اس سے اُن کے دوسرے مضامین کی تعداد کا قیاس کیا جا سکتا ہے،
اگر ان سب کو جمع کیا جائے، تو ان کا مجموعہ کئی جلدون مین آئے گا، ان مین سے بعض مضامین اتنے طویل ہین کہ مستقل
رسالون کی شکل مین شائع ہوئے، مثلاً رسالہ اہلِ سنت والجماعت، بہادر خواتینِ اسلام، حیاتِ مالک، اور [illegible]
اسلامیہ اور دنیاے اسلام، ان سب مضامین پر تبصرہ کے لئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے، اگر صرف ان کے
نامون کی فہرست لکھی جائے، تو بھی کئی صفحون مین آئے گی، اس لئے مختلف موضوع و مسائل سے متعلق نمونۃً کچھ
مضامین کا نام لکھا جاتا ہے، اس سے ان کی نوعیت اور اُن کے تنوع کا اندازہ ہو گا، مثلاً

محبتِ الٰہی اور اسلام، اسلام مین حیوانات کیساتھ سلوک، احکام القرآن، توکل و صبر کا قرآنی مفہوم، مذہب
کا قانونی حصہ، ارضِ مقدس کی داستان، ارضِ حرم، اور قرآنی احکام، خلیل اللہ کی بشریت، ذبحِ عظیم، قربانی کا
اقتصادی پہلو، فنِ تصوف اور محدثین و صوفیہ مین تطبیق کی راہ، لفظ اللہ کے معنی، اور اسمِ اعظم کا تخیل، اسلام و
حریت، یا جبر و قدر، کیا خلقی معذورین کی پیدایش انصافِ الٰہی کے خلاف ہے، اسلامی عقیدہ کے مطابق
بچون کی پیدایش کے احوال کا اختلاف، امتِ مسلمہ کی بعثت، تخلیقِ عالم کا مقصد، قرآن پاک کا تاریخی اعجاز،
سنتِ ذبحی، وحی، اور ملکۂ نبوت، کیا قرآن پاک انسانی ذہن و دماغ سے ماخوذ ہے، حکومتِ الٰہیہ اور مسلمانون کا
مطمحِ نظر،

اسلامی تہذیب و تمدن، مسلمان عورتون کے حقوق کا مسئلہ، اسلام اور زنانِ ہند، تحفظِ حقوقِ زوجین،
احادیث و سیر کی تحریری تدوین، اسماء الرجال کا قدیم ذخیرہ، خلفائے اسلام کا اقتدار، خلفائے راشدین
کا طریقِ حکومت، موجودہ ہندوستان مین کاشتکارون کے حقوق، سیاسیاتِ اسلام کے نظریے، مسلمانانِ ہند
کی مذہبی تنظیم، دنیاے اسلام مین ذہنی انقلاب، عالمِ اسلام کی تنظیم کا مسئلہ، نظم تحت اندراجِ نکاح و طلاق

و نظمِ قضاۃ، مسلمانانِ ہند کا شرعی نظام،
ہندوؤن کی علمی و تعلیمی ترقی مسلمانون کے عہدِ حکومت مین، مرہٹون کا فوجی نظام، عہدِ اسلام مین تعلیمِ
نسوان کی درسگاہین، ہندوستان مین اسلام کی اشاعت کیونکر ہوئی، ہندوستان مین علمِ حدیث، مسلمان حکماء
اور یونانی فلاسفہ، نظّام اور اُس کا فلسفہ، لاہور کا ایک فلکی آلات ساز خاندان، عربون کی بحری تصنیفات،
رتن کیتھلک کی چند من گھڑت کہانیان، برمک اور بُدھ، واقدی پھر واقدی، اصولِ تنقید، ہندستانی
کی اصلیت اور اس کے کچھ اصول، حجاز کے کتب خانے، انڈیا آفس لائبریری مین اردو کا ذخیرہ،

ان مضامین کے علاوہ ان مقالات کی بھی خاصی تعداد ہے، جو مختلف علمی مجالس مین پڑھے گئے، اور معارف
مین شائع ہوئے، اس قسم کے بیشتر مقالات مضامین سے زیادہ اہم ہین، چنانچہ اُن کی متعدد اہم کتابین مثلاً عرب
و ہند کے تعلقات، خطباتِ مدراس، خیام اور عربون کی جہازرانی اصل مین مقالات ہی تھے، جو ترمیم و اضافے
کے بعد کتابی شکل مین شائع ہوئے، ان مین حسبِ ذیل مقالات زیادہ اہم ہین، مسلمانون کی آیندہ تعلیم، یہ تقریر
جامعہ ملیہ مین پڑھا گیا، تاج محل اور لال قلعہ کے معمار، اور [illegible] ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کے دو مختلف
اجلاسون مین پڑھے گئے، اردو کیونکر پیدا ہوئی، ناگری پرچارنی سبھا کے لئے لکھا گیا تھا، ابو البرکات بغدادی
اور اس کی کتاب المعتبر دائرۃ المعارف حیدر آباد مین عربی مین پڑھا گیا تھا، اور اس کا اردو ترجمہ معارف مین
شائع ہوا، عرب اور امریکہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک اجلاس مین پڑھا گیا تھا، اس کے علاوہ اور بھی مقالات
ہین، مگر ان سب کا استقصا مقصود نہین،

انھون نے مجلسِ خلافت، جمعیۃ علماے ہند، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور،
ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد، دائرۃ المعارف حیدر آباد، آل انڈیا ہسٹری کانگریس وغیرہ مختلف علمی و دینی مجالس
کے اجلاسون اور قومی و ملی کانفرنسون کی صدارت کی، اور ان مین صدارتی خطبے پڑھے، ان مین سے جو خطبات تحریری
تھے، وہ معارف مین شائع ہوئے، اس لئے وہ محفوظ ہین، وہ جملہ امور و مسائل مین خواہ وہ علمی و مذہبی

ہوں یا قومی وملی، ایک سوچی سمجھی ہوئی پختہ اور صائب رائے اور مستقل خیالات و نظر رکھتے تھے، اور ان کا علمی ذوق استوار جما ہوا اور ہمہ گیر تھا، کہ ان کا کوئی خطبہ و تقریر بھی خواہ وہ کسی موضوع پر ہو افکار و نظریات اور علمی و تاریخی معلومات سے خالی نہ ہوتی تھی، علمی مجالس اور علمی اجتماعات کے خطبے معلومات کا خزانہ اور قومی وملی کانفرنسوں اور جلسوں کے خطبات زیر بحث مسئلہ کے متعلق تفکر و تدبر، فہم و بصیرت اور صحیح اور سلجھی ہوئی رائے کا درس ہوتے تھے، ان کا کوئی خطبہ بھی ان خصوصیات سے خالی نہیں ہے، علمی و تاریخی خطبات میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی پچاس سالہ جوبلی کے شعبۂ علوم و فنون اور اسی کانفرنس کے اجلاس کلکتہ کے شعبۂ اردو اور آل انڈیا ہسٹری کانگریس کے اجلاس مدراس کے شعبۂ تاریخ ہند ازمنۂ وسطیٰ کے فاضلانہ خطبۂ صدارت علمی و تاریخی معلومات کا گنجینہ اور ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں، طب سے ان کو کوئی تعلق نہ تھا لیکن طبیہ اسکول پٹنہ کے جلسۂ تقسیم اسناد کا خطبۂ صدارت اسلامی طب کی پوری تاریخ ہے، ان خطبات کی بڑی تعداد ہے، مثالاً صرف چند خطبات کا تذکرہ کر دیا گیا،

ان کے علاوہ ان کے شذرات بھی نہایت اہم ہوتے تھے، مختلف النوع وقتی امور و مسائل اور کبھی کبھی مستقل معاملات پر شذرات میں اظہار خیال کرتے تھے، اس لئے ان کے شذرات مسائل و مباحث کے تنوع کی حیثیت سے دائرۃ المعارف کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ان سے گذشتہ تیس پینتیس سال کی قومی و ملی تحریکوں، مختلف خیالات و رجحانات اور دوسرے پیش آمدہ حالات و واقعات کی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے، اور ان کے متعلق مصنف کے خیالات معلوم کئے جا سکتے ہیں، ان کے شذرات غور و فکر، خیالات کی صحت و پختگی اور اصابت رائے کا نمونہ اور ایجاز و اختصار اور بلاغت کے لحاظ سے ادب و انشاء کا شاہکار ہیں،

مذکورۂ بالا تصانیف اور مضامین و خطبات کی فہرست پر سرسری نظر ڈالنے سے انکی وسعت و دقتِ نظر، علمی جامعیت و ہمہ گیری کا کسی قدر اندازہ ہو جاتا ہے، اس دور میں وہ جامعیتِ علوم کی تنہا مثال تھے، اُن میں ابن رشد و ابن خلدون، ابن تیمیہ و ابن قیم، غزالی و رازی، شاہ ولی اللہ و مجدد سرہندی کے علمی جلووں کی جھلک یکجا نظر آتی تھی، اسی لئے ان کی تحریروں سے مسلمانوں کو جس قدر فیض پہنچا، اس کی مثال اس زمانہ میں کم

گی صحیح العقیدہ، لیکن بے عمل مسلمانوں کو باعمل، طالب دین کو دیندار اور دیندار کو متقی بنا دینا بہت آسان ہے، لیکن پڑھے لکھے جنوں کو شیشہ میں اتارنا اور تعلیم یافتہ متشککین اور منکرین کو دین کی راہ پر لگانا بہت دشوار ہے، اور یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس دشوار کام کو سب سے زیادہ سید سلیمان کی تحریروں نے انجام دیا، اور جو لوگ اپنے مذہب اور اپنی تہذیب کے نام سے شرماتے تھے، وہ اس پر فخر کرنے لگے، اور ان میں اس کا ذوق اور اس کی طلب پیدا ہو گئی اس طرح سید سلیمان ندوی نے ہزاروں گم کردہ راہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کو راہ راست پر لگایا۔

ان کا ایک بڑا علمی کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے اسلامی علوم و فنون پر تحقیقات کا ایک ایسا ادارہ قائم کر دیا، اور اس کو اس درجہ تک پہنچا دیا کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری اسلامی دنیا میں اس کی شہرت ہے، اور اس کے کاموں کو عزت و وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، اور اُن کی تربیت کردہ جماعت کے علاوہ ان کی تصانیف اور مضامین نے بہت سے تعلیم یافتہ مسلمانوں میں بھی سنجیدہ علمی و تحقیقی کاموں کا مذاق پیدا کر دیا، چنانچہ آج جن مسلمانوں میں بھی اس قسم کا ذوق نظر آتا ہے، اور ہندوستان میں جہاں بھی اس قسم کا کام ہو رہا ہے، اس میں سید سلیمان ندوی کی تصانیف کو بڑا دخل ہے، اس لئے وہ درحقیقت ایک علمی دور اور ایک خاص مکتب خیال کے بانی تھے، اور جب تک علمی دنیا قائم ہے، سید سلیمان کا یہ کارنامہ زندہ رہے گا۔

ان کا مزاج و مذاق اگرچہ ابتدا سے دینی تھا، اور اُن کی کسی دور کی تحریریں بھی دینی روح سے خالی نہیں ہیں، لیکن عمر کے ساتھ ساتھ دین کا رنگ اور زیادہ گہرا ہوتا گیا، اور آخر میں وہ صبغۃ اللہ میں بالکل رنگ گئے تھے، ومن احسن من اللہ صبغۃ، اور ان میں بڑا روحانی انقلاب ہو گیا تھا، اس دور میں اُن کے خیالات میں بھی بڑا تغیر پیدا ہو گیا، اور ان کی تقریروں اور تحریروں کا رنگ بھی بدل گیا، یہاں تک کہ اپنے بعض پرانے خیالات اور تحریروں سے رجوع کیا، اور ان کے نزدیک اُن کے قلم سے جو بھول چوک ہوئی تھی، اس کو "رجوع و اعتراف" کے نام سے معارف میں شائع کیا، یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے، اس کو بڑا آدمی ہی انجام دے سکتا تھا، اور یہ اُن کی عظمت کی سب سے بڑی دلیل ہے،

اس روحانی انقلاب اور اس کے نتائج کے بارہ میں دو قسم کے خیالات ہیں، ایک جماعت اس کو پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھتی، اور اس کو اُن کی علمی عظمت کے منافی تصور کرتی ہے، اس میں اس کو اُن کے علمی مرتبہ کا انحطاط نظر آتا ہے، دوسری جماعت اس انقلاب اور اس کے بعد ہی کی زندگی کو ان کا سب سے بڑا کارنامہ اور حاصل زندگی سمجھتی اور اس سے پہلے کے علمی کاموں کو ناقابل اعتنا تصور کرتی ہے، یہ دونوں رائیں غلط اور افراط و تفریط پر مبنی ہیں دونوں زندگیوں میں کوئی تضاد نہیں ہے، بلکہ وہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں، اور اس سے ان کا مرتبہ اور مقام اور زیادہ بلند ہو گیا، اس سے نہ اُن کی علمی منزلت میں کوئی فرق آتا ہے، اور نہ ان کے علمی کاموں کی اہمیت گھٹتی ہے، ان کے علمی کاموں کا مقصد بھی دین و ملت اور اسلام و مسلمانوں کی خدمت تھا، اس لئے مذہبی حیثیت سے بھی ان کی اہمیت پوری طرح قائم رہتی ہے، اور اُن کے روحانی انقلاب کو اتنی اہمیت نہیں دی جا سکتی کہ اس کے مقابلہ میں اُن کے علمی کارناموں پر پانی پھیر دیا جائے، یہ دونوں پہلو اپنی اپنی جگہ پر اہم ہیں، اور ایک کو بڑھانے کے لئے دوسری کی اہمیت نہیں گھٹائی جا سکتی، یہ کوئی غیر معمولی واقعہ یا نئی مثال نہیں ہے، اس قسم کے واقعات دوسرے اکابر اسلام کی زندگی میں بھی پیش آچکے ہیں، امام غزالی مولانا روم حتی کہ امام رازی تک کو ان مراحل سے گزرنا پڑا، لیکن آج کون صاحب علم و نظر اُن کے علمی کارناموں کی اہمیت کا انکار یا اس کی زندگی کے دونوں رخوں سے کسی کا استخفاف کر سکتا ہے، اس لئے اس سے سید صاحب کی بھی کسی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آتا،

درحقیقت یہ دونوں نقطہ نظر غلط ہیں، نہ سید صاحب رحمۃ اللہ نے راہ سلوک اختیار کرنے کے بعد علمی کاموں کو چھوڑا، اور نہ ان کا یہ راہ اختیار کرنا کسی حیثیت سے بھی قابل اعتراض ہو سکتا ہے، ان کا مذاق ضرور بدل گیا تھا، لیکن علمی کاموں کا سلسلہ بدستور جاری رہا، انھوں نے بہت سے خالص علمی مضامین مثلاً ابو البرکات بغدادی، اور اس کی کتاب المعتبر، ابن منصور کو سولی نہیں پھانسی دی گئی، عہد اسلامی میں تعلیم نسواں کی درسگاہیں، عہد جہانگیری کا ایک واقعہ، کیا مرزا بیدل عظیم آبادی شیعہ تھے، ہمت اور پرکھ، ملا خیر اللہ مہندس کے چند رسائل، قنوج، اور قومیت وغیرہ اس کے بعد لکھے جن میں

ہیں، یہ کتاب بھی اسی زمانہ کی ہے، مکتوب فرنگ کے نام سے اپنے ان خطوط کا مجموعہ مرتب کیا، جو وفد خلافت کے سلسلہ میں لندن سے اپنے احباب و اعزہ کو لکھے تھے، یادِ رفتگاں کے نام سے اُن کے لکھے ہوئے وفیات کا جو مجموعہ حال میں شائع ہوا ہے اس کو بھی وہ ترتیب دے چکے تھے، معارف میں اُن کے جو مضامین شائع ہوئے تھے، اُن کی ترتیب بھی پیش نظر تھی، علمی مجالس کی شرکت بھی برابر جاری رہی، چنانچہ آل انڈیا ہسٹری کانگریس پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، انجمن ترقی اردو وغیرہ کے جلسوں کی صدارت انھیں نے کی اور ایسے خطبہ صدارت پڑھے، اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ تصوف کی راہ میں آنے کے بعد انھوں نے علم کا کوچہ بالکل چھوڑ دیا تھا یا اس کی کوئی اہمیت اُن کی نگاہ میں نہ رہ گئی تھی، اگر کسی خاص حالت میں ان کی زبان یا قلم سے کوئی ایسا فقرہ نکل گیا جس سے تصنیف و تالیف یا علمی کاموں کی بے وقعتی ظاہر ہوتی ہو، تو اس کو حقیقت پر محمول کرنا خود سمجھنے والوں کی خوش فہمی ہے، جو لوگ شطحیات صوفیہ کی تاویل کرتے ہیں، کم از کم ان سے تو اس کی توقع نہیں کی جا سکتی،

اس سلسلہ میں ایک ذاتی واقعہ کا ذکر کرنا نامناسب نہ ہوگا، راہ سلوک میں آنے کے بعد اکثر اپنے تلامذہ اور متوسلین کو بھی اس کی تلقین فرمایا کرتے تھے، ایک مرتبہ میں نے عرض کیا کہ آپ نے تو سارے کام ختم کرنے اور جو حاصل کرنا اور دوسروں کو دینا تھا، اس کو حاصل کرنے اور دوسروں تک پہنچانے کے بعد یہ راہ اختیار فرمائی ہے اگر ہم خدام ابھی سے اس راہ پر لگ گئے تو ہمارا انجام کیا ہوگا، میرا اشارہ سمجھ کر فرمایا، میں یہ نہیں کہتا کہ علمی کام بے کار ہیں، یا ان کی ضرورت نہیں رہی، یا اُن کو چھوڑ دیا جائے، بلکہ تالیف و تصنیف کا مقصد اور نقطہ نظر بدل جانا چاہیے اور اس کے لئے خود اپنے میں تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت ہے، میں نے عرض کیا، اور ان خالص علمی کاموں کے متعلق کیا ارشاد ہے جن کے لئے کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے، اس کے جواب میں حسب عادت معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا، شوق سے کیجئے اس سے کون روکتا ہے، یہ بھی ایک کام ہے، اور اُن کی دلآویز مسکراہٹ پر بات ختم ہو گئی،

لیکن جو لوگ اُن کے سلوک و تصوف پر اعتراض کرتے ہیں، وہ بھی غلطی پر ہیں، ہر انسان پر دوسروں کے حقوق و فرائض کے ساتھ اپنے نفس کے بھی کچھ حقوق ہیں، اور دوسروں کی خدمت اور اصلاح و تذکیر کے ساتھ اپنی

فکر بھی ضروری ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سید صاحب نے جو علمی کام انجام دیئے، ان کا مقصد دین کی
خدمت تھا، اس لئے وہ بھی ان کے اعمالِ حسنہ میں داخل ہیں لیکن ان کا تعلق زیادہ تر دوسروں کی اصلاح
اس فرض کی ادائیگی اور اس کام کی تکمیل کے بعد اگر انھوں نے اپنی فلاح و تکمیل کے لئے کوئی راہ
اعتراض کی کونسی بات ہے، درحقیقت ایک مسلمان کی زندگی کے مراحل کی فطری ترتیب یہی ہے، اور اسوۂ نبوی
چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اگرچہ آپ کی زندگی کا کوئی لمحہ بھی تعلق مع اللہ اور رضائے الٰہی
طلب سے خالی نہ تھا، اور آپ کی پوری زندگی اسلام کی تبلیغ، اسکی تعلیمات کی اشاعت، اور روئے زمین پر
نظام، اور اس کے احکام کے نفاذ کی جد و جہد میں گذری مگر جب ان کاموں سے فراغت اور دین کی تکمیل
کے ساتھ تسبیح و تحمید اور توبہ و استغفار کا حکم ہوا، اور سورۂ فتح نازل ہوئی، اور جیسا کہ بخاری اور حدیث کی
کتابوں میں ہے، اس کے بعد آپ کا زیادہ وقت تسبیح و تہلیل میں بسر ہونے لگا، اس لئے سیرت نگارِ نبوی نے
اسوۂ نبوی پر عمل کیا، اور ہر مسلمان کا یہی عمل ہونا چاہئے،

درحقیقت ان دونوں زندگیوں میں کوئی تضاد نہیں ہے، بلکہ وہ ایک ہی تصویر کے دو رخ ایک ہی
کے نقش و نگار، اور ایک ہی گلدستہ کے مختلف رنگ و بو کے پھول ہیں، جن کے بغیر تصویرِ حیات کی تکمیل نہیں ہو
اس لئے جو لوگ ان دونوں پہلوؤں میں سے کسی کو بھی نظر انداز کرتے ہیں، وہ خود نا آشنائے حقیقت ہیں،

تاریخ ارض القرآن

کے متعلق

میرے ذاتی احساسات و تجربات

از

جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی

اخذ یا ترتیب کے معمولی رد و بدل سے پیش رو مصنفین کی کتابوں کو نقل کر کے اپنی طرف منسوب کر لینا، شاید دنیا
تمام کتابی زبانوں کا یہ ایک ایسا عارضہ ہے جو نہ کسی ملک کے ساتھ مخصوص ہے، اور نہ کسی فن اور نہ علم کی حد تک ہے
اور دور نظر آئے گا خصوصاً نصابی کتابوں کے ساتھ تجارتی اغراض جب سے وابستہ کر دیئے گئے ہیں، تو اس
زمانے میں اس نے وبائی شکل اختیار کر لی ہے، شمار کرنے والے ان کتابوں کے لکھنے والوں کو مصنفین اور مولفین ہی کے
زمرہ میں شمار کرتے چلے آئے ہیں، اور آج بھی ان لوگوں کو مصنف و مؤلف ہونے کی سند ملتی ہی چلی جا رہی ہے حالانکہ
کسی کے کلام (نظم یا نثر) کو بغیر کسی رد و بدل کے کوئی اپنی طرف اگر منسوب کرے، تو لگانے والے اب بھی اس پر
سرقہ اور علمی دزدکاری کا بے محابا الزام عائد کر دیتے ہیں، لیکن سوچا جائے تو پہلے اور دوسرے فریق میں عملاً و حقیقۃً
کوئی فرق نہیں ہے،

لیکن تصنیف و تالیف ہی کے دائرہ میں کچھ ایسی ہستیاں بھی پیدا ہوتی رہتی ہیں جو کسی علم و فن کے کسی
موضوع کو اس وقت تک چھوتی بھی نہیں، جب تک کہ اس کے متعلق کوئی نیا پہلو تازہ زاویۂ نگاہ ان کے سامنے

ہ آئے، سچ پوچھیے تو صحیح معنون مین مصنف اور مؤلف قرار پانے کا قدرتی استحقاق ان ہی بزرگون کو حاصل ہوا
ورنہ دوسرون کی باتون کا دہرانے والا اگر سارق نہین تو ایک نقل نویس کاتب کے سوا اور بھی کچھ ہے، دنیا جو
کتابون کی تعداد مین غیر معمولی اضافہ زیادہ تر انہی دزدان علم اور نقل نویسون ہی کی وجہ سے ہوا ہے، اور [illegible]
کافی ہے، مین کہنا چاہتا ہون کہ ہمارے سید علامہ مولینا سلیمان الندوی قدس اللہ سرہ جو اردو زبان کے اکابر مصنفین
بجا طور پر سمجھے جاتے ہین، اور انھون نے اپنے بعد ہزارہا ہزار صفحات کی شکل مین اپنی تالیفی یادگارین چھوڑی ہین
آپ اُن کو پڑھ جایئے، سب سے بڑی خصوصیت سید صاحب مرحوم کے تصنیفات مین کم از کم اس فقیر کو تو یہی نظر آئی
ہے کہ انھون نے جو کچھ بھی ارقام فرمایا ہے اس مین نئی بات، نئے معلومات پڑھنے والون کو ملتے چلے جاتے ہین
یا کم از کم پہلے جو باتین مجمل شکل مین تھین، سید صاحب کی تحقیق و تدقیق نے ان ہی باتون کو زیادہ مفصل اور زیادہ واضح
کر دیا ہے،

مرحوم غفر اللہ لہ دینیات و اسلامیات کے عالم تھے، لیکن اسی کے ساتھ عربی فارسی، اردو زبانون کے
ادب کا بھی صالح ذوق رکھتے تھے، اسی لئے اُن کے عام علمی کارنامون کا تعلق اگرچہ اسلامیات و دینیات ہی
سے ہے، لیکن اسی کے ساتھ ادبیات کے متعلق کبھی کبھی اُن کو کچھ لکھنے کا موقع اگر مل گیا، تو اُس مین بھی انھون نے
ہمیشہ نئی راہین پیدا کین، اور ایسے اچھوتے نتائج اُن کی بدولت اس سلسلہ مین بھی دنیا کے سامنے آئے کہ ہر طرف
مرحبا و آفرین کے ساتھ اُن کا استقبال کیا گیا،

قرآن و حدیث، فقہ، کلام و تصوف، اور سب سے زیادہ تاریخ اسلامی، اور ان سب کے سوا جس موضوع پر
سید صاحب نے قلم اٹھایا ہے، اور اس سلسلہ مین نئے معلومات، یا نئے نقاط نظر سے دنیا کو انھون نے روشناس کیا اگر
بنانے والے اگر اُن کی فہرست بنائین گے، تو میرا خیال ہے کہ اُن کی تعداد لاکھون نہین، تو ہزارون تک ضرور
پہنچ جائے گی، یہ اُن کے سوانح نگار کا فرض ہے کہ اس مطمح نظر سے اُن کے تصانیف اور شائع کردہ مقالات
مضامین کا جائزہ لے، دنیا کو حیرت ہوگی کہ کتنے قلیل عرصہ مین اس بندہ خدا نے جدید معلومات اور متنوع علم

کے سلسلہ مین کتنے نئے پہلوون کا اضافہ فرمایا، بڑے بڑے مصنفین کی کتابون مین بمشکل گنی چنی چند ہی نئی چیزین
آتی ہین، لیکن سید صاحب کی کتابون مین قدم قدم پر نئے انکشافات اچھوتے معلومات سے پڑھنے والون کا دامن
بھرتا چلا جاتا ہے، یہی ان کے تصنیفات کی سب سے بڑی خصوصیت ہے، معارف کے سلیمان نمبر نکالنے کا ارادہ جب
کیا گیا تو فقیر نے چاہا تھا کہ قرآن کے متعلق سید صاحب کی مشہور کتاب "تاریخ ارض القرآن" سے ان چیزون کو منتخب
کر کے پیش کرے، جن کے متعلق اپنا خیال یہی ہے کہ ایک خاص پہلو سے "قرآن فہمی" کے معیار مین فکری انقلاب پیدا ہو گیا
ہے، اعتراف کیا جائے یا نہ کیا جائے لیکن شعوری یا غیر شعوری طور پر عوام ہی نہین خواص کے فہمیدہ و سنجیدہ طبقات
بھی سید صاحب کی اس نئی علمی کوشش اور اس کے نتائج سے اکثر و بیشتر متاثر ہوئے، میری خواہش تھی کہ سید صاحب
کی اس جدید قرآنی خدمت پر سیر حاصل بحث کرون، لیکن ٹھیک ان ہی دنون مین جب اس مقالہ کی تیاری مین مشغول
تھا، بیمار ہو گیا، اور ایسا بیمار کہ پانچ چھ مہینے گذر چکے ہین اس وقت تک لکھنے پڑھنے کی صلاحیت جیسی کہ چاہیے
واپس نہین ہوئی ہے، احباب دار المصنفین کا تقاضا ہوا کہ واقعی شہیدون مین شریک ہونے کا موقع اگر نہین
ہے تو خون ہی لگا کر شہیدون مین شامل ہو جاؤن، اسی حکم کی تعمیل کر رہا ہون،

واللہ ولی الامر والتوفیق،

سید صاحب مرحوم کی کتاب تاریخ ارض القرآن اول سے آخر تک ایسے معلومات سے بھری ہوئی ہے جو
کم از کم علماء کے لیئے صرف یہی نہین کہ نئے ہین، بلکہ ان معلومات کی راہ نمائی مین مطالعہ اور تحقیق کے ارباب ذوق
اگر بڑھائے گا تو کافی مدد مل سکتی ہے، عرب کے جغرافیائی معلومات کے مصادر و ماخذ کی طویل فہرست اس کتاب مین
درج ہے، جن مین اسرائیلی و یونانی و رومانی ادبیات، اور اکتشافات اثریہ کے سوا سید صاحب نے ادبیات اسلامیہ
کے ذیل مین ان مطبوعہ اور غیر مطبوعہ عربی زبان کی کتابون کا ذکر کیا ہے، یہ ایک ایسی علمی فہرست ہے کہ ہمارے
علماء جو انگریزی یا اسی قسم کی جدید عصری زبانون سے ناواقف ہین، وہ بھی "ادبیات
اسلامیہ" کی ان کتابون سے کافی طور پر مستفید ہو سکتے ہین، یہ واقعہ ہے کہ سالہا سال کی

کدوکاوش تحقیق وجستجو کے بعد ہم جن کتابون تک رسائی حاصل کرسکتے تھے، سید صاحب کی درج کردہ فہرست سے
بیک نظر معلومات کا یہ سارا ذخیرہ ہمارے سامنے اس طرح پر آجاتا ہے، کہ کتابون کے مصنف کون ہین تصنیف مطبوعہ
ہے یا غیر مطبوعہ، غیر مطبوعہ شکلون مین ان کتابون کے نسخے کہان کہان پائے جاتے ہین، عموماً ان امور کے متعلق
بھی کافی وشافی اشارے ملتے چلے جاتے ہین،

۲ اسی طرح تورات اور عہد عتیق وقدیم کا مطالعہ کس طریقہ سے کرنا چاہیئے تورات کے سوا کتب قدیم، ترگوم
اور تالمود نامی کتابون کی اسرائیلی دین مین کتنی اہمیت ہے اور ان کتابون کے مضامین کی نوعیت کیا ہے، تاریخ ارض
القرآن کے ابتدائی اوراق ہی مین یہ سارے قیمتی معلومات ایک ہی جگہ مین مل جاتے ہین،

۳ عرب اور اس کے جغرافیہ و تاریخ کے ساتھ یورپ کے ارباب تحقیق نے جن معلومات کو وقف عام کیا ہے
اور ان سے غلط یا صحیح نتائج نکالنے کی سنجیدہ کوششین کی ہین، ایک بڑا قیمتی تبصرہ اس سلسلہ مین بھی آپ کو اس
کتاب کے شروع ہی مین مل جائے گا، جو دلون مین اس کا شوق پیدا کرتا ہے کہ غیرون کی دلچسپیون کا حال غرض
کے ساتھ جب یہ ہے تو ہم مسلمانون کا علمی فرض اس باب مین یقیناً اس سے کہین زیادہ ہونا چاہیئے،

بہرحال آپ اس کتاب کو پڑھتے چلے جائیے، کتاب پڑھنے سے پہلے آپ کے جو علمی احساسات اور
معلومات تھے، مین یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہون کہ شعوری اور غیر شعوری طور پر ان مین پائین گے کہ ترمیم ہوتی
چلی جاتی ہے، سید صاحب کے پیدا کئے ہوئے نتائج سے اتفاق و اختلاف بجائے خود ایک الگ جداگانہ
مسئلہ ہے، لیکن ان کی کاوش وکوشش کی داد مین بخل میرے خیال مین صرف تنگ دلی ہی نہین، بلکہ گونہ ایک
قسم کی عقلی اور طبیعی سفاہت ہی کا نتیجہ ہوسکتا ہے،

۴ دور کیون جائیے، قرآن مجید کے لفظ "عاد" ہی کے متعلق مین پوچھتا ہون انصاف سے دلون پر ہاتھ رکھ کر کہئے
کہ ہمارے علماء کا عام علمی احساس اس کے متعلق کیا یہی نہین تھا کہ عاد کسی غیر معمولی صفات رکھنے والی شخصیت
کی تعبیر تھی، اگرچہ خود قرآن کی یہ تعبیر کہ "قوم نوح کے بعد عاد والے زمین کے خلیفہ بنائے گئے" دلون کے اس وہم

اساس پر کہ عاد "کسی خاص آدمی کا نام" منطبق نہین ہورہی تھی،
اسی لئے زیادہ وسیع النظری سے کام لینے والے بھی بجائے شخص کے "عاد" کو عرب کے کسی ناپید اشدہ مختصر قبیلہ
کا عنوان قرار دیتے تھے لیکن سید مرحوم نے جب یہ اعلان کیا کہ

"عاد صرف کوئی محدود اور مختصر قبیلہ نہ تھا وہ ایک عظیم الشان قوم تھی، جو عرب ہی نہین بلکہ
دنیا کی قدیم ترین تہذیب کی بانی تھی،"

اور یہ فرماتے ہوئے کہ عادی تہذیب وتمدن عرب ہی کے کسی خاص علاقہ تک محدود نہ تھا، سید صاحب نے
ناقابل انکار مستحکم تاریخی واثری شہادتون سے یہ ثابت کیا کہ عاد جو قوم نوح کے بعد زمین کے خلیفہ ہوئے اور یہ کہ

"ایشیا، اور افریقہ کا کثیر حصہ اس کے (یعنی عاد کے) زور وقوت کا تماشاگاہ تھا،"

(ص ۶۵ - ج ۱)

اور صرف ایشیا وافریقہ ہی نہین، بلکہ سید صاحب نے یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ یورپ ہی کے بعض علاقون
مثلاً یونان وکریٹ تک عربون کے کسی قدیم تمدن کا جو نشان ملتا ہے، یہ سارے نقشے اسی "عاد" سے تعلق رکھتے تھے،
جو قوم نوح کے بعد زمین کے خلیفہ قرآن کے رو سے قرار پائے تھے،

انصاف سے کہئے کہ قرآنی آیت جس مین عاد کو خطاب کرکے ارشاد ہوا ہے،

واذکروا اذ جعلکم خلفاء من — اور یاد کرو (اے عاد کی قوم والو) جب
بعد قوم نوح — قوم نوح کے بعد خدا نے تم کو (زمین)
(الاعراف) — کی خلافت بخشی،

اس کا صحیح وزن سید مرحوم کے بیان وتحقیق کے بعد قلوب مین پیدا ہوتا ہے کیا یہی وزن وہ روایتین
ڈال سکتی ہین جن مین زیادہ سے زیادہ اگر کچھ پتہ دیا گیا ہے تو وہ اسی قدر ہے کہ

کانت عاد ما بین الیمن الی الشام — یمن سے شام عاد والے چیونٹیون کی طرح

مثل الذر (ص ۹۹ ج ۳ در منثور) — پھیلے ہوئے تھے،

ورنہ عام طور پر عاد والوں کے متعلق یہی سمجھا بھی جاتا ہے، اور کہا بھی جاتا ہے کہ

فیما بین عمان الی حضر موت — عمان سے یمن کے اس علاقے تک محدود تھے،

بالیمن (در منثور ص ۹۹ ج ۳) — جسے حضر موت کہتے ہیں،

یمن دوسروں کے متعلق کیا کہوں سچی بات تو یہ ہے کہ نسلِ انسانی کی تاریخ کو نبوات و رسالات کی تاریخ کی روشنی میں جب ادوار (پیریڈ) پر تقسیم کرنے کی ضرورت جامعہ عثمانیہ کے اسباق کے لئے خود فقیر کو ابتدا میں پیش آئی اور اس سلسلہ میں جیسا کہ میرا دستور تھا، ان پانچ دوروں پر بنی آدم کی تہذیبی و تمدنی اولوالعزمیوں کو تقسیم کرکے بیان کیا کرتا تھا یعنی

(۱) پہلا دور تو از آدم تا قوم نوح کا قرار دیتا تھا،

(۲) دوسرے دور کا نام اپنی اصطلاح میں میں نے "دجنسلی تمدن"[۱] رکھ چھوڑا تھا،

مقصد یہ تھا کہ ایک خاص علاقہ جو دریائے دجلہ اور دریائے نیل کے درمیان محدود تھا، اسی کے مختلف مقامات میں تمدن و ارتقاء کا ظہور ہوتا رہا، کبھی اس کی ابتدا جنوبی عرب سے ہوئی، کبھی شمالی عرب سے کبھی ارض بابل و نینوہ سے انسانی تہذیب و تمدن نے سر اٹھایا، اور کبھی دریائے نیل کے کنارے اس کے ہنگامے برپا ہوتے رہے، اسی دور میں عاد و ثمود اور اُن کے انبیاء ھود و صالح (علیہما السلام) اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وطن اور نمرودی تمدن، آخر میں موسیٰ علیہ السلام اور فرعونی تہذیب کے مقابلہ پر اس دور کی داستان ختم ہو جاتی تھی،

(۳) تیسرا دور میرے خیال کے مطابق تاریخ انسانی کا وہ تھا، جب پرانی دنیا کے مشرقی و مغربی، شمالی و جنوبی علاقوں میں بنی آدم کی کافی تعداد آباد نظر آتی ہے، اور ہر خطہ کے باشندے اپنے اپنے احوال اور امکانات کے مطابق اپنی اپنی تہذیب و تمدن کی تعمیر میں اس طور پر مصروف و مشغول ہیں کہ دوسرے علاقوں سے ان کا کوئی قوی رشتہ قائم نہ ہوا تھا، چین، ہند، ایران، یونان، روم وغیرہ اقلیموں کی تمدنی تاریخ کا تعلق اسی دور

سے تھا، اسی زمانہ میں شام و فلسطین میں اسرائیلی تمدن برسر عروج تھا، اور عرب کے جنوبی حصہ میں سبائی تبع نے [illegible] نے اسی عہد میں امتیاز حاصل کیا تھا، الغرض یہ تہذیبیں بھی مقامی تھیں، اور ان کی اصلاح و تصحیح کے لئے بھی مقامی مصلحین خدا کی طرف سے جو اٹھتے رہے وہ مقامی مصلحین تھے،

(۴) چوتھا دور انسانیت کی تاریخ کا وہ ہے، جب مختلف سیاسی و ذہنی عوامل و مؤثرات کے زیر اثر سارے مغربی ممالک میں قیصر نامی قوت کو اور سارے مشرقی علاقے میں کسریٰ نامی طاقت کو مرکزیت کا مقام حاصل ہو گیا، قیصر و کسریٰ کے مقبوضات کے درمیان عرب کی سرزمین ایک ایسی سرزمین تھی، جس پر نہ پورا اقتدار قیصر ہی کو حاصل تھا، اور نہ کسریٰ کو، یہی وہ زمانہ ہے کہ وسطِ عرب سے

اذا هلك كسرى فلا كسرى بعده — جب کسریٰ ہلاک ہو گا تو پھر کسریٰ نہ ہو گا،

واذا هلك قيصر فلا قيصر بعده، — اور قریب ہے وہ زمانہ بھی جب قیصر بھی ہلاک ہو جائے گا، پھر اس کے بعد قیصر نہ ہو گا،

کا پیغمبرانہ نعرہ بلند ہوا جس نے مغرب و مشرق کے سارے قصوں ہی کو ختم کر دیا، اور اسی کے بعد دنیا پانچویں دور میں داخل ہو گئی، اس وقت سے آج تک قدرتی کارفرمائیاں توحیدِ عالم کے نظریہ کو واقعہ کا قالب عطا کرتی چلی جا رہی ہیں، بے شمار خطوں اور اقلیموں میں بٹی ہوئی دنیا ایک ملک بلکہ شاید ایک شہر ایک بستی کی شکل اختیار کرتی چلی جا رہی ہے، تاکہ معلوم ہو کہ ساری نسل انسانی ایک ہے، اس کا معبود و خدا ایک ہے، اس کی زندگی کا قدرتی آئین بھی ایک ہے، اس کی کتاب بھی ایک ہے، اس کا نبی بھی ایک ہے، اس کا کعبہ بھی ایک ہے، سارے مقامی صحیفے منسوخ کر دیئے گئے، اور وہ خرف ہوتے چلے جا رہے ہیں، باہر سے زور لگانے والے اگرچہ ایک انسان ایک دنیا کو کن انسانی قسموں اور بیسیوں دنیاؤں میں تقسیم کرنے پر اپنا زور صرف کر رہے ہیں[۱] لیکن قدرتی مشیتِ قاہرہ

---

(۱) ان کی مذبوحی حرکتوں کی یہ انتہا ہے کہ شام جیسے مختصر ملک کو انھوں نے جنگِ عظیم کے بعد لبنان، اسرائیل، فلسطین، شرق اردن، سوریہ پانچ پانچ مستقل علاقوں کی شکل میں بانٹ رکھا ہے، حالانکہ اس مختصر سرزمین کے باشندوں میں نہ

کا ارادہ انسان کا ارادہ نہین کر سکتا تقسیم و تجزی کی آگ لگانے والے ہی توحید عالم کے ذرائع فراہم کرتے چلے جارہے ہین، تخریب ہی والون سے توحید عالم کی تعمیر کا کام لیا جارہا ہے، اور لیا جاتا رہے گا،

حتی یکون الدین کلہ للہ، تاآنکہ دین صرف اللہ (خالق عالم) ہی کے ساتھ وابستہ ہوکر رہ جائے،

باوجود انتہائی اختصار پسندی اور اجمال کے بیچ کا یہ جملہ معترضہ کافی طویل ہوگیا، اقرار یہ کرانا تھا کہ انسانی تاریخ کے ان پنجگانہ ادوار کی ترتیب کے سلسلہ مین مجھے اس کا اعتراف کرنا چاہئے کہ کم ازکم دجلیہ والے دوسرے دور کے متعلقہ معلومات کی فراہمی مین بہت زیادہ مدد مجھے سید مرحوم کی اسی کتاب تاریخ ارض القرآن ہی سے اس وقت ملی تھی، جب آج سے تیس پینتیس سال پہلے درس عثمانی کو پہلی دفعہ مرتب کرنے کا کام میرے سامنے پیش آیا تھا،

خلاصہ یہی کہ نسل انسانی کے مذکورۂ بالا ادوار و قرون مین سے سید مرحوم کی کتاب تاریخ ارض القرآن مین مجھے دوسرے دور کے متعلق تاریخی اور تاریخی سے زیادہ اثری انکشافات سے مدد ملی تھی، بلکہ اسی سے سمجھ مین بھی آیا کہ قرآن بذات خود گو کوئی تاریخی کتاب نہین ہے، اور جن قصص کا تذکرہ اس کتاب مین بھی کیا گیا ہے، اصل مقصود سب سے موعظت و بصیرت کا درس ہی ہے تاہم اسی کے ساتھ انسانی تاریخ کے اس حصہ کو جسے لوگ بھول جانے والے تھے، خاص انداز اور طریقہ سے اس حصہ کو قرآن مین محفوظ کر دیا گیا ہے، اور اس کی مصلحت سمجھ مین آئی کہ پہلے اور دوسرے دور کے متعلق قرآن نے نسبتہً زیادہ تفصیل سے کیون کام لیا، اور کیسی کیسی تفصیلین ہین کہ قوم نوح کے متعلق آج کوئی چاہے تو قرآن سے ان تاریخی نتیجون کو پیدا کر سکتا ہے، مثلاً یہ کہ زراعت

بقیہ حاشیہ (۲۲۱) زبان ہی کا اختلاف تھا، نہ رنگ کا، نہ نسل کا حتی کہ مذہبی حیثیت سے بھی اکثریت کا دین ایک ہی تھا لیکن بااین ہمہ انسانی بے شرمیون سے کام لے کر اس غریب وحدت کی تکابوٹی کر دی گئی،

لے سورۂ نوح مین اسی قوم کی طرف واستغشوا ثیابہم کے الفاظ منسوب کئے گئے ہین، ثیاب ثوب کی جمع ہے

وابی نالی ہی نہین بلکہ آبپاشی کے عام ذرائع خصوصاً دریاؤن کو کاٹ کر نہرون کا نظام بھی قائم کر چکی تھی، ایسے جانور اور مویشی جنھین عربی مین الانعام کہتے ہین، یعنی اونٹ، گائے، بیل، بھیڑ بکریون کو لوگ پالتو بنا کر ان سے کام لینے لگے تھے، بلکہ قرآن کے ایسے الفاظ یعنی ثیاب دسر کا ترجمہ اگر دیا کیا جائے، جو ان کے مناسب حال ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ جامہ بافی (حیاکت) آہنگری جیسی صنعتون کا رواج بھی قرآن سے سمجھا جاتا ہے بلکہ جب تک یہ تسلیم نہ کیا جائے کہ نجاری کا فن عہد نوح تک کافی ارتقائی مراتب طے کر چکا تھا، اس وقت تک سفینۂ نوح اور جن کاریگرون سے اس مین کام لیا گیا، ہم اس کی توجیہ نہیں کر سکتے، اسی طرح جھوٹ چھات، یا جات پات کی طبقاتی تقسیم کا سراغ بھی قصۂ نوح مین ملتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ تک اس سلسلہ مین اتنی قوت حاصل ہو چکی تھی کہ حضرت نوح علیہ السلام کے انکار کی ایک وجہ اُن کی قوم کی طرف سے یہ بھی پیش کی گئی تھی کہ تمھارا ساتھ اراذل (یا اچھوت نیچ طبقات) نے دے رکھا ہے،) یہی نہین بلکہ اسی سلسلہ مین حضرت نوح علیہ السلام کے دعویٰ نبوت کی تنقیح کرتے ہوئے جو باتین اس قوم کی طرف سے پیش ہوتی تھین، ہم ان پر جب غور کرتے ہین، تو پتہ چلتا ہے کہ احتجاج کیئے، یا ایڈوکیسی کی مشق مین یہ قوم کہان تک ترقی کر چکی تھی کہ سورۂ المومنون کے ان الفاظ پر غور کیجئے فرمایا گیا ہے، کہ

قال الذین کفروا من قومہ ما	نوح کا جنھون نے انکار کیا تھا وہ بولے کہ
ھذا الا بشر مثلکم، یرید ان	نہین ہے یہ ایک آدمی تم ہی جیسا، چاہتا
یتفضل علیکم ولو شاء اللہ	ہے، کہ تم پر بڑائی حاصل کرے، خدا چاہتا
لانزل ملائکۃ ما سمعنا	تو فرشتون کو اتارتا، ہم نے اپنے گذشتہ
بھذا فی اٰبائنا الاولین انّ	باپ دادون مین یہ بات سنی نہین ہے

(بقیہ حاشیہ ص ۲۲۲) جس کے معنی کپڑا ہین، اسی طرح سورۂ القمر مین سفینۂ نوح کے متعلق ذات الواح ودسر کے الفاظ پائے جاتے ہین، دوسر کی تفسیر مسمار کے لفظ سے کی گئی ہے، ترجمہ جس کا میخ آہنی ہے،

هو الا رجل به جنة فتربصوا به حتی حین،

مگر ایک آدمی جس پر جنون کا اثر ہے، پس انتظار کرو کچھ دن کے لئے،

بجائے ایک دلیل کے آپ دیکھ رہے ہیں، پانچ پانچ باتیں اپنے انکار کی توجیہ میں اُن کی طرف سے پیش ہو رہی ہیں، یعنی وحی کے ایک جدید علمی ذریعہ کا دعویٰ اس لئے صحیح نہیں ہے کہ نوح ہم ہی جیسا ایک آدمی ہے احساس و ادراک کی جو قوتیں تمام انسانوں میں مشترک ہیں، کوئی وجہ نہیں کہ نیا حاسہ اس میں پیدا ہوا ہو، پھر اس جدید حاسہ کا دعویٰ اُس نے کیوں کیا؟ اس کا جواب دیتے کہ بڑے بننے کی خواہش بھی اندرونی محرک ہو جس نے اس دعویٰ پر اس کو آمادہ کیا ہے، باقی یہ خیال کہ خدا نے اپنے بندوں کی اصلاح کے لئے اس شخص کو اس جدید علمی ذریعہ سے سرفراز فرمایا ہے، اس کا جواب دیتے کہ خدا کے لئے اس سے زیادہ آسان یہ تھا کہ اپنے کسی فرشتہ کو ہم میں بھیج دیتا، جسے عوام و خواص بآسانی تسلیم کر لیتے، آخر میں تاریخی شہادت پیش کرتے کہ ہماری گذشتہ تاریخ میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی، یعنی کسی نے وحی و نبوت کا دعویٰ کیا ہو، آخر میں کہتے کہ دماغی توازن اس شخص کا کچھ بگڑ گیا ہے، جو خود بخود رفتار زمانہ کے ساتھ درست ہو جائے گا،

اور یہ تو میں نے چند اجمالی اشارے کئے ہیں، ورنہ قرآن میں انسانی تاریخ کے دور اول یعنی از آدم تا

یہ میں نے مختصر لفظوں میں قوم نوح کے پیش کردہ نقاط کا ذکر کر دیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ غور کرنے سے ہر نقطہ بحث سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی منطقی اور استدلالی قابلیت کافی ترقی یافتہ ہو چکی تھی، آج بھی وحی و نبوت کے منکرین جو باتیں بناتے ہیں، شاید وہ اسی قسم کی ہیں، اس زمانہ میں قوموں کا ایک دستور یہ بھی تھا کہ اپنی قومی زندگی کی جوہری بنیادوں کا نام چند الفاظ میں کر لیتے ہیں، مثلاً اخوت و مساوات، عدالت، پھر ان لفظوں کو معبود بنا کر ساری قوم کو ان کے آگے جھکنے کا حکم دیتے ہیں، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قوم نوح میں (ود "محبت ......) سواع (وقت اور اس کی قدر و قیمت) یغوث (باہمی امداد میں ایک دوسرے کی فریادرسی) یعوق (دفاعی قوتوں کی تعمیر) نسر (کوئی خاص موسم جب برج نسر میں ستارہ آ جاتا تھا)، ان پانچ دیوتاؤں کی عبادت کا مطلب یہی تھا کہ اپنی قومیت کی صفاتی بنیادوں کو بتوں

قوم نوح، اسی طرح دور ثانی یعنی عاد و ثمود، جو ہود و صالح علیہما السلام کی مخاطب قومیں، یا ابراہیم و موسیٰ علیہما السلام نے جن لوگوں میں کام کیا، اپنی خاص اصطلاح میں جس تمدن و تہذیب کا نام میں نے "ضبطی تمدن" رکھا ہے، اس کے بعض پہلوؤں کے متعلق معلومات کا جو ذخیرہ قرآن میں محفوظ کر دیا گیا ہے، شاید ان دونوں ادوار کے متعلق اُن کے معلومات قرآن کے سوا اور کسی ذریعہ سے ہم حاصل نہیں کر سکتے، سید مرحوم کو خدا جزائے خیر دے کہ ان قرآنی قصص کے متعلق یورپ نے شکوک و شبہات کے جو گرد و غبار اچھالے تھے، خود ان ہی کے طریقہ تحقیق سے اُن کے صاف کرنے کی ایک ایسی راہ کھول دی ہے کہ کام کرنے والے چاہیں تو اس سلسلہ میں بہت کچھ کام کر سکتے ہیں، اپنی اثریاتی و حفریاتی جد و جہد سے یورپ و امریکہ والے ایسے نئے نئے انکشافات دنیا کے سامنے لا رہے ہیں جن سے قرآنی بیانات کی قدر و قیمت روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے،

بہر حال اپنی تاریخ کے جس حصہ کو یعنی دور اول و ثانی جسے لوگ عموماً بھول جانے والے تھے اسی حصہ کے متعلق قرآن میں نسبتہً جو زیادہ تفصیل پائی جاتی ہے، اور ان کے سوا تیسرے دور جس میں دنیا کے اکثر حصوں میں مقامی تمدنوں کا ظہور ہوا، اس کے متعلق بجز اس قسم کے اجمالی اشاروں کے کہ "زمین میں چلو پھرو، اُن کے حالات تم پر واضح ہوں گے"، یا قرآن کی پہلی مخاطب قوم عرب کو اجمالی لفظوں میں اطلاع دی گئی ہے کہ دنیا کی تعمیر و ارتقاء کا کام تم سے بہت زیادہ بہتر طریقہ پر دوسری قومیں انجام دے چکی ہیں، اور اُن کی اصلاح کے لئے راہنما اٹھتے رہے، ہر آبادی میں چونکانے والے (نذیر) گذرتے رہے، اسی طرح چوتھا دور جس میں دنیا قیصریت و کسرویت کی مغربی و مشرقی قوتوں کے ساتھ بلاواسطہ یا بالواسطہ وابستہ ہو گئی تھی، اس کے متعلق سورۃ الروم کی ابتدائی آیتوں میں حد سے زیادہ اجمالی اشارہ کر کے قرآن جو گذر گیا ہے، تو بظاہر اس کی مصلحت غالباً یہی نظر آتی ہے کہ دونوں پچھلے ادوار سوم و چہارم کی حالت اول اور دوم ادوار کی جیسی نہ تھی، بلکہ ہر ملک اور ہر قوم

(بقیہ حاشیہ ص ۲۵۲) یا اصنام کی شکل میں انھوں نے ڈھال لیا تھا، اور ہر شہر و قصبہ گاؤں میں انہی بتوں کو نمایاں مقامات پر گاڑ کر قوم کو وہ زندگی کا درس دیتے تھے، تفصیل کے لئے معلومات کا مطالعہ کرنا چاہیے،

اپنی تاریخ اور اپنی اثری یادگاروں کو اس طور پر قائم کر چکی تھی، کہ بآسانی اُن کے متعلق کافی معلومات عام تحقیقاتی ذرائع سے حاصل کیے جا سکتے تھے، اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کا بڑا حصہ آج ان کا مرتب شکل میں ہمارے سامنے موجود بھی ہے،

خیر میں بہت دور نکل گیا، کہنا یہ چاہتا تھا کہ سید مرحوم کی تاریخ ارض القرآن نے قرآنی مطالعہ کے متعلق ایک نئے زاویۂ نظر کو پیش کیا جس کا اعتراف قرآن کے ہر خادم کو کرنا چاہیے، انھوں نے صرف "عام انسانی تاریخ" کے سلسلہ میں نئی راہیں آیندہ تلاش و تحقیق کرنے والوں کے لیے نہیں کھولی ہیں، بلکہ قرآن کی بعض جزئی شخصیتوں کے متعلق بعض ایسے اہم انکشافات پیش کیے ہیں جن کی روشنی میں اُن کی حیثیتوں اور اُن کی قدر و قیمت میں نمایاں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے، مثلاً لقمان نامی ایک شخص کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے اور اُن کی طرف منسوب کر کے بعض قیمتی نصائح اس کتاب میں ملتے ہیں، اب ایک طرف سوچیے جو عام طور پر مشہور ہے کہ لقمان کسی عرب کے حبشی غلام تھے، اور دوسری طرف سید صاحب مرحوم کی اس تحقیق کو سامنے رکھیے جس کا حاصل یہ ہے کہ قوم عاد کے مادی عروج کے بعد جو زوال ہوا، اور اس کے بعد حضرت ہود علیہ السلام پر ایمان لانے کے بعد یہی قوم ہود کی شریعت کے مطابق "اسلامی تہذیب و تمدن" کے نظام کے قائم کرنے میں کامیاب ہوئی، اسی عہد کے ایک اولوالعزم حکمران لقمان تھے، سید مرحوم نے مختلف تاریخی شہادتوں سے اپنے دعویٰ کو ثابت کرتے ہوئے آخر میں عدن کے قریب حصن غراب نامی مقام کے کھنڈروں سے نکلے ہوئے اس کتبہ کو جسے ایک انگریز افسر ولسٹڈ نے ۱۸۳۴ء میں برآمد کیا تھا اسی کتبہ کے اس فقرے سے یعنی

"ہم پر وہ بادشاہ حکومت کرتے ہیں، جو کمینہ خیالات سے بہت دور، اور شریروں کو سزا دینے والے تھے، ہود کی شریعت کے مطابق ہمارے واسطے پیدا ہوتے تھے، اچھے فیصلے ایک کتاب میں لکھے جاتے تھے،" (ص ۱۰۲ ج ۱ تاریخ ارض القرآن)

انھوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ کتاب جس میں فیصلوں کے نقل کرنے کا جو ذکر ہے یہی وہ کتاب ہے جو

لقمان کے نام سے عرب میں عام طور پر مشہور تھی، جس کا مطلب یہی ہوا کہ قرآن نے جیسے تورات و انجیل وغیرہ کی سچائیوں کو اپنے اندر محفوظ کر دیا ہے، اسی طرح سورۂ لقمان کی وہ باتیں جن کا لقمانی حکمت کے نام سے قرآن میں تذکرہ کیا گیا ہے، یہ ہودی شریعت کی غیر فانی صداقتوں سے تعلق رکھنے والی باتیں ہیں، گویا قرآنی دعویٰ "مصدقاً لما بین یدیہ" کی ایک شکل لقمانی حکمت بھی ہے،

اس میں شک نہیں کہ اس سلسلہ میں سید صاحب کے بعض دعاوی دلائل کے لحاظ سے اب بھی محل غور و تحقیق ہیں لیکن کہنے والوں نے جیسا کہ کہا ہے سوال اور جواب علم ان ہی دونوں باتوں کے مجموعہ کی تعبیر ہے، ہر علم اور فن میں سوال اٹھانے والے علم کے نصف حصہ کے حقدار ہوتے ہیں، خواہ اُن کے پیش کردہ جوابوں سے لوگوں کو اختلاف ہی کیوں نہ ہو، یہی بات سید صاحب مرحوم کے متعلق میں کہنا چاہتا ہوں، انھوں نے قرآن کے ایک خاص پہلو کو اپنی اس کتاب میں تلاش و تحقیق کے لیے پیش کیا ہے، ان کا دعویٰ یہی ہے، فرماتے ہیں کہ

"تیرہ سو برس میں ایک کتاب بھی مخصوص اس فن میں نہیں لکھی گئی" (ص ۳ ج ۱)

اس سلسلہ میں اُن کے جوابوں سے ممکن ہے، اختلاف کیا جائے لیکن سوالات کے پیدا کرنے والے یقیناً وہی قرار پائیں گے، انھوں نے علم سے دین کی خدمت کی ایک نئی راہ نکالی، امید ہے کہ آیندہ اس پر کام کرنے والوں کے اجر میں اُن کا بھی حصہ ہوگا،

سید صاحب نے جس زمانہ میں اپنی یہ کتاب مرتب کی تھی، جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں اُن پر عقلیت پسندی کا زیادہ اثر تھا، اور شاید اسی کا نتیجہ ہو کہ بعض مواقع پر مثلاً حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کی پیدائش کے سلسلے میں چٹان سے نکلنے کے واقعہ کا جو انھوں نے صاف لفظوں میں انکار کیا ہے[1]، غالباً یہ اُن کی عقلیت پسندی کی یادگار ہے، لیکن باایں ہمہ حیرت ہوتی ہے کہ اسی زمانہ میں سورۂ فیل کا تذکرہ کرتے ہوئے سر سید احمد خان کی تفسیر کے متعلق اُن کے قلم سے یہ الفاظ نکل پڑے ہیں کہ

---

[1] دیکھو ارض القرآن ج ۱ ص ۱۹۷

"سر سید نے اس سورہ کی جو تفسیر تہذیب الاخلاق مین لکھی تھی، اور جس سے اس واقعہ کے اعجوبہ پن کو دور کرنے کی کوشش کی تھی، وہ سرتا پا لغو اور اغلاط سے مملو ہے" (ص ۳۲۲)

اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصہ مین ہد ہد پرندے کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ لکھتے ہوئے کہ

"اس زمانہ کے بعض نطرت پرست کہتے ہین کہ مُرغ کا بولنا، اور اس کی بولی سے مفہوم کا سمجھنا خلافِ عقل ہے"

سید مرحوم نے جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ

"جانورون کی عاقلیت کا مسئلہ مسلم ہوتا جاتا ہے، بندرون کی بولیون کی ابجد تیار کی جارہی ہے، تو ہُدہُد کے بولنے پر تعجب کیون ہو"

اسی کے ذیل مین یہ اضافہ بھی اُن کے قلم نے کیا ہے کہ

"اگر پرندون کا بولنا اب بھی کھٹکتا ہے تو فرض کر لو کہ نامہ بر کبوترون کی طرح تربیت یافتہ نامہ بر ہدہد ہوگا"

مگر اسی کے ساتھ اسی سلسلہ مین اُن کا یہ فرمانا کہ

"طیر کے معنی فوج لینا جیسا کہ مولوی چراغ علی نے لیا ہے، اسی طرح بے ثبوت ہے جس طرح سر سید کا سورۂ فیل کی تفسیر مین طیر سے خیال بدلینا" (ص ۲۶۸)

یہی باتین اُن کی حقیقی دینی نطرت کی غمازی کر رہی ہین، اور خدا کا شکر ہے کہ اسی پر اُن کا خاتمہ بالخیر ہوا والعاقبۃ للتقویٰ

"نقوشِ سلیمانی"

ادب و انشا کی کچھ جھلکیان

از

جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی

"تو یہ کہیے کہ آپ امیر مینائی کی غزل گوئی کے قائل نہین صرف اُن کی فن دانی اور تحقیقِ لغت و زبان کے قائل ہین، اچھا ایک شعر سناتا ہون، ...... بتایئے کیسا ہے......"

"اچھا اور بہت اچھا ہے"

"اور یہ شعر!......"

"یہ بھی خوب ہے، سُبحان اللہ"

اچھا اور یہ ...... اور یہ ...... لے اب کہان تک پہنچئے گا، یہ سارے شعر امیر ہی کے تھے"

ذکر دسمبر ۱۹۱۳ئہ کا ہے، آگرہ یا اردو والون کے شہر اکبر آباد مین محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ حسب معمول خوب دھوم دھام سے ہو رہا ہے، جلسہ مین میلہ کی دھوم دھام، جشن شاہی کا تزک و احتشام، خواص کا مجمع اور عوام کا ازدحام، ملک کے گوشہ گوشہ سے پڑھا لکھا مسلمان کھنچا چلا آرہا ہے، مہمانون کے ایک خیمہ مین اخیر دسمبر کی ایک ٹھنڈی رات مین دو شخص آس پاس لیٹے ہوئے وقت گذاری کے لئے شغل اردو شعر و شاعری سے کر رہے ہین،

امیر کو داغ سے لڑا رہے ہیں، ایک کو گرا اور دوسرے کو چڑھا رہے ہیں، یہ شعر پر شعر تابڑ توڑ سنانے والا ہے سید سلیمان ندوی، ۵۳ء کا شیخ طریقت نہیں، ۱۳ء کا جوان عمر صاحب نظر و صاحب قلم، اور سُن سُن کر بلا بیت بازی مات کھا جانے والا ہے، ان سطور کا راقم آثم، پڑھا نہ لکھا، نام محمد فاضل! —— سید صاحب کا یہ عالم دو بعد ایک مدت سے قائم تھا، اُن کے علم و فضل کا سکہ کئی سال سے دل پر بیٹھا ہوا، یہ کیا خبر تھی کہ اللہ و کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو سنبھالنے والا اور اہل لال کو وقت کی ظلمتوں میں چمکانے والا، کلامِ امیر کا حافظ نکلے گا، مرآۃ الغیب[1] کا آئینہ بردار صنم خانۂ عشق[2] کا پرستار! یہ پہلی بار کھلا کہ یہ حضرت بہ این زہد و تقوی اردو شعر و سخن کے رسیا ہیں، اور اردو غزل و تشبیب کے متوالے!

سید صاحب کے فاضل اجل اور عالم بے بدل ہونے کا ایک زمانہ قائل ہے، دنیا کو مسلّم ہے کہ وہ فن تاریخ میں امام وقت تھے، اور سیرت نگاری میں اپنی نظیر آپ، لیکن آخر تک کم ہی لوگوں نے اُن کے ادبی شعری تنقیدی رتبہ کو جانا، اور کمتر ہی لوگوں نے انھیں ادیب انشا پرداز اور سخن سنج کی حیثیت سے پہچانا! اسلام کی تاریخ میں ایسی ناشناسی اور کم شناسی کی مثالیں نہ معدوم ہیں نہ غیر معلوم،

اب آخر زمانہ میں تو اُن کا عام مطالعہ یوں بھی بہت گھٹ گیا تھا، بلکہ کہنا یہ ہے کہ سمٹ سمٹا کر صرف "دینیات" تک محدود ہو گیا تھا، لیکن جب شوق مطالعہ جوان تھا، اور دن بھی جوانی کے تھے، تو اردو کی غزلیات کیا معنی ہزلیات تک کا دفتر بے معنی و بامعنی اُن کی انگلیوں کی نوک پر تھا، دیوان کے دیوان پڑھ ڈالے، کلیات پر کلیات ختم کر ڈالے، اور "گلدستہ" کا تو اب لفظ بھی تشریح طلب ہو گیا ہے (اپنے وقت میں تازہ غزلوں کے ماہنامہ کو کہتے تھے) ایک زمانہ میں ان گلدستوں کی بہار تھی، لکھنؤ تو پھر لکھنؤ ہے اور اودھ میں بلکہ قصبوں تک میں اُن کے ورق، ورقِ گل کی طرح کھلے ہوئے اور سید صاحب تھے کہ ان کی خوشبو دن میں لیے ہوئے پھر شاعروں کی باہمی نوک جھونک کے رسالے، اپنی بوقلمونیوں میں مولوی صاحبان کے مناظرانہ رسالوں سے

[1] امیر مینائی کا دیوان اول [2] ایضاً دیوان دوم، غیر آباد یقینی اللہ کا کردی ناقبا،

لڑتے ہوئے اس نے اُس کی زبان پکڑی، اُس نے اِس سے محاورہ کی سند مانگی، اِس نے اُس کے کلام میں ایطائے جلی نکالا، اُس نے اس کے استاد تک کو بیچ میں رکھ دیا، انھوں نے اُن پر سرقۂ مضمون کا الزام رکھ کر اُن کی موٹی سی عزت اُتار لی، انھوں نے اِن کے شعر میں پہلوئے ذم و فحش نکال کر اُن کی گردن ناپ لی، ——

سید صاحب کا وطن خود ہی اردو شعر و سخن کے حق میں گلزار اور پھر سید صاحب کا لکھنؤ میں سالہا سال کا قیام، جو کسر رہ گئی تھی پوری ہو گئی، سید صاحب اس چمن کے ایک چہکتے ہوئے بلبلِ خوش نوا خود بن گئے، شاعر بھی تھے، تخلص رفقی کرتے تھے، کبھی قطعہ کبھی رباعی کہتے، اور تفریحاً ہر بحرِ سخن میں شناوری کرتے، جون ۱۹۱۶ء میں جب اس ہیچمدان کا عقد ہوا ہے، سید صاحب نے ازراہِ محبت و یگانگت کئی کئی رباعیاں فی البدیہہ موزون کر دی تھیں، صرف ایک یاد رہ گئی، آپ بھی سن لیں،

لایا ہے پیام یہ خوشی کا قاصد — نوشاہ بنے ہیں آج عبد الماجد
وہ روزِ سعید بھی خدا لائے جلد — بن جائیں گے جب کسی کے والد ماجد

غزل بھی کبھی کبھی چوری چھپے کہہ لیتے، صرف دو چار شعر نمونہ کے حاضر ہیں،

دل حریفِ نگہ یار کہاں سے لاؤں — جو نہ بیخود ہو وہ میخوار کہاں سے لاؤں
مدرسہ چھوڑا، خرابات میں آکر ٹھہرا — دوسرا سایۂ دیوار کہاں سے لاؤں
توبہ توبہ، مری توبہ بھی ہے کوئی توبہ — ٹوٹ جائے جو نہ ہر بار کہاں سے لاؤں

——

تشہیر کا باعث نہ ہو دامانِ قبا دیکھ — لائے نہ کہیں رنگ یہ خونِ شہدا دیکھ
انکار تھا تجھ کو مری تاثیر دعا سے — اب میری طرف دیکھ تو تاثیر دعا دیکھ
آزاد مکاں سے ہے اُسے قیدِ مکاں کیا — گر آنکھ ہو تو بتخانہ میں بھی نورِ خدا دیکھ

یہ مضمون سید صاحب کی شاعری پر نہیں، نثر پر ہے، اُن کی شاعری پر نقد و تبصرہ کے لئے ایک مستقل مقالہ درکار ہے، اور یہ منزل تو پھر بعد کی ہے، پہلے کوئی شاگرد ذرا تلاش و تفحص سے کام لے کر اُن کا سارا کلام

یکجا تو کریں،

سید صاحب کی نثر پر اگر قلم اٹھایئے تو دیدہ و دل حیران، کہ شروع کہاں سے کیجئے، اور ختم کہاں پہنچ کر کیجئے، سیرۃ النبیؐ کی ضخیم مجلدات سے لے کر خیام، خطبات مدراس اور رحمت عالم تک بڑی اچھوتی اور چھوٹی بڑی کتابون تک کون سی ایسی ہے، جہان حضرت سلیمانؒ ایک خشک مولوی ملا نے معلوم ہوتے ہون، اور صحت زبان و سلاست بیان نمایان نہ ہو، شستگی، متانت، شرافت، یہ تو اُن کے اسلوب تحریر کے جوہر اصلی ہین، اور اس پر [illegible] طرازی کی گلکاریان، اور حسن صناعت کی سحر طرازیان، جیسے خاتم سلیمانی مین نگین، اور مستقل تصنیفات و مجموعے معارف کے شذرات اور معارف اور دوسرے رسالون کے مقالات سب کو یکجا کیجئے، تو صفحات کی تعداد سیکڑون نہین، ہزارون تک پہونچے، اور مجموعہ کو تقسیم کیجئے، تو جلدون پر جلدین کتابون کی ڈھلتی چلی آئین —— اتنے بڑے کام پر ہاتھ ڈالنا ہے بڑے جگر کا کام، اور ممکن اُسی کے لئے ہے، جو ایک چھوٹے سے مضمون کا نہین، پوری ایک کتاب کا تہیہ کرکے بیٹھے، اور فرصت دو چار دن کی نہین، ایک مدت دراز کی نکال رکھے، سلیمان عالی جاہ کے حدود مملکت کا جائزہ لینا ہرگز کم ہمتون، کم فرصتون، کوتاہ نظرون کا کام نہین

"ہم اپنی زبان کے اس قیمتی سرمایہ کا آغاز سکون سے کرنا چاہتے ہین، تاکہ یہ لفظی دولت مضمون کی معنوی دولت کے لئے فال نیک بن سکے۔" (ص ۲۹۰)

یہ الفاظ سید صاحب کے ہین، اور ایک مقالہ کی تمہید سے منقول ہین، جو بعض پرانے لفظون کی نئی تحقیق کے عنوان سے ہندوستانی اکیڈمی، یو۔پی کے سالانہ اجلاس الہ آباد مین ۱۹۳۰ء مین انھون نے پڑھ کر سنایا تھا اور بعد کو وہ اُن کے دوسرے خطبات، مقالات و مقدمات کے ساتھ مل کر اُن کے ادبی و علمی مضامین کے مجموعہ مین شائع ہوا ہے، مجموعہ کا نام نقوش سلیمانی ہے، اور یہ کتاب ۲۰×۲۶ کے سائز پر ۴۶۷ صفحہ پر ۱۹۴۰ء مین شائع ہو چکی ہے، کتاب کیا ہے سید صاحب کے کمالات ادبی و علمی کی ایک مہر زدہ دستاویز، آگے اقتباسات جو بھی ہون گے، اسی کتاب سے ہون گے۔

یہان تو سید صاحب اپنی زبان کے خزانۂ ادب مین تحقیق الفاظ کے نوادر کا اضافہ کرنے کے لئے کھڑے ہوئے ہین، اب دیکھئے اس ذرۂ بے بہا کے بعد یون گہرافشان ہین:

ہماری زبان کا ایک پامال لفظ "دام" ہے، ایک تو اس کے معنی قیمت کے ہین، اور دوسرے معنی ایک معمولی سکہ کے ہین، جس کی ایک ذلیل ترین صورت ہماری زبان مین چھدام کی ہے، جو چھ اور دام دو لفظون سے بنا ہے، اس لفظ کی تاریخ کے لئے ہم کو آج سے دو ہزار برس پہلے لوٹ جانا ہے، ایک زمانہ تھا کہ یونان کے کشورکشا اور سوداگر چپہ چپہ دنیا پر چھاگئے تھے، ان ملکون مین یونانی حکم اور یونانی سکے چلتے تھے، اور ان کے یونانی نام زبانون پر تھے،....

....یونان کے چاندی کے سب سے کم قیمت سکہ کا نام درخم تھا، اس نے عربی مین درہم اور فارسی مین بیچ سے ایک حرف گرا کر درم کی صورت اختیار کی، اور ہندوستان مین ایک حرف اور گرا کر اور اس کی جگہ ایک لمبی آواز بڑھا کر دام ہو گیا، یہ لفظ جس طرح سکہ کو بتاتا تھا، سکہ کے وزن کو بھی بتاتا تھا، چنانچہ عربی طب مین وزن کا وزن درہم اور فارسی طب مین درم سے بتایا جاتا ہے، اسی لفظ نے جب فرنگستان کی ٹوپی پہنی تو ڈرام ہو گیا، جو اب ہمارے انگریزی طبی کالجون، دواخانون اور شفاخانون مین ایک بیگانہ کی حیثیت سے وارد ہے، اور شاید اب کوئی پہچانے بھی نہین کہ دام اور ڈرام دونون کی ایک ہی شخصیت ہے، صرف آب و ہوا، لہجہ اور شکل و صورت کا فرق ہو گیا ہے،

اکبر کے زمانہ مین دام چاندی کے سب سے چھوٹے سکہ کے بجائے تانبے کے سکہ کا نام تھا، اس کو پہلے پیسہ کہتے تھے، اور اب بھی کہتے ہین، یہ روپیہ کا چالیسوان حصہ تھا، پھر ایک دام کے پچیس حصے کرکے ہر حصہ کو جتیل کہتے تھے، اب گوگا کہتے ہین، اکبر کے زمانہ مین بھی اس کا نام ملتا ہے، اسی تقسیم سے یورپ کی زبان مین ایک محاورہ بہت ہے، ہر گاؤن یا ہر زمیندار کی ملکیت ۲۰ دام فرض کی جاتی ہے، اور یہ آنے پھر پائی اور دام پر بانٹے جاتے ہین، ایک دام

یہ عبارت نقل کرتے وقت درم و دام کی اس قرابت پر ایک عامی کو غالب کا یہ مصرعہ بے اختیار یاد پڑ گیا، "درم و دام اپنے پاس کہاں" اور فارسی کا چلا ہوا فقرہ "دامے درمے بھی"،

کا آدھا ادھیلا اور ¼ پاؤلا اور ⅛ دمڑی کہلاتا ہے، اور یہ اخیر لفظ دام کی تصغیر یا تحقیر ہے، آئین اکبری کے زمانے
ایک من تانبے میں ایک ہزار چوالیس درم (پیسے) تیار ہوتے تھے" (ص ۲۹۰-۲۹۱)

سید علیہ الرحمۃ نے یقیناً فیلالوجی (لسانیات) پر کوئی تصنیف اپنی یادگار نہیں چھوڑی لیکن ان کے
نمونے سے اندازہ ہوگیا ہوگا، کہ انھیں فن لغت و اشتقاق الفاظ سے کتنی مناسبت تھی، اس میدان میں
اپنا ذہن کہاں کہاں دوڑاتے رہتے، کن کن آسمانوں سے تارے توڑ توڑ کر لایا کرتے، اور خشک لغوی تحقیق
کو کتنا شگفتہ بنا کر رکھتے —— اتنا پھیلاؤ تو آپ نے صرف ایک لفظ دام کی خاطر دیکھا، کتاب کا پورا ڈیڑھ صفحہ
اسی کی نذر ہوگیا، قدر جب اس گھٹیا سکہ کی یہ ہوئی تو پھر اشرفی کی قیمت تو اس سے کہیں زائد ہے، اس کی
وجہ تسمیہ کی کاوش میں تو جو کچھ پاپڑ نہ بیل ڈالے ہوں، بجا ہے، سنیئے اور کچھ دیر تک کان لگائے سنتے رہیئے:

"دام اور قیراط جس طرح باہر سے آئے ہوئے نام ہیں، اسی طرح ہمارے سب سے قیمتی سکہ اشرفی کا نام بھی باہر
سے آیا ہوا ہے۔ مجھے بہت دنوں سے اس کی اصلیت کی تلاش تھی، اور پتہ نہ چلنے پر دل کو یہ کہکر تسکین دے لی کہ
چونکہ یہ طلائی سکہ سب سکوں میں اشرف ہے، اس لئے اشرفی کہلایا، مگر دفعۃً ایک غیر متوقع ماخذ سے اس کی
اصلیت دریافت ہوئی، تو معلوم ہوا کہ سکہ اشرف نہ تھا، بلکہ جس بادشاہ کی طرف وہ منسوب ہے
وہ اشرف تھا۔

طلائی سکہ کے لئے سب سے پرانا نام دینار ہے، اور یہ بھی یونانی ہے مگر چونکہ عربوں میں یہ سکہ جاری تھا،
اس لئے انھوں نے عبدالملک کے زمانہ میں ۷۶ھ یا ۷۵ھ میں طلائی سکہ ڈھالا تو اس کا نام دینار
ہی رہنے دیا جب ان کے قدم ہندوستان پہنچے تو ان کا دینار بھی اُن کے ساتھ آیا، اور آج تک خاندانی
مسلمانوں میں دین مہر کی تعداد میں سکہ رائج الوقت کے ساتھ چند دینار سرخ رسمی طور سے جاری ہے، تغلق
کے زمانہ میں ہم کو اشرفی کے لئے دو لفظ ملتے ہیں، ایک تنکۂ زر، یہ تنکہ سکہ کے معنی میں عام طور سے بولا جاتا تھا،
اور اسی سے تنخواہوں کی تعیین ہوتی تھی، پیادہ کی ماہانہ تنخواہ ۷½ تنکہ اور سوار کی ۲۰ تنکہ تھی، مخدوم زادہ بغداد

کے لئے دس لاکھ تنکہ وظیفہ مقرر ہوا، مصری خلیفہ کا سفیر جب سلطان محمد تغلق کے دربار میں آیا ہے اور جمعہ کے
دن خلیفہ کا نام خطبہ میں پہلی دفعہ پڑھا گیا ہے تو چندیں طبقہا پُر از تنکۂ زر و نقرہ بر آں نثار شد" (برنی ص ۴۹۲)
اس سے معلوم ہوا کہ اشرفی کے لئے اس زمانہ میں تنکۂ زر بولا جاتا تھا، خلجی کے زمانہ میں ایک تنکۂ زر ایک
تولہ سونے کا ہوتا تھا اور تنکۂ نقرہ ایک تولہ چاندی کا (فرشتہ ص ۱۱۴) روپیہ کو تنکۂ نقرہ اور اس سے کم
درجے کے سکہ کو صرف تنکہ کہتے تھے، یہ لفظ قدیم یادگار کے طور پر آج بھی بعض پرانے خاندانی مسلمانوں میں
دین مہر کی تعیین میں بولا جاتا ہے، خیال ہوتا ہے کہ یہی تنکہ تو آج ٹکے کی صورت میں ہمارے سامنے نہیں؟
دوسرا لفظ "مہرِ زر" ہے، اُس کو مہر اس لئے کہتے تھے کہ اس پر شاہی نقش ہوتا تھا، مُہرِ زر کی
اصطلاح برنی میں ملتی ہے،

"سلطان محمد مُہر مس پیدا آورد، فرمان داد کہ مہر مس را خرید و فروخت چنانچہ مہر و زر و نقرہ
جاری است" (ص ۴۷۵)

......دکن میں طلائی سکہ کا نام ہون تھا، جو آخر میں مخفف ہو کر ہُن ہوگیا، اور آج ہماری زبان میں
اس نسبت سے دولت کی کثرت کے معنی میں ہُن برسنا ایک یادگار رہ گیا ہے، روپیہ کا لفظ اور سکہ
شیر شاہ کا چلایا ہوا ہے، (آئین اکبری ص ۱۸) اور عجب نہیں کہ روپا سے بنا ہو، سونے کے سکہ کے لئے اشرفی
کا لفظ ہندوستان میں نورالدین جہانگیر کے زمانہ میں استعمال میں آیا ہے، چنانچہ فرشتہ نے اپنی تاریخ میں حسن
گنگو بہمنی کے خزانہ پانے کی اتفاقی سرگذشت کے بیان میں لکھا ہے:-

"زنجیر را در گردن ظرفے مملو از اشرفی طلائی و طلائے غیر مسکوک دید"

(فرشتہ ۔ نولکشوری ص ۲۷۴)

......مصر کے چرکسی بادشاہوں میں ایک برسبائی تھا، اس نے ۸۲۵ھ سے ۸۴۱ھ تک حکومت
کی، اس کا شاہی لقب الملک الاشرف تھا، یہی اشرف اشرفی کا مصدر و معدن ہے، مشہور عرب جہاز راں

ابن ماجد اسد البحر نے جس نے ۹۰۴ھ (۱۴۹۸ء) میں واسکوڈی گاما کو ہندوستان پہنچایا تھا "الفوائد فی اصول البحر والقواعد" کے نام سے جہازرانی پر ایک کتاب لکھی ہے، جو چند سال ہوئے کہ فرانس سے چھپ کر شائع ہو چکی ہے، اس کا زمانہ نویں صدی ہجری کا اخیر اور دسویں صدی ہجری کی شروع تھا،

.... اس کی کتاب کے مطالعہ سے اشرفی کا بھید مجھے معلوم ہوا، ابن ماجد ایک خاص سلسلہ میں لکھتا ہے:

الحادی عشر برسائی الاشرف مناسب — گیارہواں بادشاہ برسبائی اشرف ہے جو اشرفی

سکۃ الاشرفی (صف ۲۸ طبع پیرس) — سکہ کا چلانے والا ہے،

اس سے معلوم ہوا کہ اشرفی کا سکہ مصر سے چل کر بحر ہند میں داخل ہوا تھا، اور وہاں سے پورے ہندوستان میں پھیل گیا، ابن ماجد نے اپنی یہ کتاب ۸۹۵ھ میں لکھی ہے اور اس سکہ کے بانی کا ذکر کیا ہے، اور فرشتہ نے اپنی اصل کتاب اس کے بیس برس بعد ۹۱۵ھ میں لکھی، اور "اشرفی علائی" کا نام لیا ہے یعنی علاء الدین خلجی کے وقت کی اشرفی، حالانکہ خلجی کے زمانہ میں اشرفی کا نام بھی پیدا نہیں ہوا تھا، مگر یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم پرانے بادشاہوں کے سونے کے سکوں کو یا انگریزی پونڈ کو اشرفی کہہ دیتے ہیں" (ص ۲۹۶)

یہ ساری تحقیق جو یہاں ذرا مختصر ہو کر نقل ہوئی ہے، کتاب کے پورے چار صفحوں میں آئی ہے، ــــ

اور اسی طرح لفظ پر لفظ لکھتے اور ہندی کی چندی کرتے چلے گئے ہیں، "کرانت"، "بیمہ"، "ڈاک"، "قمری"، "سوسی"، "بزنی"، "رقم"، "ہندسہ"، "ریاضیات"، "سیاسیات"، یہ دس عنوانات اور اس کے نتائج کے ہیں، اور ان بارہ لفظوں کے اشتقاق اور تحقیق تسمیہ کی موشگافیوں میں پورا مقالہ ختم ہو گیا ہے،

پھر یہ بارہ لفظ وہ ہیں جن کی ذاتیں بالکل الگ الگ ہیں، یعنی اُن کا تعلق باورچی خانہ سے بھی ہے، بزازے سے بھی، چڑیا خانہ سے بھی اور صرافے سے بھی، سرکاری ایوانوں سے بھی اور درسی کاشانوں سے بھی یونہی زبردستی گتھے میں بنا ڈال کر گتھے نہیں کرنے گئے ہیں، بات میں بات پیدا کی گئی ہے، نکتہ سنجی کو کھل کھیلنے کا میدان ہاتھ لگ گیا ہے، اور انشائے لطیف نے جیسے الگ تھلگ رہنے والے روٹھے ہوؤں کو گلے لگا کر

ایک دوسرے سے متصل بنا دیا ہے ــــ دعویٰ پر دلیل ملاحظہ ہو،

ڈاک کے مقابلہ "قمری" آیا ہے، بھلا ان دو اسموں میں کیا ربط، کیا تعلق ہو سکتا ہے، لغت ڈاک کے خاتمہ پر پہنچئے:-

"اگلے زمانہ میں مصر وغیرہ اور ہمارے ملک میں بھی جہانگیر نے ڈاک کے کبوتر اڑا دیئے تھے، اس نسبت سے ایک اڑتی سی بات کبوتر ہی سے ایک ملتے جلتے پرندے کی نسبت سُن لیجئے"؛

دیکھا آپ نے، ادب و انشاء کے اس شہباز نے کس طرح ہنستے کھیلتے ڈاک کے تھیلے کی ڈوری کے پرے باندھ اس سے حق سرہ بڑھوا دیا! اسی ہلکے پھلکے انداز سے ربط، بیمہ اور ڈاک کے بزنی اور رقم کے، اور رقم اور ہندسہ کے درمیان قائم ملے گا، ــــ اس ربط و ضبط کی ساری داستان پڑھنا ہو تو اس کتاب کی طرف توجہ فرمائی جائے،

پھر یہ نہیں ہوا کہ یہ لسانیاتی کاوش اسی ایک لکچر پر ختم ہو گئی ہو، اس کی چاٹ جو پڑی تو مصرع طرح غزل کے بجائے دو غزلہ تیار ہو گیا، لکچر تو اکیڈمی میں سنایا گیا تھا، اس کا دوسرا نمبر اسی عنوان کے ساتھ خاص معارف کے لئے لکھا، اور وہ ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا، اس میں الفاظ ذیل زیر بحث آئے،

ناشتہ[۱]، نہار[۲]، فلسفہ[۳]، تاب[۴]، رکابی[۵]، قلیہ قورمہ[۶]، شوربا[۷]، شراب[۸]، کباب[۹]، قالین[۱۰]، شاگرد پیشہ[۱۱]، راج[۱۲]، زچہ، مامتا، مزدور[۱۳]، سنری، خراد[۱۴]، ساہول[۱۵]، گنیا[۱۶]، جہاز[۱۷]، جہیز[۱۸]، تجہیز[۱۹]، سرخی[۲۰] (عنوان)، سرسل[۲۱]، نستعلیق[۲۲]، جلیلا[۲۳]، کفش[۲۴]، مادری[۲۵]، قلمی[۲۶]، تماشہ[۲۷]،

یعنی پہلے مقالہ کے دونے سے بھی زائد، ۱۲ کی جگہ ۲۷، نقش ثانی کے معنی ہی یہی ہیں کہ نقش اول سے بڑھ کر رہے، کیا کیفیت میں اور کیا کمیت میں،

اس مقالہ کا بھی رنگ انشاء آپ دیکھنا چاہتے ہیں؟ اچھا تو ایک ہلکی سی جھلک سہی، شوربا کی نمکینی کے بعد قلم کی زبان یوں شکرفشاں ہوتی ہے، اور مستی کے ذکر میں بھی رندی تک نہیں پہنچتی، صرف شوخی کے حدود کے اندر رہتی ہے:-

"اسی عربی شُرب (پینا) سے ایرانیوں نے شراب اور شربت تیار کیا، اور اُسے ہندوستانیوں نے قبول کر لیا، شراب کے معنی عربی میں ہیں "جو چیز پی جائے"، یہاں تک کہ قرآن میں دودھ کو بھی شراب کہا ہے، ایرانیوں نے جس کو شراب کہا، اُس سے متوالی شراب مراد لی، اس سے یورپی زبانوں میں سیرپ تیار ہوا، جو شکر پڑ کر میٹھا ہو گیا، لیکن ایرانیوں کے اثر سے ہم نے پانی میں گھول کر جو چیز تیار کی، اس کو شربت کا نام دیا، لفظ عربی ہے، اور معنی عجمی، عربی میں اس کے معنی فقط پینے کے ہیں"، (ص ۳۱۶، ۳۱۷)

ان میٹھے میٹھے بولوں کو سُن کر خیال یہ نہ گذرے کہ سید صاحب کی ہر تحقیق سو فی صدی صحیح ہی تھی، کون فاضل اس کا دعویٰ کر سکتا ہے؟ بشر بہرحال بشر ہے، اور سید صاحب اپنی بشریت کے اعتراف و اقرار میں ہرگز کسی سے پیچھے رہنے والے نہ تھے، لسانیات کے ایک ماہر خصوصی ہمارے صوبہ میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی سندیلوی ثم الہ آبادی ہیں، انھوں نے جب بعض حصوں پر نقد کیا، تو سید صاحب نے یہی نہیں کہ فراخ دلی کے ساتھ اسے معارف میں شائع کر دیا، بلکہ شوربا کی حد تک تو کھلے طور پر، اور مستری کے لئے بھی ایک حد تک اپنی تحقیق سے رجوع بھی کر لیا،

لغوی اور اشتقاقی بحثوں کا شعبہ ختم ہوا، سید صاحب کے دو اور بڑے کارنامے مستقل قدر و قیمت رکھنے والے یہ ہیں، کہ

(۱) انھوں نے عربی و فارسی کی تمام تر ماتحتی سے نکال کر اردو کی خود مختاری اور ایک قائم بالذات زندگی کی سرگرم وکالت کی، وہ اصلاً ایک عالم دین اور مولوی تھے، قدرۃً اُن کے طبقہ سے توقع یہ تھی کہ وہ اردو پر عربی کی حاکمیت سے خوش ہونگے، اور ساری کوشش اس کے قائم و برقرار رکھنے کی کریں گے، لیکن اس کے برعکس انھوں نے عربوں کی "تعریب"، اور فارسیوں کی "تفریس" کی طرح، اہلِ ہند کو پورا حق "تہنید" کا دلایا،

"جب اہلِ ہند یہی کریں، یعنی وہ کسی دوسری زبان کے لفظ کو اپنی زبان کے اصول پر تراش خراش کر کے اپنی زبان میں ملا لیں تو اس کو تہنید کہیں گے، یہ اصول زبانوں کے بڑھنے اور پھیلنے کے لئے بہت ہی

مفید ہے، یہ اصول قریب قریب دنیا کی سبھی زبانوں میں چلتا ہے، اور اُس کے مانے بغیر ممکن ہی نہیں، کہ زبان ترقی پا سکے"، (ص ۳۲۸)

آج ۱۹۵۲ء میں یہ بات بالکل صریح و واضح معلوم ہو رہی ہے، مگر ۳۹ء میں جب سید صاحب نے "تہنید" کے عنوان سے اُسے معارف میں پیش کیا تو یہ آواز کچھ نامانوس سی تھی، پرانے خیال کے اہلِ قلم خاصی تعداد میں اس پر مصر تھے کہ عربی و فارسی کے قاعدے اردو میں بھی چلائے جائیں گے، اور اُن کے پاس دلیل بجز جمود و تقلید کے اور کوئی نہ تھی، اُس کے مقابلہ میں سید صاحب کا سیدھا، صاف و دلنشین استدلال ملاحظہ ہو:-

"...... ایک قوم کا آدمی جب کسی دوسری قوم کی بولی کا کوئی لفظ لیتا ہے تو اس کی زبان کی فطرت مجبور کرتی ہے کہ ارادہ اور احساس کے بغیر اس کی شکل بدل دے، ہندوستان کے باہر کا آدمی خواہ کچھ کرے، مگر وہ ہمارے ہندی حرفوں کو کبھی نہ بول سکے گا، وہ اس کو کچھ نہ کچھ بدل دے گا، وہ ہمارے لہجہ سے ہمارے لفظوں کو نہ نکالے گا، مگر اس میں بھی کچھ ہیر پھیر کرے گا،

یہی حال ہندیوں کا بھی ہے، عربی کے خاص حرف وہ ادا نہیں کر سکتے، ع، ء اور الف میں، ث، س اور ص میں اور ت اور ط میں وہ فرق نہیں کر سکتے، اس لئے دوسری زبان کا جو لفظ ہمارے ہاں آئے گا وہ جب تک اپنی بیگانگی چھوڑ کر بالکل گھریلو نہ بن جائے گا، وہ ہمارے دیس میں رہ نہیں سکتا، یہی وجہ ہے کہ عربی، فارسی، سنسکرت، انگریزی وغیرہ کے جو ہزاروں لفظ ہماری زبان میں آگئے ہیں، وہ ہماری زبان کے قاعدوں پر چڑھ کر ہماری زبان کی شکل و صورت اختیار کرنے پر مجبور ہیں،

متوار کے معنی میں رواج کی اصل عربی اور فارسی میں رواز ہے، مگر ہمارا ہندوستانی لفظ رواج ہی ہوگا، عربی کا جو لفظ تمنٰی ہے، مگر فارسی والوں نے اُسے لیا، تو تمنا کر دیا، اور ہم نے بھی اُسی کو قبول کیا، عربی تماشی کو ایرانیوں نے تماشا کیا، اور ہم کو بھی یہی تماشا پسند آیا، لالٹین کی اصل لینٹرن ہے، مگر ہم کو لالٹین ہی کی روشنی پسند ہے، لینٹرن انگریزی ہو تو ہو، مگر ہمارا لفظ تو بہ تمام ہے، جو ٹین کی بگڑی ہوئی شکل ہے؛ لفظ تبادلہ عربی سے لیا گیا ہے

غلط ہی کیوں نہ ہو، لیکن ہماری زبان میں یہ صحیح ہے کہ اس کو چھوڑ کر مبادلہ یا تبادلوں کی کوشش زبردستی ہے۔"

(ص ۲۲۱)

قدیم طرز کے عالموں سے اس کی توقع ہو ہی نہیں سکتی مگر سید صاحب عالم تھے یہی تو ندوی، اور اُن کی ندویت اُن کی خوش ذوقی اور سلامتِ مذاق کی پوری طرح ضامن تھی ——— ۲۰ صفحہ کے مقالہ میں سید صاحب نے پچاسوں عربی لفظوں کی مثالیں دے دے کر دکھایا، ہر کہ عربی میں اُن کے معنی کچھ تھے، اردو میں آ کر کچھ ہو گئے، یا اُن کا تلفظ عربی سے اُردو ہو گیا یا اُن کے واحد جمع بننے میں عمل اُردو قاعدوں پر ہوا کہ

(۲۰) اسی درجہ کا بلکہ اس سے بھی بڑا دوسرا کارنامہ سید صاحب کا اردو زبان کے سلسلہ میں اس کے نام سے متعلق ہے، سید صاحب کا اصرار تھا کہ اس کا نام "ہندوستانی" چلانا اور پھیلانا چاہیے، کہ یہی اس کا نام فی الاصل ہے بھی، اور یہی اُس کی اشاعت و مقبولیت میں بھی بہت معین ہوگا، شروع شروع اس تحریک کی خاصی مخالفت ہوئی، اور انہی مخالفوں میں میں بھی تھا، اور بدگمانی مجھے یہ ہو رہی تھی کہ اردو کے خلاف، اس کے اسم و مسمیٰ دونوں کے خلاف جو زبردست پروپگنڈا اردو کے دشمنوں نے شروع کر رکھا ہے، اس سے کسی حد تک سید صاحب بھی متاثر و مرعوب ہو گئے ہیں، اور نام کی حد تک ہتھیار ڈالنے پر آمادہ، لیکن غالباً ۱۹۳۲ء میں جب کہ ایک بار اُن سے علی گڈھ میں اس پر زبانی مفصل گفتگو ہوئی، تو قائل ہونا پڑا کہ رائے انہی کی صحیح و صائب تھی، اور اردو کے بجائے ہندوستانی نام رکھنے کا مشورہ کسی مرعوبیت کی نہیں، بلکہ اردو کی دوستی و خیر خواہی ہی پر مبنی تھا، سید صاحب کا کہنا یہ تھا کہ

"ہم اس زبان کا نام اردو جو صرف سو ڈیڑھ سو برس سے رفتہ رفتہ ہماری زبانوں پر چڑھ گیا ہے، یک قلم چھوڑ دیں، اس کا نام ہندوستانی رکھیں، اور اسی کو شہرت دے کر عام کریں، دنیا کی اکثر زبانوں کا نام ملک یا قوم کے نام سے موسوم و منسوب ہوتا ہے، اردو کا نام اس ملک و قوم سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، ایسا اجنبی نام جس سے قومی و ملکی جذبہ کو کوئی تحریک نہ پہنچے، احتراز کے قابل ہے، اور اس کے بجائے

اس کا ہندوستانی نام، ہندوستان، اور وہ بھی ہندو اور مسلمانوں کے مشترکہ وطن کے نام کے تصور کے حامل ہونے کے سبب سے پوری طرح اپنے اندر ہمدردانہ جذبات کی روح رکھتا ہے، اور معلوم ہوتا ہے، کہ یہ ایسی زبان کا نام ہے جس کو پورے ملک سے تعلق ہے، اور وہ پورے ملک کی متحدہ زبان ہونے کا دعویٰ رکھتی ہے، عام خیال ہے کہ یہ ہندوستانی نام انگریزوں کا بخشا ہوا ہے، مگر یہ واقعہ نہیں، ...... ہم اس نام کے ذریعہ سے ملک کے سامنے وہ تخیل پیش کریں گے جو ہندو مسلم کے مشترکہ وطن کے تصور کی ترجمانی کرے گا، اور مغلوں کے لشکری استیلا کی تاریخ سے جو لفظ اردو میں چھپی، ہم کو نجات دے گا۔" (ص ۷۵، ۷۶)

یہ مقالہ ۱۹۳۲ء کا ہے، اور آج اس کی قدر ہوتی ہے، کہ اس زمانہ میں اس کے اندر کتنی دور اندیشی تھی کتنی مصلحت شناسی تھی، ——— مقالہ میں اور بھی جو مشورے درج تھے، وہ سب ایسے تھے، جو اردو کے ایک دوست دانا ہی کی زبان سے ادا ہو سکتے تھے، مثلاً یہ کہ عربی و فارسی کے جتنے الفاظ اب تک ہماری زبان کا جزو بن چکے ہیں، بس اُن کے علاوہ (بجز اصطلاحات کے) اور نئے نئے لفظوں کو فرہنگ و قاموس کی مدد سے گڑھ گڑھ کر اردو میں نہ لایا جائے، اور یا پھر یہ کہ ہندی کے جو لفظ اردو یا ہندوستانی میں بہ آسانی کھپ جانے والے ہوں، اُن کے لینے میں خواہ مخواہ ضد اور ہٹ کو کام میں نہ لایا جائے،

سید صاحب کو اُن کی زندگی کے صرف آخری ۵-۶ برسوں میں جنھوں نے دیکھا ہے، اور جن کی واقفیت اُن سے اسی زمانہ تک محدود ہے، وہ عجب نہیں کہ انھیں محض ایک "مقدس شیخ خانقاہ" سمجھ رہے ہوں، جس کے اوقات صرف اوراد و نوافل، اذکار و اشغال کے لئے وقف رہتے ہیں، اور جس کو شعر و شاعری، زبان و ادب کے نفیوں سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہوتا، ——— معتقدوں، مریدوں، اور مسترشدوں کی یہ رائے کتنی ہی اخلاص نیت پر مبنی ہو، غلط فہمی ہر حال میں غلط فہمی ہی ہے، سید صاحب اور جو کچھ بھی ہوں، (اور یقیناً وہ اور بہت کچھ تھے بھی) اُن کے اس مرتبۂ امتیاز سے کوئی انھیں محروم نہیں کر سکتا، کہ وہ ایک ادیب صاحب طرز تھے، اور طرز اُن کا شگفتہ و لطیف ایک انشا پرداز تھے، شوخ و ظریف نقاد تھے، گہری نظر رکھنے والے،

سخن سنج تھے، کھوٹے کھرے کے پرکھنے والے، لکھنوی نہ تھے، پر لکھنوی ہی تھے، اپنے استاد شبلی نعمانی ہی کی طرح بلکہ اُن سے بھی کچھ بڑھ کر، وطن ثانی بھی مثل وطن ہی کے ہو جاتا ہے، یہ اعتراف آپ خود اُن کی زبان سے سننا چاہتے ہیں، تو سنیئے، جنوری ۱۹۳۶ء میں وہ ہندوستانی اکیڈمی کے جلسہ سالانہ میں شعبہ اردو کے صدر منتخب ہوئے، خطبہ صدارت کے شروع ہی میں فرماتے ہیں:-

"......آپ کی اس ذرہ نوازی کی قدر اور بڑھ جاتی ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ مجھے اس اعزاز کی دولت اس سرزمین میں بخشی گئی، جو ہمیشہ سے علم و ادب کا گہوارہ اور بڑے بڑے ادیبوں اور عالموں کا مرکز ہے، خاکسار کو لکھنؤ سے وطن کی نسبت حاصل نہیں، لیکن گذشتہ ۳۶ برس سے مجھے اس سے جو علمی و تعلیمی تعلق رہا ہے، وہ وطن ہی کے مانند ہے، اسی کی گود میں میرے ہوش و تمیز کی آنکھیں کھلیں، اسی کے دامن میں میری تعلیم و تربیت ہوئی، اور اسی کی آب و ہوا میں میرا علمی و ادبی نشو و نما ہوا، اس لئے اس سرزمین کا ہر گوشہ میرے لئے وادی ایمن اور اس چمن زار کی ہر کیاری میرے لئے نظارہ فروز ہے"

خوش نصیب ہے وہ ماں جو ایسے جوہر قابل کو گود دے، مبارک ہے وہ فرزند جسے ایسی مادر مہربان کا آغوش نصیب ہو جائے ـــــ اعزاز و اکرام کی تالی دونوں ہی ہاتھ مل کر بجتی ہے،

نازاں منم کہ ہمچو توئی قدرداں من

نازاں توئی کہ ہمچو منے مدح خوانِ تو!

تنقید و تبصرہ کی بہار دیکھنا ہو تو اسی مجموعہ کے صفحہ ۲۶۴ سے لے کر ص ۴۹۹ تک کے موضوع سے ادبی مقدمات کی سیر کر جائیے نثر و نظم کی "۔۔ ادبی و شعری کتابوں پر مقدمے ہیں، جو کتابیں گمنام، غیر معروف یا دھندلی سی تھیں، وہ جب اس مسِ سلیمانی سے چمک اٹھی ہیں، اور جو پہلے ہی سے روشن و معروف تھیں ان میں اور چار چاند لگ گئے ہیں!

اکبر پر نقد و تبصرہ، داد و تحسین، آپ بہتوں کے قلم سے پڑھ چکے ہیں، اب ذرا دیکھئے کہ حضرت سلیمان

جب یہ ابنِ زہد و متانت اس پیکر شوخی و ظرافت کو اپنی بزم معارف میں لاتے ہیں، تو تعارف کس انداز سے کراتے ہیں، اور نقیب بن کر صدائیں کیا کیا لگاتے ہیں ـــــ "نقیب کی تنبیہ کسی معتقد کو گراں نہ گذرے، ذکر اکبرؔ کا ہے، اکبر اس وقت ۷۰ سال کے معمر و محترم بزرگ ہیں، اور مولانا ندوی اُن کے خردوں کے خرد، یعنی اُن کے صاحبزادہ سے بھی کم عمر۔

"ظرافت کا رنگ جو سید انشا اور سعادت علی خان کی بدولت لکھنؤ کی شاعری میں پیدا ہو گیا تھا اس کا مقصد محض تفریح طبع اور دل بہلانا تھا، ضلع جگت اور رعایت لفظی لکھنؤ کا خاص مذاق ہے، اس کا نتیجہ بھی صرف تفنن طبع تھا، لکھنؤ میں امانت اس اقلیم کا بادشاہ ہوا ہے، جانؔ صاحب کا رنگ گو زنانہ لہجہ میں اگر بدنما ہو گیا تھا تاہم اس کی بنیاد بھی محض تفریح طبع تھی، میر صاحب کا احسان ہے کہ انہوں نے سعدی، ابن یمین اور خیام کے مغز سخن کو امانت کے الفاظ میں اور سید انشا کی بولی میں اس طرح ادا کیا کہ وہ نہ صرف تفریح طبع اور واہ واہ کا سامان رہا، بلکہ اس کی تہ میں پند و موعظت، اخلاقی تعلیم، سیاسی نکتے، فلسفیانہ اسرار، مذہبی مسائل، اجتماعی مباحث نظر آنے لگے، سید انشا کے زمانہ کی سرکاری زبان فارسی اور ترکی تھی، وہ اسی شیرہ اور اقوام سے اپنا شربت تیار کرتے تھے، اب انگریزی سرکاری زبان ہے، میر صاحب اس بادہ افرنگی کی آمیزش سے ذوق کلام کو لطف دیتے ہیں .... میر صاحب اسی شیر و شکر میں پند و موعظت اور نصیحت گری کی ان تلخ دواؤں کا گھونٹ گلے سے اتار دیتے ہیں جن کو یوں پینا اس جدید دور ثقافت و نزہت پسندی میں ناممکن تھا، میر صاحب بھری محفل میں علمائے کرام، مشائخ عظام، امرا و حکام، مدعیان رہبری عام، اور نوجوان تعلیم یافتوں کا خاکہ اڑاتے ہیں، اور اُن کی چتون پر بل تک نہیں آتا" (ص ۱۶۵، ۱۶۶)

اور پھر چند صفحوں کے بعد :-

"جدید تہذیب کے دلدادہ، بے پردگی کے حامی اور عورتوں کو پبلک میں دیکھنے کے مشتاق ہیں، اُن

سمجھتے ہین کہ جو انگریزی نہ جانے، گویا وہ تعلیم سے عاری ہے، امیر صاحب اُن کے دعوی کی تشریح ان الفاظ مین کرتے ہین :-

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب وہ شمعِ بزم ہے پہلے چراغِ خانہ تھی

شمعِ بزم اور چراغِ خانہ کی تشبیہ مین کر عجب نہین کہ عورتون کی بے پردگی، اور انگریزی تعلیم کے مدعی چراغ پا ہو جائین؟

رخصت اے بزمِ شبلی کے مکین، بلکہ سرور بزم صدر اور چشم و چراغ، سلیمان ندوی رخصت! تو نے جہان ایک طرف الحاد و بے دینی کے بڑے بڑے سرکش و منہ زور جنات کو بوتلون مین بند کیا، وہین الفاظ و معانی کی کیسی کیسی لطیف پریان بھی شیشہ مین اتارتا رہا!!

سید صاحب کے پیش نظر

بعض اہم علمی کام

از

مولانا محمد اویس صاحب ندوی استاذ تفسیر دار العلوم ندوۃ العلماء

سید صاحب اس دنیا سے تشریف لے گئے، اور اپنے ساتھ علوم و معارف اور کمالات کا ایک خزانہ لے گئے، لیکن جو کچھ چھوڑ گئے ہین، وہ بھی کم نہین ہے، اُن کی تصنیفات، مقالات، خطبات، اور مکاتیب ایک گنج گرانمایہ کی حیثیت رکھتے ہین، موجودہ اور آیندہ نسلون کی دینی، اخلاقی، علمی، اور ذہنی رہنمائی کے لئے اس مین بڑا قیمتی سامان موجود ہے،

لیکن ان "الباقیات الصالحات" کے سوا سید صاحب کے سامنے کچھ اور بھی کام تھے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ کی جو باتین میرے علم مین ہین، اُن کو قلم بند کر دون، ممکن ہے کہ دوسرے حضرات کے پاس بھی اس سلسلہ کے کچھ معلومات ہون، اگر یہ سب چیزین جمع ہو جائین تو آیندہ کے کامون کا ایک خاکہ تیار ہو سکتا ہے، اور سید صاحب کے "حسنات" کا ایک نیا باب کھل سکتا ہے،

سید صاحب کو اسلامی علوم مین حقیقی شغف قرآن مجید سے تھا، آیاتِ قرآنی سے کلامی، فقہی، اخلاقی، اور سیاسیاتِ اسلامی کے مسائل کا استنباط، اس کے ادبی لطائف کی تشریح و توضیح، اور تاریخی مباحث کی تحقیق اُن کی زندگی کا دلچسپ موضوع تھا، ارض القرآن، اور سیرۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ضخیم جلدین، اُن کے اس مذاق کی شاہد عادل ہین،

سید صاحبؒ کے ذہن میں عصری مذاق کے مطابق قرآن مجید کے مسائل کی ترتیب و تدوین کا ایک نقشہ تھا،
وہ چاہتے تھے کہ اصول کی رعایت کرتے ہوئے، دیانت اور ذہن کی سلامتی کے ساتھ "آیاتِ قرآنیہ پر
غور کیا جائے" اور ان آیات سے جن کلامی فقہی، اخلاقی اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی مسائل کا استنباط
ہو سکے، ان کو احادیثِ نبویہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نیز صحابہؓ و تابعینؒ اور سلف صالحینؒ کی تشریحات کے ساتھ
الگ الگ مرتب کیا جائے"!

یہ تجویز بظاہر بہت مختصر معلوم ہوتی ہے لیکن اگر اس کو عملی جامہ پہنایا جائے تو پورا ایک ادارہ اس کام
میں لگ سکتا ہے، اسلامی علوم میں مفید ترین کتابوں کا اضافہ اور اسلامی نظریات کو سمجھنے کے لئے بہترین مواد
جمع ہو سکتا ہے!

سید صاحبؒ نے عقائد القرآن اور فقہ القرآن کے نام سے اس سلسلہ میں دو عنوان قائم فرما کر
کچھ کام بھی شروع کر دیا تھا، فقہ القرآن کے لئے راقم سطور سے قرآن مجید کی آیاتِ احکام کو جمع کرایا تھا، جو
میرے پاس موجود ہیں،

دوسرے محققین کی طرح سید صاحبؒ کا خیال تھا کہ آیاتِ قرآنی کی حیثیت کلیات کی ہے، اور احادیثِ
نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) انہی کلیات کی تشریح ہیں، اس سلسلہ میں سید صاحب کی رائے تھی کہ قرآن مجید نیز
ذخیرۂ احادیث کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا جائے، اور ارشاداتِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو انہی کلیات
کے ماتحت جمع کیا جائے، اس موضوع سے متعلق سید صاحبؒ نے اپنی یادداشت کی کاپی میں دو عنوانات قائم
فرمائے تھے، پہلا عنوان یہ ہے:

"الآیات التی استدل بها النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی ما قاله"

اس عنوان کے تحت میں سید صاحبؒ نے ۱۵ استدلالاتِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جمع فرمایا تھا، مثال
کے طور پر چند ملاحظہ ہوں،

(۱) فضل العالم علی العابد کفضلی علی ادناکم ثم تلا انما یخشی اللہ من عبادہ
العلماء (ترمذی تفسیر)

(۲) فلما قضی الصلوٰۃ قال من نسی الصلوٰۃ فلیصلها اذا ذکرها فان اللہ تعالیٰ
قال اقم الصلوٰۃ لذکری (ابوداؤد)

(۳) نهانا عن الاستخصاء ثم قرء علینا، یا ایها الذین آمنوا لا تحرموا طیبات
ما احل اللہ لکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین، (بخاری)

(۴) ان اللہ یملی الظالم ثم قراء وکذالک اخذ ربک اذا اخذ القری و
ہی ظالمة . (مسلم)

دوسرا عنوان یہ ہے،

القسم الثانی من الاحادیث التی تفسر القرآن بغیر ذکر القرآن،

اس عنوان کے تحت میں سید صاحب نے ۲۰ احادیث کو جمع فرمایا تھا، اس کی مثالیں ملاحظہ ہوں،

(۱) ایاکم والظن (مسلم) ان بعض الظن اثم،

(۲) انما ہی اعمالکم ترد علیکم ولا تجزون الا ما کنتم تعملون،

(۳) انفق ینفق علیک - وما انفقتم من شیء فهو یخلفه

دوسرے علماء نے بھی اس عنوان سے دلچسپی ظاہر فرمائی ہے، مثلاً صاحب روح المعانی کا خیال ہے کہ حدیث
اللّٰهم من احییته منا فاحیه علی الاسلام ومن توفیته منا فتوفه علی الایمان
آیت ولا تموتن الا وانتم مسلمون سے ہے[۱]، اسی طرح حضرت مولانا انور شاہ صاحب فرماتے ہیں:
ولکن منکم امة یدعون الی الخیر الآیة استنبط منه حدیثه صلی اللہ علیہ وسلم،

---

[۱] روح المعانی ج ۴ ص ۱۶،

لا تزال طائفۃ من امتی ظاہرین علی الحق وحدیثہ صلی اللہ وسلم والجہاد ماض الی یوم القیامۃ[۱]

ان عنوانات کو پورا کرنا کچھ آسان کام نہیں ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ بڑی اہم اور مفید خدمت ہوگی، اور اگر اس موضوع پر کچھ کام کر ڈالا جائے، تو اپنے طرز کی نئی چیز ہوگی،

ان اہم اور بنیادی کاموں کے سوا قرآن مجید کے سلسلہ میں سید صاحبؒ کے پیش نظر حسب ذیل کام بھی تھے، ان میں سے بعض سید صاحب کی نگرانی میں انجام پا چکے ہیں، مگر ابھی ان کی طباعت کی نوبت نہیں آئی ہے،

(۱) دار المصنفین کے کتب خانہ میں الفوز الکبیر کا ایک قلمی نسخہ ہے، جس میں شاہ صاحبؒ کے حواشی قرآن مجید اور اصول ترجمۂ قرآن مجید کا رسالہ بھی ہے، سید صاحب کی خواہش تھی کہ اس کو شائع کیا جائے،

(۲) قرآن مجید میں کائنات کی مختلف چیزوں کو بطور "آیاتِ الٰہی" کے پیش کیا گیا ہے، سید صاحبؒ کا خیال تھا کہ ان تمام آیات کو الگ الگ عنوانات کے ماتحت جمع کیا جائے، اور جن چیزوں کو بطور آیات کے پیش کیا گیا ہے، اُن کے متعلق قدیم و جدید ماخذ سے ایسے معلومات کو جمع کر دیا جائے، جن سے ان آیاتِ الٰہی کے آیت (یعنی نشانی) ہونے کی حیثیت اور حقیقت واضح ہو جائے، سید صاحبؒ نے ان آیات کو عنوانات کے ماتحت جمع کرایا تھا، اُن کی تشریح کا، کام باقی ہے،!

(۳) سید صاحب کا خیال تھا کہ معانی و بلاغت نیز دوسری کتابوں میں مسائل کی تشریح کے ضمن میں قرآن مجید کے لطائفِ ادبیہ کو واضح کیا گیا ہے، اگر آیاتِ متعلقہ کو عنوان بنا کر ان سب کو سورتوں کی ترتیب کے ساتھ جمع کر دیا جائے، تو قرآن مجید پر ادبی حیثیت سے غور کرنے والوں کے لئے ایک مفید خدمت ہوگی، بحمد للہ دو جلدوں میں یہ کام پورا ہوا،

---

[۱] مشکلات القرآن ص ۱۹۰،

(۴) قرآن مجید کے اعجاز کا مسئلہ قرآنی علوم میں جو اہمیت رکھتا ہے، وہ ظاہر ہے، ہر عہد میں مختلف حیثیتوں سے اس پر کلام کیا گیا ہے، مسلمانوں کے عہدِ تصنیف سے لیکر اس وقت تک اس موضوع پر جو کچھ بھی لکھا گیا ہے، اس کو سنین کی ترتیب کے اعتبار سے سید صاحب نے جمع کرایا، یہ مجموعہ ایک جلد میں تیار ہوا ہے، جس کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے اپنے زمانہ میں لوگوں نے کن کن نوعیتوں سے اس مسئلہ پر غور کیا ہے،

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کی الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، سید صاحب کی نگاہوں میں بہت اہمیت رکھتی تھی، مگر ان کے نزدیک اس کی حیثیت متن کی تھی، اس لئے وہ چاہتے تھے کہ اس کا تحشیہ کیا جائے، یعنی شاہ صاحب کے ارشادات کو آیاتِ قرآنی سے مدلل کیا جائے، نیز اُن کے بیانات کی دوسرے محققین کی کتابوں سے توثیق کی جائے، اس سلسلہ میں بھی تھوڑا کام ہو چکا ہے،!

دار المصنفین کے زمانۂ قیام میں سید صاحبؒ نے مجھ سے اسلام کے نظام کاشتکاری، اور کتبِ فقہ سے زراعت و آب پاشی کے مسائل کو اُردو میں مرتب کرنے کے لئے فرمایا، میں نے کام شروع کر دیا، اسی زمانہ میں سید صاحب تھانہ بھون تشریف لے گئے، وہاں مولانا تھانویؒ سے اس کا ذکر آیا، اور رائے یہ قرار پائی کہ شروع سے پورے سلسلۂ فقہ کو اردو میں مدون کر دیا جائے، تاکہ اردو داں طبقہ کے ہاتھ میں ایسا مجموعہ آجائے جو روزمرہ کی ضروریات میں اُن کے لئے کافی ہو، سید صاحبؒ نے تھانہ بھون سے تشریف لاکر اس تجویز کا ذکر فرمایا، اور ارشاد فرمایا کہ اب کتاب الطہارۃ سے کام کو شروع کرو، اس کی تعمیل شروع کر دی گئی، مگر اس کے بعد ہی دار العلوم ندوہ چلا آیا، اور سید صاحب قبلہ بحیثیت قاضی القضاۃ بھوپال تشریف لے گئے، وہاں پہنچ کر سید صاحب کو اس سلسلہ کی تکمیل کی اور ضرورت محسوس ہوئی، اور بار بار خطوط میں اس سلسلہ کی تکمیل کی تاکید فرماتے رہے، میں نے کتاب الطہارۃ کو ایک جلد میں مکمل کر کے بھوپال ارسالِ خدمت کیا، تو بھوپال کے بعض علماء سے اس پر تقریظیں لکھا کر واپس فرمایا اور دوسری جلد کا کام شروع کرنے کی تاکید فرمائی مگر افسوس کہ پہلی جلد سے کام آگے نہ بڑھ سکا، سید صاحبؒ کو اس سلسلہ کی تکمیل کا بیحد خیال تھا، وفات سے چند ماہ پیشتر جب ہندوستان تشریف لائے تھے تو بار بار فرماتے

تھے کہ اس وقت نئے نئے مسائل سامنے آ رہے ہیں، اور ایسے علماء کی ضرورت ہے جو ان مسائل کی تشفی بخش
جواب دے سکیں، اس لئے فقہ کی تعلیم پر بہت توجہ کرنا چاہئے، دار العلوم کے طلبہ کے سامنے جو تقریر فرمائی تھی
اس میں بھی اس پر زور دیا تھا، بہرحال اردو میں فقہ اسلامی کی تدوین کی تجویز اہمیت رکھتی ہے، اور یہ کرنیکا کام ہے
ہندوستان کے گذشتہ اور موجودہ علماء کے حالات کے جمع و ترتیب کا کام بھی سید صاحب کے پیش نظر تھا،
اسی خیال سے معارف میں وفیات کا عنوان قائم فرمایا تھا، ارشاد فرماتے تھے کہ آیندہ مورخ کو اس سے بڑی
مدد ملے گی،!

نواب صدیق حسن خان صاحب مرحوم کے کتب خانہ میں ہندوستان کے گذشتہ علماء کے حالات پر کچھ قلمی
مسودات فارسی زبان میں تھے، سید صاحب ان مسودات کو دار المصنفین لائے، ان کو صاف کرایا، مبیضہ کو
اصل سے مطابقت کا کام میرے سپرد فرمایا، اسی زمانہ میں مجھ کو ملا جیونؒ امیٹھوی کی خودنوشت سوانحعمری
کا ایک قلمی نسخہ ملا، گو اس کو خودنوشت کہنا آسان نہیں ہے، بہرحال میں نے سید صاحب کو دکھلایا، سید صاحب
نے اس کو بھی نقل کرایا، اور اسی مجموعہ میں شامل کرایا، ان کا خیال تھا کہ یہ مجموعہ شائع کر دیا جائے، میں نے [illegible]
مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی ناظم دار المصنفین سے اس مجموعہ کے متعلق دریافت کیا تھا، مگر وہ
فرماتے تھے کہ دار المصنفین میں موجود نہیں ہے، خدا کرے یہ مجموعہ محفوظ ہو، اگر کبھی اس کی اشاعت کی نوبت آئی
تو ایک تاریخی خدمت ہوگی،

سید صاحب نے ایک بار میبذی پڑھاتے وقت ارشاد فرمایا تھا کہ مسلمان فلاسفہ نے طبیعیات کے سلسلہ
میں جن عملی تجربات کا ذکر کتابوں میں کیا ہے، اگر ان سب کو جمع کر دیا جائے، تو ان علماء کی اس سلسلہ کی
خدمات پر روشنی پڑ سکتی ہے،!

اسی طرح منطق کے سلسلہ میں سید صاحب کا خیال تھا، کہ مسلمانوں نے فن منطق میں جو اضافے کئے ہیں ان کے
متعلق بھی مفصل طور سے لکھا جائے،!

آخر میں سید صاحب کی ایک خواہش کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جس کا تعلق خود اُن کی تصانیف سے ہے اور
جس سے ان کے تصنیفی احتیاط کا اندازہ ہوتا ہے، وہ خواہش یہ تھی کہ اُن کی تصانیف بالخصوص سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم
پر اہل علم نظر ثانی کا کام کیا جائے، اپنے بعض شاگردوں سے زبانی اور خطوط میں اس کا ذکر فرمایا، گو صرف
عقیدۃً ہی نہیں بلکہ حقیقۃً سید صاحب کا قلم خود اس قدر محتاط تھا کہ اُن کی تصانیف پر خصوصی طور سے نظر ثانی کی ضرورت
نہیں ہے، لیکن اُن کی یہ خواہش اُن کی عالی ظرفی، وسعت نظری، تلاش حق کی فکر، اور مسائل دینیہ میں انتہائی
ورع و احتیاط کی کھلی ہوئی دلیل ہے، شاید عام طور سے لوگوں کو نہ معلوم ہوگا، کہ دار المصنفین میں جب سیرۃ
کی کوئی جلد چھپتی تھی، تو پہلا اڈیشن بڑی تقطیع پر چھپتا تھا، اور اس کے دو ڈھائی سال کے بعد چھوٹی تقطیع والا
اڈیشن چھپتا تھا، یہ تاخیر صرف سید صاحب کی احتیاط کی وجہ سے ہوتی تھی، وہ چاہتے تھے کہ پہلا اڈیشن اصحاب
علم اور اہل نظر کی نگاہوں سے گذر جائے، اُن کی تنقید کا حال معلوم ہو جائے، تب دوسرا اڈیشن چھاپا جائے،
تاکہ اس نئے اڈیشن میں تصحیح وغیرہ کا موقع مل جائے، اللہ تعالیٰ عام مصنفین کو اسی فضل و کمال اور رسوخ علم
کے ساتھ یہی احتیاط نصیب فرمائیں، آمین،

تحریک ندوۃ العلماء اور سید صاحب

از

جناب مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی رفیق دارالمصنفین

اٹھارہوین اور انیسوین صدی کا جو زمانہ یورپ کی تاریخ کا سب سے زرین دور شمار ہوتا ہے، وہی مسلمانون کی تاریخ کا سب سے تاریک اور مظلم دور ہے، یورپ اس زمانہ مین اپنی ترقی کے نقطۂ عروج تک پہنچ رہا تھا، اور اسلامی ممالک زوال کے آخری نقطے تک گر کر موت کی ہچکیان لے رہے تھے، دنیا کی سیاسی و تمدنی قیادت کی وہ باگ جو ایک ہزار برس سے اُن کے ہاتھون مین تھی یورپ کے ہاتھون مین جا رہی تھی، اور یہ موت کا سنبھالا لے کر یکے بعد دیگرے اپنی قیادت کی زندگی سے محروم ہو رہے تھے، یا محروم کئے جا رہے تھے، یورپ غالب ہو رہا تھا، اور یہ محکوم و مغلوب ہو رہے تھے،

مسلمانون کا یہ زوال کوئی اتفاقی واقعہ نہین تھا، جو اچانک پیش آگیا ہو، بلکہ اپنے پیچھے اسباب زوال کی ایک لمبی تاریخ رکھتا ہے، اسی طرح یورپ کا یہ غلبہ اور عروج محض کوئی ہنگامی سیاسی تغلب نہین تھا، جو یکایک اُسے حاصل ہو گیا ہو، بلکہ اس کے جلو مین ایک جدید تمدن، ایک جدید فلسفہ، علم و فن، ایجاد و اختراع کی ہمہ گیر قوت اور سیرت و کردار کی ایک نئی طاقت تھی، جو اُس نے برسون کی محنت اور جانفشانی کے بعد فراہم کی تھی، یہی وجہ ہے کہ اس کے اثرات جہان پڑے، وہان اُس کو محض سیاسی و معاشی غلبہ ہی حاصل نہین ہوا، بلکہ ان سے وہان کی تہذیب و تمدن، علم و فن اور فکر و عمل کے تمام گوشے متاثر ہوئے، اور

اس غلبہ کا اثر یون تو ساری دنیا پر پڑا، مگر اس کا شکار سب سے زیادہ اسلامی ممالک ہوئے، ہندوستان مین اہل یورپ کے معاشی اور کہین کہین سیاسی اثرات تو اٹھارہوین صدی کے آخر سے پڑنا شروع ہو گئے تھے، تاہم ابھی تک یہان ایک نام نہاد مرکزی حکومت باقی تھی، جو عام ہندوستانیون اور خاص طور سے مسلمانون کی امیدون کا آخری سہارا تھی، لیکن جب ۱۸۵۷ء مین انگریزون نے اس پر بھی قبضہ کر لیا، اور یہ آخری سہارا بھی جاتا رہا، تو یہان کے عام باشندون مین شکست خوردگی اور انتشار ذہنی کی عجیب کیفیت پیدا ہوئی،

تحریک ندوۃ العلماء کا پس منظر

مسلمانون پر اس نئی صورتِ حال کا ردِ عمل دو طرح سے ہوا، ایک گروہ نئے انقلاب کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرنے مین لگ گیا، اور دوسرا گروہ اپنے اسلاف کے چھوڑے ہوئے سرمایہ کی حفاظت مین مشغول ہو گیا،

پہلے گروہ کا نقطۂ نظر زندگی کے ہر شعبہ مین سراسر نقل و تقلید تھا، اس لئے اس سے جو لوگ متاثر ہوئے وہ آہستہ آہستہ سیاست، معیشت، تہذیب، تمدن، معاشرت، اخلاق حتی کہ دین و مذہب کے بارے مین بھی اُن کا وہی نظریہ بن گیا، جو حکمران قوم کا تھا، اس سے کچھ نہ کچھ مادی فوائد ضرور حاصل ہوئے، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ اس طرزِ عمل کی بدولت ہمارا تصور دین بدلا، تصور اخلاق بدلا، فلسفۂ زندگی بدلا، اور ہماری تہذیب کی بنیادین متزلزل ہو گئین،

دوسرے گروہ کا ردِ عمل اس کے بالکل برعکس ہوا، پہلا گروہ اگر آنے والے سیلاب مین بہ نکلا، تو دوسرا گروہ جمود کی چٹان بن کر بیٹھ گیا، اس نے کوشش کی کہ علم و مذہب اور اخلاق و معاشرت اور روایات کی اس پوری میراث کو جو اٹھارہوین صدی کے لوگون نے چھوڑی، اور انیسوین صدی کے لوگون نے پائی تھی جون کا تون باقی رکھا جائے، اور نئی فاتح قوم کا نہ کوئی اثر قبول کیا جائے، اور نہ اس کے سمجھنے مین اپنا وقت ضائع کیا جائے، انھون نے ایک لمحہ کے لئے بھی اس پر غور نہین کیا، کہ اگلون کی میراث کا تجزیہ کرکے دیکھین کہ اس مین کیا چیز باقی رکھنے کی، اور کیا بدلنے کے لائق ہے، اور نہ اس کی جانب توجہ کی کہ جدید تہذیب سے کیا لینے کے

قابل ہے، اور کیا چھوڑنے کے قابل ہے، اس کے بجائے انھون نے اپنا سارا زور پہلی حالت کے باقی رکھنے پر صرف کیا، ان کا نصاب، وطریقۂ تعلیم، ان کے مشاغل، ان کے مسائل، ان کا انداز فکر اور طریق کار سب کا وہی تھا جو ایک صدی پہلے تھا، الا ماشاء اللہ،

اس کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ہمارے بزرگون نے دین واخلاق کی جو میراث چھوڑی تھی، کچھ لوگ اس کو سنبھال کر بیٹھ گئے، اور آیندہ نسلون کو منتقل کرنے لگے، اور آج قرآن وسنت کا جو علم ہمارے پاس باقی رہ گیا ہے وہ ان ہی کی بدولت رہ گیا ہے، مگر اس گروہ کے طرز عمل سے کچھ نقصانات بھی ہوئے،

انیسوین صدی کے آخر مین قریب قریب پورے ہندوستان مین یہی صورت حال رونما تھی، کہ ایک طرف جدید گروہ تھا جس مین ایک ولولہ اور جوش تھا، اور جس کا اثر ورسوخ دن بدن بڑھتا جا رہا تھا، دوسری طرف ہمارا قدیم گروہ تھا جو اپنی موجودہ حالت پر بڑی حد تک قانع تھا، اور جس کا حلقۂ اثر روز بروز گھٹتا اور سمٹتا جا رہا تھا، ان دونون گروہون کے طرز عمل کے اس اختلاف اور اس مین افراط وتفریط کی وجہ سے ان مین اجنبیت وبیگانگی کی ایک ایسی خلیج حائل ہو گئی، کہ دونون کا ایک جگہ جمع ہونا اور دونون سے بیک وقت تعلق قائم رکھنا بھی دشوار ہو گیا، نہ عام مذہبی طبقہ نے یہ ضرورت محسوس کی کہ جدید تعلیم کے فوائد سے بہرہ مند ہونا چاہیے، بلکہ وہ اس کو الحاد وزندقہ قرار دے رہا تھا، اور نہ جدید تعلیم یافتہ گروہ نے اس بات کی کمی محسوس کی، کہ علم دین حاصل کرنے کے لئے اہل دین کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہے، بلکہ وہ اس کو قدامت پرستی اور تنگ نظری سمجھتا تھا،

قدیم وجدید کی اس کشمکش کے علاوہ خود مذہبی گروہ بھی آپس مین متفق ومتحد نہین تھے، بلکہ وہ مختلف جماعتون مین بٹے ہوئے تھے، اور ہر جماعت دوسری جماعت کو گمراہ سمجھتی تھی، ان کا آپس مین ایک جگہ جمع ہونا، اور ایک دوسرے کے پیچھے چلنا نا ممکن ہو گیا تھا، یہان تک کہ کتنی جگہ انھون نے خانۂ خدا کو بھی تقسیم کر لیا تھا، جن کے آثار کہین کہین اب بھی باقی ہین، اس صورت حال کی وجہ سے مسلمان تو قدیم وجدید کی تفریق کے ساتھ دوسری

بہت سی تقسیمون اور تفرقون کا شکار ہو رہی تھی،

مگر اس اختلاف وپراگندگی کے دور مین بھی قوم مین بعض ایسے عاقبت اندیش اور اعتدال پسند افراد موجود تھے، جو اس اختلاف کو قومی ودینی حیثیت سے سخت مضر سمجھتے تھے، ان کے خیال مین مسلمانون کے لئے نہ تو جدید طبقہ کی مرعوبانہ اور خالص ترقی پسندانہ ذہنیت بالکلیہ مفید تھی، اور نہ قدیم گروہ کا جمود وتعطل، تعصب وتحزب، اور جدید تعلیم سے گریز سود مند تھا، مگر ان طبقون مین اختلاف کی خلیج اتنی وسیع ہو چکی تھی، کہ اس کا پاٹنا اور ان کو کسی ایک مقصد پر متحد کرنا آسان نہین تھا، اس لئے پہلے انھون نے ایسے تمام لوگون کو جو موجودہ صورت حال کو بدلنے اور اس کی اصلاح کا جذبہ رکھتے تھے، ایک مرکز پر جمع کرنے کی کوشش کی، تاکہ انہی کے ذریعہ موجودہ فضا کو بدلنے اور قدیم وجدید اور مذہبی گروہی عصبیت کو مٹانے کا کام انجام دیا جائے، اسی اعتدال پسندانہ اور جامع تخیل کی صورت گری سنہ ۱۸۹۲ء مین کانپور مین مجلس ندوۃ العلماء کی شکل مین ہوئی،

اس مجلس نے جب اس تخیل اور مقاصد کو مسلمانون کے سامنے پیش کیا تو ابتدا مین بعض جماعتون خصوصاً قدیم مذہبی طبقہ کی طرف سے اس کی شدید مخالفت ہوئی، مگر اس کے باوجود قوم کے عاقبت اندیش، اور دردمند اور اعتدال پسندانہ عناصر خواہ ان کا تعلق کسی گروہ اور کسی فرقہ سے رہا ہو، اس آواز پر کھنچ آئے، اور دو برس کے بعد ہی سنہ ۱۸۹۴ء مین یہ منظر دیکھنے مین آیا، کہ مختلف الخیال اور متضاد عناصر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر دین وملت کے تحفظ کی تدبیرین سوچنے لگے، اور اجنبی حکومت کی وجہ سے جو نئی صورت حال اور مشکلین پیدا ہو گئی تھین، ان کے حل کرنے کے منصوبے بنائے،

دار العلوم ندوۃ العلماء

اس مجلس نے اپنے وسیع اور ہمہ گیر تخیل کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جو تدبیرین اختیار کین، ان مین ایک یہ بھی تھی کہ ایک ایسی درسگاہ کھولی جائے جس کا طریقۂ تعلیم اور نصاب تعلیم قدیم وجدید کی خامیون سے پاک اور ان کی خوبیون کا جامع ہو، تاکہ اس سے جو افراد تعلیم پاکر نکلین، وہ قوم کے اندر اس جامع تخیل کا احساس پیدا کر سکین جس کی اس وقت ضرورت تھی، اور جس کے لئے مجلس ندوۃ العلماء کا قیام عمل مین آیا ہے، چنانچہ

اسی تجویز کے تحت لکھنؤ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نام سے ایک درس گاہ کا قیام عمل میں آیا، اسی جامع تخیل و ندوۃ العلماء کے گوہر شب چراغ علامہ سید **سلیمان** ندوی رحمۃ اللہ علیہ تھے،

اس وقت مجلس ندوۃ العلماء کا منظر محض ایک عربی درسگاہ رہ گئی ہے، مگر جس زمانہ میں یہ مجلس قائم ہوئی تھی اسوقت مستقلاً ایک نئی تحریک دعوت اور قدیم وجدید کی جامعیت کا ایک نشان تھی، اس کے پلیٹ فارم سے دین وملت کے بیسیوں مسئلے طے ہوئے تھے،

درس گاہ کے قیام کے بعد بھی بہت دنوں تک یہ مجلس اپنی اصلی ہیئت میں باقی رہی، مگر آہستہ آہستہ اس کی تحریکی حیثیت ختم ہوتی گئی، اور اس کے ارباب بست وکشاد کی ساری توجہ اس درس گاہ تک محدود ہو کر رہ گئی، اس میں شک نہیں کہ اس درس گاہ نے تحریک کی جامعیت اور اس کی ہمہ گیری کو کسی نہ کسی حد تک باقی رکھا، اور اس کے تخیل کو عملی جامہ پہنایا، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ درس گاہ درس گاہ ہوتی ہے، اور تحریک تحریک، درس گاہ کا اثر محدود ہوتا ہے، اور تحریک کا اثر ہمہ گیر اور وسیع ہوتا ہے، لیکن پھر بھی اس درس گاہ کے نونہالوں نے مسلم قوم کے ہر طبقہ کے فکر وعمل میں جو انقلاب جو حرکت اور جو اعتدال و توازن پیدا کیا، اسکو بھلایا نہیں جا سکتا،

آج ہم جس شخصیت کا ذکر کر رہے ہیں، وہ اسی مادرِ علمی کا پروردہ اور اسی دانشکدہ علم وفن کا گل سرسبد تھا، اور یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر دارالعلوم ندوۃ العلماء کی آغوش سے محض ایک سید سلیمان ندوی ہی کی شخصیت پیدا ہوئی تھی، تو بھی ہم اس تحریک کو ناکامیاب نہیں کہہ سکتے تھے، مگر اس نے تو ملک کے اندر اور ملک سے باہر اتنے نشانات چھوڑے ہیں کہ ان کے ذریعہ دین وملت کے کتنے راہرو منزلِ مقصود کا پتہ پا رہے ہیں،

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تقریباً نصف صدی تک، ندوہ کی جامعیت، ہمہ گیری اور اعتدال پسندی کو محض زندہ رکھا، بلکہ اس میں اور وسعت دی، قدیم وجدید کی تفریق اور علماء کی گروہی عصبیت کو مٹانے اور ان کو باہم شیر وشکر کرنے میں پورے اخلاص کے ساتھ حصہ لیا، اور اس میں سب سے زیادہ کامیاب ہوئے، اور اسلام اور اسلامی تمدن وتاریخ پر جو داخلی اور خارجی حملے کئے جا رہے تھے، ان کی روک تھام کیلئے ندوہ نے جو

...خلی اور خارجی حملے کئے جا رہے تھے، اُن کی روک تھام کے لئے ندوہ نے جو پروگرام بنایا تھا، اسے سید صاحب نے ایجابی و سلبی دونوں حیثیتوں سے پورا کیا، یعنی انھوں نے ان حملوں کا جواب بھی دیا، اور اسلامی مسائل کی ایسی صحیح اور دلنشین تشریح کی کہ حملہ کرنے والوں کی ہمتیں چھوٹ گئیں، اور کتنے تائب ہو کر اسلام کے گرویدہ ہو گئے،

سید صاحب کی شخصیت ملک وقوم کے مختلف الخیال عناصر کا ایک سنگم تھی، جہاں مختلف دھارے آکر مل جاتے تھے، اُن کی ذات پر ہر حلقے، ہر طبقے اور ہر گروہ کو اعتماد تھا، ندوہ کی سالانہ مجلس جب تک ہوتی رہی اس میں ہر مکتب خیال کے لوگ اکٹھا ہوتے رہے، مگر اس مجلس کے برہم ہونے کے بعد علماء میں صرف ایک سید صاحب ہی کی ذات تھی جہاں یہ عناصر جمع ہو سکتے، ہر طبقہ کے لوگ ان پر یکساں اعتماد کرتے، اور اُن کو اپنی مشترک علمی و دینی اور سیاسی مجلسوں کا صدر نشین بناتے تھے،

تحریک ندوۃ العلماء کے پیش نظر جو مقاصد تھے، مختصراً ان کا تذکرہ کرنے کے بعد اُن کی روشنی میں سید صاحب کے کارناموں کی تفصیل کی جائے گی،

ان مقاصد کی تفصیل علامہ شبلی کی زبان سے سنیئے جنھوں نے ندوہ کے قالب میں نئی روح پیدا کی،

جب دارالعلوم ندوۃ العلماء کی نئی عمارت مبنی شروع ہوئی، اور اس کی دیوارین کچھ بلند ہو گئیں تو علامہ شبلی پر اپنے لگائے ہوئے پودے کو پھولتا پھلتا دیکھ کر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی، اور ایک دن تمام طلبہ کو لے کر عمارت کے پاس گئے، جو کمرہ تفسیر قرآن کے لئے تعمیر ہو رہا تھا، وہاں سے مزدوروں کو ہٹا دیا، اور طلبہ کے ساتھ اپنے ہاتھوں سے کچھ دیر اینٹیں، گارا اور چونا ڈھوتے رہے، اسکے بعد طلبہ کو جمع کر کے ایک تقریر کی جس کے آخر میں انھوں نے بڑے الحاح وزاری کے ساتھ یہ دعا کی،

"اے خدا یہ چند ناتوان، کم حیثیت، کم مایہ بچے تیرے گھر میں مزدوری کرنے آئے ہیں، ان کی مزدوری قبول کر، مغربی خیالات کا سیلاب مسلمانوں کو اپنی رو میں بہائے جاتا ہے جن کے ساتھ اُن کی مذہبی حالت، مذہبی علوم، مذہبی شعائر، سب اس طوفان کی زد میں ہیں، اے خدا! ان

چند ناتوان بچوں کا دعویٰ ہے کہ وہ اس سیلاب کی ٹکر کو سنبھالیں گے، یہ بہت بڑا دعویٰ ہے جو ان کے چہرہ پر نہیں کھلتا تو ہی ہر جواں کی آبرو رہ جائے"

علامہ شبلی جن ناتوان بچوں کو لے کر مزدوری کے لئے گئے تھے، اور جن کے لئے انھوں نے خدا کی بارگاہ میں یہ دعا مانگی تھی کہ ان کو مغربی سیلاب کے مقابلہ کے لائق بنا، ان میں ایک سید سلیمان ندوی بھی تھے،

یہ پُر درد اور پُرسوز دعا اس گھر کے پاس مانگی گئی تھی، جو کلام الٰہی کی تفسیر کے لئے تعمیر ہو رہا تھا، جو اس بات کی علامت تھی کہ مغربی سیلاب کے روکنے کے لئے نونہالانِ ندوہ جو بھی کوشش کریں گے، اس کی بنیاد کتاب اللہ پر ہوگی، چنانچہ سید صاحب نے اپنی تمام علمی سرگرمیوں میں اس کو ہمیشہ پیش نظر رکھا،

اوپر ذکر آچکا ہے کہ ندوہ نے نہ تو جدید گروہ کی راہ عمل اختیار کی تھی، اور نہ قدیم گروہ کی، اس لئے شروع میں اس کی شدید مخالفت ہوئی، علامہ شبلی نے اس کے جواب میں بہت سے مضامین لکھے، اور اپنا نقطۂ نظر نہایت سنجیدگی سے سمجھایا، ۱۹۰۵ء میں الندوہ میں ندوہ کی تعلیمی پالیسی پر ایک مضمون لکھا جس کے آخر میں لکھتے ہیں:

"ہم نے بار بار کہا ہے، اور پھر یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے لئے نہ صرف انگریزی مدرسوں کی تعلیم کافی ہے، نہ قدیم عربی مدرسوں کی، ہمارے درد کا علاج ایک معجون مرکب ہے، جس کا ایک جزء مشرقی اور دوسرا مغربی ہو"

جب ندوہ کی چند سالہ کوششوں سے اس کے نتائج نگاہ کے سامنے آئے تو علماء کو جدید تعلیم کی ضرورت کا کسی قدر احساس ہو گیا، مگر جدید حلقہ میں دینی تعلیم کی ضرورت کا احساس ابھی پیدا نہیں ہوسکا تھا، علامہ شبلی نے اس کے لئے ایک طویل مضمون لکھا جس میں حسب ذیل سوالات قائم کئے، اور پھر خود ہی ان کے جوابات دیئے،

(۱) جدید تعلیم کی ضرورت ہے یا نہیں؟ (۲) قدیم تعلیم کی ضرورت ہے یا نہیں؟

پہلے سوال کے جواب میں اب اختلاف نہیں رہا، اگر کسی کو ہو تو اس سے خطاب کرنے کی ضرورت نہیں،

دوسرے سوال کا جواب جدید گروہ کے ذہن میں دفعۃً نفی کی صورت میں آئے گا، لیکن ذرا غور سے کام لینا چاہئے، اور پہلے ان سوالات کا جواب دینا چاہئے،

(۱) کیا مسلمانوں کی قومیت مذہب کے سوا اور کچھ ہے؟

(۲) اگر نہیں ہے تو مذہب کے قیام کے بغیر ان کی قومیت کیونکر قائم رہے گی؟

(۳) اگر مذہب کی ضرورت ہے، تو مذہبی تعلیم قدیم تعلیم کے بغیر کیونکر قائم رہے گی؟

شاید یہ کہا جائے کہ انگریزی تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم بقدر ضرورت ممکن ہے، اور اسی قدر کافی ہے لیکن کیا صرف اسی قدر تعلیم سے قرآن و حدیث کی حفاظت ہو سکتی ہے؟ کیا اس درجہ کے تعلیم یافتہ اسلامی مشکل مسائل کی تشریح کر سکتے ہیں، کیا غیر مذہب والے مذہب اسلام .... جو اعتراضات کرتے ہیں ان کے مقابلہ کے لئے اتنی تعلیم کافی ہے،؟

اس کے بعد قدیم و جدید دونوں طریقۂ تعلیم پر تنقید کر کے آخر میں لکھتے ہیں،

"دونوں گروہ اب قوم کے ضروری اجزاء ہیں.... دونوں کو آپس میں دست و بازو ہو کر کام کرنا چاہئے،

"علماء کے جس گروہ نے جدید ضرورتوں کا اندازہ کیا ہے، اور اس کے موافق عربی تعلیم میں اصلاح و اضافہ چاہتے ہیں، وہ ان اصولوں کے سوا اور کیا اختیار کر سکتے ہیں، جو ندوہ نے اختیار کیا ہے (مقالات شبلی ج ۳)

یہ تفصیلات اس لئے پیش کی گئی ہیں تاکہ اندازہ ہو جائے کہ ندوۃ العلماء محض ایک درس گاہ کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک جامع تخیل تحریک تھی، جس کے پیش نظر حسب ذیل مقاصد تھے،

(۱) مغربی افکار و خیالات اور تہذیب و تمدن کا سیلاب جو مسلمانوں کو اپنی رو میں بہائے لیے جاتا تھا اس کا مقابلہ کیا جائے۔

(۲) قرآن وسنت کی حفاظت، اور اُن سے براہِ راست تعلق پیدا کرانے کی کوشش کیجائے یعنی ان کی تعلیمات کو ایسے موثر انداز سے پیش کیا جائے کہ لوگ ان کا زیادہ سے زیادہ اخلاقی اثر لین، اور اُن کو عملاً اپنی زندگی مین نافذ کرین،

(۳) قدیم وجدید دونون طریقۂ تعلیم کی اصلاح کی جائے، اور اس کا عملی تجربہ دارالعلوم ندوۃ العلماء مین کیا جائے، تاکہ قوم مین ایسے تعلیم یافتہ افراد پیدا ہون جو قوم کی صحیح رہنمائی کر سکین،

(۴) قدیم وجدید طبقون کی اجنبیت، اور علماء کی گروہی عصبیت کو مٹا کر ان کے اندر اعتدال پیدا کیا جائے،

سید صاحب کی زندگی اور ان کے کارنامون پر اگر ایک سرسری نظر بھی ڈال لی جائے تو یہ اندازہ ہو جائیگا کہ وہ ان مقاصد کا عملی پیکر تھے، انھون نے زندگی کے ہر کام اور ہر موقع پر ان مقاصد کو پیش نظر رکھا، وہ سیاست کی ہنگامہ آرائیون مین ہون، یا علم وفن کے گوشۂ تنہائی مین، ندوۃ العلماء کے پرسکون اجلاس مین ہون، یا جمعیۃ العلماء کے پرشور جلسون مین، فاضلانِ دیوبند کے حلقہ مین ہون یا ندویون کی برادری مین، قدامت گزیدون کے حجرون مین ہون یا جدید طبقہ کے عشرت کدون مین وہ ندوہ اور اُس کے مقاصد کو کبھی نہین بھولتے تھے،

ندوہ کے مذکورہ مقاصد کی افادیت کو آج ہر طبقہ اور ہر گروہ نے محسوس کر لیا ہے، اور اسی لحاظ سے اپنے اندازِ فکر اور طرزِ عمل مین کچھ نہ کچھ تبدیلیان بھی کر لی ہین، مگر نصف صدی پہلے اس کی شدید مخالفت کی گئی تھی اس مخالفت کے نتیجہ مین علامہ شبلی نے ندوہ کی معتمدی سے علٰحدگی اختیار کر لی، سید صاحب کو بھی ان مخالفتون کا سامنا کرنا پڑا، مگر ان کی جامع اور ہمہ گیر شخصیت مین یہ ساری مخالفتین چھوٹے چھوٹے گندے نالون کی طرح گرین اور بہ گئین،

یون تو ندوہ کے پورے حلقہ نے اس کے مقاصد کو پورا کرنے مین کچھ نہ کچھ حصہ لیا، مگر سید صاحب نے ان مین سب سے زیادہ کامیابی حاصل کی، اور ان کی کوششین سب سے زیادہ نتیجہ خیز ہوئین،

درسگاہ کے قیام کے بعد ندوہ کے مقاصد کا عملی نمونہ پیش کرنے کے لئے دوسرا قدم یہ اٹھایا گیا کہ

الندوہ جاری کیا گیا، اس رسالہ نے مسلمانون کے فکر ونظر پر جو اثر ڈالا، اس کا کچھ حال سید صاحب کی زبان قلم سے سنئے،

"اس پرچہ مین علوم اسلامیہ کی تجدید، عقل ونقل کی تطبیق، معقول ومنقول اور قدیم وجدید علوم کے موازنہ اور عربی نصاب تعلیم کی اصلاح پر بہت سے محققانہ مضامین شائع ہوئے، اس رسالہ نے سیکڑون برس بعد علماء کی سطح جامد مین حرکت پیدا کی، اب تک علماء کے تحقیقاتی مسائل منطق، عقائد اور فقہ کے چند مسائل قرار پائے تھے، جن پر گو بہت کچھ لکھا جا چکا تھا، پھر بھی جو آتا تھا، وہ انھی کو دہرا دہرا کر اپنا اور دوسرون کا وقت ضائع کرتا تھا، حالانکہ زمانہ کا رُخ اُدھر سے اِدھر پھر چکا تھا، اور حالات نے اسلام اور علوم اسلامیہ کی خدمت کیلئے کچھ اور ہی ضروریات پیدا کر دیئے تھے، الندوہ کا یہ بڑا فیض ہے، کہ اُس نے علمائے کرام کے خیالات مین انقلاب پیدا کیا، اور ان کو کتنی ہی ناگواری ہوئی ہو اور انکی پیشانی پر کتنے ہی بل پڑ گئے ہون، لیکن انھون نے اُس کو پڑھا اور پڑھنے پر مجبور ہوئے،

اس سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ علماء کے سامنے جدید مباحث کا دروازہ کھلا، اسلام اور علوم اسلام کی خدمت کے نئے طریقے ان کو نظر آئے، زبان وبیان کے انداز و پیرایۂ بیان معلوم ہوئے، الندوہ کا اثر خصوصیت سے نوجوان علماء[1] اور قریب فارغ التحصیل طلبہ پر بجد پڑا، نام نہین لونگا، مگر بتا سکتا ہون کہ بڑے بڑے مقدس آستانون اور درسگاہون کے حاشیہ نشینون نے اس کے طرزِ نگارش اور پیرایۂ بیان کی نقل اُتاری، اور اپنے اپنے دائرہ مین ناموری حاصل کی، اور اُن سے دین وملت کو فائدہ پہنچا، خود دارالعلوم ندوہ کے طالب علمون کو اس سے بہت فائدہ پہنچا، اور کئی مستند طالب علمون کی (جو اس وقت مشہور مصنف ہین) بسم اللہ اسی دبستان سے ہوئی؛"

---

[1] خاص طور سے مولانا ابوالکلام قابلِ ذکر ہین جن کی علمی تحریرون کا آغاز الندوہ سے ہوا،

خود سید صاحب نے ندوہ کے مقاصد کے پیش نظر دینی اور تحقیقی کام انجام دیئے، اس کی ابتدا الندوہ ہی سے ہوئی، ابھی سید صاحب نے اس مین دوسرا یا تیسرا ہی مضمون لکھا تھا کہ مولانا حالی پڑھ کر باغ باغ ہوگئے، اور علامہ شبلی کو ان مین مبارکباد دی،

"سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ دار العلوم نے اپنی تعلیم کا نہایت ہی عمدہ نمونہ پہلی ہی بار پیش کیا ہے فبارک اللہ فیہا وفی طلبتہا وفی تعلیمہا، مجھے امید نہین بلکہ یقین ہے کہ عربی کی کامل تعلیم اور انگریزی کی بقدر ضرورت ہماری قوم مین ایسے لائق مضمون نگار اور مصنف پیدا کرے گی کہ محض انگریزی تعلیم آج ویسا ایک بھی نہ پیدا کر سکی ہے"[1]

سید صاحب کی اسی صلاحیت کی بنا پر ان کی طالب علمی ہی کے آخری زمانہ مین اُن کو الندوہ کی نیابت سپرد کر دی گئی، جس کو انھون نے یہ خدمات تقریباً چار سال انجام دیا، سید صاحب نے اس مدت مین بہت سے ایسے مضامین لکھے جس کے ذریعہ مغربی خیالات اور مادی تصور حیات کی سطحیت اور ناپائداری ثابت کی، اور اس کے مقابلہ مین اسلامی احکام کی فوقیت اور اسکی پائداری دکھائی مثلاً"

مذہب اسلام اور علم و عقل، القرآن والفلسفۃ الجدیدہ، فنائے مادہ، اسلام پر ایک جرمن کا لکچر، اکرات القرآن، ایمان بالغیب، اسمائے القرآن وغیرہ،

ایک اہم مضمون اس وقت اردو زبان مین اشتراکیت اور اسلام کے معاشی نظام پر بے شمار کتابین لکھی جا چکی ہین، مگر اس زمانہ مین یہ موضوع بالکل نیا تھا، اور اردو مین غالباً سب سے پہلے سید صاحب ہی نے اس پر قلم اٹھایا، اور الندوہ مین کئی قسطون مین اشتراکیت اور اسلام کے عنوان سے ایک محققانہ مضمون لکھا، جس مین اشتراکیت پر تنقید کی، اور اس کے مقابلہ مین اسلام کے معاشی نظام کی خوبی دکھائی، تعلیم سے فراغت کے بعد سید صاحب ندوہ ہی مین استاذ ادب مقرر ہوگئے جس کی وجہ سے تعلیمی حیثیت سے بھی اُن کو ندوہ کی خدمت کا موقع ملا،

[1] الندوہ ربیع الآخر ۱۳۲۳ھ

اسی زمانہ مین علامہ شبلی نے ندوہ کی معتمدی سے علحدگی اختیار کرلی، اور وہ مجلس برہم ہوگئی، جو ندوہ کے مقاصد کی تکمیل کے لئے علامہ شبلی نے کئی برس کی جانکاہ محنت کے بعد بنائی تھی، ان کی علحدگی تحریک ندوہ کے لئے بڑا حادثہ ثابت ہوئی، اور اس مین ایک ایسا خلا پیدا ہوگیا جس کا اثر برسون رہا، اور وہ خلا اس وقت پر ہوا جب ۱۹۲۳ء مین سید سلیمان ندوی دار العلوم ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم بنائے گئے، اس علحدگی کا سبب ندوہ کے تعلیمی مقاصد مین مولانا شبلی اور بعض دوسرے کارکنان ندوہ مین نقطۂ نظر کا اختلاف تھا، مدرسین اور کارکنون کی اکثریت ندوہ کو اسی پرانے ڈھرے پر لیجانا چاہتی تھی جس کی اصلاح کے لئے ندوہ کا قیام عمل مین آیا تھا، اور علامہ شبلی ندوہ کو ان اصلاحات کا نمونہ بنانا چاہتے تھے جن کے لئے یہ درسگاہ قائم کی گئی تھی، غرض اسی کشمکش کے نتیجہ مین علامہ شبلی کو الگ ہونا پڑا، اس طرح وہ بزم علم و دین جس کی شیرازہ بندی انھون نے برسون کی محنت کے بعد کی تھی، منتشر ہوگئی، خود سید صاحب بھی ندوہ سے علحدہ ہوگئے، گو اب استاذ اور شاگرد دونون کا ندوہ سے کوئی قانونی تعلق باقی نہین رہا تھا، مگر اس کے مقاصد کی تکمیل کا جذبہ جو ان کی زندگی کا اب مشن بن چکا تھا، باقی رہا،

اسی زمانہ مین ہندوستانی مسلمانون کی سیاسی زندگی مین ایک نیا شور طرابلس پر اٹلی کے حملہ سے برپا ہوا، جس سے ہر صاحب احساس کا دل بے چین ہوگیا، مولانا ابوالکلام نے جو ہندوستان مین اس کے سب سے بڑے وکیل تھے الہلال کے ذریعہ اسے ایک دینی و قومی مسئلہ بنا دیا، اور مسلمانون کے دلون مین مغرب کے خلاف ایک نیا جوش و جذبہ پیدا کر دیا، علامہ شبلی نے بھی زبان و قلم سے اس مین پورا حصہ لیا اور مولانا ابوالکلام کی درخواست پر سید صاحب کو الہلال کی معاونت کے لئے بھیجا، اس طرح مغربی سیلاب کے مقابلہ کا جو کام سید صاحب اب تک الندوہ کے پرسکون علمی گوشہ مین بیٹھ کر رہے تھے، اب وہ کام سیاسی میدان مین اکر الہلال کے شعلہ بار مضامین کے ذریعہ انجام دینے لگے، الہلال کے زمانۂ ادارت مین انھون نے بہت سے معرکۃ الآرا مضامین لکھے، اور مسلمانون مین انگریزون کے خلاف جو جذبہ مولانا ابوالکلام کے الہلال نے پیدا کیا تھا، اس مین سید صاحب کے زور قلم کو بھی بڑا دخل تھا، خصوصیت سے ان کا مضمون مشہد اکبر، الحربۃ فی الاسلام تو اس وقت بچے بچے کی زبان پر تھا،

جب ہندوستان کی سیاست مین ذرا سکون پیدا ہوا، تو سید صاحب پھر لکھنؤ واپس چلے آئے، اور استاذ کے مشورے سے پونا چلے گئے،

پونا ہی کے زمانۂ قیام مین ارض القرآن جیسے اہم موضوع پر قلم اٹھایا، ارض القرآن کا موضوع جغرافیۂ قرآن ہے، اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ تو اس کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہی، مگر اس وقت اس کے بارے مین چند باتین جو ہمارے موضوع سے متعلق ہین، عرض کی جاتی ہین،

آج سے پچاس برس پہلے خالص جغرافیۂ قرآن پر اردو کیا عربی زبان مین بھی کوئی جامع اور مکمل کتاب موجود نہین تھی، قدیم عربی تاریخون مین متفرق طور سے اس پر بحثین ضرور ملتی ہین، مگر عربی مورخین کو قدیم زبانون اور رومی تاریخون اور اثری انکشافات سے فائدہ اٹھانے کا موقع کم ملا تھا، اس لئے جب یہ کتابین ان کے سامنے آئین، اور عرب و شام عراق وغیرہ مین اثری انکشافات ہوئے تو ان کی روشنی مین یورپین مورخین نے قرآن مین مذکورہ مقامات اور ان کی قومون کے بارے مین شکوک و شبہات پیدا کرنے کی کوشش کی، سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب مین مغربی مصنفین کے تمام جدید ذرائع معلومات اور قدیم ماخذ کو سامنے رکھ کر قرآن کا جغرافیہ لکھا، مغربی مصنفین کی تاریخی تحقیقون اور قیاس آرائیون کی کمزوری دکھائی، اور قرآن پر کئے گئے ایک ایک اعتراض کا پردہ فاش اور اس کا مکمل جواب دیا، اس سلسلہ مین انھون نے عربی مورخین کی بھی بعض تاریخی غلطیون کی وضاحت کی،

غرض اس کتاب کے ذریعہ انھون نے قرآن کو ہدف طعن بننے سے بھی بچا لیا، اس لئے ان کی یہ خدمت دینی حیثیت سے بھی بہت اہم ہے، اور علمی و تحقیقی حیثیت سے بھی،

سیرت نبوی سیرت نبوی کی تالیف کا کام علامہ شبلی نے ندوہ ہی مین شروع کیا تھا، جس مین سید صاحب بھی شریک تھے، اس تالیف سے ان کا مقصود محض حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کی واقعات نگاری اور آپ کی کچھ اخلاقی تعلیمات کا تذکرہ نہین تھا، بلکہ اس کے متعدد مقاصد تھے جن مین ایک یہ بھی تھا کہ پیغمبر

اسلام اور آپ کی حیات مبارکہ کے بارے مین جو غلط فہمیان پھیلائی گئی تھین ان کو دور کیا جائے، اور آپ کی سیرت کا صحیح مرقع دنیا کے سامنے پیش کیا جائے، جلد اول کے دیباچہ مین لکھتے ہین :-

"اگلے زمانہ مین سیرت کی ضرورت صرف تاریخ اور واقعہ نگاری کی حیثیت سے تھی، علم کلام سے اس کو واسطہ نہ تھا،

یورپ کے مورخین آنحضرت صلعم کی جو اخلاقی تصویر کھینچتے ہین، وہ نعوذ باللہ ہر قسم کے معائب کا مرقع ہوتی ہے، آج کل مسلمانون کو جدید ضرورتون نے عربی علوم سے بالکل محروم کر دیا ہے، اس لئے اس گروہ کو اگر کبھی پیغمبر اسلام کے حالات و سوانح دریافت کرنے کا شوق ہوتا ہے، تو انہی یورپ کی تصنیفات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے، اس طرح آہستہ آہستہ یہ زہر آلود معلومات اثر کر جاتی ہین،

علامہ شبلی نے اس کا جو وسیع خاکہ تیار کیا تھا ابھی اس مین وہ رنگ نہین بھرنے پائے تھے کہ جوار رحمت مین چلے گئے، ان کے بعد سید صاحب نے انہی کے نقش قدم پر چل کر اس کی تکمیل کی، سیرت جلد چہارم کے دیباچہ مین لکھتے ہین :-

"ہم انشاء اللہ تفصیل سے بتائین گے کہ تمدن، معاشرت، بالخصوص قوانین نکاح، طلاق، وراثت، حقوق نساء، غلامی، جہاد، اصول حکومت (سیاست) اقتصادیات وغیرہ کے متعلق تمام دنیا کے مذاہب کے کیا اصول اور تمام سلطنتون اور قومون کے کیا قوانین تھے، اور آج مغرب نے اس انتہائی تہذیب تک پہنچ کر کس حد تک ان امور مین ترقی کی ہے، پھر موازنہ کر کے ہم دکھائین گے کہ شریعت اسلام کے مقابلہ مین مغرب کا معراج ترقی شریعت اسلام کا پایۂ اولین ہے۔"

سید صاحب نے فکر و نظر کی جس وسعت اور مجتہدانہ بصیرت کے ساتھ سیرت کا ذخیرہ تیار کیا، اور اس ذریعہ کے مغربی افکار و خیالات پر جو تنقید کی ہے، اس کی مثال کم از کم ہندوستان کی اسلامی تاریخ مین نہین ملتی،

دارالمصنفین

ندوہ نے اپنے مقاصد کو بروئے کار لانے اور ندویوں کی فکری و علمی تربیت کے لئے یہ کوشش کی تھی کہ ندوہ میں ایک شعبہ تصنیف و تالیف بھی قائم ہو، چنانچہ ۱۹۱۰ء میں دہلی میں ندوہ کا اجلاس ہوا تو علامہ شبلی نے اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے ایک نئی تجویز یہ پیش کی کہ اس کے لئے ایک بڑا کتب خانہ فراہم کیا جائے ان کی تجویز کے الفاظ یہ تھے،

"یہ تجویز کہ ندوہ میں ایک دائرۂ تالیف قائم کیا جائے جس کے ارکان کا کام صرف مطالعۂ کتب اور تصنیف و تالیف ہو، ...... یہ اسی وقت پوری ہو سکتی ہے جب ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا جائے"،

اسی جلسہ میں سید صاحب نے بھی ایک مضمون پڑھا تھا جس میں اسی تجویز کو عملی شکل دینے کی متعدد تجویزیں تھیں، انھوں نے آخر میں لکھا تھا،

"ندوۃ العلماء جس قسم کے علماء اپنے مدرسہ میں تیار کرنا چاہتا ہے، وہ اسکیم سے ظاہر ہے کہ یہاں کے طلبہ درجۂ عالمیت یا درجۂ تکمیل کے بعد تالیف و تصنیف میں مشغول ہوں، اور ایک بڑے پیمانہ پر صیغۂ تصنیف و تالیف قائم کیا جائے، .... اور اس ادارہ کا نام دارالمصنفین ہو"

مگر بعض کوتہ اندیشوں اور بداندیشوں کے اختلاف کی وجہ سے استاد اور شاگرد کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی کہ دارالمصنفین ندوہ میں کھلے، پھر بھی علامہ شبلی آخر وقت تک اس کیلئے کوشش کرتے رہے، اور ان کے دوسرے شاگردوں کی بھی یہی خواہش تھی، جب مولانا مسعود علی صاحب نے یہ خواہش ظاہر کی تو ان کو لکھتے ہیں:

"بھائی وہ لوگ دارالمصنفین ندوہ میں بنانے کب دیں گے، کہ میں بناؤں حالانکہ اس میں انہی کا فائدہ ہے"،

جب وہ ارباب ندوہ کی طرف سے بالکل مایوس ہو گئے، تو اسے اعظم گڈھ میں کھولنا طے کیا، وہ اس کا خاکہ تیار کر چکے تھے، اور ندوہ کے بعض ذہین طلبہ کا انتخاب بھی کر لیا تھا، مگر ابھی اس کی صورت گری نہیں

کر پائے تھے کہ علی علیین میں جگہ پا گئے، سید صاحب نے ان کے بعد ندوہ کے اس مقصد کو پورا ہی نہیں کیا، بلکہ اس میں وسعت بھی دی،

دارالمصنفین کے کاموں کی تفصیل کا موقع نہیں ہے لیکن اگر اس کے کارناموں پر ایک اجمالی نظر بھی ڈال لیجائے، تو اس کا اندازہ ہو جائے گا کہ مغربی مصنفین نے اسلامی نظام حکومت، اسلامی تاریخ اور اسلامی علوم کے بارے میں جو غلط فہمیاں پھیلائی تھیں دارالمصنفین نے ان میں سے ایک ایک کا جواب نہایت ہی علمی اور تحقیقی انداز سے دیا، یہاں کی ہر کتاب گویا ایک سوال کا مدلل جواب ہے، دارالمصنفین کا یہ علمی و تحقیقی کام گویا ایک پوری جماعت نے انجام دیا ہے، مگر یہ سب سید صاحب ہی کے فیض تربیت کا اثر ہے،

سیرت نبوی کی تکمیل کے بعد دارالمصنفین کا سب سے بڑا کارنامہ سیر الصحابہ کی تکمیل ہے، اس سلسلہ کی سب سے پہلی کتاب خلفائے راشدین ہے، اسلام جس طرح کا نظام دنیا میں قائم کرنا چاہتا ہے اس کی تفصیل سیرت کے ذریعہ کی گئی تھی، مگر اس سوال کا جواب کہ یہ نظام اپنی پوری جلوہ سامانیوں کے ساتھ آنحضرت کے بعد بھی باقی رہا یا نہیں، اس کتاب سے ملتا ہے، پھر اس کے ذریعہ اس خیال کی بھی تردید کی گئی کہ مذہب و سیاست دونوں الگ الگ چیزیں ہیں، دونوں کی آمیزش ممکن نہیں ہے

اس کے بعد کی جلدوں میں عام صحابہ کے حالات ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی انفرادی سیرتیں اسلام کی عملی تفسیر تھیں،

سیر الصحابہ کے ساتھ سید صاحب نے تاریخ اسلام کی تالیف کا کام بھی شروع کرایا، جس کے ذریعہ بتایا گیا کہ گو خلافت راشدہ کے بعد اسلامی حکومت کا طریقۂ انتخاب شورائی نہیں رہا تھا، جس کی وجہ سے اسلامی جمہوریت کی روح مردہ ہو گئی تھی، اور اس کی جگہ ملوکیت نے لے لی تھی، پھر بھی نظام حکومت کا پورا ڈھانچہ اسلامی ہی تھا، اس لئے علم و تمدن، اخلاق و معاملات، اور عقائد و عبادات پر صدیوں تک اس کی برکتیں باقی رہیں، نیز اس کے ذریعہ اسلامی تاریخ کے ان پہلوؤں کو بھی صحیح اور واضح طور سے پیش کیا گیا، جن کو مغربی مصنفین

نے غلط طور پر پیش کیا تھا،

ہندوستان کی جو تاریخیں انگریزوں نے لکھیں ان میں انھوں نے اپنے سیاسی مصالح کے پیش نظر مسلمانوں کے دور کو ایسے انداز میں پیش کیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں کشمکش کی خلیج زیادہ گہری ہو [illegible] سید صاحب نے ادارہ کے ابتدائے قیام ہی سے اس کام کی طرف توجہ کی، خود متعدد مضامین لکھے اور دار [illegible] کے متعدد رفقاء کے سپرد یہی کام کیا،

اس کے علاوہ وہ کون ایسا اہم موضوع ہے جس پر دارالمصنفین نے کتابیں نہیں پیش کی ہیں، قرآن، حدیث، فقہ، فلسفہ، تمدن، غرض کوئی گوشہ نہیں چھوٹا ہے،

معارف | ادارہ کے قیام کے تقریباً دس ہی سال بعد سید صاحب نے معارف نکالا، اس پرچہ کے ذریعہ انھوں نے دین و مذہب کی، ملک و ملت کی، اور زبان و ادب کی جو بیش بہا خدمت انجام دی اور اسکے ذریعہ [illegible] کو جس طرح زندہ کیا، ہندوستان میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے، قدیم وجدید کا کون سا ایسا مسئلہ ہے جس پر معارف میں مضمون شائع نہیں ہوا، خصوصاً مغربی افکار و خیالات کی تردید میں تو صدہا مضامین اس میں شائع ہوئے ہوں گے، خود سید صاحب نے جو بیش قیمت مضامین اس میں لکھے ہیں، اُن کی ضخامت کئی ہزار صفحات ہوگی، انھوں نے خاص طور سے اہل مغرب کے افکار و خیالات کے جواب میں جو مضامین لکھے ہیں ان کی تعداد بھی کافی ہے،

یورپ کے مشہور مستشرق مارگولیتھ کی کتاب کے حوالہ سے مانچسٹر گارجین میں ایک مضمون آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے بارہ میں شائع ہوا تھا جس میں مضمون نگار نے بعض نامناسب باتیں واقدی کی روایت سے نقل کی تھیں، سید صاحب نے کئی نمبروں میں اس کا جواب دیا، اس بحث میں مارگولیتھ کے علاوہ ڈرہم یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر گیوم نے بھی حصہ لیا، سید صاحب نے ان دونوں کو اپنے محققانہ مضامین کے ذریعہ خاموش کیا، [illegible] میں ایک یورپین اہل قلم نے ایک مضمون میں لکھا "مسلمان ارسطو کی گاڑی کے قلی تھے" سید صاحب نے اس کا

نہایت ہی محققانہ جواب دیا، اور ثابت کیا کہ مسلمانوں نے یونانی فلسفہ کی خدمت ضرور کی ہے، مگر اس فلسفہ کے وہ مقلد نہیں ہیں، بلکہ انھوں نے اس کے سارے تار و پود کو بکھیر کر رکھ دیا ہے، اسی زمانہ میں عورتوں کے حقوق کے سلسلہ میں اسلام پر اعتراض کیا گیا، اس کے رد میں ایک طویل مضمون لکھا، ۱۹۳۰ء کا پورا سال تقریباً اسی طرح کے مضامین کے لکھنے میں صرف ہوا، مشہور انگریزی اخبار اسٹیٹسمین میں ایک مضمون واقعہ کربلا کے بارے میں شائع ہوا، جس میں بعض قابل اعتراض باتیں تھیں، سید صاحب نے اس کا جواب دیا، اسی سال پنجاب یونیورسٹی میں ڈاکٹر ڈاٹن کی کتاب "تاریخ اقوام اسلامیہ" داخل نصاب کی گئی، جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے بارے میں بعض بے بنیاد اور توہین آمیز باتیں تھیں، سید صاحب نے اس کے خلاف معارف میں سخت احتجاج کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کتاب نصاب سے خارج کر دی گئی، اس کے علاوہ خود ہندوستان کے بہت سے فتنہ نگاروں کا بھی جواب دیا،

معارف کی علمی اہمیت اور اس کی قدر افزائی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ مولانا محمد علی نے ایک بار سید صاحب کو لکھا کہ

"میرے متعدد انگریزی رسالوں کی جلدیں نہیں بندھی ہیں، یہ شرف خاص معارف کو حاصل ہوگا کہ مجلدات تیار کرائی جائیں گی"،

مولانا ابوالکلام اس کے بارے میں لکھتے ہیں:-

"معارف کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں، صرف یہی ایک پرچہ ہے، اور ہر طرف سناٹا ہے"

ایک اہم کارنامہ | اس سلسلہ میں اُن کا سب سے بڑا کارنامہ سیرت النبی کی تالیف ہے، یہ کتاب نہ محض سوانح نبوی کا بہترین ذخیرہ ہے، بلکہ اسلام کی بنیادی تعلیمات کا بھی ایک عمدہ مرقع ہے، اردو کیا عربی میں بھی سیرت نبوی پر جتنا ذخیرہ موجود ہے، کوئی بھی ضعیف اور رطب و یابس روایات سے خالی نہیں ہے، مگر اس سیرت کی یہ سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ اس کی ساری بنیاد یا تو قرآن پر ہے یا [illegible]

اور مستند احادیث نبوی پر،

سیرت نبوی کے علاوہ بھی سید صاحب نے جتنے دینی کارنامے انجام دیئے ہین، ان مین ان کی یہ خصوصیت نمایان نظر آئے گی کہ انھون نے اپنے ہر دعوی کی دلیل قرآن یا سنت صحیحہ سے دی ہے، ہر سوال کے جواب مین قرآن کی کوئی آیت یا حدیث نبوی پیش کی ہے، غرض یہ کہ سیرت کا ضخیم ذخیرہ ہو یا خطبات مدراس اور معارف کے مضامین، اُن سب مین اُن کی یہ امتیازی خصوصیت نمایان نظر آئے گی، خود فرماتے تھے کہ مین نے سیرت کی تالیف اور اسلامی مسائل مین کتاب و سنت کے علاوہ کسی تیسری چیز کو بنیاد نہین بنایا ہے"

بسا اوقات قرآن و سنت سے استدلال کرنے مین وہ اس دقت نظری سے کام لیتے ہین کہ عام اہل علم کے ذہن کی رسائی وہان تک نہین ہوتی، اور غالباً یہی وجہ ہے کہ بعض کم سوادون نے اپنے ذہن کی اسی نارسائی کی بنا پر اُن کی قرآن فہمی پر اعتراضات بھی کئے ہین،

سید صاحب کی اس خصوصیت کی تفصیل کے لئے مستقل ایک مضمون کی ضرورت ہے، اگر مجمل طور سے اُن کے کارنامون کے بارے مین یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا، کہ سید صاحب نے براہ راست قرآن و سنت سے دینی مسائل کی جو عالمانہ تشریح کی اور انکی روشنی مین سیرت نبوی کی جیسی جدید ترتیب و تبویب کی ہے، اور پھر ان سب کا ایک دوسرے سے جو ربط و تعلق دکھایا ہے، اس کی مثال پورے اسلامی لٹریچر کی کسی ایک تصنیف مین ملنی مشکل ہے، چند مثالین یہان دیجاتی ہین، جن سے قرآن و سنت پر ان کی وسعت نظر، ان مین غور و تدبر اور اُن سے نتائج اخذ کرنے مین اُن کی مجتہدانہ بصیرت کا اندازہ ہوجائے گا، اور یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ سیرت نبوی کے سرچشمہ کو انھون نے ضعیف روایتون کی آلایشون سے کس طرح پاک و صاف کر کے ہمارے سامنے پیش کیا ہے، اور اس کا اندازہ سب سے زیادہ معجزات کی بحث مین ہوتا ہے،

معجزات نبوی کے سلسلہ مین مسلمانون نے ہمیشہ یا تو افراط سے کام لیا، یا تفریط سے، جن لوگون نے افراط سے کام لیا، وہ انکار ہی کر بیٹھے، اور جن لوگون نے تفریط کو راہ دی، وہ ہزارون بے سرو پا

روایتون کو جزو ایمان بنا بیٹھے، آج بھی مسلمانون مین ان دونون انتہا پسندیون کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے،

سید صاحب نے سیرت کا جو حصہ معجزات پر لکھا ہے، اس مین ان دونون باتون کو سامنے رکھا، ایک طرف انھون نے عقل پسندون کی خشک پسندی کی دھجیان بکھیری، اور دوسری طرف ہزارون روایتون سے انتخاب کر کے معجزات نبوی کا ایک صحیح مرقع پیش کیا، اور اس استدلال اور انتخاب مین انھون نے کسی تجدد سے کام نہین لیا، بلکہ انھون نے منکرین کے سامنے انہی کے مسلّم عقلا و ائمہ کے اقوال سے معجزات نبوی پر استدلال کیا، اور روایت پرستون کے موقف کی کمزوری انھون نے خالص محدثانہ اصول کی روشنی مین دکھائی، جن کی وجہ سے دونون کو خاموش ہونا پڑا،

معجزات نبوی کے بارے مین عام طور پر یہ خیال ہے کہ معجزہ نام ہے محض کسی ظاہری خرق عادت واقعہ کا، جیسے عصائے موسیٰ ید بیضا شق القمر وغیرہ، سید صاحب نے اس عام غلط فہمی کا پردہ بڑی خوبی کے ساتھ چاک کیا، اور انھون نے بتایا کہ معجزہ محض اسی کا نام نہین ہے، یہ تو معجزہ کی ظاہری اور معمولی قسم ہے، کسی نبی کا اصل معجزہ اس کی تعلیم، اس کے اثرات اور نتائج، اس کی پاکیزہ سیرت، اس کا اخلاق اور کردار ہوتا ہے، جس کا اس کی زندگی کے ہر لمحہ مین مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، اس کو انھون نے باطنی معجزہ سے تعبیر کیا ہے، ظاہری معجزہ بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے، مگر اس کی حیثیت اصل کی نہین فرع کی ہے، اس کا اثر کچھ دیر رہتا ہے، اور باطنی معجزہ کا اثر تا قیامت رہے گا، پھر اس دعوی پر انھون نے قرآن و سنت سے سیکڑون دلیلین دی ہین، جن مین سے ہر دلیل نہایت ہی محکم، اور نا قابل تردید ہے، (ملاحظہ ہو سیرت حصہ سوم (ص ۱۹۳ تا ۲۲۵)

معجزہ کے سلسلہ مین دوسری غلط فہمی یہ بھی ہے کہ انبیاء علیہم السلام براہ راست کائنات کے تصرف پر قادر ہین، اور وہ جس وقت جو چاہین کر سکتے ہین، اس غلط فہمی کا شکار سب سے زیادہ عیسائی، اور کسی حد تک جاہل مسلمان ہین، سید صاحب نے اس سلسلہ مین قرآن کی بے شمار آیات کی روشنی

مین ثابت کیا ہو کہ قرآن نے اس ذہنیت کی اصلاح کی ہے، اور اس نے بتایا ہے کہ معجزہ کا ظہور نبی کی قدرت و تصرف سے نہین ہوتا، بلکہ وہ خالص خدا کی قدرت اور حکمت کا کرشمہ ہوتا ہی،

غرض یہ کہ اس سلسلہ مین اس طرح کی نہ جانے کتنی غلط فہمیون کو انھون نے دور کیا ہے، اب یہ کہنا واقعہ کا اظہار ہوگا کہ معجزات انبیاء سابقین اور معجزات نبوی پر قرآن کے دلائل کا اتنا انبار، اور فکر و استدلال کا ایسا اچھا مرقع، صحیح روایات کا اتنا بڑا ذخیرہ کسی زبان مین حتی کہ عربی مین بھی موجود نہین ہے،

معجزات نبوی کی طرح معراج نبوی کے بارہ مین بھی عام طور پر اہل علم محض روایات ہی پر اعتماد کرتے چلے آئے تھے، جس کی وجہ سے یہ ایک مافوق الفطرت واقعہ تو ضرور معلوم ہوتا تھا، مگر اس مافوق الفطرت واقعہ کی ضرورت کیون پیش آئی؟ ہماری زندگی کے لئے اس کی کیا اہمیت ہے؟ اگلے انبیاء کے ساتھ بھی یہ واقعہ پیش آیا یا نہین؟ اس کا صحیح نقشہ کیا ہے؟ اس مین بارگاہ خداوندی سے کیا پیغام عطا ہوا ہے؟ اس کے سب گوشے بڑی حد تک تشنۂ تفصیل تھے، سید صاحب نے ان تمام گوشون پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، اور ہر جگہ اپنے استدلال کی بنیاد قرآن اور صحیح روایات ہی کو بنایا ہے، محض واقعہ مین دلچسپی پیدا کرنے کے لئے کہین کسی روایت کا سہارا نہین لیا ہے، خاص طور سے انھون نے معراج کے پیغام کے سلسلے مین جو کچھ لکھا ہے اس کی نظیر کسی دوسری کتاب مین کم از کم عاجز کو نظر نہین آئی،

عام طور پر معراج کا پیغام پنج وقتہ نماز کو سمجھا جاتا ہے، سید صاحب نے بتایا کہ یہ معراج کے پیغام کا ایک اہم جزو ہے، کل نہین ہے، انھون نے دکھایا ہو کہ سورۂ اسراء مین عقائد، عبادات، تمدن اور معاشرت و سیاست کے جو اصول بیان کئے گئے ہین، وہ سب معراج ہی کے پیغامات ہین، معراج نبوی محض ایک خرق عادت واقعہ نہیں ہے، بلکہ یہان سے نبوت محمدی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے، سیرت جلد ۳ مین تفصیل ملاحظہ ہو،

اسی طرح سید صاحب نے سیرت جلد ۵ مین عبادات قلبیہ کے تحت اخلاص، تقوی اور صبر،

شکر وغیرہ کی جو تفصیل کی ہے، اور ان باطنی کیفیات کے حصول کے لئے قرآن و سنت کی روشنی مین جو طریقہ بتایا ہے اس کا عشر عشیر بھی کسی مروجہ تصوف کی کتاب مین نہین ملتا، سلسلۂ سیرت کی دوسری اہم کتاب خطبات مدراس ہے، یہ وہ خطبے ہین جو انھون نے مدراس مین دیئے تھے، اس کتاب مین انبیائے کرام کی انسانی خدمت، دوسرے بانیان مذاہب کی تعلیم کی تاریخی حیثیت، اور سیرت نبوی کی ہمہ گیری کا جو مرقع پیش کیا گیا ہے اگر اس کو کوئی غیر مسلم غیر جانبدارانہ نقطۂ نظر سے پڑھے، تو وہ اسلام اور پیغمبر اسلام کی ذات سے متاثر ہی نہین، بلکہ ان کا عقیدتمند ہوئے بغیر نہین رہ سکتا، اس کتاب نے مسلم قوم کو سیرت نبوی پر بولنے اور لکھنے کا ایک نیا ماخذ دیا، اس کی بدولت مقررین کو سیرت نبوی کے پیش کرنے کا ایک نیا انداز اور نیا ڈھنگ معلوم ہوا، بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس کی بدولت کتنے لوگون کو سیرت پر بولنا آگیا،

دوسرے ان کے وہ بیسیون مضامین ہین، جو انھون نے قرآن و سنت کے مختلف موضوعون پر معارف مین لکھے ہین، ان مضامین کے علاوہ، انھون نے اس مقصد کی خاطر مولانا حمید الدین صاحب فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کے مختلف حصون کو اپنے خاص اہتمام سے چھپوایا، جن کی وجہ سے قرآن فہمی کی ایک نئی راہ کھلی،

اس مختصر تفصیل سے اندازہ ہو گیا ہوگا، کہ قرآن و سنت کی حفاظت و خدمت کے سلسلہ مین سید صاحب کی امتیازی خصوصیت کیا تھی، اور علماء مین ان کا مخصوص مقام کیا تھا،

دوسرا مقصد

ندوۃ العلماء کے پیش نظر دوسرا اہم مقصد موجودہ نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم کی اصلاح تھا، نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم کی اصلاح کے سلسلہ مین ندوہ کے پیش نظر قریب قریب وہی نقشہ تھا، جو ڈیڑھ صدی پہلے شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پیش کیا تھا، یعنی ابتدائی صرف و نحو اور عربی ادب کی تعلیم کے بعد طلبہ کو براہ راست قرآن و سنت کی تعلیم مین لگا دیا جائے، اور پھر یہ سلسلہ تکمیل تعلیم تک جاری رہے، البتہ طلبہ کی استعداد کے اضافہ کے ساتھ ساتھ ان کی تعلیم و تدریس کے معیار مین بھی اضافہ ہوتا جائے، یہان تک کہ اختتام تعلیم تک ان ماخذ پر ایک تحقیقی نظر ہو جائے، دوسرے علوم و فنون مثلاً فقہ، اصول فقہ کی تعلیم، قرآن و حدیث کی تعلیم کے بعد یا پھر ضمنی طور

اُن کے ساتھ ہی دی جائے تاکہ طلبہ کے ذہن میں اصل و فرع کا فرق بھی پورے طور پر بیٹھتا جائے اور یہ بھی معلوم
ہوتا جائے کہ یہ علوم بجائے خود ماخذ اور بنیاد نہیں ہیں، بلکہ اصل ماخذ قرآن و سنت کے خادم یا تابع کی و سائل ہیں
ظاہر ہے کہ اس اصلاح کی ابتدا سب سے پہلے خود دار العلوم ندوۃ العلماء سے ہونی چاہیئے تھی، مگر ابتدا ہی
ندوہ کو جو مدرسین اور منتظمین ملے، اُن میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی، جو اُس نصاب تعلیم پر جو کئی صدی سے عربی
مدرسوں میں پڑھایا جا رہا تھا، کسی ترمیم کے لئے راضی نہ تھے، حالانکہ یہ اُن کو بخوبی معلوم تھا کہ اس نئی
درسگاہ کے قیام کا بنیادی مقصد ہی اصلاح نصاب ہے، اور اُن کو اس طرف بار بار توجہ بھی دلائی گئی، مگر
چونکہ اُن کے پشت پر پورے مذہبی طبقہ کی حمایت موجود تھی، اس لئے انھوں نے اپنے اس رویہ میں کوئی تبدیلی
نہیں کی، اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیجئے کہ امرتسر میں ندوہ کے سالانہ اجلاس میں جب علامہ شبلی نے اپنا مشہور
اصلاحی ترکیب بند پڑھا، تو مولانا فاروق چریا کوٹی جو ندوہ ہی میں صدر مدرس اور علامہ شبلی کے استاد رہ
چکے تھے، ان شعروں پر بہت خفا ہوئے جن میں ۴ عناصر کے نظریہ اور فلسفۂ قدیم پر تعریض و تنقید تھی،
اور طلبہ کے سامنے ۴ عناصر کے وجود پر کئی دن تک تقریر کرتے رہے، اس ترکیب بند کا ایک شعر یہ تھا:

تا چہ سود ست وہر آن فلسفۂ عہد قدیم
تا چہ سود ست وہر آن ہیئت پارینہ نہا

علامہ شبلی نے جو تحریک ندوۃ العلماء میں ابتدا سے شروع کی تھی، اس ذہنیت کے بدلنے کے لئے بڑی سخت
جد و جہد کی، اسی غرض سے دار العلوم میں قیام کیا، اور اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہو گئے تھے، مگر پھر ان
کی علٰحدگی سے یہ اصلاح کی تحریک کچھ دنوں کیلئے دب گئی، اور پھر اس کو پوری کامیابی اس وقت ہوئی جب
سید صاحب معتمد بنائے گئے،

سید صاحب نے بھی ندوہ کے اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لئے پوری جد و جہد کی اور اُن کی اس جد و جہد
کا نتیجہ ندوہ کے اندر بھی اچھا نکلا، اور ندوہ سے باہر بھی، علامہ شبلی نے اپنے زمانہ معتمدی ہی میں قرآن کی

تفسیر کی تعلیم اور براہ راست اس کے مطالعہ کا سلسلہ شروع کرا دیا تھا، اسی طرح نحو و صرف کی کتابوں میں بھی
انھوں نے بہت کچھ رد و بدل کر دیا تھا، بلاغت و معانی میں مختصر و مطول کے بجائے امام بلاغت عبد القاہر
جرجانی کی کتاب دلائل الاعجاز رکھ دی تھی، انگریزی کی تعلیم کا بھی کچھ سلسلہ شروع ہو گیا تھا، سید صاحب نے
اس اصلاح کو اور وسعت دی، انھوں نے عربی ادب کا معیار پہلے سے بلند کر دیا، حدیث کی تعلیم تیسرے ہی
درجہ سے شروع کرائی، براہ راست قرآن سے قرآن کی تعلیم بالکل ابتدا سے انتہا تک پھیلا دی حتی کہ
دار العلوم ندوہ میں بچوں کو ترکیب کی مشق ہی قرآن کے آخری پارہ سے کرائی جاتی ہے، انگریزی کو نصاب کا ایک
ضروری جزء قرار دیا،

عربی مدارس میں عموماً عربی ادب کی جو کتابیں خواہ وہ نثر کی ہوں یا نظم کی پڑھائی جاتی ہیں، وہ
بیشتر متاخرین یا عجمی مذاق شعراء و ادباء کی ہیں، جن کا اسلوب بیان نہایت ادق اور عجیب ہوتا ہے، جن
میں الفاظ زیادہ اور معانی کم ہوتے ہیں، اُن کے پڑھنے پڑھانے سے عام طور پر طلبہ کو عربی الفاظ اور کچھ
عربی ترکیبوں پر تو ضرور عبور ہو جاتا ہے، مگر ان کے ذریعہ نہ تو عربی کا صحیح اور پاکیزہ مذاق ہی پیدا ہوتا ہے،
اور نہ قرآن کے سادہ اور دلنشین اسلوب بیان سے مناسبت ہی پیدا ہوتی ہے،

اس سلسلہ میں دوسری خامی قدیم طریقۂ تعلیم میں یہ تھی، کہ اس میں طلبہ میں عربی تحریر و تقریر کی صلاحیت
پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی تھی، ندوہ کی اصلاحی تحریک سے پہلے عربی مدارس کے عربی مذاق کا کیا حال
رہا ہوگا، اس کا اندازہ ایک حال کے واقعہ سے لگائیے، جو مولانا ابو الحسن علی صاحب کے ساتھ پیش آیا
تھا، مولانا نے بیان کیا، کہ میں ایک مجلس میں گیا، جہاں ایک مشہور عربی درسگاہ کے ممتاز فضلاء
موجود تھے، میں جس وقت مجلس میں پہنچا، تو یہ حضرات کھانے میں مشغول تھے، ندوی سمجھ کر ایک برگزیدہ بزرگ نے
برجستہ عربی میں فرمایا کہ

یا شیخ تعال واجلس ههنا وكل معنا،

مولانا نے کہا اس عربیت پر مجھے ہنسی تو بہت آئی، مگر بزرگون کا مجمع تھا، اس لئے ضبط کر کے کہا:-

"اما الجلوس فنعم واما الطعام فلا"

اس کے بعد پھر اردو مین بات چیت شروع ہو گئی،

ندوہ نے شروع ہی سے عربی نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم کی اس خامی کی طرف توجہ کی تھی، اور کسی حد تک یہ خامی شروع ہی مین دور بھی ہو گئی تھی، مگر پھر بھی جدید ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے، ابھی اس مین مزید وسعت کی ضرورت تھی، سید صاحب نے اس کی طرف خاص طور سے توجہ کی، متعدد نثر و نظم کی پرانی کتابین نصاب سے خارج کین، اور متعدد نئی کتابین داخل کین، عربی ادب و زبان کی تعلیم کیلئے بعض ممتاز اساتذہ کو عربی ممالک سے بلا کر ندوہ مین رکھا، بعض طلبہ کو عربی ممالک مین تعلیم کے لئے بھیجا، عربی اخبارات و رسائل کے منگانے کا اہتمام کیا، طلبہ کی ایک مجلس نادیۃ العربی کو جو خاص اسی مقصد سے قائم کی گئی تھی، ترقی دی، غرض اس شعبہ کی اصلاح کے لئے ہر ممکن کوشش کی،

سید صاحب کے دور مین ندوہ کے تمام علمی شعبون کو ترقی ہوئی، مگر خاص طور سے اس مبارک دور مین عربی ادب و انشاء کو بہت زیادہ عروج ہوا، اس دور مین ندوہ نے عربی ادب کے جیسے لعل بے بہا قوم کے سامنے پیش کئے، اس کی مثال ہندوستان کی کوئی درسگاہ نہین دے سکتی، اس دور کے متعدد ندوی فضلاء کی عربی ریڈرین داخل درس ہین، اور ان کی متعدد عربی تصنیفین وہان ہاتھون ہاتھ فروخت ہو رہی ہین، اور ان کے متعدد اڈیشن نکل چکے ہین،

اصلاح نصاب کے سلسلہ مین موجودہ ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے ایک کام جدید عربی ریڈرون کی تیاری کا بھی تھا، سید صاحب نے اس سلسلہ مین دوسرون سے بھی کام لیا، اور خود بھی اس کام کو انجام دیا، انھون نے بچون مین عربی ادب کا مذاق پیدا کرنے کے لئے دروس الادب کے نام سے دو رسالے لکھے جن مین بتدریج

جدید و قدیم عربی الفاظ، ترکیبین، اور انشاء کے مشقی سوالات ہین، جن کو پڑھ کر بچون مین عربی مذاق آسانی سے پیدا ہو جاتا ہے، جدید تعلیمی تقاضون اور تجربون کے پیش نظر ندوہ کے دوسرے فضلاء نے اس کے لئے اچھی سے اچھی ریڈرین تیار کی ہین، مگر اس سلسلہ کی سب سے پہلی کوشش سید صاحب نے کی، ان کی یہ کتاب ملک مین کافی مقبول ہوئی، اس مقبولیت کا اندازہ اس سے لگتا ہے، کہ اب تک اس کے ۱۵-۱۰ اڈیشن نکل چکے ہین،

اس سلسلہ مین سید صاحب نے دوسری کوشش یہ کی کہ جدید عربی الفاظ کا ایک لغت "لغات جدیدہ" کے نام سے تیار کیا، جس کے ذریعہ ہندوستان کے عربی مدارس کے طلبہ ہزارون جدید عربی الفاظ سے واقف ہوئے، یہ کتاب سید صاحب کی ابتدائے عمر یعنی آج سے پچاس برس پہلے کی تصنیف تھی، اور جدید عربی ادب مین مغربی افکار و خیالات اور جدید انکشافات کی وجہ سے برابر نئے الفاظ، نئی ترکیبین داخل ہو رہی تھین، اس لئے اس کتاب کے دوسرے تیسرے اڈیشن کے وقت ان کو اس کتاب مین ترمیم و اضافہ کا خیال ہوا، اس کام کے لئے انھون نے اپنے محبوب شاگرد مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کو منتخب کیا، اور ان کی اصلاح کے بعد یہ کتاب دوبارہ سہ بارہ شائع ہوئی،

اصلاح نصاب کی ان داخلی کوششون کے علاوہ سید صاحب نے بہت سی خارجی کوششین بھی کین، اس موضوع پر متعدد مضامین لکھے، متعدد بڑی اور چھوٹی قدیم و جدید درسگاہون کو اس سلسلہ مین مفید مشورے دیئے خاص طور سے جو درسگاہین ان کے مشورے سے مستفید ہوئین ان مین مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ ملیہ دہلی، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، جامعہ عباسیہ بہاولپور، مدرسہ شمس الہدی پٹنہ، اسلامیہ کالج پشاور، وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہین،

۱۹۳۳ء مین سید صاحب نادر شاہ کی دعوت پر افغانستان گئے، اس سفر مین ڈاکٹر اقبال اور بعض دوسرے اہل علم بھی سید صاحب کے ساتھ تھے، سید صاحب نے نادر شاہ سے تعلیم کے مسئلہ پر جو گفتگو کی اس مین انھون نے ندوہ کے خیالات کی پوری ترجمانی کی، انھون نے فرمایا کہ

"افغانستان کی عربی و مذہبی تعلیم کا نصاب ایسا ہو کہ طلبہ مین موجودہ زمانہ کے لحاظ سے

سیاسی و اجتماعی اصلاحات کی طرف میلان ہوا، اور ان میں مذہبی شگفتگی بھی پیدا ہوئی،

۱۹۳۳ء میں صوبہ بہار و اڑیسہ کے وزیر تعلیم جناب سید عبدالعزیز صاحب مرحوم نے سید صاحب کو دینی مدارس کے نئے نصاب کی ترتیب و اصلاح کے لئے انھیں تکلیف دی اور سید صاحب نے اس مبارک کام کو مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی کی معیت میں انجام دیا، بہاولپور میں ندوہ کی طرز کی ایک درسگاہ جامعہ عباسیہ ہے، اسکے نصاب کی ترتیب و اصلاح میں بھی سید صاحب نے حصہ لیا،

تیسرا مقصد ندوہ کا تیسرا مقصد مسلمانوں کے مختلف مذہبی فرقوں، جماعتوں اور جدید و قدیم تعلیم یافتہ گروہ اور افراد کے درمیان اتحاد و اتفاق، اور ان میں انتہا پسندی، اور تعصب و تحزب کے بجائے اعتدال پسندی اور وسعت نظری پیدا کرنا تھا، ارباب ندوہ نے شروع سے اس مقصد کے لئے جد و جہد کی، اور اس میں ان کو بڑی حد تک کامیابی ہوئی، ندوہ کی انتظامی مجلسیں، اور اس کے عام اجلاس، اس اتحاد و اتفاق کا نہایت ہی روح پرور منظر پیش کرتے تھے،

سید صاحب نے بھی ندوہ کے دوسرے مقاصد کی طرح اس مقصد کو بھی ہمیشہ حرز جان بنائے رکھا ۱۹۲۶ء میں سید صاحب کو جمعیۃ العلماء کی صدارت پیش کی گئی، تو انھوں نے اپنے خطبہ صدارت میں قوم پر ندوہ کے اس احسان کا ذکر علماء کے بھرے ہوئے مجمع میں ان الفاظ میں کیا،

"آج سے تیس برس پہلے جب کہ حالت یہ تھی اور معاملہ فہم علماء نے ندوۃ العلماء کی تاسیس کی کہ آئندہ اسلام کو جس قسم کے خدمتگزاروں کی ضرورت پیش آئے گی، اس کے لئے قبل از وقت تیاری ہو، اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں جدید و قدیم نئے اور پرانے خیالات اور جمود و نظریت کے بیچ میں صراط مستقیم قائم ہو گئی، اور پٹنہ کے اجلاس ندوۃ العلماء میں یہ موقع پیش آیا کہ طرہ و دستار (یعنی جدید و قدیم) میں مصالحت ہو گئی،

آج ہمارے درمیان جو چند مصلحت شناس، دوراندیش اور اصلاح کوش علماء کا وجود ہے

اور چند مخلص الایمان، جاں نثار اسلام اور دینی عقیدت سے سرشار جدید تعلیم یافتہ ہستیاں ہیں، وہ اسی مصالحت اور موافقت کے خوشگوار نتائج ہیں،"

یہ طرہ و دستار میں مصالحت سید صاحب ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھی،

مسلمانوں کی تفریقوں اور فرقہ بندیوں کا ایک بڑا سبب علماء کی غلط بینی اور ان کی تنگ نظری ہے، سید صاحب نے اسی مجمع علماء میں بڑے درد و سوز کے ساتھ ان کو اس خامی کی طرف متوجہ کیا،

"مسلمانوں کی مضبوطی کا راز خود ان کے درمیان باہم اتفاق و اتحاد اور رواداری ہے، تمام وہ لوگ جو قائل ہیں توحید و رسالت میں مشترک اسلامی مفاد کی غرض سے ملت کے اہم مشترکہ مسائل میں اپنی وحدت ارادہ اور وحدت عمل کا ثبوت دیں، اور مختلف فیہ مسائل میں اظہار اختلاف کے لئے مناسب لب و لہجہ اور طریقہ ادا سے کام لیں، مسلمان جس ملک میں تباہ ہوئے وہ حدیث مشہور کے مطابق دشمنوں کے حملہ سے نہیں، بلکہ آپس کے اختلاف سے"

(خطبہ صدارت ص ۵۲)

سید صاحب زندگی بھر اس جادۂ اعتدال اور محبت و مسامحت کی اس صراط مستقیم پر قائم رہے اور اپنی اس روش کی وجہ سے علماء میں سب سے زیادہ کامیاب رہے، اپنے سب سے زیادہ محبوب شاگرد مولانا مسعود عالم صاحب ندوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں،

"محبت، اعتماد اور مسامحت ہمارا دستور العمل ہے، چنانچہ اس وقت تک اس میں کامیابی ہوئی ہے، جس دن یہ بات نہیں رہے گی، میں نہیں رہوں گا،"

(مکاتیب سلیمان ص ۱۱۳)

سید صاحب کے اس طرز عمل کا اثر یہ ہوا کہ مختلف خیال کے لوگ اعتماد کرتے تھے، اور وہ ان کے آپس کے اختلافی مسائل میں اکثر حکم بنائے جاتے تھے، مولانا محمد علی اور مولانا عبدالباری کے سیاسی اور مذہبی

اختلافات کے زمانہ مین سید صاحب ہی کی ایک ذات ایسی تھی، کہ باوجود دوری کے ان پر دونون اعتماد کرتے تھے، چودھری خلیق الزمان اور مولانا عبد الباری کی کشمکش سید صاحب ہی کی کوششون سے ختم ہوئی، اس کے علاوہ علما کے مختلف گروہون اور افراد کے درمیان بھی عموماً سید صاحب ہی نقطۂ اتصال بنتے تھے، مولانا اشرف علی صاحب تھانوی اور مولانا حسین احمد مدنی مین بعض سیاسی مسائل مین اختلاف تھا اور ابھی انکے ماننے والون مین باقی ہے، گو سید صاحب کو مولانا اشرف علی صاحب سے تعلق خاطر زیادہ تھا، مگر مولانا حسین احمد مدنی اور ان کے متوسلین بھی سید صاحب پر پورا اعتماد کرتے تھے، اور یہ دونون مجلسون مین عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، علمائے پھلواری، علمائے بدایون، اور علمائے فرنگی محل کے مسلک سے سید صاحب کو یک گونہ اختلاف تھا، اور اس سے وہ لوگ واقف بھی تھے، مگر سید صاحب کی ندوی روش نے کبھی آویزش نہین ہونے دی، بلکہ یہ لوگ بھی ان کو بڑی وقعت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے، مسلم لیگ و کانگریس سیاسی اختلاف کی وجہ سے پورے ہندوستان کے مسلمان دو حصون مین بٹ گئے تھے، اور دونون مین عوام سے لیکر لیڈرون اور علمار مین شدید کشمکش پیدا ہو گئی تھی اس کشمکش مین بھی سید صاحب کبھی جادۂ اعتدال سے نہین ہٹے،

سید صاحب کی اس معتدل روش کا نتیجہ تھا کہ اُن کے زمانہ کی مختلف مذہب و مشرب کی تمام اہم شخصیتون سے اُن کے تعلقات تھے، ان سب سے ان کے ذاتی اور نجی تعلقات تھے، اور اس مدت مین کوئی ایسا قومی سیاسی، یا دینی کام نہین ہوا جس مین سید صاحب نے کوئی اہم حصہ نہ لیا ہو، سید کرامت حسین اکبر آبادی، نواب عماد الملک، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر انصاری، گاندھی جی، موتی لال، جواہر لال، نواب فضل اللہ، مسٹر راس مسعود، ڈاکٹر اقبال، ظفر علی خان، مولٰنا عبد اللہ غازی پوری، مولانا عبد الحی ناظم ندوۃ العلماء، مولانا عبد الباری فرنگی محلی، قاضی سلیمان منصور پوری، مولانا عبد الماجد بدایونی، شاہ سلیمان پھلواروی، مولانا سلیمان اشرف، مولانا ابو بکر شیث، مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی، مولانا حمید الدین

فراہی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی مولانا حسین احمد مدنی، مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی وغیرہ جیسے مختلف الخیال، اور مختلف المذاق اشخاص سے سید صاحب کا کسی نہ کسی درجہ مین تعلق تھا،

ممکن ہو کہ ان کی اس خوبی کو کوئی شخص خامی پر محمول کرے، مگر بہر حال اس "خامی" کے پیدا کرنے کے لئے بھی بڑی عالی حوصلگی، اور وسعت ظرف کی ضرورت ہے، جو بڑی مشکل سے پیدا ہوتی ہے،

سید صاحب ندوہ کی درسگاہ کے لئے عملی طور پر بھی بہت کچھ کیا ہے، دار العلوم ندوہ کی مسجد انھی کے دور کی یادگار ہے، عباسیہ ہال انھی کے دور مین مکمل ہوا، طلبہ کا دار الاقامہ انھی کی کوششون سے بنا، ندوہ کو ہزارون روپیے کی مالی امداد تنہا ان کی کوششون سے حاصل ہوئی،

سید صاحب کو ندوہ سے جو تعلق خاطر تھا، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ آخر عمر مین وہ ندوہ کے مقصد کے بغیر کوئی سفر کرنا بھی پسند نہین کرتے تھے، مولانا مسعود عالم صاحب کو ایک خط مین لکھتے ہین:-

"گو ڈھاکہ اور جاوا سے بلاوا تھا، مگر اب تک ندوہ کے بغیر سفر کرنے کو جی نہین چاہتا،"

ندوہ کے طلبہ مین کچھ دنون بدنظمی اور دینی احساس کی کمی ہو گئی تھی، ان کی کوششون سے جب یہ خامی دور ہونے لگی، تو ان کو حد درجہ مسرت ہوئی، اس مسرت مین مولٰنا مسعود عالم صاحب مرحوم کو لکھتے ہین،

"آپ سُن کر خوش ہون گے کہ دار العلوم کا رنگ بدل رہا ہے، طلبہ، ڈسپلن سے آشنا ہو رہے ہین"

سید صاحب ندوہ کے مقاصد اور اس کے طریقہ کار کو جامد چیز نہین سمجھتے تھے جن مین ضرورت کے مطابق کوئی تغیر نہین کیا جا سکتا بلکہ وہ اس کو ایک ترقی پذیر چیز سمجھتے تھے جس مین ضرورت کے مطابق تبدیلی کیجا سکتی ہے، انھی کو لکھتے ہین،

"ندوہ کے مقاصد و مطالب کو نئی روشنی مین پھر سے دیکھنا ہے، کہ اب کیا ہو اور

کیا کرنا ہے"۔

ندویوں کی تربیت سید صاحب کی یہی خواہش تھی کہ ان کی جیسی دینی حمیت اور جامعیت، اُن کی اعتدال پسندی اور حق پرستی، ان کا شیوۂ محبت و مسالمت ہر ندوی میں پیدا ہو جائے، وہ قدیم ندویوں کے مجمع میں ہوں یا جدید طلباء دار العلوم کے جھرمٹ میں سب کو یہی تلقین کرتے تھے تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے، اس لئے اُن کے خطوط کے چند اقتباسات یہاں پیش کئے جاتے ہیں، مولانا مسعود عالم کو لکھتے ہیں،

"الفرقان میں آپ کا مضمون دیکھا، دین کی حمیت کی شان دیکھ کر خوشی ہوئی، میری امیدوں کے مرکز آپ ہی جیسے چند عزیز ہیں،

مولانا مسعود عالم میں دینی حمیت اور توحید میں شدت و غلو کی وجہ سے بعض مصلحین سے ان کا تعلق غلو کی حد تک ہو گیا تھا، اُن کو اس کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔

تصلب و تعصب حکم دین میں ہوا چاہیئے، نہ کہ اشخاص اور ان کے مسالک میں خواہ حنفیت ہو یا وہابیت بل ملۃ ابراہیم حنیفاً۔

ایک خط میں قانون کے مقابلہ میں اخلاق کی اہمیت اور اظہار رائے میں صداقت کی طرف توجہ دلاتے ہیں:-

"میں قانون کے مقابلہ میں اخلاق زیادہ پسند کرتا ہوں، .... رائے عدل و صداقت کیساتھ دیجائے ولو کان ذا قربیٰ،

مولانا مسعود عالم ندوی نے اشتراکیت اور اسلام پر ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کیا، تو اُن کی ہمت افزائی کرتے ہیں، اور عہد جدید کے فتنوں کے مقابلہ پر ابھارتے ہیں،

"بہت خوب آپ نے اشتراکیت اور اسلام پر لکھنا شروع کر دیا، جی چاہتا ہے کہ جس طرح وقت کے دوسرے فتنوں کے ازالہ میں علمائے ندوہ نے کام کئے ہیں، اسی طرح وہ اس کے ازالہ میں بھی کام

کریں، اور آپ لوگ اس کے اہل ہیں،

یہ چند اقتباسات میں نے مولانا مسعود عالم ندوی کے مجموعۂ مکاتیب سلیمانی سے نقل کر دیئے ہیں، اس طرح کے خطوط وہ خورد و کلاں ندوی کو لکھتے رہتے تھے، مولانا شاہ معین الدین صاحب ندوی کو جو اس وقت انکے علمی جانشین ہیں، اس طرح کے بے شمار خطوط لکھے ہیں، خود اس عاجز کو انھوں نے جو تربیتی خطوط لکھے ہیں، اس کا ایک ایک جملہ حرز جان بنائے رکھنے کے قابل ہے،

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ،

سیرتِ سلیمانی کا عرفانی پہلو

از

جناب غلام محمد صاحب بی اے حیدر آبادی

اہل اللہ کی بزم قدس میں تین طرح کی ہستیاں نظر آتی ہیں، ایک تو وہ جن کی سیر تیں سر تا سر جذب و شوق اور معرفت کا آئینہ ہیں، مثلاً بایزید بسطامیؒ، شیخ عبد القادر جیلانیؒ، مجدد الف ثانیؒ وغیرہ، دوسری وہ جن کی زندگیاں گو بے داغ ہیں، لیکن ان کا جوہرِ عرفانی ایک عرصہ بعد کھلا ہے، جیسے امام غزالیؒ، عارف رومیؒ، شیخ فرید الدین عطارؒ وغیرہ، تیسری وہ ہستیاں جن کی حیات کبھی تو عام معیارِ اخلاق سے بھی پست تھی، مگر جب انقلاب آیا، تو رشکِ تقوی اور معیارِ معرفت قرار پا گئی، مثلاً سید الطائفہ جنید بغدادیؒ، حضرت بشر حافیؒ وغیرہ —— ہمارے ممدوح کا مقام اس اعتبار سے وسطانی زمرہ میں نظر آیا۔

ورثہ — انسانی سیرت دو ہی اجزا سے عبارت ہے، ایک تو موروثی صفات، اور دوسرے اکتسابی کمالات، ہمارے حضرت والاؒ کو دونوں جہتوں سے حظ وافر ملا تھا، وہ سید زادے تھے، شرافت و مروت، عفو و درگذر، ایثار و سخاوت، حلم و بردباری، عالی حوصلگی، اور پامردی حضرت کو ورثہ میں ملی تھی، پھر یہ بھی خوش بختی کی بات تھی کہ یہ صفات آپکے گرد و پیش کے بزرگوں میں پوری طرح نمایاں تھیں اور آپ کا ماحول علم و عرفان اور طہارتِ جسمانی و روحانی کا سنگم بنا ہوا تھا، آپکے والد ماجد ایک عالم و طبیب حاذق اور نقشبندی ابو العلائی سلسلے کے شیخ اور صاحبِ نسبت بزرگ تھے، راقم نے خود حضرت کو یہ فرماتے سنا کہ میں نے اپنے والد و حضرت مولانا

[فضل الرحمن گنج مرادآبادی] سے زیادہ بے نفس اور باخدا ہستیاں اپنی عمر میں نہیں دیکھیں، آپکے بڑے بھائی مولانا حکیم ابو حبیب جو عمر میں آپ سے ۱۲ سال بڑے تھے، دسنہ کے ایک مشہور طبیب جید عالم، اور حضرت شاہ ابو احمد بھوپالی مجددیؒ کے خلیفہ مجاز تھے، آپ کے چچا حافظ تجمل حسین صاحب ایک صاحبِ حال بزرگ اور شاہ فضل الرحمن گنج مرادآبادی کے خلیفہ تھے،

اکتساب — اس پاکیزہ ماحول اور ان اعلیٰ موروثی صفات کے ساتھ حضرت والاؒ کو کسب کمالات کے بھی پورے مواقع ملے، ابتدا ہی سے آپکے والد ماجد نے آپ کی اخلاقی تربیت کو ہمیشہ پیش نظر رکھا، پھر آپ کے بڑے بھائی مولانا ابو حبیب صاحب نے بھی پوری توجہ صرف فرمائی، خود حضرتؒ فرماتے تھے، کہ لڑکپن میں میں نے اپنے بڑے بھائی صاحب سے بیعت کی تھی اور ان سے کچھ ذکر اور مراقبات بھی کئے، اور ان کے حلقہ توجہ میں بھی بیٹھا کرتا تھا، اور ان کے فیض صحبت سے اپنے اندر پاکی محسوس کرتا تھا، لیکن یہ باطنی پہلو اس دور میں کچھ اجاگر نہ ہو سکا، کیونکہ اس وقت حصول علم مقدم تھا، چنانچہ ابتدائی تعلیم مدرسہ امدادیہ دربھنگہ اور پھلواری شریف میں پائی، اور پھر غالباً ۱۹۰۱ء میں ذہن و فکر کی آخری تربیت گاہ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں پہنچے، خداداد فہم و ذکا، اور پھر مولانا شبلی کی تعلیم و تربیت نے مل کر حضرتؒ کو صفِ علماء میں اس قدر ممتاز کیا کہ متنوع علوم و فنون کی جامعیت اور ان میں تحقیق و نظر کے اعتبار سے شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے بعد اگر نظر کہیں آکر ٹھہرتی ہے، تو وہ حضرت سید صاحب ہی کی ذات گرامی ہے ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء،

حکیم الامت سے مراسلت کا غیبی سبب — علوم و فنون کی فضاؤں میں تخت سلیمانی تو خوب پرواز کرتا رہا، مگر مولانا شاہ ابو حبیب صاحبؒ کی برکت سے روحانی عالم کے جو اثرات قلب سلیمانی پر پڑتے تھے، وہ ساری علمی مصروفیات کے باوجود قائم رہے، اور برابر فکر لاحق رہی، کہ کوئی شیخ کامل ایسا مل جائے جو روحانی پرواز میں مدد دے سکے، عجیب بات ہے کہ اواخر ۱۹۲۹ء میں حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے ایماء سے مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے رسالہ کشف الدجی لکھا، اور اس کا ایک نسخہ تقریظ کے لئے حضرت علامہ

کی خدمت میں ارسال فرمایا، ہمارے حضرت نے اس کے جواب میں حکیم الامت کو ایک خط لکھا اس کے مکتوب کی نقل
یہاں طوالت کا موجب ہوگی، البتہ اس کا جواب جو حکیم الامت کی طرف سے عطا ہوا وہ اقتباساً درج ذیل ہے
اس سے طرفین کی خط و کتابت کا حال معلوم ہو جائے گا:

مولانا المحترم دامت فیوضہم[1]

السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

عجیب بات ہے کہ انبساط کا قصد نہ میرا تھا نہ جناب کا، دونوں طرف اتفاقاً ہی اس کے اسباب
پیش آگئے، اس طرف کا واقعہ تو جناب نے تحریر ہی فرما دیا، اس طرف یہ واقعہ ہوا کہ میں نے باتعیین
کسی بزرگ کے پاس رسالہ بھیجنے کو نہ کہا تھا، دو وجہ سے ایک یہ کہ مجھکو بزرگوں کی فہرست ہی بہت
غیر مکمل معلوم ہے، دوسرے کسی کو ایسی تکلیف دیتے ہوئے ہمت نہیں ہوتی، خصوص اگر بزرگ
ہو، تو بے حد حجاب ہوتا ہے، یہ رسالہ میرے ہمشیر زادہ نے لکھا، اگرچہ میرے ہی کہنے سے لکھا، چونکہ
آج کل عام طبائع کی حالت پر نظر کرکے اس استفتاء کی مضرتِ عامہ کا قوی اندیشہ تھا، اس کے
انسداد کی سبیل انفع تدبیر علماء کی موافقت حاصل کرنا ذہن میں آیا کہ عوام پر اس کا خاص اثر
ہوتا ہے، اس لئے میں نے عزیز موصوف کو معارف دیکر مشورہ دیا کہ جہاں جہاں مناسب
ہو بھیج دیا جائے، میں ان کا ممنون ہوں کہ انھوں نے جناب کو بھی تکلیف دے کر یہ موقع دیا کہ
میں جناب کا مخاطب بن سکا، غرض یہ واقعہ ادھر سے ہوا، بہرحال حجاب مرتفع ہونے کے بعد اب
مضامین محبت کا جواب عرض کرتا ہوں، جناب کی تواضع نے ضرور مجھکو ایک معتد بہ درجہ
میں معتقد بنا دیا، اور غالب یہ ہے کہ آئندہ اس میں اضافہ اور قوت ہو، ...... مسئلہ
کے متعلق جس عنوان سے رائے سامی ظاہر فرمائی ہے، اس سے سہل اور دل میں اتر جانے والا
عنوان کم ذہن میں آتا ہے[2] بارک اللہ تعالیٰ معارفکم، ....

---

[1] حضرت حکیم الامت کے ہاں ہر ایک کے حفظ مراتب کا جو پاس و لحاظ تھا اس کی دلیل میں تنہا یہ مکتوب کافی ہے۔ حضرت مولا

آخر میں جو خانقاہ کے متعلق اپنا انجذاب اور اس کے ساتھ کچھ موانع محتمل کا ذکر فرمایا ہے،
اگر خانقاہ میں حضرت شیخ قدس اللہ سرہٗ اب رونق افروز ہوتے تو سب مضامین حقیقت پر منطبق
ہوتے لیکن اب محض حسن ظن پر منطبق ہو سکتے ہیں، اس سے آگے ہیچ، البتہ میں زیادہ تکلف کرنے
کو بھی اعادۂ حجاب سابق اور دوسرے انبساط لاحق سمجھ کر پسند نہیں کرتا، اس لئے بلا تکلف
معاملہ کی سچی بات عرض کرتا ہوں، کہ جناب کا یہ حسن ظن اگر کسی روایت پر مبنی ہے تو لائق تدقیق
ہے "اور اگر ذوقی و وجدانی ہے تو میں دوستی کرنے کے لئے تیار ہوں، بشرطیکہ مجھکو علوم میں محتاج
نہ بنایا جائے، کہ ان سے معرّا ہونے کو اوپر ظاہر کر چکا ہوں، والصدق ینجی والسلام

ناکارہ آوارہ ننگِ نام اشرف برائے نام

از تھانہ بھون، ۲۸ دسمبر ۲۵ء

اس پہلی مراسلت کے بعد جس کے سامان غیب ہی سے ہوئے تھے، ہمارے حضرت والا نے ایک اور
خط حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی خدمت میں لکھا جس کا متعلقہ جزو یہ ہے:-

---

(بقیہ حاشیہ ص ۲۸۶) کی رائے یہ تھی: "آپ (یعنی مستفتی) جس کو مکروہ سمجھتے ہیں، میں اس کو بھی روا کہتا ہوں، اور میرے
نزدیک تو نیل دقال و روایت سے زیادہ مستحکم دلیل عمل سلفِ کرام ہے اگر ایسا کھلا اور شدید الاحتیاج مسئلہ ہونے کے
باوجود کسی نے اس کو جائز نہیں بتایا، اور نہ کبھی اس پر عمل کیا،

[2] حضرت علامہ نے یہ تحریر فرمایا کہ تھا: "بار بار میرا دل جب زمانہ کے فتن و حوادث سے گھبرا اٹھتا ہے، اور
بے اختیار کسی سکینت و طمانیت کے مامن کی تلاش ہوتی ہے تو خانقاہ امدادیہ کی یاد آتی ہے، لیکن ڈر تھا کہ
معلوم نہیں کہ اجنبیت و بے گانگی سے میرے متعلق کیا کیا آپ تک پہنچا ہو، اور آپ مجھے تخاطب کا اہل بھی سمجھیں
یا نہیں، ...... اب میں اس کشمکش کی منزل میں ہوں جس میں علوم ظاہری تسکین کا باعث نہیں بنتے، دعا کا طالب
اور ہمت کا خواستگار ہوں"،

"میرے لئے کوئی ایسا نسخہ تجویز فرمائیں، کہ مجھ میں استقامت و تثبت اور رغبت الی الطاعات پیدا ہو، فرائض کا پابند ہوں، بدعات سے نفور ہوں، کبھی کبھی ذوقِ سجود کی لذت بھی پاتا ہوں، امام ربانی مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے سلسلے سے عقیدت تام ہے، خرافات و طاماتِ صوفیہ کا منکر ہوں، ....."

اس کے جواب میں حکیم الامت نے اپنے رسالہ "قصد السبیل" کی تسہیل روانہ فرمائی، اور ساتھ ہی گر کی باتیں یہ تحریر فرمائیں جو عطر تصوف ہیں،

"مامور بہ وجوباً یا استحباباً اس طریق میں صرف افعال ہیں، انفعالات نہیں، مثلاً استقامت و تثبت و رغبت الی الطاعات والتزام فرائض و تنفر عن البدعات ولذت و ذوق و اخلاص و اصلاحِ قلب و امثالہا، ان میں جو چیزیں یا بعض چیزوں کے جو اجزا افعال ہیں، وہ مامور بہ ہیں، کیونکہ وہ اختیاری ہیں، اور جو انفعالات ہیں، وہ مامور بہ نہیں، کیونکہ وہ غیر اختیاری ہیں، البتہ وہ انفعالات بعضے مطلقاً بعضے خاص احوال میں محمود و ثمرہ ہیں، اور اسی درجہ میں مطلوب بھی ہیں، مگر وہ سب آثار و ثمرات انہی افعال کے ہیں، اور وہ افعال ہی اُن کے اسباب ہیں، کہ ان کی طرف فی الجملہ یا فی الاکثر مفضی ہیں ان کے علل نہیں کہ ان سے متخلف ہی نہ ہوں، اگر تخلف بھی ہو تو مضر نہیں، کیونکہ اصل مقصود قرب و رضا کی وہ ثمرہ طبعی نہیں، والسلام"

رکاوٹ

مذکورہ بالا مکاتبت کے بعد ایک اور خط ان بزرگوں کے درمیان آیا، اور گیا، اور اس پر آخری تاریخ ۲۹ رشوال ۵۳ھ کی ملتی ہے، انگریزی لحاظ سے ۳۵ء کا کوئی مہینہ ہوگا، اس کے بعد پھر تقریباً دس برس تک کے لئے استفادہ و افادہ کا سلسلہ منقطع رہا، اور اس کی وجہ راقم نے خود حضرت والا کی زبانی یہ سنی ہے کہ اس زمانہ میں تھانہ بھون سے رسالہ "النور" مولانا ظفر احمد عثمانی کے زیر ادارت نکلتا تھا، اور اس میں گاہ

سے معارف، جب جب حکیم الامتؒ کی خدمت میں عریضہ لکھنے کا ارادہ ہوتا تو کوئی نہ کوئی اختلافی مسئلہ النور میں شائع ہوتا، اور اس کی وجہ سے طبیعت میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی،

پہلی حاضری

۱۹۳۴ء کے ختم اور ۳۵ء کے آغاز کا زمانہ تھا، حضرتِ والاؒ ڈاکٹر اقبال مرحوم کی دعوت پر کسی کمیٹی میں شرکت کے لئے لاہور تشریف لے گئے، اب تک مولانا تھانوی قدس سرہٗ سے کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی، لاہور سے واپسی میں خیال آیا کہ تھانہ بھون کچھ دیر کے لئے اتر جائیں، چنانچہ یہ اندرونی تقاضا پورا ہوا، اور اس حاضری سے مرشد تھانوی نے جو اثر لیا، اس کو خود انہی کے جچے تلے موثر الفاظ میں سنئے، مولانا عبد الماجد دریابادی کے نام ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں،

"مولانا سید سلیمان ندوی صاحب دفعۃً تشریف لے آئے، میں مکان پر تھا، سنتے ہی حاضر ہوا، پہلے سے ذہن میں ان کا جثہ طویل و عریض تھا، ملا تو معتدل الخلقت پا کر قلب کو بہت انس ہوا، پھر ملاقات و مکالمت سے ان کی تواضع و سادگی و رعایتِ جلیس دیکھ کر تو مسخر ہی ہو گیا، گیارہ بجے تشریف لائے تین بجے واپس تشریف لے گئے، مجلس میں بہت دیر تک ثنا خوانی کرتا رہا،"

رجوع اور بیعت

اس ملاقات سے ظاہر ہے کہ فریقین کے دل محبت و عظمت سے معمور ہو چکے تھے، لیکن پھر بھی ایک عرصہ تک خط و کتابت کی صورت نہ نکل سکی، حالانکہ اس عرصہ میں سلیمانی نگاہ 'مرشد کامل' کے لئے برابر متلاشی تھی، اور ادھر ادھر پھر اگر کہیں ٹھہرتی تھی تو وہ تھانہ بھون ہی کے شیخ الشیوخ کا آستانہ تھا، اس عرصہ میں ایک مرتبہ حضرت والاؒ کو عالم رؤیا میں شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کی زیارت نصیب ہوئی، حضرت سیدؒ نے اپنے سینہ کی طرف اور حضرت حاجی صاحبؒ کے سینہ مبارک کی جانب اپنے ہاتھ سے اشارہ

۱؎ کیسی ستم ظریفی ہے، وہ لوگ جنھوں نے بزعم محبت یہ مشہور کر رکھا ہے کہ سید صاحب گئے تو تھے ملنے کے لئے لیکن مولانا تھانوی نے ان کو مسخر کر لیا، اور خود مرید بنا لیا، اس بیان میں اگر مولانا تھانوی کی شکایت ہے تو سید والا مرتبت کے رتبہ عالی کا کونسا پاس لحاظ ہے؟ ۲؎ حکیم الامت ص ۴۳۵

کرتے ہوئے عرض کیا "اس کو ایسا کر دیجئے"، حضرت حاجی صاحب مسکرائے اور فرمایا "اب تو مین یہ کام نہین کرتا"۔ حضرت سیدیؒ کا بیان ہے کہ اس کی تعبیر یہ ذہن مین آئی کہ حضرت حاجی صاحب چونکہ عالمِ ناسوت سے تعلق منقطع فرما چکے ہین، اس لئے اُن کو عذر ہے، اور اُن کے کسی جانشین سے تعلق جوڑنا چاہئے، چنانچہ پھر نظر حکیم الامت ہی پر پڑی، ساتھ ہی اس کا بھی اعتراف فرماتے تھے کہ حکیم الامتؒ سے تعلق قائم ہونے مین مولوی عبدالباری صاحب ندوی کے اصرار کو بھی دخل ہے، غرض پھر مستقل تعلق کے اسباب یون پیدا ہوئے کہ حکیم الامت قدس سرہ اگست ۱۹۳۸ء مین اپنے علاج کے سلسلہ مین لکھنؤ تشریف لائے تھے، اس موقع کو حضرت والا نے غنیمت سمجھا، اور حاضرِ خدمت ہو کر مستقلاً رجوع ہو کر بیعت سے مشرف ہوئے،

حضرتِ والاؒ کی بیعت کے سلسلہ مین ایک واقعہ کا اظہار خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ دو معتبر راویون[5] سے حقیر نے یہ بات سنی ہے کہ قطب ارشاد مولانا تھانوی جب لکھنؤ تشریف لے گئے، تو تھانہ بھون مین ایک مجذوب نے آپکے ایک مرید سے پوچھا "تمھارے پیر کہان گئے ہین"؟ انھون نے عرض کیا کہ علاج کے سلسلہ مین لکھنؤ تشریف لے گئے ہین، اس مجذوب نے قہقہہ لگایا، اور کہا "علاج ولاج تو ایک بہانہ ہے ایک شہباز کے شکار کو گئے ہین، شکار کر لائین گے" ـــــ چنانچہ جب حضرت والاؒ کے رجوع و بیعت کی اطلاع عام ہوئی تو سب کو اس قلندر کی بات کا یقین آگیا ع

قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید

خصوصی ربط

غرض اب کیا تھا، اُدھر قوتِ فیضان جوش زن اور ادھر طلبِ صادق بے اندازہ، چنانچہ اسی اضطراب مین فرماتے ہین،

نغمۂ بے گانہ بھلا کیا ترجمانی کر سکے ۔۔۔ شوق بے اندازہ پیچیدہ ہے میرے دل مین جو

جام پر جام مجھے دے کے بنادے بہزاد ۔۔۔ مہبرسر جوشیِ اذکار کہان سے لاؤن

[5] مراد حاجی عثمان خان صاحب مرحوم مالک کتب خانہ اشرفیہ اور محترمی ڈاکٹر عبدالحی صاحب مدظلہ ہین،

دیر سے آیا ہون ساقی دور سے آیا ہون مین ۔۔۔ ہو عطائے خاص مجھکو جو عطائے عام ہے[1]

اور حضرت شیخ نے بھی اس تشنگی کو بجھانے کی پوری سعی فرمائی، بارگاہِ تھانویؒ کے ایک ممتاز خلیفہ مولانا مفتی محمد حسن صاحب نے کئی بار فرمایا کہ حضرت سید صاحب جب خانقاہ مین تشریف لائے تو ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی طبیعت مین ایک جوش پیدا ہو جاتا، اور معلوم یون ہوتا کہ گویا جوان ہو گئے ہین، گھنٹہ بھر کی محفل کو دو دو گھنٹہ کا طول دیتے تھے، اور محترم ڈاکٹر عبدالحی صاحب نے فرمایا کہ خود حکیم الامت مجھ سے فرماتے تھے کہ جب رات کو دو بجے آنکھ کھلتی ہی، تو جی چاہتا ہے کہ سید صاحبؒ کو بلالون اور باتین کرتا رہون، مگر اُن کی زحمت کے خیال سے چُپ ہو جاتا ہون،

شیخ و مرید کے اس خصوصی ربط سے متعلق کم از کم دو روایات اور سنائے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہین چاہتا۔ـــ

ایک مرتبہ حضرت سیدی خانقاہ مین تشریف لے جا رہے تھے محفل آراستہ تھی، حکیم الامت کی نظر جو سید والا پر پڑی، تو بے ساختہ کھڑے ہوگئے، مرید صادق نے بڑھ کر عرض کی "حضرت تشریف رکھین"، تو ارشاد فرمایا، "واللہ مین تعظیماً کسی کے لئے نہین اٹھتا، مین تو فرطِ محبت سے کھڑا ہوگیا"

ایک مرتبہ حکیم الامت نے ایک چھڑی تحفۂ محبت کے طور پر بھیجی، اور اس کے ساتھ ایک رقعہ بھی جس کا آغاز اس پر از محبت اور بلیغ جملہ سے فرمایا تھا :

"راحتِ جان! راحتِ جسم کا سامان بھیج رہا ہون"

حضرت سیدیؒ نے اس عطائے شیخ کو دل و جان سے قبول فرما کر جواباً تحریر فرمایا کہ

[1] یہ سب اشعار حضرت سیدی کے ہین، ان کو بطور استدلال پیش کرنے مین اس لئے تامل نہین کہ حضرت والا نے خود اپنے اس دور کے کلام کے متعلق فرمایا کہ "یہ تو میرا سفرنامہ ہے" اس کلام کا آغاز اور انجام حکیم الامت سے رجوع اور اُن کی رحلت پر ہوا، جس مین بہ مشکل پانچ چار غزلین ہوئی ہین، اس مجموعہ کا نام حضرت والا نے "غزل الغزلات" تجویز فرمایا تھا کہ یہ نام حضرت سلیمان علیہ السلام کے مجموعہ کلام کا تھا، (غ)

"اس عطائے خاص سے میں نے استقامت فی العمل کی تعبیر لی"

حضرت شیخ نے جب یہ عارفانہ جواب پڑھا تو انبساط سے معمور ہو گئے، اور اس کا ایک طویل جواب تحریر فرمایا، جو سراسر دعاؤں سے لبریز تھا[1]

مولانا مفتی محمد حسن صاحب نے فرمایا، کہ ہم لوگوں کو تعجب ہوتا تھا، کہ حضرت سید صاحب کو اتنی جلد یہ قدر رسوخ کیسے حاصل ہو گیا، مگر بعد کو پتہ چلا کہ یہ جوہر ہی کچھ اور تھا،

اسی اثنا میں حضرت علامہ نے حکیم الامت کی تحریک اور اشارہ کے بغیر اپنے احساس سے مجبور ہو کر بعض اختلافی مسائل میں رجوع و اعتراف کا مضمون "معارف" میں شائع فرمایا اور اس کو ملاحظہ کے لیے بھیجا، تو حضرت شیخ بے حد مسرور ہوئے، اور خلافِ عادت دس بارہ توصیفی اشعار مثنوی کے وزن پر لکھ کر بھیجے[2] چند یہ ہیں :-

از سلیمان گیر اخلاصِ عمل	دان تو نروی رانزہ از دغل
اے دلت معمور از اسرارِ حق	اے دولت مخمور از آثارِ حق
اے دلت پر نور از انوارِ حق	اے دلت مسرور از اخبارِ حق

ہم کو نہیں معلوم کہ حسام الدین چلپی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد یہ سعادت بجز حضرت سیدیؒ کے کسی اور کے بھی حصہ میں آئی ہو کہ شیخ نے مرید کی مدح میں بے ساختہ اشعار کہے ہوں،

---

[1] یہ دونوں باتیں حضرت سیدی نے احقر سے تنہائی میں ایک مرتبہ فرمائی تھیں، اور پھر اس کی اجازت بھی عطا فرمائی تھی کہ احقر اس خط و کتابت کی نقل کر لے، جو حکیم الامت اور ان کے درمیان رہی، مگر مرض الموت کی وجہ سے خود یہ خزانہ نکال کر عطا نہ فرما سکے، اور حضرت کے صاحبزادہ اپنی پریشانیوں میں اس سلسلہ کے ارشادِ پدری کی تعمیل سے قاصر رہے، ورنہ احقر اس سے بڑی مدد ملتی، تین چار ابتدائی خطوط کی جو نقلیں مل گئیں، وہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا کرم ہے۔ [2] یہ محرم ۱۳۶۱ھ کا واقعہ ہے،

خلافت

برسوں کی منزلیں دنوں میں طے ہوتی چلی گئیں، ایک مرتبہ حکیم الامت کی طرف سے ایک گرامی نامہ وصول ہوا جس کا عنوان تھا "استشارہ بعد از استخارہ" اور اس میں لکھا تھا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کو خلافت دوں، اس سلسلہ میں میں نے استخارہ بھی کر لیا اب آپ کا کیا مشورہ ہے؟ حضرت سیدیؒ نے فرمایا کہ چونکہ قریب ہی میں تھانہ بھون کی حاضری کا قصد تھا، اس لئے میں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا، بلکہ جب حاضر خدمت بھی ہوا تو خاموش ہی رہا، آخر ایک دن حضرت والا کی طرف سے ایک پرچہ ملا کہ "آپ نے میرے استشارہ کا جواب نہیں دیا"

اس اصرار پر میں نے یہ جواب لکھا کہ

"حضرتِ والاؒ کا مکتوبِ گرامی پڑھ کر قدموں تلے سے زمین نکل گئی، کہاں میں اور کہاں یہ ذمہ داری"[1]

بس یہ جواب پانا تھا کہ شیخ الشیوخ کے قلب سے الحمد للہ کی ایک صدا اٹھی اور سید والا مرتبت کو خلافتِ باطنی سے سرفراز فرما کر مسند ارشاد پر بٹھایا ——— اور اس بات کے راوی حضرت حاجی عثمان خان صاحب مرحوم ہیں جو حکیم الامتؒ کے فدائی اور خلیفہ مجاز تھے کہ حضرت سید صاحب کو خلافت عطا فرما کر حضرت والا اس قدر مطمئن تھے کہ بارہا فرمایا کہ الحمد للہ اب مجھے کچھ فکر نہیں، میرے بعد ایسے ایسے لوگ موجود ہیں، ذَالِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَاءُ،

شور و غوغا

حیرت ہے کہ عین اس وقت جب کہ بارگاہِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا سیرت نگار اپنے ممدوح کی حیاتِ طیبہ کے آخری نقش و نگار سے اپنی زندگی کو آراستہ کرنے میں مشغول تھا، بے بصروں نے اس کے خلاف ایک شور و غوغا بپا کیا کہ علامۂ عصر نے مسندِ علم چھوڑ دی، عین اس وقت جب کہ وہ "آبروئے ندوہ" اپنے ساتھ ایک جماعتِ کثیر پیدا کر کے اور اس کو بہر کار لگا کر تسبیح بحمد ربک واستغفرہ کی منزل طے کر رہا تھا بعض نادانوں نے اوس کے اس عمل کو تعطل قرار دیا، عین اس وقت جب کہ وہ پیکرِ عبودیت اُن ساری خدمات علمیہ

---

[1] یہ سب روایت بالمعنی سمجھی جائے، مگر مفہوم کی صحت میں کوئی کلام نہیں، (رغ)

سے فارغ ہوکر جو ایک ادارہ سے بھی ممکن نہ تھین، فاذا فرغت فانصب والی تربیت ہو رہا تھا، مدعیانِ دانش نے اس پر اعتراض کیا کہ تشغل کیا؟ —— لیکن اس عارف نے اس سارے شور وغل کا جواب اپنے عمل کے استحکام اور معنی خیز تبسم کے ساتھ یہی دیا،

دستارِ فضیلت ہو یا دلقِ مرقع ہو
ہونا ہے اُسے اک دن نذرِ مئے ویخانہ

کبھی خود ماننے والون نے زیادہ شور مچایا، تو صرف اتنا فرمایا کہ لوگ مجھکو کہتے تو محقق اور علامہ ہین، مگر درحقیقت بے عقل جانتے ہین، —— اور اگر کبھی کسی نے زیادہ احسان جتایا، تو صاف یہ جواب لکھ دیا کہ جن کمالات کی بنا پر آپنے مجھے اپنا قبلہ بنایا تھا، انہی کمالات نے مجھکو مولانا تھانوی کے آگے جھکا دیا، مین نے اپنے انجام پر نظر کرلی، اب آپ کو اختیار ہے کہ اپنا قبلہ کوئی اور تجویز کرلین،

یہ ہنگامہ کوئی نیا یا ہمارے سید ذی شان کے ساتھ خاص نہین، عرفار و اتقیار کی تاریخ مین ایسی اور بھی مثالین مل جاتی ہین، —— عارف رومیؒ نے جب شمس تبریزؒ کا دامن تھاما تھا، تو کیا خود مولانا رومیؒ کے شاگردون نے شمسِ تابان پر دھول جھونکنے کی کوشش نہین کی؟ اور کیا بالآخر انہی ناقدرون کے ہاتھون عارف رومیؒ کو مدتون بادیہ پیمائی نہین کرنی پڑی؟ —— اسی طرح امام غزالیؒ کو بھی اس مرحلہ پر پہنچ کر کیا کچھ نصیحتیں سننی نہ پڑین، خود امام عالی مقام ہی کی زبانی کچھ روداد سنیئے:-

"علما، اور ارکانِ سلطنت کو جب خبر ہوئی تو سب نے نہایت الحاح کے ساتھ روکا اور حسرت سے کہا کہ یہ اسلام کی بدنصیبی ہے، ایسی نفع رسانی (یعنی درس و تدریس) سے آپ کا دست بردار ہوجانا شرعاً کیونکر جائز ہو سکتا ہے؟ — تمام علما، و فضلا، یہی کہتے تھے لیکن مین اصل حقیقت کو سمجھتا تھا، اس لئے سب کو چھوڑ چھاڑ دفعۃً کھڑا ہوا، اور شام کی راہ لی[51]"

[51] الغزالی از علامہ شبلی نعمانی،

کیسی یکسانیت ہے عارف رومیؒ و امام غزالیؒ، اور اسی دور کے سید العلمار والصلحار، مسند نشین شبلیؒ و اشرفؒ مین!!

فنار الفنار

سچ کہا ہے ایک صاحب نظر نے کہ حضرت سید صاحب کو عروج کی حالت مین تو لوگون نے کچھ سمجھا پایا بھی، مگر نزول کے عالم مین کوئی سمجھ ہی نہ سکا کہ ان کا کیا مرتبہ ہے[52]، راقم بلاخوف تردید عرض کرتا ہے کہ حضرت والا، کا پہلا قدم وہان پڑا، جو بہت سون کی انتہا ہے، تفصیل کا موقع نہین، فنی زبان مین مختصراً یہ سمجھ لیجئے کہ ایک شہرۂ آفاق محقق و مفکرِ اسلام اور ایک مرجع علمائے عصر شخصیت کا کسی شیخ وقت کے آگے اپنے آپ کو مٹی کردینا ہی اس امر کی بین دلیل ہے کہ وہ مرتبۂ نفس سے گذر کر مرتبۂ روح مین داخل ہوگیا، اور مرتبۂ نفس کا طے کرلینا بلا مبالغہ بہت سون کی منتہا ہے، —— پھر جب اس منزل پر بھی حضرتِ والا نے اپنے شیخ عالی مقام سے عرض کیا کہ حضرت کچھ نصیحت فرما دیجئے، تو حکیم الامتؒ کا خود بیان ہے کہ وہ کچھ دیر کے لئے سوچ مین پڑ گئے کہ ایک عالم عصر کو کیا نصیحت کرین، کچھ سمجھ مین نہ آیا تو یہی فرمادیا کہ اس راہ کی ابتدار و انتہا فنا ہے[53]، یہ بات خاطرِ سلیمانی مین اس درجہ جم گئی، اور اس کے بعد اپنے آپ کو اسی قدر مٹایا کہ خود مٹنے کا احساس بھی جاتا رہا، فنا سے گذر کر فنار الفنار تک پہنچ گئے، مدح و ذم ایک ہوگئی، مفوض کامل بن گئے، خود حضرت حکیم الامتؒ کے متعدد خلفائے اجل مثلاً حضرت مفتی محمد حسن صاحب، مولانا محمود الغنی صاحب، حاجی محمد عثمان خان صاحب مرحوم، مولانا عبد الباری صاحب ندوی، ڈاکٹر عبد الحی صاحب، مولینا مسیح اللہ صاحب وغیرہ کو راقم نے اس معاملہ مین ایک زبان پایا کہ حکیم الامت قدس سرہ سے فنائیت کا درس جیسے حضرت سید صاحب نے حاصل کیا، اور جو کمال اس مرتبہ مین پیدا کیا، وہ کہین اور نظر نہین آتا، —— مثالین اس کی چند ہوتین تو نقل بھی کرتا، یہ تو ایک مستقل باب ہے،

[52] یہ ڈاکٹر عبد الحی صاحب مد ظلہ کا جملہ ہے، [53] یہ واقعہ تفصیلاً اشرف السوانح مین موجود ہے، مگر بغیر نام کے صرف ان الفاظ کے ساتھ کہ "ایک فاضل اجل نے مجھ سے نصیحت کیلئے فرمایا"!

ع : سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکران کے لیے

بس اس وقت تو بزرگوں کی تصدیقات ہی پر یقین کر لیجیے!

صبر و شکر

حیاتِ سلیمانی کا بڑا حصہ شکر ہی کا آئینہ ہے، علم و فضل، عزت و عظمت، دولت و ثروت ہر اعتبار سے ہمیشہ سرفراز رہے، مگر آخر عمر کے دس برس میں، اپنوں کی ناقدری و ناسپاسی، اپنے محبوب ادارہ دارالمصنفین سے جدائی، تقسیمِ ہندوستان کے بعد کراچی کا قیام[1]، اور یہاں کی مالی اور ذہنی پریشانیاں یہ سب ایک مستقل مجاہدۂ اضطراریہ تھا، پھر شدید شدید بیماریوں کا سلسلہ اس سے الگ ہے ـــ یہ وقت صبر کی آزمائش کا تھا، اور دیکھنے والوں نے حضرت سلیمانؒ کے ظرف عالی کو، دیکھا کہ وہ کس وقار اور متانت سے یہ مقام بھی طے کر گئے، مجھے ایک معتقد کی حیثیت سے یہ بات کھٹک جاتی تھی کہ ایک پیکر مروت و شرافت اور ایک مرنجان مرنج ہستی کے خواہ مخواہ لوگ کیوں درپے آزار ہو گئے تھے؟ حضرت سیدی کی رحلت کے بعد اپنا یہ استعجاب استاذی و مخدومی مولانا مناظر احسن گیلانی مدظلہ کی خدمت میں پیش کیا، اس کا جو عارفانہ جواب حضرت گیلانی کی طرف سے ملا، اس سے رنج و غم کے بادل چھٹ گئے، آپ بھی اس کو سن کر بصیرت و سکینت حاصل کیجیے،

"ہمارے سید الملت قدس اللہ سرہ العزیز کی صابریت کے جن حالات کی طرف آپنے اشارہ فرمایا ہے، ان کا تعلق سچ پوچھئے تو اس جہان سے زیادہ نہ تھا، ان کی زندگی کا بڑا حصہ شکوریت کے زیر اثر گذرا تھا، صابریت کی منزلیں رہی جاتی تھیں، زندگی کے آخری دور میں ان منزلوں سے بھی وہ گذر گئے، اور خوب گذرے، صرف علامہ، ڈاکٹر اور اعظم المصنفین ہی ہونا ان کے لئے مقدر نہ تھا،

سید العارفین بن کر رفیق اعلیٰ میں قدرت نے ان کو بلانا چاہا، اسی کا نظم کیا گیا۔ـــ

[1] اس کی کچھ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو احقر کا مضمون "علامہ سید سلیمان ندوی اور کراچی کے تین سال" جو ریاض کے خصوصی نمبر بابتہ ماہ مارچ ۵۵ء میں چھپا ہے۔

..........اذیت نہ ہو تو صبر کا مطلب ہی بے معنی ہو جاتا ہے، صابریت کے اس دور میں ان کو اذیت ہوئی، اور کافی اذیت ہوئی، لیکن جس راہ پر اب پڑ چکے تھے، اس راہ کی سرا اذیت دوسرے عالم کی مسرتوں کی ضمانت بنتی چلی گئی، انما یوفی الصابرون اجرهم بغیر حساب، یہ شعر نہیں لاہوتی حقیقت ہے"

(مکتوب مورخہ ۱۵؍فروری ۵۴ء)

جود و سخا

بخشش و عطا بزرگوں کا ایک خاص وصف ہے، بعض بزرگوں میں یہ وصف عیاں ہے، اور بعض میں مخفی، بھوپال کی حاضریوں میں اور کراچی کے دوران قیام میں احقر کو اس کا اندازہ ہو گیا تھا، حضرت والا چپکے چپکے بڑے اعتدال سے، مالی ایثار فرمایا کرتے تھے، لیکن رحلت کے بعد میرے ساتھ ایک عجیب معاملہ پیش آیا جس سے شیخ کے دست کرم کی وسعت کا اندازہ ہوا، مرض الموت سے کچھ قبل احقر نے اپنی مالی پریشانیوں کا اظہار کیا تھا اور اس سے مقصود بھی بجز حصولِ دعا کے اور کیا ہو سکتا تھا، پھر مرض الموت میں تو اس کا ذکر بھی بے جا تھا، لیکن وہ سراپا مہر و کرم ہستی، اس ناکارہ کے حال پر اس درجہ متوجہ تھی کہ میری پریشانی کا خیال آخر وقت تک قائم رہا، اور اس درد کی درمانی کیے بغیر چین نہ آیا ـــ رحلت شیخ قدس سرہ کے شاید ہفتہ بھر بعد حضرت کی اہلیہ محترمہ مدظلہا نے ایک بند لفافہ اس ہدایت کے ساتھ عنایت فرمایا کہ گھر جا کر اس کو کھولئے، ـــ میں یہی سمجھتا رہا کہ شاید کوئی راز کے کاغذات ہوں، یا حضرت والا کے مکتوبات، لیکن گھر پہنچ کر جو لفافہ کھولا، تو اس میں یہ خط دیکھ کر آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، اور پھر رقت طاری ہو گئی:-

"عزیز القدر سلمہ ـــ السلام علیکم

"مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ، بجز صبر کے انسان اور کیا کر سکتا ہے، حضرت مولانا جب حیات تھے تو اکثر و بیشتر آپ کو ایک ہزار روپیہ ہدیہ دینے کو کہا کرتے تھے، مگر میں اپنی غفلت یا ان کی علالت کا الجھاؤ کہیے کہ ان کی حیات میں پورا نہ کر سکی، اب یہ ان کی خواہش کے مطابق آپ کو ہدیہ کر رہی ہوں

آپ اس کو قبول کرکے ممنون فرمائیں، آپ کو یہ رقم دے کر میرا قلب بہت مطمئن ہے، اور اللہ پاک
کی رحمت سے اُمید ہے کہ اُن کی روح کو بھی مسرت اور سکون ہوگا، رب رحیم اُن کو اعلیٰ مرتبہ عطا
فرمائیں، میرے خاتمہ بالخیر کے لئے ہمیشہ دعا کیجئے،

والسلام — والدۂ سلیمان

خدا جانے فیض روحانی کے ساتھ ساتھ جود وسخا کے دریا بھی کتنے بہائے گئے — قدس اللہ اسرارہٗ،

کشف والہام | کشف والہام اور کرامت جیسی نہ مقصود ہیں نہ مطلوب، نہ اُن کو قرب الٰہی میں کوئی دخل ہے
البتہ بقول حکیم الامتؒ یہ قرب سے ناشی ضرور ہیں، اور جو حضرات ان کی اہمیت کی نفی کرتے ہیں، وہ ان علوم
سے کچھ خالی نہیں — حضرت مرشدیؒ کی خدمت میں جو لوگ حاضر ہوتے رہے، وہ سب اس بات کو محسوس
کرتے رہے کہ جو اشکال ذہن میں لے کر گئے، شیخ نے از خود ایک جملہ میں اس کا جواب عطا فرمایا، اور عرض
معروض کی نوبت ہی نہ آئی حتی کہ بعض مرتبہ یہ بھی ہوا کہ کئی کئی افراد کے ذہن میں مختلف نوعیت کے شبہات
تھے، اور حضرت شیخ نے جب گفتگو فرمائی، تو ہر ایک کے شبہ کا ازالہ ہوگیا، حالانکہ کسی نے اس کا اظہار
نہ کیا تھا، — "جگ بیتی سنانے کے لئے تو ایک مستقل باب کھولنا ہوگا" آپ بیتی کا ایک جزو پیش کرتا ہوں:

ستمبر ۱۹۴۷ء میں پہلی مرتبہ حضرت شیخ کی خدمت میں بھوپال حاضر ہوا، دو دن بعد ذہن میں یہ وسوسہ
آیا کہ یہاں آنے سے حاصل کیا ہوا، یہ نماز روزہ[1] تو گھر پر بھی ہو ہی رہا تھا — اس وسوسہ سے بچنے کی
وہ تمام تدبیریں اختیار کرلیں جو حضرت حکیم الامتؒ نے تجویز فرمائی ہیں لیکن وسوسہ تھا کہ بڑھتا ہی چلا
جارہا تھا، حتی کہ ۲۴ گھنٹے اس خیال پر گذر گئے، اور میں نے حضرت والاؒ سے اس سلسلہ میں کچھ عرض نہ کیا،
دوسرے دن عصر کی نماز کے لئے حضرت والاؒ مسجد جارہے تھے، احقر بھی ساتھ تھا، چلتے چلتے دفعۃً رُکے
چیں بجبیں ہوکر احقر کی طرف دیکھا، اور فرمایا : "تو نے مجھ پر کوئی احسان کیا" — بس یہ فرماکر پھر آگے بڑھ گئے

[1] یہ رمضان کا مہینہ تھا،

احقر کو یوں محسوس ہوا کہ کسی نے سر پکڑ کر خوب اچھی طرح جھنجھوڑ دیا، اور وہ وسوسہ کافور تھا! — بعد انتقال
جب احقر نے اپنی اس حالت کا ذکر کیا، تو تبسم ہوئے، اور فرمایا،

"ہمارے حضرت والاؒ فرماتے تھے کہ جہاں خزانہ ہوتا ہے، چور وہیں نقب لگاتا ہے"

انشاء اللہ آپ کو فائدہ ہوگا،

دوسری مرتبہ مارچ ۱۹۴۹ء میں پھر خدمت شیخ میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی، حضرت والاؒ
کچھ بیمار تھے، ایک روز پلنگ پر جو کمرہ کی دیوار سے متصل لگا ہوا تھا، دیوار ہی کی طرف رُخ کرکے لیٹے ہوئے
تھے، خادم سرہانے کے قریب بیٹھا ہوا تھا، میرے دل میں اپنے شیخ کی عظمت و محبت کے خیالات موجزن
ہوئے، یکایک حضرت اقدس نے کروٹ بدلی اور مسکرا کر احقر سے فرمایا،

"آپ تو بس یہ سمجھئے کہ "پیر من خس است و لے اعتقاد من بس است"

یہیں قیام کراچی کے دوران میں میں نے حسب عادت اپنا ایک احوال نامہ (جو ملفوف تھا) پیش
کیا، اس میں کچھ عقلی الجھنوں کا ذکر تھا، — بس جوں ہی عریضہ ہاتھ میں لیا، فرمانے لگے،

"معلوم ہوتا ہے فلسفیانہ کتابیں آج کل زیر مطالعہ ہیں، اُن کو چھوڑ دیجئے، اس میں کیا رکھا ہے!"

احقر کے والد ماجد سلسلۂ نقشبندیہ سے منسلک ہیں، اور مولانا سید عبد اللہ صاحب مجددی حیدرآبادی
صاحب زجاجۃ المصابیح کے مرید رشید، وہ فرمایا کرتے ہیں کہ حضرت والاؒ کا مکاشفہ بھی بڑا زبردست تھا
گو وہ اس کا اظہار نہیں فرماتے تھے!

اور یہ تو حاضری کا معاملہ ہوا، ورنہ حضرت والاؒ کے سارے منتسبین خواہ وہ ہندو پاک کے کسی گوشہ
میں ہوں اس برکت کو ہمیشہ محسوس کرتے رہے کہ کیسی ہی باطنی الجھن اور پریشانی ہو، جہاں حضرتؒ کی خدمت
میں خط لکھا، اور ڈاک کے حوالہ کیا کہ وہ ساری تشویش سکینت سے بدل جاتی تھی، احقر کے ساتھ تو
حضرت والاؒ کے آخر حیات میں یہ معاملہ رہا کہ جب کوئی الجھن پیش آئی اور عریضہ لکھنے بیٹھا کہ اس کا جواب

خود بخود ذہن میں آ گیا، ایک مرتبہ حضرت والا سے یہ کیفیت عرض کی، اور معذرت کی کہ اسی وجہ سے ایک عرصے
کوئی احوال نامہ پیش نہ کر سکا، تو فرمایا :- بھئی اس پر تو شکر ادا کیجئے، معذرت کی کیا بات ہے؟

بحیثیت شیخ محقق

اب تک حضرت والا سے متعلق جو کچھ عرض کیا گیا وہ اُن کی نیکی و پاکی، تقویٰ و طہارت و
محبت و معرفت کا ایک بالکل اجمالی تذکرہ تھا، لیکن اہلِ فن جانتے ہیں کہ ہر زاہد و عابد اور ولی اللہ کا ایک مصلح
و شیخ محقق ہونا بھی کوئی لازمی امر نہیں، تربیت روحانی کے لئے فن تربیت سے مناسبت اور اس میں درک
نہایت ضروری ہے، ہمارے حضرت والا جہاں میدان علم کے شہسوار تھے، وہاں فنِ تصوف میں بھی "شیخ
محقق" کی شان رکھتے تھے اور ان کے فیوض ہند و پاکستان کے طول و عرض میں جاری و ساری ہیں، اگرچہ
زنگوں کے بھی منتسبین کا حال راقم کے علم میں ہے، اس سلسلہ میں مختصر طور پر صرف چند اقوال نمونۃً پیش ہیں، جن سے اُن کی شان
تحقیق کا اندازہ ہو گا،

ایک مرتبہ راقم نے عرض کیا کہ حضرت عمل پر توجہ الحمدللہ دوام ہے لیکن اس کی عدم قبولیت کا گمان ہوتا ہے
سنا فرمایا :-

"خوب اپنے احوال کو اللہ میاں کے سر تھوپ دیا، اُن کی رضا و قبولیت کا حال تو دوسری دنیا
میں معلوم ہو گا، یہاں تو صرف عمل مقصود ہے، عمل میں لگے رہئے"!

پھر عرض کیا کہ حضرت قرب کے آثار کچھ تو یہاں بھی ظاہر ہوتے ہوں گے؟ — ارشاد ہوا :-

"یہ بھی بندے ہی کے ظنون میں بڑے سے بڑے ولی کا بھی جو اعتقاد ہے وہ محض ظن غالب کی
بنا پر ہے، اور اپنے میں آثار قبولیت تلاش کرنا عجب ہے، کیسے آثار اور کیسی بزرگی، اس راہ میں تو
اپنے آپ کو مٹانا ہی اصل شے ہے"!

ایک مرتبہ احقر نے تنہائی میں بعض اپنے احوال عرض کئے، تو ارشاد فرمایا :-

"میرے ساتھ تو روزانہ کا یہ معاملہ ہے کہ جب سوتے وقت لائٹ بند کر دیتا ہوں تو سامنے کو

نور سے نور دکھائی دیتا ہے، مگر میں فوراً آنکھیں بند کر لیتا ہوں کہ ہر آنچہ می شود بہ ہمہ غیر خداست"

ایک مرتبہ اذکار و اشغال کا تذکرہ تھا، تو ارشاد فرمایا کہ سلطان الاذکار، شغل اسم اللہ، کشف قبور، او
اس قبیل کی چیزیں تصوف نہیں ہیں، بلکہ تصوف کا آرٹ ہیں، آرٹ میں حقیقت کہاں، تصوف کا مقصود
تو صرف حصول رضائے الٰہی اور اتباع سنت ہے، ہاں اس سلسلہ میں از خود کوئی بات حاصل ہو جائے تو وہ
اور بات ہے!

اسی طرح یہ بھی فرمایا کہ مثنوی مولانا روم بھی تصوف نہیں بلکہ فلسفہ تصوف ہے، اور فلسفہ سے
بگڑے ہوئے دماغوں کا علاج ہے نہ کہ ہر ایک کا، اس سلسلہ میں احقر نے عرض کیا کہ مثنوی کے پہلے دو
اشعار میں جو بات بیان کی گئی ہے وہ تو ایک حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ عالم ارواح میں ایک مقام حق تعالیٰ
کے قرب کا حاصل تھا جہاں وعدۂ الست لیا گیا، تو کیا عجب جواب مرحمت ہوا فرمایا،

"وہ مقام متخیل ہوتا ہے جس کا ذکر آپ کر رہے ہیں، وہ تو ایک کانفرنس تھی جو بادشاہ نے
طلب کی تھی، وہ مقام کیسے ہو گیا؟

ایک محفل میں حضرت شیخ اکبر اور حضرت مجدد الف ثانی رحمہما اللہ کا ذکر آیا، تو حضرت سیدیؒ نے کسی
گُر کی بات بتائی، ارشاد فرمایا :

"شیخ محی الدین ابن عربیؒ نے توحید کی تعلیم پر زور دیا اور اس کو فلسفیانہ انداز میں پیش فرمایا،
اُن کی اصطلاحات کے ذریعہ جو ضلالت پیدا ہوئی وہ توحید کی راہ سے آئی اور لوگ انا الحق کے مدعی
بن گئے، اور حضرت مجدد الف ثانی نے اتباعِ سنت پر زور دیا، مگر ساتھ ہی نبوت کی فلسفیانہ توضیح
و تشریح پیش فرمائی، اس کے ذریعہ جو ضلالت آئی وہ نبوت کی راہ سے آئی تھی، اور انا النبی اور انا
المہدی" کہنے والے پیدا ہوئے"

ایک دفعہ احقر سے سوال فرمایا کہ "فنا فی الشیخ" کے کیا معنی ہیں، احقر نے عرض کیا کہ شیخ کی محبت جب ہر محبت

پر غالب آجاتی ہیں تو اسی کا نام "فنا فی الشیخ" ہے، فرمایا کہ یہ تو ابتدائی کیفیت ہیں "فنا فی الشیخ" ہوجانے کے اصل معنی تو یہ ہیں کہ اپنے احوال و واردات بھی وہی ہوجائیں جو شیخ کے ہیں، چنانچہ ہمارے مولانا عیسیٰ صاحب فانی فی الشیخ تھے!

رویا اور تعبیرِ رویا | مسلکِ اشرفیہ میں خواب کو کچھ زیادہ اہمیت حاصل نہیں، ایک مرتبہ حضرت سیدیؒ نے ارشاد فرمایا کہ "اخلاق ہی سے قرب حاصل ہوتا ہے، اچھے اچھے خواب یا محض کثرتِ نوافل سے قرب نصیب نہیں ہوتا، حتیٰ کہ حضورِ انور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خواب میں رویت بھی گو بہت بڑی بات ہے، مگر قربِ حق پر دلالت نہیں کرتی، بلکہ اس کا منشا صرف یہ ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ آپ کی اتباع کی جائے، چنانچہ اگر رویت کے بعد اصلاحِ اخلاق کی زیادہ فکر نہیں کی گئی، اور محض رویت پر بزرگی کا خیال ہوگیا، تو پچھلی حالت بھی سلب ہوجاتی ہے۔ ـــــ یہ تو امر واقعہ کا ذکر ہوگیا، ویسے ہمارے حضرت والاؒ کو تعبیرِ رویا کا خاص ذوق حاصل تھا، دو ایک نمونے ذیل میں پیش ہیں، اہلِ فن کو ابنِ سیرینؒ کی یاد آجائے تو کوئی عجب نہیں،

راقم کی اہلیہ نے خواب میں دیکھا کہ سر کے بال سفید ہوگئے، یہ خواب جب خدمتِ شیخ میں عرض کیا گیا تو جواب ملا:۔

"شاید اولاد کی بشارت ہو، واشتعل الراس شیبا"

اس تعبیر کو پاکر تحقیق کی گئی تو بات بالکل صحیح تھی، ـــــ اب ایک خواب اس ناکارہ کا اور اس کی تعبیر سنیئے:۔

راقم نے دیکھا کہ وہ اور مولینا سید عبدالحی صاحب (حال مفسر ریڈیو پاکستان) راستہ سے چلے جا رہے تھے کہ ایک کافر میت سے تڑپتا ہوا دکھائی دیا، میرے دل میں ہمدردی کا خیال پیدا ہوا ہی تھا کہ میری ہڈیوں کا ڈھانچہ ایک لکڑی کے تختہ پر ہوا میں معلق ہے، اور اس کافر سے قریب ہونا چاہتا ہے مگر ہو نہیں سکتا، اس کے ساتھ ہی یہ بھی محسوس کیا کہ اپنے گوشت اور پوست کا پورا مجسمہ اپنے کندھے پر ڈالے

مولانا کے ساتھ چلا جا رہا ہوں آبادی بہت دور ایک قبر قد آدم سے زیادہ گہری کھدی ہوئی تھی، راقم نے اپنے گوشت و پوست کی لاش کو اس کے اندر ڈال دیا، اور پھر ہم دونوں نے جلدی جلدی قبر کو مٹی سے بھر دیا۔ اس کے بعد آنکھ کھلی تو طبیعت میں ایک سکون تھا، ـــ اس کی تعبیر جو ملی، ملاحظہ ہو،

"یہ کافر نفسِ امارہ ہے، آپ کی اپنی لاش آپ کا مرتبہ فنا کے قریب ہونے پر دال ہے، حدیث میں ہے، عد نفسک من الاموات یہ کیفیت اسی مرتبۂ فنا، کی طرف اشارہ کرتی ہے، بحمد اللہ"

حضرت کا آخری حال | احقر کے فہمِ ناقص میں حضرت والاؒ کا رنگ چشتی نہیں بلکہ نقشبندی تھا، وجد و حال کی جگہ سکون و وقار، قیل و قال کی جگہ اتباعِ سنت کا اہتمام حضرت کا خاص شعار تھا، پھر بھی منصبِ ارشاد پر متمکن ہونے کے بعد چند برس تک یہ حالت تھی کہ جب بولنے پر آتے تو سوز و گداز کے دریا بہا دیتے ہیں آج بھی اس تقریر کی یاد سے ایک کیفیت طاری ہورہی ہے، جب حیدرآباد میں مولوی محمد مظہر صاحب مرحوم کی کوٹھی پر یہ احقر بھی حاضر تھا، اور مولٰنا سید عبدالحی صاحب (حال مفسر ریڈیو پاکستان) کے علاوہ اور بھی چند عقیدت کیش موجود تھے، شیخ نے نہ جانے کس سوز میں ڈوب کر فرمایا،

"اللہ تبارک و تعالیٰ کے پاس کس چیز کی کمی ہے، مقامِ صدیقیت کیوں نہیں طلب کرتے یہ تو آپ کے ظرف کی کوتاہی ہے، حوصلوں کو بلند کیجئے"

ان جملوں سے سارے حاضرینِ محفل کی آنکھیں اشکبار اور دل شعلہ زار ہوگئے تھے، لیکن آخر کے تین چار برس میں دریائے پرشور ایک بحرِ ذخار بن گیا تھا، دراصل ۱۳۵۸ھ کے حجِ بیت اللہ کے بعد حضرت والاؒ کو عبدیت کا ملہ اور نزولِ تام حاصل ہوگیا، اور پانی اس سطح پر پہنچ گیا کہ بظاہر جوش کے سارے آثار ختم ہوگئے مگر جو جھولیتا اس کو پتہ چلتا کہ حقیقتِ حال کیا ہے!

دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اپنی ساری نزاکت و نفاستِ طبع کے باوجود حضرت والاؒ پر دورانِ قیام

عبودیت کا اس قدر غلبہ رہا کہ صرف ایک کرتہ اور پاجامہ یا تہمد میں ملبوس برہنہ پا چلچلاتی دھوپ میں طواف کرتے دکھائی دیتے تھے، اور اس پیرانہ سالی اور ضعف قوی کے باوجود اپنا سا کام خود ہی کرتے تھے، راقم نے خود حضرت سے سُنا کہ ایک روز اسی سادگی سے صحن حرم میں بیٹھے تسبیح پڑھ رہے تھے کہ کسی عرب عالم نے سلام کیا، اور پوچھا کہ اے شیخ ہم نے سنا ہے کہ آج کل آپ تصوف کا شغل رکھتے ہیں؟ ___ حضرت فرماتے تھے کہ اس وقت کچھ تائید غیبی ایسی شامل حال ہوئی کہ مسلسل آدھ گھنٹہ تک قرآن وحدیث ہی کی تائید سے تصوف کو ثابت کرتا چلا گیا، جس کا ماحصل یہ تھا کہ رذائل نفس سے پاکی اور فضائل اخلاق کا حصول واجب ہے، وہ عرب عالم اس گفتگو سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ انھوں نے اقرار کر لیا کہ اگر تصوف یہ ہے تو اس سے کس کو انکار ہے ___ غرض مکہ معظمہ میں شیخ کو جو فیوض حاصل ہوئے اور جو انشراح نصیب ہوا، اس کا اندازہ اُن کی نظم کے دو ایک شعر سے لگا لیجئے، جو اسی فضا میں کہی گئی تھی فرماتے ہیں

دیدہ دل اگر ہو باز راز رہے نہ راز میں — جھانکتی ہیں حقیقتیں آئینۂ مجاز میں

اس کے کرم کے ہیں نشان اسکی عطا کا کیا شمار — دیدیا خاصیوں کو بار، بزم حریم راز میں

اب مکہ معظمہ سے فارغ ہو کر دیار رسولؐ میں پہنچے، بارگاہ رسالت میں حاضر ہو کر سیرت نگار رسول نے چند نعتیہ اشعار کہے، جس پر شیخ کے کلام کا غالباً خاتمہ ہے، اس نعت کا آخری شعر ان کی حالت کا آئینہ دار ہے استدعا کرتے ہیں،

بجھ جائے تیرے چھینٹوں سے اے ابر کرم آج
جو آگ مرے سینہ میں مدت سے دبی ہے

عاشق رسول کی یہ استدعا قبول ہو گئی، ایک رات حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے، اپنے آپ کو قدم رسالت پر گرا دیا، رحمت عالمؐ نے اپنے شیدائی کو اٹھا لیا، اور ایک طویل دعا پڑھ کر سینہ پر دم کر دی ___ حضرت والا کی آنکھ کھلی تو حضور انورؐ کی دعا یاد تھی اپنی اہلیہ

محترمہ کو بلا کر وہی دعا اُن پر دم کر دی، اور پھر سارا ماجرا سنایا، ___ غالباً اس واقعہ کے بعد ہی وہ سکون خاطر اور عبدیت مطلقہ نصیب ہوئی، جو تا آخر حیات قائم رہی، ___ اور اس نزدل تام کی وجہ سے ان کی غلبت و مرتبت کی معرفت ہی مشکل ہو گئی، مولانا محمود الغنی صاحب سہارنپوری ثم پاکستانی جو حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے قدیم خلفاء میں سے ہیں، اکثر فرمایا کرتے تھے کہ لوگ مولٰنا کو تو پھر بھی پہچان لیں گے، مگر حضرت سید صاحب کے کمال کو پہچاننا بہت دشوار ہے، اور پھر فرمایا کہ ایک مرتبہ حضرت سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، اور سلام کر کے کمرہ میں داخل ہی ہوا تھا کہ وہ کیفیت محسوس ہوئی جو حضرت حکیم الامت کی رحلت کے بعد پھر کبھی حاصل نہ ہوئی تھی،

اب آخر میں دو لفظ مرض الموت سے متعلق عرض کر کے اس صحبت کو مجبوراً ختم کرتا ہے، ۲۲ر نومبر ۵۳ء کے دن (جس کے بعد شام کو حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ داغ مفارقت دے گئے) بعد نماز ظہر حضرت کی اہلیہ محترمہ حسب معمول حضرت والا کی صحت کے لئے دعا مانگ رہی تھیں کہ یکایک ایک سفید پوش ہستی نمودار ہوئی، اور اُس نے ایک دودھیا رنگ کا گلاس محترمہ کی خدمت میں پیش کیا، محترمہ نے گھبرا کر ہاتھ چھوڑ دیئے، اور پیچھے مڑ کر حضرت والا سے (جو پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے) عرض کیا کہ آپ نے کچھ دیکھا؟ ___ جواب ملا کیا ہوا؟ اہلیہ محترمہ نے واقعہ سنایا تو خلاف عادت پورے اطمینان سے یہ ارشاد فرمایا:-

"یہ آپ کی تسکین کا سامان کیا گیا ہے"،

اس سے گمان ہوتا ہے کہ شاید حق تعالیٰ نے اپنے محبوب بندے کو کوچ کا اشارہ فرما دیا تھا، ___ دن گذر گیا، مغرب کی نماز پڑھ کر داہنی کروٹ ٹھیک مطابق سنت لیٹ گئے، راقم کی نظریں چہرۂ انور پر جمی ہوئی تھیں، دفعتہً ایک ہچکی آئی، اور روح سلیمانی لبیک کہہ کر اپنے مولیٰ کے حضور حاضر ہو گئی، الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون کا مشاہدہ کھلی

انکھون ہوگیا، روح کی مفارقت کے بعد اس عاشقِ رسول کے جسم مین کوئی تغیر تو کیا آتا، چہرۂ مبارک اور زیادہ منور و تابان ہوگیا، اور سکینت و فرحت کے ایسے جلوے نمودار ہوئے کہ جس کی بھی نظر پڑی اُس کے دل نے سیدالملت کے ولی اللہ ہونے کی تصدیق کی ——— آہ! ہندوستان کی تاریخ مین یہ دوسرا "ولی اللہ" پیدا ہوا تھا، سو وہ بھی آج زینتِ تاریخ بن گیا،

عمرہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید برون
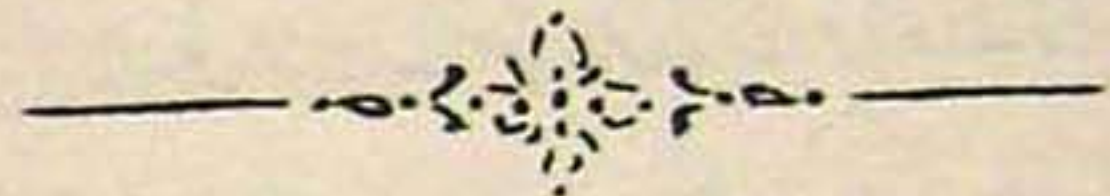
حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا سلوک و تصوف

اور

طریقۂ تربیت

از

مولانا سید عبدالرؤف صاحب اورنگ آبادی

آہ! علم و ادب، تاریخ و سیر مین یگانۂ روزگار، سلوک و تصوف مین ممتاز اور جملہ اسلامی علوم مین جامع و باکمال ہستی دنیا سے رخصت ہوگئی،

خدایا بران تربتِ نامدار | بفضلت کہ بارانِ رحمت ببار

اور اپنی تحقیقاتِ علمیہ، حقائقِ دینیہ، نکاتِ احسانیہ اور رموزِ روحانیہ کے ایسے نقش و نگار چھوڑ گئی، جو مدتون باقی رہین گے، ایسی جامع کمالات ہستی صدیون مین کہین پیدا ہوتی ہے،

عمرہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات | تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید برون

علمی بزم کے تو وہ صدر نشین تھے ہی سلوک و تصوف مین بھی اُن کا بڑا درجہ تھا، اور اس کے وہ اسرار و رموز اور معارف و حقائق بیان فرماتے کہ دل کیفِ یقین سے لبریز ہوجاتا، اس مختصر مضمون مین اس کے بعض جلوے دکھائے جائینگے، اس راہ مین ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ علمی صدارت کی بھری مجلس مین اپنی علمی لغزش (۱) اور کوتاہیون کا اعتراف اور ہر اس تحقیق و رائے سے جو کتاب و سنت کے موافق نہ ہو، رجوع کرکے "نعرۂ ناصواب توبہ یارب" کی صدا بلند کی، عملی سلوک و تصوف کی یہ وہ تجلی تھی کہ مدعیانِ علم و عمل کی آنکھین خیرہ

ہو کر رہ گئیں، نفس پرستی کے اس دور میں محض رضائے الٰہی، اور اتباع حق کے لئے اتنی بڑی ہستی کا اپنی قلمی لغزشوں کا اعتراف اور اس سے برأت کرنا عرفان حقیقت کے کمال اور فنائیت و فنائے نفس کی روشن دلیل ہے،

فنائے ذات اور اتباع حق کی یہ وہ مثال تھی جس پر خود شیخ طریقت نے مرید کی شان میں مدحیہ اشعار ارشاد فرمائے، اور اس ناچیز کی عقیدتمندانہ نظر پہلی مرتبہ حضور والا رحمۃ اللہ علیہ پر پڑی، ناچیز اس زمانہ میں حضرت مجدد تھانوی کی بیعت سے مشرف ہو کر مولانا محمد عیسیٰ صاحب کے زیر تربیت تھا، حضرت والا رحمۃ اللہ نے تحریر فرمایا کہ اگر وہ مصلح پسند نہیں ہیں، تو مناسب حال کوئی دوسرا مصلح منتخب فرمالیں، اس کے کچھ دنوں کے بعد حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ سے لکھنؤ اسٹیشن پر ملاقات ہوگئی، اور شاہ گنج تک رفاقت کا شرف ملا، اس مختصر صحبت کا دل پر ایسا اثر پڑا کہ خط کے ذریعہ نذر عقیدت پیش کی، اس کے بعد حضور کے حسب طلب کئی مرتبہ آپ کے وطن دیسنہ میں حاضری کا موقع ملا، اور دوسرے سفر میں اخذ بیعت و ارادت اور فیوض و برکات حاصل کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، اس کے بعد بارہا شرف زیارت حاصل ہوا، مگر پاکستان کی ہجرت کے بعد اس سے محرومی رہی، البتہ مراسلت کا سلسلہ برابر جاری رہا،

اس دس سالہ مدت میں حضور کی زبان و قلم سے جو ارشادات نکلے ہیں، افادۂ عام کے خیال سے ان کے مختصر اقتباسات درج کئے جاتے ہیں کہ شاید ان سے کسی قلب سلیم کو فیض و برکت حاصل کرنے کی توفیق ہو، ان سے حضور کے سلوک و تصوف کی حقیقت اور آپکے طریقہ تربیت کا بھی اندازہ ہوگا،

تواضع

آپ میری نسبت یہ سمجھ لیں کہ یہ خاکسار حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کے خدام میں سب سے کمتر اور رتبہ میں بھی فروتر ہے، اس پر بھی اگر اس ذرۂ بمقدار کی طرف اپنے دل کی کشش بے تکلف محسوس کریں تو ظاہر فرمائیں، ایسا نہ ہو کہ بعد کو پچھتاوا آئے، میرے حالات کو بھی تحقیق فرمالیں کہ میں اس قابل بھی ہوں، اگر ان سب باتوں کے بعد بھی دل کا میلان ہو تو خدمت سے انحراف نہیں،

مقصد بیعت اور تفویض امانت

بیعت کا مقصد تو یہ ہے کہ مرشد و مسترشد میں اس امر کا معاہدہ ہوتا ہے کہ مرشد

تعلیم و ارشاد میں تا امکان غفلت و دریغ نہ کرے اور مسترشد تا امکان اطاعت و انقیاد میں کوتاہی سے کام نہ لے، مرشد کے ذمہ جو فرائض عائد ہوتے ہیں، اس کی ادائگی پر با اخذ بیعت بھی تیار ہوں، اور چونکہ میں اس میں کوتاہی پاتا ہوں، اس لئے تاخیر کر رہا ہوں یا ابھی وقت اس امانت کی سپردگی کا نہیں آیا ہے، وقت کا انتظار کیجئے جب وقت آئے گا، تو خود بخود یہ دولت نصیب ہو جائے گی،

پیر اور مرید کے فرائض

غالباً یہ ذہن نشین ہوگا کہ یہ عمر بھر کا سودا ہے، اس لئے اس راہ میں جو قدم رکھا جائے، وہ خوب سوچ سمجھ کر رکھا جائے، پیر کی نسبت صرف اتنا اعتقاد رکھنا شرط ہے کہ میری تلاش میں میری نافعیت کے لئے اس سے بہتر کوئی شخص اس وقت نہیں ہے، بہر حال یہ طرفین سے الحب فی اللہ کا معاہدہ ہے، کہ طالب تعمیل میں اور مطلوب یعنی شیخ تعلیم میں کوئی کمی اخلاص میں نہ کرے گا، اس سلسلہ میں چار باتیں بمنزلہ اصول کے ہیں،

اعتقاد، انقیاد، اطلاع، اتباع اس راہ میں ضروری ہیں، اپنے کو مربی کے ہاتھ میں اس طرح دیدیں جس طرح مریض طبیب کے ہاتھ میں اپنے کو دیدیتا ہے، اصول اربعہ کی پیروی رہے، میں نے پہلے ہی لکھ دیا ہے کہ اپنے شیخ کی نسبت یہ اعتقاد رکھنا چاہئے کہ میری نافعیت کے لئے میری تلاش میں یہ سب سے بہتر ہے، پس دوسروں سے انکار کی ضرورت نہیں ہے، مگر اتباع ایک کی چاہئے، ایک ساتھ دو طبیبوں کا مریض مصیبت میں رہتا ہے، اعتقاد اور انقیاد تو معلوم کر لیا، اطلاع سے مقصود شیخ سے مکاتبت اور اتباع سے احکام شیخ کی پیروی ہے،

نماز کی حقیقت

نماز کو اپنی طرف سے پوری ظاہری و باطنی آداب اور خضوع و خشوع کے ادا کرنے کی کوشش کیجئے، جس قدر ہو اللہ کا شکر کیجئے، اور آئندہ کے لئے ہمت کیجئے، اور دعا کیجئے، ہمارے حضرت کی تحقیق ہے کہ مبتدی نماز میں یکسوئی کے لئے الفاظ کی طرف اور متوسط معنی کی طرف اور منتہی ذات بحت کی طرف یہ تصور کرے کہ بندہ اپنے آقائے حقیقی کے سامنے کھڑا ہے، اور وہ اس کو دیکھ رہا ہے، اس کا اثر یہ ہو کہ قلب میں سکون اور جسم میں پستی اور تواضع کی شان پیدا ہو، نماز میں اصل شے حضور اور خشوع ظاہری و باطنی ہے، اور نیز ہر قسم کے رذائل سے امکان دوری اور فضائل کے حصول کی کوشش اور اطاعت الٰہی پر مداومت، اور حصول رضائے الٰہی کا شوق

باقی غیر مقصود رہیں، تو امورِ مقصودہ میں ان امور کی طرف بیشتر متوجہ رہیں،

التزام سنن و نوافل اور تہجد

نمازِ پنجگانہ کے بعد حسب ذیل نمازوں پر حتی الامکان مداومت کی جائے، نمازِ تہجد، بعد مغرب ۶ رکعات نفل اوابین، طلوعِ آفتاب کے بعد ۲، یا ۴ رکعت نفل چاشت، اور نفل سنن نمازِ پنجگانہ کے بعد، نماز میں اعتدال ارکان، اور حضورِ قلب کی کوشش رہے، تہجد کا التزام ازبس ضروری ہے یہی مفتاحِ اسرار ہے، اگر رات کو احیاناً ناغہ ہوجائے، تو بوقت چاشت، بارہ رکعات پڑھیں، تہجد عجیب عبادت ہے، جس پر خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً دوام فرمایا ہے، اس لئے سنت مؤکدہ[1] ہوا، اب اہلِ محبت کے لئے کیا گنجائش رہی، فضائلِ اعمال کے اکتساب کا سبق محدثین سے نہیں محبین سے لیں، علیکم بقیام اللیل فانہ داب الصالحین تو لزوم پر دال ہے، تہجد باجماعت اگر اتفاقاً ہو تو جائز ہے ورنہ اہتمام اور تداعی کے ساتھ نہیں، غور کرنا چاہئے کہ اس میں ریا اور نمود کی خواہش تو پوشیدہ نہیں، اگر تہجد قضا ہوجائے تو طلوعِ آفتاب کے بعد دوپہر سے پہلے بارہ رکعتیں پڑھ لی جائیں، تہجد کی نماز ذرا جہر سے پڑھنا مستحب ہے،

دعا کا اہتمام

تہجد کے بعد بارگاہِ الٰہی میں پوری درد و الحاح کے ساتھ اپنے لئے دعا کیجئے، دعا میں تضرع و خضوع ہونا چاہئے، عصر اور صبح کی نماز کے بعد دعا خوب کیا کیجئے، اور مانگئے جو آپ کے لئے مناسب ہوگا انشاء اللہ ملے گا، اس در سے کوئی محروم نہیں پھرا ہے، "اُدعُونی اَستجب لکم" ہے اس کا اعلان ہے اور "الدعاء مخ العبادہ" ارشاد ہے،

احتسابِ نفس

اپنے عیوب کی تلاش میں رہیے، اور جو عیب سب سے زیادہ ابھرا ہو، علی العیان معلوم ہو، اس کے دفعیہ کی کوشش کیجئے، مثلاً کبر، عجب، ریا، حسد، وغیرہ، ان عیبوں کی حقیقت دریافت کیجئے، اور پھر اس کا علاج معلوم کیجئے، اپنے میں شکستگی، انکسار، تواضع ہونی چاہئے، اور ہر وقت اپنے عیوب پر نظر جمی رہے، اور اس کی اصلاح کی

---

[1] سنت مؤکدہ کی تعریف اس پر صادق ہے، البتہ قولاً تاکید نہیں فرمائی، شفقۃً علی الامۃ، مگر اپنے عمل سے مؤکد ثابت کردیا،

کی فکر دامنگیر ہو، استکبار وافتخار و غرور کہ ہمچو من دیگرے نیست کے شیطانی پھندے میں گرفتار نہ ہوجائیں، اپنے کو مجموعۂ ذمائم اخلاق سمجھنا خیر و برکت ہے، بے سبب تذکرہ اسرارِ قلبی اور رازِ روحانی کو ظاہر کرنا بھی استکبار و ریا میں داخل ہے، غیبت بہت بری چیز ہے، اس سے نیکیاں دوسروں کو مل جاتی ہیں، اپنے قلم سے خود کو مولوی لکھنا کبر کے آثار میں سے ہے، گویا اس کا اظہار ہے کہ لوگ اس کو بڑا سمجھیں، مکائدِ نفس بہت دقیق ہیں، اللہ تعالیٰ بچا دیں، رکھیں، تواضع اور فنائے ذات کی راہ پیشِ نظر رہے، فنائے نفس کے لئے اللّٰھم اجعلنی فی عینی صغیراً کی دعا مفید ہے، اپنے کو سب سے بدتر سمجھنا سب سے بہتر ہے، اس کا ہمیشہ اور ہر کام میں خیال رہے، بس اپنے عیوب پیش نظر رہیں، اور ان کی اصلاح کا خیال غالب اور اس باب میں اپنے نفس کے مکائد پر نظر رہے،

اصل سلوک

حصولِ تقویٰ تحلی بالفضائل اور تخلی عن الرذائل برائے رضائے الٰہی اصل سلوک ہے، ہر قسم کے رذائل سے بقدر امکان دوری اور فضائل کے حصول کی کوشش، اور اطاعتِ الٰہی پر مداومت اور حصول رضائے الٰہی کا شوق اور باقی غیر مقصود ہیں، اپنی اصلاح و تربیت کی دھن میں لگے رہئے، تاآنکہ اللہ کے سوا ہر چیز کی محبت فنا ہوجائے، ریا، عجب، کبر رنگ برنگ صورتوں میں ظاہر ہوتے رہیں، اور یہ سالک کے لئے سخت خطرناک ہیں، اس لئے ان سے احتراز کا اہتمام نہایت ضروری ہے، بڑی چیز یہ ہے کہ اپنے پر نظر بڑائی کی نہ پڑے، تہ راستہ مردودیت کا ہے، ابیٰ واستکبر وکان من الکافرین، ہر حال میں تواضع و فنا پر نظر رہے اور ذمائم اخلاق پر،

حصولِ تقویٰ

منہیات و اوامر کی تصریح پیش نظر ہے، مقصود حصولِ تقویٰ ہے، کہ قرآن پاک "ھُدًی لِلمُتَّقِین" ہے، عبادت کا منشا بجاآوری کے بعد حصولِ تقویٰ ہی ہے، "لَعَلَّکُم تَتَّقُون" بعد فرائض و سنن و نوافل کی پابندی علیٰ مراتب الوجوب والاستحباب کے منہیاتِ شرعیہ سے احتراز کا لزوم کیا جائے،

ہیں ناقص ہیں، یادِ الٰہی سے غفلت نہ ہو، ذکر کا مقصود یہی ہے،

ذکر دوام ادعوا ربکم تضرعاً و خفیۃً الی ولا تکن من الغافلین "تلاوت فرما کر دوام ذکر کے فضائل ثمرات اور وعدے اور غفلت کے نتائج بد اور وعید بیان فرمائے، اور پھر ومن یعرض عن ذکر الرحمٰن کے تفسیری نکات بیان کئے، اور ہر حرکت و سکون پر عمل و قول میں ذکر کی تاکید فرمائی، یادِ الٰہی کو مرکزِ خاطر کرنے کی ہدایت فرمائی اور بیان کیا کہ احکامِ شرعیہ کی روح ذکر ہی و کر ہے، جمال، نوال کمال کے اعتبار سے ذاتِ باری ہی کو محبوبیت حاصل ہے، تو اسی محبوبِ حقیقی کی یاد واجب ہے، الذین اشد حبا للہ" منصوص ہے، دنیا اور تعلقاتِ دنیا کے ساتھ یادِ الٰہی بڑی چیز ہے، اور یہی سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضوان اللہ علیہم ہے، چنانچہ حضرت عروہؓ کا پاؤں جب کاٹا جانے لگا تو ہوش و حواس ہی میں پاؤں کاٹنے کا انھوں نے حکم دیا، اسم ذات یعنی اثبات و نفی کے ذکر کے جمالی و جلالی ہر دو طریق کو عملاً ظاہر فرما کر تکرار کی ہدایت کی، اور فرمایا کہ وقتِ ذکر قربتِ حق، سماعتِ حق، رحمتِ حق اور نزولِ رحمت پیش نظر رکھنا چاہئے تاکہ ثمراتِ ذکر جلد سے جلد تر ظاہر ہوں، اپنی بابت فرمایا کہ مجھے تو ذکرِ جلالی میں خشکی پیدا ہو جاتی ہے، اس لئے ذکرِ جمالی پر بیشتر عمل کرتا ہوں، اور اسی میں سہولت و لذت محسوس کرتا ہوں، آپ کو اختیار ہے کہ جس طریقہ کو چاہیں، اختیار کریں، نپولین اعظم جب کسی سپاہی کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا تھا تو اس کا نام لے کر پکارتا تھا، جس کا اثر یہ ہوتا تھا کہ وہ اس پر جان دینے کو تیار ہو جاتا تھا، اسی طرح اسمائے الٰہی کی یاد اور تکرار اُن کی توجہ خاص کو اپنی طرف مبذول کراتا ہے، اس ارحم الراحمین کا نام پاک ورد کیا جائے گا تو اس کی رحمتیں ذاکر کی طرف متوجہ کیوں نہ ہوں گی، ماسویٰ اللہ سے بے نیازی کے لئے اثبات و نفی کا ذکر اس کے معنی کے استحضار کے ساتھ کافی و دوانی ہے،

لے اسم میں خود محبوبیت نہیں، اسم میں محبوبیت محبوب کی ذات پر دال ہونے کے سبب سے ہوتی ہے، کسی اسم کی محبوبیت ذات پاک کی محبوبیت کا نتیجہ اور ظل ہے،

اہتمام و التزام عمل اعمال تو سب کو معلوم ہیں ضرورت عمل کی ہے، اور حصولِ تقویٰ اور رضائے الٰہی کو کرنے ساری کوشش اسی کی چاہئے، باقی سب فلسفہ ہے، کام میں لگے رہیں،

ع "تادمِ آخر دمے فارغ مباش"

عمل خیر لوجہ اللہ تعالیٰ ہو، اصل یہ ہے کہ امتحان کی تیاری کے لئے جو وقت صرف ہوتا ہے، وہ بیکار نہیں جاتا ہے، نمبر اسی سے ملتے ہیں، کسی اضطراری عذر کے سبب سے اگر کسی معمول میں کمی ہو جائے تو انشاء اللہ تعالیٰ ہم کو ہماری نیت کے مطابق حق تعالیٰ اُس کی جزا عنایت فرمائیں گے، یہ اُن کی شانِ رحیمی و کریمی ہے، عمل کیلئے صرف ہمت و عزیمت، دوامِ عمل، اور صحتِ فکر و نظر کی ضرورت ہے، عمل، عملیات اور تعویذ کی نہیں، مقبولیت کی خواہش اس راہ کا کانٹا ہے، اللہ تعالیٰ کی رضا کے سوا عمل کا دوسرا محرک نہ ہو اور ہر حال میں ذکر لساناً و قلباً و عملاً جاری رہے،

احکامِ الٰہی کی اطاعت اور رضائے الٰہی کی طلب اصل شے احکامِ الٰہی کی کلی اطاعت، حلال حرام کا خیال، معاملات میں صفائی اخلاق کی نزاہت، اتباعِ نبوی کا دھیان، التزامِ سنت کا اہتمام ہے، بدعات و رسوم تمام امور میں احتراز، اور تمام امور میں رضائے الٰہی کی طلب، ان امور کی طرف توجہ فرمایئے کہ یہ اصول میں ہیں، اور باقی سب فروع اور تمہ ابرِ دوامِ ذکر کا ظہور یہی ہے اطاعات و مرضیاتِ الٰہی کی اتباع کا ذوق بڑھے اور اللہ تعالیٰ کی یاد و حالاً ہو، باقی کیفیات تو آتی جاتی رہتی ہیں،

استقامت بڑی دولت ہے اب تو زندگی کے آخر لمحہ تک یہ استقامت قائم رکھنا ہے، توفنی مسلماً والحقنی بالصالحین کی دعا چاہئے، اپنے کام میں تا دمِ آخر استقامت کے ساتھ لگے رہئے، یہی بڑی دولت ہے "تادمِ آخر دمے فارغ مباش" "معمولات پر استقامت مبارک" "الاستقامۃ فوق الکرامۃ" قال اللہ تعالیٰ "قل اللہ ثم استقم" سلوک کی اصل کلید ہے، عوارض کی وجہ سے کمی باعثِ افسوس نہیں، وہ کمی افسوس کے قابل ہے، جو غفلت یا کوتاہی کے باعث ہو، اپنی تکمیل اور اصلاح سے کبھی غفلت نہ برتیں اہر حالت

پاسِ انفاس — پاسِ انفاس کا مقصد بھی یہ ہے کہ کوئی سانس ذکرِ الٰہی سے خالی نہ جائے، اس کی صورت یہ ہے جو آسانی سے ہو سکتی ہے کہ ہر سانس کے ساتھ اللہ اللہ جاری رہے، بغیر تلفظِ لسانی محض ذکرِ قلبی کے ساتھ، اس کا فائدہ ذکرِ دوام ہے، جو حسبِ استطاعت مامور ہے،

مراقبۂ اللہ معی — اللہ معی کا مراقبہ شروع کر دینا چاہئے، اللہ معی کا تصور کہ ہر وقت وہ ہمارے ساتھ اور ہمارے قریب اور ہمارے ہر فعل و خیال کا ناظر و حاضر ہے، اس کے مضمون پر غور کیا جائے، اور اس کے مناسب آیات کا استحضار رہے، واذا سئلک عبادی عنی فانی قریب، وھو معکم اینما کنتم، ونحن اقرب الیہ من حبل الورید، نحن اقرب الیہ منکم و لکن لا تبصرون، وھو علیم بذات الصدور، ولا تخفی علیہ خائنۃ الاعین وما تخفی الصدور، الا یعلم من خلق، الم یعلم بان اللہ یریٰ اسی کیفیت کا رسوخ اصل روح ہے جس کا طریقہ ذکر و شغل ہے،

قلب کا ذاکر ہونا — قلب کا ذاکر ہونا یہ فن کی کوئی اصطلاح نہیں ہے، کثرتِ ذکر سے قلب میں ذکر کا لفظ اللہ اللہ ہو یا لا الٰہ الا اللہ یا کوئی اور مرکوز ہو کر حدیثِ نفس کے طور پر جاری ہو جاتا ہے، جو ارادہ کے بغیر بھی قائم رہتا ہے، بلکہ اس کا استحضار بھی نہیں رہتا ہے کہ ذکر جاری ہے، ...... بہرحال اس کا طریقہ صرف کثرتِ ذکر پر توجۂ تام ہے، اور یہ کوئی مشکل نہیں ہے،

مجاہدہ و ریاضت اور اس کے ثمرات — مجاہدہ و ریاضت سے فضل و رحمت اور توفیقاتِ الٰہیہ کی صلاحیت و استعداد پیدا ہوتی ہے، ہر نبی و ولی کو مجاہدہ و ریاضت کے عقبات سے گذرنا ضرور ہے، رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کا غارِ حرا میں معتکف ہونا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کوہِ طور پر قیام کرنا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جنگلوں میں مقیم ہونا، اور اولیاء و فقراء کی نفس کشی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، لیکن باہمہ کسب و ریاضت ضرور نہیں کہ رحمت کا ورود اور برکاتِ روحانی کا نزول فی البدیہہ ہو، یہ سب فضلِ رحمانی ہے، وہ ذاتِ پاک بے نیاز ہے، مگر سالک کو پُر امید ہی رہنا چاہئے، جزاءً من ربک عطاءً، گویا مزد نہیں بخشش ہے، اور یہ بخشش بے حساب و کتاب ہوتی ہے،

اوامر و نواہی کی بجا آوری جس گرم جوشی اور خلوص سے ہوگی، اسی قدر انوارِ رحمت و برکات کا نزول ہوگا، بعض لوگ احکام و اعمال بجا لاتے ہیں، ذکر و شغل بھی کرتے ہیں، مگر ثمرات و اثرات مرتب نہیں ہوتے ہیں، وجہ اس کی یہی ہے کہ خلوص و محبت جو بمنزلۂ روح کے ہے، وہ ان میں مفقود ہے، کوئی شخص کونین کھائے، اور کونین کے اثرات مرتب نہ ہوں، تو ظاہر ہے کہ اس کے ناقص ہونے کا حکم لگایا جائے گا، اسی طرح نماز و روزہ اور دیگر احکام و اعمال بجا لاتے ہیں، اور ان کے اثرات و ثمرات ظاہر نہیں ہوتے ہیں تو سمجھو کہ ان اعمال کی بجا آوری میں نقص ہے، اور پیشگاہِ الٰہی میں تو قدر کمال کی ہے،

کیفیات — سالک کو بڑا دھوکہ ذوق و شوق اور لذت کا ہوتا ہے، سو اس کو پوری طرح سمجھ لیجئے کہ یہ چیزیں اگرچہ محمودہ ضرور ہیں، مگر مقصود نہیں، ان کا منشا اسی قدر ہے کہ کام میں جی لگتا ہے، اور آسانی ہوتی ہے، مگر اس کو قرب و رضا اور حصولِ ثواب میں کوئی دخل نہیں، کیونکہ یہ امور غیر اختیاریہ میں ہیں، اور غیر اختیاریہ نہ مطلوب ہیں، اور نہ مقصود، دوا کا اصل مقصود صحت بخشی ہے، خوش ذائقگی اور لذت نہیں، جب انسان کے بدن میں صحت آتی ہے، تو طاقت اور کھانے کی لذت تو خود بخود آ جائے گی، اس کے لئے کوئی الگ دوا کی ضرورت نہیں، ابتدائی جوش و شوق میں کمی فطری ہے، یہ مرحلہ زندگی میں بھی پیش آتا ہے، کوئی افسوس کی چیز نہیں، جوش و شوق ہو یا نہ ہو، عمل میں کوتاہی نہ ہونے پائے، جس طرح آغازِ شباب میں عروسِ نو کے ساتھ جو شور و شوق و جوشِ طبع کا مظاہرہ ہوتا ہے، وہ رفتہ رفتہ تمکین سے بدل جاتا ہے، اور بجائے بوالہوسی کے دیرینہ محبت ...... اس کی جگہ لیتی ہے، میرا ایک شعر ہے،

دیکھئے ملتی ہے کب دولت سکونِ عشق کی　　ہائے ہوئے جوش تو ہنگامہ آغاز ہے

صبر و شکر — حضرتِ والا رحمۃ اللہ علیہ کا ملفوظ ہے کہ دو حال سے خالی نہیں یا تو بندہ کو نعمت ملتی ہے، تو اس پر شکر واجب ہے، یا ابتلا پیش آتا ہے تو اس پر صبر مامور ہے، اور یہ دونوں حالتیں موجبِ ازدیادِ ترقی ہیں، اور یہی صبر و شکر کی دوہری منزل پوری زندگی کے سفر میں ملتی رہتی ہے، شکر و رضا بڑی چیز ہے، اگر توفیقاتِ الٰہی

پر بھی شکر کیجئے، آپ کو گونہ طمانیت جو حاصل ہوئی ہے، آپ اس طمانیت کو ذکر و مناجات میں صرف کیجئے کہ اس کا شکر یہی ہے، شادی و غم دونوں توام ہیں،

ع موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

خواب اور اس کی حیثیت رویا اور خواب بشارات ہیں، اس کے سوا ان کی اور کوئی حیثیت نہیں، نہ یہ ذریعۂ قرب ہیں اور نہ اس پر انکمال مفید طریق، البتہ خوش ہونا چاہیے کہ خواب سے مطلع کیا جاسکتا ہے، مگر اس سے اپنی بزرگی کا زعم نہ ہو کہ ایسے خواب فاسق بھی دیکھ سکتے ہیں، ہاں اس بات کا شکر کیجئے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی تربیت اس طرح فرماتے ہیں، بہر حال اس کے پیچھے نہ پڑیے، یہ گو بشارات ہیں، مگر مقصود نہیں،

ع نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم

بیداری کے معاملات کی طرف توجہ فرمائیے اسی کا سوال اور اسی کا مواخذہ ہے، باقی رویا اور خواب بشارات سے زیادہ نہیں، دھن کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہیے، خواب کی حیثیت شرع میں صرف بشارات کی ہے اللہ تعالیٰ اس اظہار بشارت سے کبھی ان شکلوں کو منتخب فرماتے ہیں، جن سے خواب دیکھنے والوں کو موانست ہوتی ہے، اس میں خواب میں نظر آنے والے بزرگوں کو کوئی دخل نہیں ہوتا، بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے اس اظہار بشارت میں اپنا آلہ اپنے فضل سے بنا لیا،

مکرر مکتوب ہے کہ خواب کی حیثیت صرف بشارات کی ہے، اور اس ہیچمدان کو دیکھنا اس بات کی علامت ہے کہ آپ مجھ سے نسبت رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ساری توفیقات ہیں، وہ جب چاہتے ہیں تو کسی بندہ کو خواب میں یا بیداری میں تنبیہ یا توفیق ارزانی فرماتے ہیں اور اس کے لئے کبھی کبھی ازقبیل انفس ہونے کے لئے اسی کی شکل و صورت کو بمنزلہ ...... وجہ و آلہ بناتے ہیں جس سے صاحب معاملہ کو مناسبت اور محبت اور عقیدت ہوتی ہے ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء،

احترام نبوی اور حب رسول رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی اور ذکر گرامی کے ساتھ صلی اللہ علیہ وسلم لکھا کیجئے،

عزت و احترام ظاہری و باطنی دونوں چاہیئے، عملاً اتباع سنت ہر کام میں اور قولاً درود کی کثرت حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذریعہ ہیں، درود خصوصاً جمعہ کے دن کہ وہ اس دن بارگاہ نبوی میں پیش ہوتے ہیں، ہمارے حضرت رحمۃ اللہ کو یہ درود پسند تھا، اللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِہٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ جمعہ کی رات بالخصوص کثیر درود چاہیئے، ایک خواب کے سلسلہ میں سوال ہے کہ کیا واقعات عالم اور حوادث روزگار کا وقوع وحدوث بارگاہ نبوی سے ہوا کرتا ہے؟

جواب:۔ استغفر اللہ واقعات عالم اور معاملات تکوین صرف اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہیں، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم باعث رحمت ہیں، آپ پر اللہ تعالیٰ کی جو بظاہر رحمت ہوئی و مثالی بشارت رحمۃ للعالمین کے توسط سے دکھائی گئی، مکرر حکم ہے صلوٰۃ و سلام بطور ذکر کے نہیں، بلکہ بطور درود کے پڑھ سکتے ہیں، خصوصاً جمعہ کے روز اگر بجائے ذکر درود پڑھا جائے تو اچھا ہے، وحشت دور کرنے کے لئے کسی مختصر درود کی کثرت کیجئے،

اے نام تو دافع بلا ہا
بیماری قلب را شفا ہا

بحمد اللہ آپ کے لئے حرمین میں دعا کی گئی، اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں آپ کا خواب مبارک ہوا اور اس سلسلہ میں آپ کی مقبولیت کی دلیل ہے، اللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ مناجات مقبول میں جو کچھ ہے ادعیہ ہمارے ہاں معمول ہے اس کی اجازت ہے، بارک اللہ تعالیٰ،

تصور شیخ اور صالحین کی محبت تصور شیخ بلا قصد و ارادہ ہو تو حرج نہیں، اور ہمارے حضرت کے خلفاء میں سے جناب خواجہ عزیز الحسن رحمہ اللہ تعالیٰ کا، ار شعبان کو انتقال ہو گیا، افسوس دعائے مغفرت کیجئے اور ایصال ثواب بتلاوۃ القرآن کیا کیجئے،

صالحین کی محبت کلید کامیابی ہے،

وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کا مفہوم صحیح مختصر یہ جان لیجئے کہ صرف اسی کی ذات

پاک موجود ہے، ماسوی ذات باری تعالیٰ سب کالعدم ہیں مگر اس کا ہرگز یہ مفہوم نہیں کہ ہر چیز خدا ہی خدا ہے، یہ تو وحدۃ نہیں، کثرت کا مفہوم ہے، نعوذ باللہ من ذالک، وہ وحدہٗ لاشریک ہے،

اور وحدۃ الشہود کا مفہوم یہ ہے کہ ہر چیز میں اسکے وجود اور اس کی قدرت کا ظہور ہے اور بس،

تصوف علمی اور تصوف عملی

تصوف کی دو قسمیں ہیں، ایک علمی دوسری عملی، تصوف کی کتابوں سے جو علم حاصل ہوتا ہے، وہ تو تصوف علمی ہے، اور مجاہدہ اور عمل سے جو صوفیانہ شان پیدا ہوتی ہے، وہ تصوف عملی ہے، آپ تصوف عملی میں اپنا وقت صرف کیا کیجئے، اور اس پر وقت صرف کرنا زیادہ مفید اور موجب خیر و برکت ہے،

ملفوظات قرآن وہ گنجینہ ہے کہ ہر نظریہ والا اپنے نظریہ کے مطابق اس میں نکات و رموز پاتا ہے، ایک متصوف کو تصوف ہی تصوف نظر آتا ہے، ایک سیاسی کو سیاست ہی سیاست اوس میں نظر آتی ہے، مگر مجھے تو قرآن پاک میں تصوف ہی تصوف نظر آتا ہے،

ہمارے شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ کا نظریہ تصوف وہی ہے، جو مجدد طریقت شیخ الکل حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، کمال دین و اسلام کا نام تصوف ہے، احکام شرعیہ کی بجاآوری احسان و اخلاص کے ساتھ عین طریقت و حقیقت ہے، تصوف اسلام کا خلاصہ اہتمام طاعت اور اجتناب معصیت، اور دوام ذکر ہے اور بس،

افکار دنیا لاحاصل ہیں

قلب کو طمانیت اور دماغ کو سکون کیوں نہیں ہے؟ اس کے عدم حصول کا باعث کوئی دینی یا دنیاوی فکر ہوگی، اگر دینی فکر ہے تو مبارک، اور دنیاوی فکر ہے، تو اس فکر کا حاصل ہی کیا ہے، اللہ ولی المومنین ونعم الوکیل پیش نظر رہے،

کار ساز ما بفکر کار ما　　فکر ما در کار ما آزار ما

مجدد طریقت شیخ الکل کی تصانیف کا مطالعہ

بارہا و کرات مکتوب ہے کہ ہمارے حضرت کی تصانیف یعنی جس قدر ملفوظات اور مواعظ ہیں، انھیں مطالعہ کیا کیجئے، مواعظ و رسائل کا مطالعہ اکسیر ہدایت ہے،

اس سے استقامت اور بصیرت میں مدد ملے گی،

آپ التکشف فی التصوف اور بادۂ عرفان شرح دیوان حافظ پڑھا کیجئے، حضرت والا کے مواعظ و ملفوظات کے مطالعہ سے انشاء اللہ تعالیٰ کشف حجابات ہوں گے، اور سلوک کی سیدھی راہ معلوم ہوگی،

امام اور امامت کے فرائض

ناچیز کے ذمہ خطابت امامت کی خدمت بھی سپرد ہے، اس لئے اس باب خاص میں بھی زبانی اور تحریری ہدایات فرمائیں، اور حاضری کے مواقع پر خطابت و امامت کے لئے آگے بڑھا کر عملاً ہدایات حاصل کرنے کا موقع دیا،

امام نماز کا انتخاب تو جماعت کے ہاتھ میں ہے، تو پھر انتخاب و اجازت کے بعد امامت کیلئے آگے بڑھنا چاہئے تھا، اور تقاضائے ادب تو یہی تھا کہ بجا اذن بلا پس و پیش آگے بڑھ جائیے، ہاں بلا اذن جماعت امامت کرنا غلط تھا، بصورت امامت امام میں جو ریائی کیفیات پیدا ہوئی تھیں، ان کو ظاہر فرما کر ان سے اجتناب و احتراز کی تاکید فرمائی،

تحسین صورت اور بتکلف حسن و خوبی کے ساتھ قرأت ادا کرنے کی کوشش جو امام کرتا ہے، اس کا مقصد مقتدیوں سے داد تحسین کے حصول کے سوا اور کیا ہے؟ اور یہ چیز خلوص کے بالکل منافی ہے، نماز میں تمام تر توجہ خلوص نیت کے ساتھ احکم الحاکمین خالق کائنات اور رب العالمین کی طرف ہونی چاہئے، نماز اور دیگر عبادات محض انہی کی رضا اور خوشنودی کیلئے تو ہونی ہی چاہئیں، بلکہ مومن و مسلم کو ہر معاملہ ہر فعل و عمل ہر حرکت و سکون میں خدا کی رضا پر نظر رکھنا چاہئے، اور ان ہی کے مرضی کی سعی چاہئے، روایات و آثار اور امثال سے امام و امامت و خطابت سے متعلق آداب و رعایات امام و ماموم بیان فرمائے،

کیفیات و احوال اور توحش کے بعد بھی ضبط و سکون کے ساتھ مخلصانہ طور پر اس خدمت کو انجام دینا چاہئے، کسی وقت نماز میں بندۂ ہیچمدان سے سہو ہو گیا جب سجدۂ سہو ادا کر کے نماز سے فارغ ہوا، تو اعادۂ نماز کے لئے بنظر تحسین صلوٰۃ حکم فرمایا،

حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے تعلقات سے پیشتر گاہے گاہے اور تعلقات کے بعد تو اکثر عاجز استفتا اور استفسارات کیا کرتا تھا، گاہے فرماتے کہ کسی مفتی سے فتوی طلب کیجئے، گاہے جواب عنایت فرماتے، چنانچہ چند فتاوی راقم کے پاس محفوظ ہیں، ان مین سے صرف ایک فتوی جو بابت رویت ہلال صوم و افطار جو علماء کے درمیان مین معرکۃ الآرا ہے، درج کیا جاتا ہے جس سے مولانا کے تفقہ فی الدین کی حیثیت ناظرین پر واضح ہو جائے گی،

استفتاء: علماء دین متین مسائل مندرجۂ ذیل مین کیا فرماتے ہین:- ؟

مسئلہ (۱)

کسی مسلم ریاست کی مسلم جماعت یا کسی غیر مسلم ریاست کی مسلم جماعت نے رویت ہلال صوم، یا رویت ہلال فطر کی تحقیق و تفتیش اور شرعی شہادت لینے کے بعد کسی مسلم عادل مجاز شخص یا کسی غیر مسلم معاون و مجاز شخص کی زبانی، ریڈیو یا ٹیلیفون یا تار کے ذریعہ رویت ہلال صوم، رویت ہلال فطر کی خبرون کو دیگر بلاد و شہور مین نشر کرایا، اور بیک وقت مختلف مقامات سے نشر کرایا، تو ایسی متحقق و معتبر قابل اور متواتر خبرون پر مسلمانون کا صوم یا افطار شرعًا جائز ہے یا ناجائز؟ اگر ناجائز ہے، تو اس کی دلیلیں ازروی شرع عقلی و نقلی کیا ہین؟

مسئلہ (۲)

کسی مسلم یا غیر مسلم ریاست کے کسی شہر کے عالم دین یا امام مسجد جامع جن کی عدالت و صداقت مسلم ہو خود بعد اخذ شہادت شرعی کسی ریڈیو اسٹیشن سے رویت ہلال صوم یا رویت ہلال فطر کی خبرون کو نشر کرتے ہین، یا بجواب تار ٹیلیفون کے ذریعہ خبر ارسال کرتے ہین، تو ایسی صورت مین صوم یا افطار شرعًا جائز ہے، یا ناجائز، اگر ناجائز ہے تو کیون؟ اس کی عقلی و نقلی دلیلین ازروے شرع شریف کیا ہوسکتی ہین،

بینوا و توجروا۔

الجواب

(۱) کوئی قاضی ریاست اسلامیہ یا غیر اسلامی ریاست مین کوئی مسلمانون کا مقرر کردہ قاضی یا امام شرعی شہادت لینے کے بعد رویت ہلال صوم یا فطر کا اعلان بذریعہ ریڈیو یا تار ٹیلیفون کرے تو اس کے قضا کے مطابق عمل کرنا درست ہو، کیونکہ یہ شہادت نہین بلکہ نتیجۂ شہادت ہو، قضائے قاضی کا اعلان ہو، مگر ضرورت ہو کہ ان آلات نشر کی پوری نگرانی کی جائے، اور اس کا سارا کام مسلمانون کے ہاتھون انجام پائے،

(۲) تنہا عالم دین یا امام جامع مسجد ہونا کافی نہین، اس کا مسلمانون کی جماعت کا مقرر کردہ یا عملاً مسلم ہونا ضروری ہے، اگر ایسا شخص ہلال فطر، اور ہلال صوم کی شہادت شرعی لیکر کسی آلۂ نشر سے شائع کرے، یا تار ٹیلیفون سے ارسال کرے، تو اس کے مطابق عمل کرنا درست ہے، جب کہ آج بھی توپ یا گولہ یا نقارہ یا گھنٹہ سے ہلال یا چاند کے طلوع و غروب کا اعلان حکومت یا کسی مسلّمہ جماعت کی طرف سے کیا جاتا ہے، اور اس پر عمل کیا جاتا ہے،

سید سلیمان تاریخ ۱۰ر اگست ۴۸ء

از ریاست بھوپال

اس فتوی مین یہ فقہی نکتہ کہ یہ شہادت نہین بلکہ نتیجۂ شہادت ہے، قضائے قاضی کا فیصلہ و اعلان ہے، علامہ رحمۃ اللہ علیہ کی فقیہانہ نکتہ سنجی کی دلیل روشن ہے، دوسرے علماء نے اس شہادت کے غیر معتبر ہونے کی وجہ یہ بیان کی کہ یہ آلات جدیدہ شہادت کے قائم مقام نہین ہین، یا یہ آلات ذرائع شہادت کے قائم مقام نہین ہو سکتے ہین، اور اسی پر بار بار زور دیتے ہین، شہادت اور نتیجۂ شہادت کے فرق کی جانب کسی کی نظر نہین گئی،

حضرت قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کا عارفانہ کلام
اور
تصوف مین اُن کا مقام

از

جناب سید حسین صاحب ڈپٹی کمشنر لکھنؤ ڈویزن

حضرت قبلہ سید صاحبؒ کے ذکر کو اُنہی کے شیخ کے اس مصرعہ سے شروع کرتا ہون،

ع از سلیمان گیر اخلاص عمل

یہ ایک شعر کا مصرعۂ اولیٰ ہی، اور مصرع ثانی محفوظ نہین، اس کو خود حضرت قبلہ کی زبان مبارک سے سُنا تھا،

غالباً ماہ اکتوبر ۱۹۴۲ء کی آخری تاریخون مین سے کوئی تاریخ اور شوال ۱۳۶۱ھ کا آخری عشرہ تھا، مین اس زمانہ مین بلیا سے رخصت پر دار المصنفین اعظم گڈہ گیا ہوا تھا، حضرت قبلہ کے قیام کا کمرہ تھا، عصر و مغرب کے درمیان کا وقت تھا، یہ وہ زمانہ تھا جب کہ حضرت قبلہ کو تھانہ بھون سے گہرا ربط اور حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے خط و کتابت کا اصلاحی سلسلہ شروع ہو چکا تھا، حضرت قبلہ اس وقت کن مقامات سے گذر چکے تھے، اور کن حالات سے عبور کر رہے تھے، اس کا جاننے والا بجز رب العزت کے اور کوئی نہین، شیخ کامل واصل و طالب صادق وصے بدل دونون اس دارِ فانی سے دار البقا مین پہنچ چکے ہین، انھون نے اصول طریق کے مطابق اس چیز کو راز مین رکھا، مگر عادۃ اللہ ہے کہ جن حالات سے فلوق

[...]پیش کرنا چاہتے ہین، اس کے لئے غیب سے سامان مہیا کر دیتے ہین، ورنہ بزرگان پیشین کے حالات ہم تک نہ پہنچے؛

چنانچہ اس دن حضرت قبلہ کے خط کا جواب حضرت تھانویؒ کے دستِ مبارک کا لکھا ہوا موصول ہوا، چونکہ حضرت قبلہ کے علم مین یہ تھا کہ اس ناچیز کو بھی حضرت حکیم الامت سے عقیدت ہے، اس لئے فرمایا کہ حضرت مولانا کا خود لکھا ہوا ہے، اور خود حضرت کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اس زمانہ مین حضرت مولاناؒ بوجہ ضعف خطوط کے جواب عموماً خود نہین تحریر فرماتے تھے، بلکہ دوسرون سے لکھوا دیتے تھے لیکن حضرت قبلہؒ سے اس درجہ خصوصیت تھی کہ خود ہی جواب تحریر فرمایا تھا، یہ سن کر مین متوجہ ہو گیا کہ اگر کوئی خاص بات ہو گی تو خود ہی بتلائین گے، میری توجہ کو دیکھ کر فرمایا حضرت مولانا کبھی کبھی اشعار مین جواب تحریر فرماتے ہین، مین نے دیکھا کہ چار پانچ شعر حضرت مولانا تھانوی کے تحریر کردہ اس مکتوب پر تھے، مگر مجھے زیادہ قریب کر دیکھنے کی جرأت نہ ہوئی، میرا اشتیاق دیکھ کر اس کا ایک شعر پڑھ کر سُنایا جس کا مصرعۂ اولیٰ اوپر تحریر کیا گیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ نے اس کی تصدیق فرما دی کہ حضرت قبلہ اخلاص عمل کی منزل کو طے کر چکے تھے، اس پر رسوخ ہو چکا تھا، اور دوسرون کے لئے ان کا اخلاص عمل نمونہ بن چکا تھا، حضرت تھانویؒ کو جن لوگون نے دیکھا ہے، اور اُن کے معیار و مسلک سے آگاہ ہین، وہ اس کو سمجھ سکتے ہین کہ حضرتؒ کا فرمانا کہ فلان شخص سے اخلاص عمل کا سبق لو معمولی بات نہ تھی یہ خطاب بھی یقیناً اُن کے کاغذات مین ہو گا،

میرا قیام اعظم گڈہ ہی مین تھا کہ حضرت قبلہؒ نے الٰہ آباد کا سفر کیا، اور اثنائے راہ مین یہ غزل وارد ہوئی، جو کسی حد تک اُن کے اس وقت کے جذبات کی طرف اشارہ کرتی ہے،

براہ الٰہ آباد ۲۴ر اکتوبر ۱۹۴۲ء،

ابھی تو مشق[51] فغان کنج[52] مین ہزار[53] کرے
اثر[54] کے واسطے کچھ اور انتظار کرے

---

[51] یعنی گوشۂ خمول و خمول یا خلوت شب [52] مراد خود طالب یعنی اپنی ذات ہے [53] مراد اپنی زاری کا [54] رضائے حق،

جو آج لذتِ دردِ نہان کا جویا ہے | وہ پہلے سوز سے دل کو تو داغدار کرے
انہی کے وسیلے سے ملتا ہو جس کو ملتا ہو | وہی نہ چاہیں تو کوشش کوئی ہزار کرے
ادب سے دیکھیں عشاق دورِ سوان کو | مجال ہے جو نہیں کوئی ہمکنار کرے
سنا تو دے اوسے افسانۂ غمِ ہجران | وہ اعتبار کرے یا نہ اعتبار کرے
وہ اپنے کان سے سنتے ہیں میرے نالون کو | وہ طرزِ نالہ ہو جان کو بے قرار کرے
پلا دے ساغرِ سرشار مجھکو وہ ساقی | خزان کو ایک اشارہ میں جو بہار کرے
تری نظر میں ہے تاثیرِ مستیِ صبا | تری نگاہ جسے چاہے بادہ خوار کرے

تری نگاہ مین دو نون خواص رکھے ہین
وہ چاہے مست کرے چاہے ہوشیار کرے

اس غزل سے ثابت ہوتا ہے کہ باوجود شیخ کے اس ارشاد، ع از سلیمان گیرا خلاصِ عمل
وہ اپنی حالت پر مطمئن نہین ہین، اور آثار جذب و عشق سے پوری غزل اس کیفیت سے لبریز ہے،
دوسرے ہی دن حضرت سید صاحب قبلہ رحمۃ نے الہ آباد سے لکھنؤ کا سفر فرمایا اور اس سفر مین وہ
غزل ارقام فرمائی، جو لکھنؤ کے تعزیتی جلسہ منعقدہ ۲۶، ۲۷ دسمبر ۵۲ء کو مولوی حمید صاحب ازحرم
نے پڑھ کر سنائی تھی جس سے حاضرینِ جلسہ پر وہ حالت طاری ہوئی جو دیکھنے والے ہی جانتے ہین
اور اس کا بیان کرنا کم از کم میرے لیے مشکل ہو، وہ غزل یہ ہے،

بمقام لکھنؤ ۵ اکتوبر ۱۹۴۲ء

صدقِ احساس کی دولت ہمین فرما دیجے | غمِ امروز بھلا دے غمِ فردا دیدے
دھن کچھ ایسی ہو فراموش ہو اپنی ہستی | دلِ دیوانہ و سودائی و شیدا دیدے
اپنے میخانہ سے اور دستِ کرم سے اپنے | دو لرزتے ہاتھوں مین مرے ساغر و مینا دیدے

کھول دے میرے لئے علمِ حقیقت کے رموز | دل وہ دانا دل بینا دلِ شنوا دیدے
تو دل مین رنگِ عمل بھر کے بنا دے رنگین | لبِ خاموش بنا کر دلِ گویا دیدے
دلِ بیتاب ملے دیدۂ پُر آب ملے | تپِ آتش مجھے دیدے نمِ دریا دیدے

درد دل سینہ مین رہ رہ کے ٹھہر جاتا ہے
جو نہ ٹھہرے مجھے وہ درد خدایا دیدے

یہ غزل اپنی کیفیات کے اعتبار سے سید صاحب قبلہ رحمۃ کی بہترین غزلون مین، اور ان کی کیفیات
عروج و کمال کی آئینہ دار ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ اشعار مین جو عرض درگاہ قاضی الحاجات مین کی گئی
تھی، وہ مقبول ہو گئی، اس کو پڑھکر بے ساختہ حضرت خواجہ حافظ رحمۃ اللہ علیہ کی یہ غزل یاد آتی ہے، اس کا
بھی شان ورود کچھ اسی قسم کا ہے،

دوش وقتِ سحر از غصہ نجاتم دادند | وندر آن ظلمتِ شب آبِ حیاتم دادند
بیخود از شعشعۂ پرتوِ ذاتم کردند | بادہ از جامِ تجلی بصفاتم دادند
من اگر کامروا گشتم و خوشدل چہ عجب | مستحق بودم و این ہا بزکاتم دادند

کیمیائیست عجب بندگیِ پیرِ مغان
خاکِ او گشتم و چندین درجاتم دادند

ایک مرتبہ لکھنؤ سے قبلہ کا سفر تھانہ بھون کا ہوا، اور شیخ کی بارگاہ مین تشنگی کو سیرابی عطا ہوئی
اس کی مرقع ایک غزل اور ایک نعت ہے، نعت یہ ہے،

تھانہ بھون، ۲۰ شوال ۱۳۶۱ھ
مطابق ۱ نومبر ۱۹۴۲ء عیسوی

نام محمد صلِ علیٰ نورِ محمد صلِ علیٰ | خدمود وصل علیٰ قدِ موزون صل علیٰ

رحمتِ عالم صلِّ علیٰ فخرِ آدم صلِّ علیٰ
مرسلِ اکرم صلِّ علیٰ، اسمک احمد صلِّ علیٰ

چہرہ، نورِ شمسِ ضحیٰ زلفِ معنبر لیلِ سجیٰ
قلبِ مطہر عینِ ہدیٰ ذکرِ محمد صلِّ علیٰ

شاہدِ عالم شاہِ امم ہادیِ اعظم شمعِ حرم
صاحبِ لطف و جود و کرم حق نے کہا صلِّ علیٰ

راقم کا گمان غالب ہے کہ اس قیام تھانہ بھون میں قبلہ علیہ الرحمۃ فانی فی الرسول ہو گئے، اور سیرت نگارِ نبوی کے لئے فنا فی الشیخ ہونے کے بعد فنا فی الرسول ہونے میں کیا دیر لگ سکتی ہے، جس شخص نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس زندگی کے ہر ہر پہلو پر سالہا سال کے غور و فکر کے بعد قلم اٹھایا ہو، اور اس کو مدلل و مبسوط طریقہ سے ضبط کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا ہو، کیا یہ ممکن ہے کہ اس نے اپنے حالات و اخلاق کو اسی سانچہ میں ڈھالنے کی سعی نہ کی ہوگی، جن لوگوں کو حضرت علیہ الرحمۃ اور ان کی نشست و برخاست، ان کے رہن سہن، ان کے خندہ و تبسم، ان کے خورد و نوش، ان کی رفتار و گفتار، ان کے حالات و کردار، ان کے معاملات —— ان کا صبر و تحمل، ان کی جود و عطا وغیرہ کو دیکھنے کا موقع ملا ہے، وہ اس کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان کے جملہ حالات میں اسوۂ رسول کی کتنی جھلک تھی، اس کے علاوہ حضرت نجیب الطرفین سید تھے اور انکے اسلاف میں سلسلہ بسلسلہ دولتِ ولایت ودیعت ہوتی چلی آئی تھی، خود ان کے ذاتی حالات اظہر من الشمس ہیں، ان کو قریب سے دیکھنے والوں کا جن میں ہر طبقہ ہر جماعت اور ہر خیال کے لوگ شامل ہیں، اس پر اتفاق ہے کہ سیرت نگارِ نبوی کے ظاہری و باطنی اخلاق و اعمال پر خلقِ نبوی کا کتنا گہرا اثر تھا، خود حضرت مولانا تھانوی نے پہلی ہی ملاقات میں اپنے خاص متعلقین سے فرمایا تھا کہ

"بھائی ان کے اندر کس بات کی کمی ہے، ان کی مثال تو بارود کی سی ہے، محض دیا سلائی لگانے کی دیر ہے"

تھانہ بھون میں دس بارہ روز کے قیام کے بعد جب لکھنؤ واپسی ہوئی تو مجھے بھی ان کے پروگرام کی اطلاع ہوئی، رخصت پر تو تھا ہی اپنے نجی کام سے لکھنؤ گیا، اور بعد فجر ندوۃ العلماء کے مہمان خانہ پر پہنچا، وہاں قبلہ کو

موجود پایا، آپ کے حالات و کیفیات کو بینا چیز کیا سمجھ سکتا لیکن اتنا اندازہ ضرور ہوا کہ حضرت بے حد مسرور و شاداں ہیں، دار العلوم کے اساتذہ و طلبہ اور دیگر حضرات مہمان خانہ میں حضرت کے گرد جمع تھے، اور آپ اپنے مخصوص انداز میں گفتگو فرما رہے تھے، چائے آئی، میں بھی شریک ہوا، چائے کے بعد مخصوص حضرات وہاں رہ گئے تھے، جن میں زیادہ دار العلوم ہی کے اساتذہ اور طالب علم تھے، اس مجلس میں قبلہ نے اپنی غزل مورخہ ۲ر نومبر جو اوپر درج ہو چکی ہے لوگوں کو سنائی، یہ مجلس تقریباً دس گیارہ بجے ختم ہوئی، کھانا کھایا گیا، بعد قیلولہ کے بعد نماز ظہر مسجد دار العلوم میں جماعت کے ساتھ ہوئی، اس کے بعد پھر مہمانخانہ میں مجلس ہوئی، اس مجلس میں بھی کچھ غزلیں سنائیں، حاضرین میں سے چند حضرات کو میں نے علیحدہ کہتے ہوئے سنا کہ سید صاحب قبلہ میں غیر معمولی تغیر ہے، یہ باتیں ان میں نہ کبھی دیکھی تھیں اور نہ سنی تھیں، اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ ان کو کبھی اس طرح شعر پڑھتے نہیں سنا تھا، اس لئے بہت متعجب تھے، دو یا تین دن دار العلوم میں قیام رہا، اس درمیان میں برابر اس قسم کی مجلس ہوتی رہی، پھر لکھنؤ سے قبلہ کے ساتھ میں بھی ہم سفر ہوا، ریل میں یہ غزل ارقام فرمائی،

براہ شاہ گنج ۱۶ر نومبر ۴۲ء

ہر بات میں جس کی ہو کیفیتِ مستانہ
آباد رہے یارب تا حشر وہ میخانہ

چھائی ہے یہاں مستی ہر ایک نمازی ہے
حیرت ہے یہ گھر اک دل مسجد ہے کہ بتخانہ

زاہد نے کہاں پائی زاہد نے کہاں پی لی
گفتار ہے رندانہ رفتار ہے مستانہ

دستارِ فضیلت ہو یا دلقِ مرقع ہو
ہونا ہے اسی اک دن نذرِ درِ میخانہ

ہر قطرہ ندامت کا جو دیدۂ تر میں ہے
ہے دامنِ خالی کا وہ گوہرِ شاہانہ

وہ چشمِ محبت تو جو پیاسے محبت ہو
دیکھے تو ذرا کر کے اس کو کوئی یارانہ

معشوق یگانہ ہے عاشق بھی یگانہ ہو
یعنی کہ جو اس کا ہو وہ سب سے ہو بیگانہ

حاصل رہے کیفیت ہر وقت حضوری کی

اے دل میں مرے چھپ جائے صورتِ جاناں

جو شعر لکھتے تھے اس کو کمترین کو سناتے تھے کچھ اشعار ظہر کی نماز سے پہلے لکھے، کچھ اس کے بعد اور عصر سے پہلے غزل مکمل ہو گئی، اور شاہ گنج ہوتے ہوئے ہم لوگ ۸ بجے شب کو اعظم گڈھ کو پہنچے، آخری شعر کے علاوہ پوری غزل میں یا تو شیخ کے فیوض و برکات کا ذکر ہے، یا خود اپنی ذاتی کیفیت و حالت کا بیان ہے، آخری شعر خاص طور پر کئی حیثیتوں سے قابل غور ہے، اس میں فنانی اللہ کی دلالت پائی جاتی ہے،

حضور دوام کی تمنا کے ساتھ محبوبِ حقیقی سے دل میں سما جانے کی التجا عروج کا انتہائی مقام ہے جس کے بعد سیر فی اللہ شروع ہوتی ہے، جس کی انتہا نہیں، اسی مقام کو کسی عارف نے اس شعر میں ظاہر کیا ہے،

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جان شدی

تا کس نگوید بعد ازین من دیگرم تو دیگری

اس کے بعد ۲۸ نومبر ۴۲ء کو اعظم گڈھ ہی میں یہ غزل ہوئی،

کیا بھری تاثیر میں مطرب تری آواز ہے
جو تری محفل میں بیٹھا وہ سراپا ساز ہو

باغ میں صحرا نظر آتا ہے اور صحرا میں باغ
اب مرے جوشِ جنون کا اور ہی انداز ہو

پاؤں تو حد ادب سے عشق میں باہر نہ رکھ
وہ ہمہ خوبی و محبوبی سراپا ناز ہو

نام اُن کا ہر نفس میں لب پہ یوں آیا کیا
تن سے جیسے روح بسمل مائلِ پرواز ہو

دیکھئے ملتی ہے کب دولت سکونِ عشق کی
ہائے ہوئے جوش تو سرمایہ آغاز ہے

گاہ دیکھا تمہاری چشم تصور نے تمہیں
اب وہی تصویر میری ہمدم و دمساز ہو

جو نہیں معلوم ہے اس کو کوئی جانے گا کیا

جب کہ جو معلوم ہے وہ بھی سراسر راز ہو

اس غزل کا بھی قریب قریب وہی انداز ہے، جو اس سے پہلے کی غزل کا ہے، اب سید علیہ الرحمۃ فانی فی الشیخ ہو چکے تھے، اور ان کا کلام اسی نہج پر قائم ہو گیا،

دسمبر ۴۲ء کی پہلی یا دوسری تاریخ کو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا والا نامہ آیا، عصر کی نماز کے بعد حسب معمول کمرہ میں چائے آئی سب اعزہ جمع ہوئے، چائے پی کر سب لوگ چلے گئے، مگر میں وہیں بیٹھا رہا، قدرے سکوت کے بعد ارشاد فرمایا کہ حضرت مولانا کا والا نامہ آیا ہے، تحریر فرمایا ہے کہ من جانب اللہ وارد ہوا ہے کہ آپ کو طریق قادریہ نقشبندیہ سہروردیہ و چشتیہ میں اجازت بیعت کی دوں، چنانچہ اس وارد غیبی کے تحت آپ کو اس کا اہل پاتے ہوئے اجازت بیعت کی دیتا ہوں، اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ برکت و صبر عطا کریں، اور آپ کے فیوض کو عرصۂ دراز تک جاری رکھیں، آپ اس کی اطلاع اپنے ملنے والوں اور دوستوں کو بھی کر دیں، تاکہ لوگوں کو علم ہو جائے، اور ان کو افادہ ہو،

یہ خبر سنانے کے بعد اپنے مخصوص انداز میں فرمایا، کہ بھائی میں تو بالکل خام ہوں لیکن حضرت کے ارشاد کی تعمیل میں تم کو اس کی خبر کرتا ہوں تم اپنے عزیز بھی ہو، اور حضرت سے تم کو عقیدت بھی ہے، میں سن کر باغ باغ ہو گیا، اس کے بعد بھی میرا قیام تقریباً ۳ ہفتہ اعظم گڈھ میں رہا، اور برابر قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میسر رہی، اور بہت قریب سے ان کے حالات مشاہدہ میں آئے، جن کا پوری طرح تحریر میں لانا میرے لئے مشکل ہے اور اس کی اس مختصر مضمون میں گنجائش بھی نہیں ہے، اس لئے صرف نمونہ مشتے از خروارے پیش کرتا ہوں کہ ان سے محبت کرنے والوں کے اشتیاق کو کچھ سیری ہو سکے،

سب سے بڑی بات جو میں نے دیکھی وہ یہ تھی کہ اس کے بعد بڑی تیزی سے ماسوا سے قلب کا رہا سہا علاقہ بھی منقطع فرما لیا، پہلے دار المصنفین کے کاموں سے خالی اوقات کا کافی حصہ اہل و عیال کے ساتھ دینی مذاکرہ میں صرف فرماتے یا چھوٹے بچوں سے بذلہ سنجی میں، اب ان اوقات کا بڑا حصہ خلوت میں گذرتا، خواہ مسجد میں ہو یا اپنے سکونت کمرے میں، پہلے عصر کے بعد چائے رفقائے دار المصنفین کے ساتھ نوش فرماتے، اور مغرب تک ان سے مختلف

مسائل پر گفتگو فرماتے، یہ مجلس بھی تقریباً ختم ہوگئی، کبھی اعزہ، اہلیۂ محترمہ سے اشتیاق ظاہر کرتے کہ قبلہ سے کچھ باتیں سنوا دیجئے، عرصہ ہوا اُن کی صحبت جی بھر کر نہیں میسر نہیں آئی، تو وہ جا کر گوشۂ خلوت سے لے آتیں، اور کچھ دیر کے لئے آپ تشریف لے آتے، اہل و عیال و احباب کی درخواست بہت کم مسترد فرماتے تھے، اس لئے کبھی دلجوئی و استمالت کے لئے برآمدہ یا آنگن میں تشریف رکھتے، مگر دل کہیں اور ہی ہوتا، سب کی خیر و عافیت دریافت فرماتے، اور جلد ہی اُٹھ کر جانا چاہتے، اگر کوئی اصرار کرتا، تو تھوڑی دیر کے لئے رُک بھی جاتے، لیکن سب کو یہ محسوس ہوتا،

چسکا لگا ہے جام کا شغل ہے صبح و شام کا
اب میں تمہارے کام کا ہم نفسو نہیں رہا

یہ صورت دیکھ کر لوگوں نے اصرار کرنا ترک دیا، اور حضرت قبلہ کا اہل و عیال سے ملنا جلنا بھی دس پانچ منٹ کا رہ گیا، باہر کے سفر بھی ترک فرما دیئے، ایم اے وغیرہ کے امتحانات کی ممتحنی وغیرہ سب چھوڑ دی، دارالمصنفین کے کام کے اوقات کے علاوہ خلوت کو زیادہ عزیز رکھنے لگے،

خورد و نوش اور لباس وغیرہ میں بڑی تبدیلی ہوگئی، پہلے کے لباس فاخرہ سب بکسوں ہی میں بند رہ گئے، نادر شاہ کی عطا کردہ خلعت کو کیڑوں نے چاٹ لیا، اکثر اہلیۂ محترمہ یاد کر کے ہر دوسرے دن کپڑے نکال دیتیں، اور اگر کاموں کی مشغولیت سے انھیں خیال نہ رہتا، تو خلاف معمول تین تین دن تک ایک ہی کپڑا پہنے رہتے، بعض لوگ جن کو مزاج عالی میں درخور تھا، کبھی عرض کرتے کہ حضرت تصوف کے یہ معنی تو نہیں کہ انسان کو کپڑا بدلنے کی بھی خبر نہ رہے، مسکرا کر فرماتے کہ اب بڈھا ہوگیا ہوں، یاد نہیں رہتا آپ یاد دلادیا کریں،

چودھری اکبر حسین صاحب جج نے جن کو حضرت سے عقیدت تھی، تحریر فرمایا کہ حضرت آپ تو خود علوم و معارف کا سمندر ہیں، آپ کو مولانا تھانوی کے پاس جانے کی کیا ضرورت پیش آئی، دریا سمندر میں

گرتا ہے نہ کہ سمندر دریا میں، اور بھی بعض لوگوں کے اسی قسم کے خطوط آئے، ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ دیکھئے ان حضرات کو کہ ایک طرف مجھ سے اظہار عقیدت بھی فرما رہے ہیں، اور دوسری طرف اپنی تجویز بھی پیش کر رہے ہیں، اور میرے فیصلہ پر تنقید بھی ہے، عقیدت کے تو یہ معنی ہیں کہ اُن کو یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ میرے متعلق جو کچھ کہتے ہیں، اگر وہ سب صحیح ہو تب بھی اُن کو غور کرنا چاہئے کہ میں نے جو کچھ کیا ہے وہ سوچ سمجھ کر اور دور جان کر کیا ہوگا، یہ تو ایک اصولی بات ہے کہ اگر ایک فن میں مجھے مہارت نہیں، اور کوئی اس فن کا مجھ سے زیادہ واقف کار ہے، تو اس سے اس بات کے دریافت کرنے میں کونسی بات خلاف عقل ہے، یہ کیا ضروری ہے کہ ایک انسان میں سارے علوم موجود ہوں، تمام کمالات تو اللہ پاک ہی کے لئے ہیں، اور یہ تو نص سے بھی ثابت ہے کہ فضّل اللہ بعضهم علی بعض، اس لیے ان کا یہ اعتراض میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا، مگر یہ بیچارے معذور ہیں، اُن کی نیت بُری نہیں ہے، کبھی کسی پر تعریض نہیں فرماتے، بات کو منقح کرنے کے بعد فیصلہ سامع پر چھوڑ دیتے، خود قطعی حکم نہ لگاتے، عجیب تحمل اور صاحب خلق و مروت انسان تھے، اکثر فرماتے کہ بھائی کیا میرے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ میں اپنے کپڑے بھی خود سی لیا کروں، یہ تو فن کی بات ہے، حضرت مولانا تھانوی کو اللہ پاک نے فن تصوف میں اس دور میں بڑی مہارت عطا فرمائی ہے، اس لئے ان کی مہارت سے اگر فائدہ اٹھایا جائے، تو اس میں کونسی عیب کی بات ہے،

انہی ایام میں اکثر دیکھا کہ حضرت قبلہ فرش زمین پر بیٹھے ہیں کہ لوگ آ گئے، آپ وہیں بیٹھے بیٹھے گفتگو فرمانے لگے، کبھی بعد نماز مغرب دارالمصنفین کی مسجد کی شمالی چار دیواری پر ایک کونہ میں ذکر حق میں مشغول ہوتے، کبھی مکان مسکونہ کے باہر برآمدہ میں تخت پر بغیر کسی فرش کے، کبھی مکان کے کسی اور گوشہ میں متوجہ الی الحق پائے جاتے، کھانے کا وقت آتا یا کسی اور ضرورت سے لوگ تلاش کرتے ہوئے پہنچتے تو اس حالت میں دیکھ کر عرض کرتے کہ اس طرح کیوں تشریف رکھتے ہیں، فرما دیئے ہوتے تو فرش بچھا دیا جاتا، یا قالین کی جانماز بچھا دی جاتی، سردی کا موسم ہے، ٹھنڈک نہ لگ جائے، فرماتے کہ ان ظاہری باتوں میں کیا رکھا ہے، خود قبلہ کا شعر اس

جون پور، ۲۷ر اکتوبر ۱۹۴۳ء،

ہم ایسے رہے یان کہ ویسے رہے
وہان دیکھنا ہے کہ کیسے رہے

خیالِ دورروزہ کا کیا عیش و غم
سفر کا بھی کیا جیسے تیسے رہے

یہ اس شخص کا حال ہے جو اس دور مین نفاست مزاج مین مرزا جان جانان شہید کی مثال اور ظاہری و باطنی حسن اخلاق کا مجسمہ تھا، جس کا رہن سہن اور لباس شاہانہ رہ چکا تھا، جس کی سیرت نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ہند بھی مقبول ہو چکی تھی، وہ دار العلوم ندوۃ العلماء کا درخشندہ ستارا جس کی علمی شہرت ساری دنیا اسلام مین تھی، وہ صاحب علم جس کے قلم کا لوہا یورپ کے مستشرقین تک مانتے تھے، جس کے زور قلم نے الہلال کو بدر کامل بنا کر چمکایا، جس کی معارف نوازی نے علم و فن کے دریا بہا دیئے، جس نے استاد مرحوم کی وصیت کو اس درجہ نباہا کہ اعظم گڈھ جیسے ویرانے کے ایک گوشہ مین ساری عمر گذار دی، اس چھوٹے سے مقام کو علم و فن کا مرکز بنا دیا، اور دار المصنفین کی علمی شہرت ساری دنیا مین پھیلا دی، جس کی زیارت کے لئے دور دور کے اہل کمال آتے تھے،

وہ جامع العلوم جس کو نادر شاہ نے کابل یونیورسٹی کا نصاب بنانے کے لئے منتخب کیا، جس نے اپنی عربی دانی کا سکہ عربون تک پر بٹھا دیا، جس نے پیرس اور روم و لندن وغیرہ کے علمی حلقون سے خراج تحسین حاصل کیا، وہ مورخ اعظم جو اپنے دور مین مدتون معیار تاریخ سمجھا گیا، وہ قدیم و جدید کا سنگم جس کی ذات مین دونون کی سرحدین ملتی تھین، وہ پرتو صفات نبوی، وہ نمونۂ اخلاق اسلامی، وہ جامع کمالات انسانی، وہ جسے دنیا کی ہر قسم کی جاہ و شہرت بے طلب حاصل تھی، دفعۃً جب مقام فنا سے گذرتا ہے تو اپنے آپ کو دیا مٹا تا ہے کہ موتوا قبل ان تموتوا کا مصداق بن جاتا ہو حضرت قبلہ کی ایک غزل ان حالات کی بہترین ترجمان ہے،

پا کر تجھے اپنے کو مین کیا بھول گیا ہون
ہر سود و زیان دو سرا بھول گیا ہون

جس دن سے مری دل مین تری یاد بسی ہے
ہر ایک کو مین تیرے سوا بھول گیا ہون

آتا ہے خدا بھی ترے صدقہ مین مجھے یاد
گویا کہ بظاہر مین خدا بھول گیا ہون

عالم کے تماشے نہین اب جاذب دل ہین
ہر لذت ہستی کا مزا بھول گیا ہون

ہر سمت نظر آتے ہین ہر وقت وہ مجھکو
دوری مسافت کا گلہ بھول گیا ہون

اب مسئلۂ کثرت و وحدت کو مین سمجھا
پا کر تجھے سب تیرے سوا بھول گیا ہون

سجدہ طرف کعبہ ہے، دل تیری طرف ہے
اب قبلہ بھی ای قبلہ نما بھول گیا ہون

حل جب سے ہوا فلسفۂ حسن حقیقت
ہر مسئلہ اے ذہن رسا بھول گیا ہون

ہے آہ سحرگاہ مین وہ ذوق لب گوش
چنگ و نئے و بربط کی صدا بھول گیا ہون

منظور تری چشم رضا جب سے ہوئی ہے
امید جزا خوف سزا بھول گیا ہون

اے رہبر توفیق مجھے راہ بتا دے
نقش قدم راہ نما بھول گیا ہون

اے خضر مرا قافلہ کس سمت گیا ہے
تیمیز صدا ہائے درا بھول گیا ہون

الٹا ہے ورق آج سے افسانۂ نو کا
افسانۂ پارینہ و لا بھول گیا ہون

یہ غزل حضرت مولانا تھانوی سے بیعت ہونے کے ہفتہ عشرہ کے اندر ہی کہی تھی، اس زمانہ میں جو کیفیات ان پر طاری ہوئین، ان کی ترجمانی اس سے بہتر اور کسی غزل مین نہین پائی جاتی،

تصوف مین حضرت کا جو مقام تھا، اس کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے، مگر اس فن مین حضرت کو جو دستگاہ حاصل تھی، اس کا کسی قدر اندازہ حضرت کے اقوال سے کیا جا سکتا ہے، ایک بار مین نے استفسار کیا کہ حال، و مقام کیا ہے، اور مراتب سلوک کسے کہتے ہین، اس کے جواب مین تحریر فرمایا،

حال :- سالک کے قلب پر جو عارضی کیفیت، اس کے اختیار کے بغیر

طاری ہو جائے،

مقام: وہ مرتبۂ سلوک جس پر سالک رسوخ قدم کے ساتھ قائم ہو جائے،

مراتب سلوک: یعنی مقامات جیسے صبر و شکر، توکل، استقامت علی الحق، زہد، رجا، وغیرہ،

ایسے جامع کمالات کا تذکرہ جس کے قلم نے صدہا انسانوں کو زندۂ جاوید کر دیا، مجھ جیسے ہیچ مرز انسان کے بساط سے باہر ہے، لیکن اُن کی جو شفقت اس ناچیز پر تا دم آخر رہی، اس کو کسی طرح بھولا نہیں جا سکتا، اور یہ کمترین فرد خانوادۂ سلیمانی اس وقت بھی اُن کے فیوض کو اپنے اوپر اسی طرح پاتا ہے، جس طرح اُن کی حیات میں پاتا تھا، اور انہی کی روحانی برکت سے یہ چند سطور اس ناچیز کے قلم کر تحریر میں آگئیں،

اب میں اس ذکر کو حضرت قبلہ کے خواجہ تاش حضرت مولانا عبد الصمد صاحب مدظلہ دامت برکاتہ کی اس تحریر پر ختم کرتا ہوں، جو انھوں نے حضرت قبلہ کی وفات کے وقت مجھکو لکھی تھی،

"ایک خبر جانکاہ ریڈیو سے ۲۲ر نومبر کی شب میں پاکستان سے نشر ہوئی تھی کہ ہمہ صفت علوم دینیہ و ادبیہ و تاریخ و تصوف کے آن موصوف کے ارتحال کی تھی، اس کا صدمہ بہت ہے، "انا للہ وانا الیہ راجعون" اللہ تعالیٰ اُن کو بہتر ٹھکانا جنت الفردوس میں عطا فرمائیں، اور ان کے درجات عالیہ ہر روز وہاں بلند فرماتے رہیں، موت تو اس عالم آب و گل کے ہر ذی بساط ہستی کے لئے لازم ہو چکی ہے مگر موصوف ہمہ صفت پر کیا ماتم کا حق ادا ہو سکے، سوا اس بات کے کہ ہند کی سرزمین کا ایسا فرد جو علمی و ادبی عالم میں مایۂ ناز ہستی تھا، جس کی تلافی اس عالم میں محال کا اندازہ لگاتے ہوئے و شوار ہی نہیں بلکہ محال ہے، اللہ تعالیٰ آن موصوف کو اعلیٰ علیین میں بلند مقام پر فائز فرمائیں،

اور ہم پس ماندگان کے لئے اُن کی ذات اقدس کو نمونہ بنا کر درس عمل کی توفیق بخشیں، آپ کی بہت سی خصوصیات اکتسابی وغیر اکتسابی نوادرات میں سے تھیں جو قابل مطالعہ و سبق ہیں، اللہ تعالیٰ صبر جمیل عطا فرمائیں،

حضرت قبلہ مرحوم میرے محترم بڑے پیر بھائی تھے، جن کا صدمہ مجھے بہت زیادہ ہے، اس کی تلافی تو بس اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہی کر سکتی ہے،"

ڈاکٹر سید سلیمان ندوی مرحوم اور انکا تشخص

از

ڈاکٹر محمد زبیر صاحب صدیقی

مولانا ڈاکٹر سید سلیمان ندوی کی وفات ہم لوگوں کے لئے ایک جانکاہ حادثہ ہے، اس حادثہ ہائلہ سے ہندوستان کی مسلم سوسائٹی مین علی العموم اور ہماری علمی دنیا مین علی الخصوص ایک ایسا خلاء پیدا ہوگیا ہے جس کا پُر کرنا بہت ہی مشکل اور متعذر معلوم ہوتا ہے، سید صاحب مرحوم مین اُن کے علمی تبحر کے ساتھ ساتھ ایسی ذاتی اخلاقی اور نفسانی خوبیان تھین، جو آج کل ہم لوگون مین مفقود ہیں، یہ خصائل حسنہ اُن کو اپنے آباء واجداد سے وراثۃً ملے تھے، اور علمی تبحر انھون نے اپنی مسلسل محنت وجانفشانی، اور مطالعہ سے حاصل کیا تھا،

وہ علماے بہار کے ایک ایسے ممتاز خاندان کے چشم وچراغ تھے، جن کی اخلاقی خوبیون کی داستان وہان کے اکثر بڑے بوڑھے بیان کیا کرتے تھے، اُن کا مولد وموطن بہار کا ایک چھوٹا سا گاؤن دسنہ تھا، جو اب بھی اہلِ علم کا مجمع ہوم ہونے کی حیثیت سے اس صوبہ مین ایک خاص امتیاز رکھتا ہے، ایسی چھوٹی سی بستی کے علمی ماحول مین سید سلیمان مرحوم نے اپنی ابتدائی عمر صرف کی اور عربی فارسی کی ابتدائی تعلیم بھی حاصل کی، زندگی کا یہ ابتدائی حصہ ہر شخص کے لئے بہت ہی اہم ہوتا ہے، اسی زمانہ مین انسان کے خصائل بنتے ہین، اس کی سیرت کا بڑا اہم حصہ جڑ پکڑتا ہے، اور اس کا تشخص متعین ہوتا ہے، ماہرین نفسیات کی تو

رائے ہے کہ پانچ سال کی عمر کے بعد انسان کے کردار مین عموماً کوئی اہم تغیر پیدا ہی نہین ہوتا، سید سلیمان مرحوم کی سیرت اور خصائص وشمائل کی بنیاد اسی چھوٹے سے گاؤن کے علمی ماحول مین پڑی، اور ان کا تشخص یہین متعین ہوا،

یہ ماحول ہمارے قدیم طرز کے علماے اسلام کا تھا، جو قرآن وحدیث وغیرہ کو پڑھ کر صرف اپنے حافظہ ہی مین نہ رکھتے تھے، بلکہ ان مین جو اخلاقی تعلیم ہے، اس کو اپنے دلون مین سمو لیتے تھے، وہ محاسنِ اخلاق کے مجسمے ہوتے تھے، اُن کی جیتی جاگتی چلتی پھرتی تصویر ہوتے تھے، عجز وانکسار، محبت ومودت، صداقت وامانت، صبر واستقامت، تحمل، وتشکر، عفت وپاکبازی، عام انسانی ہمدردی، خوفِ خدا، اور جذبہ بہ خدمتِ خلق، اور دوسری صفاتِ عالیہ کے ساتھ، جن کی تعلیم کلامِ پاک اور رسولِ کریم نے دی ہے متصف ہوتے تھے، یہ لوگ اپنے بچون اور طلبہ کو ابتدائی عمر مین کریما، اور پندنامہ جیسی اخلاقی کتابین صرف پڑھاتے ہی نہ تھے، بلکہ انھین جو عملی اخلاقی تعلیم دی گئی ہے، ان کا اپنے اعمال وافعال، اور حرکات وسکنات سے، ان کے سامنے مظاہرہ بھی کرتے تھے، وہ جس طرح اپنے اوقات کی قدر کرتے تھے اسی طرح دوسرون کے اوقات کی قدر وقیمت کو بھی سمجھتے تھے،

یہ سارے صفاتِ حمیدہ سید سلیمان نے اپنے آباؤ اجداد سے وراثۃً پائے تھے، اور اُن کے ماحول نے انکی سیرت وکردار مین پختگی پیدا کردی تھی، میری جو چند ملاقاتین سید سلیمان صاحب مرحوم سے ہوئین، اُن سے مجھ پر یہی اثر ہوا کہ سید صاحب مرحوم کے محاسن اخلاق، اہلِ اسلام کے لئے ایک نمونہ تھے، ان ملاقاتون کی تفصیل یہ ہے،

یہ عجیب افسوسناک واقعہ ہے کہ باوجود اس کے کہ میرا مولد وموطن ضلع پٹنہ ہی ہے، اور مین نے بھی علوم عربیہ کی ابتدائی تعلیم شہر پٹنہ ہی مین حاصل کی، سید سلیمان مرحوم سے میری ملاقات صرف پانچ دفعہ ہوئی، اور ان مین بھی چار بار محض اتفاقی طور پر،

پہلی ملاقات ۱۹۱۱ء مین ہوئی، جب مین مدرسہ عالیہ رامپور سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اورینٹل کالج لاہور مین مولوی فاضل کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا، سید صاحب اُس زمانہ مین دار العلوم ندوۃ العلماء مین مدرس تھے، لاہور سے پٹنہ جاتے ہوئے مین مولنا شبلی مرحوم اور سید صاحب مرحوم کی زیارت کرنے کیلئے دو دن

لکھنؤ مین ٹھہر گیا، سید صاحب سے مسجد مین نماز ظہر کے وقت ملاقات ہوئی، صرف چند منٹ کچھ باتین کین پھر مین نے رخصت چاہی، تو سید صاحب نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا، مین نے مدرسہ کے طلبہ کے شرارت آمیز انداز مین مسکرا کر عرض کیا کہ مولنا! رخصت کے وقت تو مصافحہ آیا نہین ہے، سید صاحب مسکرائے، اور بجائے اس کے کہ اس مسئلہ پر بحث کرنا شروع کر دیتے، خاموش ہو رہے، حالانکہ وہ اس مسئلہ پر اچھی خاصی عالمانہ بحث کر سکتے تھے،

سید صاحب سے میری دوسری ملاقات ۱۹۲۶ء مین ندوۃ العلماء کے کتبخانہ مین محض اتفاقی طور پر ہوئی مین کتب خانہ مین ابن تیمیہ کی کتاب المعتبر کے مخطوطہ کی تلاش مین گیا تھا، اتفاق سے سید صاحب بھی وہان موجود تھے، لیکن مین نے اُن کو نہ پہچانا، مہتمم کتب خانہ سے باتین کر کے واپس ہونے لگا تو سید صاحب نے خود ہی بلا تکلف میرا نام دریافت کیا، مین نے عرض کیا "زبیر" تو فرمایا کہ "مین بھی یہی سمجھا تھا، میرا نام سید سلیمان ہے" مین نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا، اور نہ پہچاننے کی معذرت کی، اس کے بعد ندوہ کے متعلق چند باتین ہوئین، اور آیندہ تفصیلی ملاقات کی امید پر مین نے رخصت حاصل کی،

میری تیسری ملاقات سید صاحب سے اتفاقی طور پر ریل مین ۱۹۳۲ء مین ہوئی، سید صاحب حسب معمول نہایت بے تکلفی سے ملے، اس زمانہ مین مین تاریخ علم الحدیث پر کام کر رہا تھا، اس موقع کو غنیمت سمجھکر مین نے اُن سے استفادہ کے خیال سے فنِ اسماء الرجال کی ابتداء، اور نقدِ حدیث وغیرہ کے متعلق مختلف سوالات کئے، اور اس سلسلہ مین گولڈزیہر کی کتاب "مطالعاتِ اسلامیہ" کی تعریف کی، سید صاحب کو میری یہ بات پسند نہ آئی، فرمایا کہ یورپین مصنفین اصطلاحات وغیرہ کی ناواقفیت کی وجہ سے غلطیان کرتے ہین اور اسلام پر حملے کرتے ہین، آپ ان لوگون کی باتون پر نہ جائیے، مین نے عرض کیا کہ یہ تو صحیح ہے کہ پڑھے لکھے آدمی کو کسی دوسرے کے کہنے پر بے سوچے سمجھے آمنّا وصدّقنا نہ کہنا چاہئے، بلکہ ہر مسئلہ پر جہان تک ممکن ہو تو تحقیق کے بعد رائے قائم کرنا چاہئے .... لیکن اس کے ساتھ

ساتھ دوسرون مین کوئی خوبی ہو تو اس کی داد بھی ضرور دینا چاہئے، اور گولڈزیہر کی وسعتِ نظر کا مین قائل ہون، اور اس کی داد دیتا ہون، مولنا نے فرمایا کہ جب آپ اوس کی کتاب کا زیادہ غائر مطالعہ کرین گے، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کی تحقیق کی نوعیت کیا ہے، بعد کے مزید مطالعہ سے مولانا کا فرمانا اتنا بھر تو صحیح ثابت ہوا کہ گولڈزیہر کبھی کبھی اپنے نتائج محض مفروضات کی بنا پر نکالتا ہے، اور اس مین سخت غلطی کرتا ہے لیکن اس کا علمی تبحر اور اس کی وسعتِ نظر اپنی جگہ پر ہے،

اسی صحبت مین سید صاحب مرحوم نے مجھ سے حضرت عائشہؓ کی تنقید حدیث کا ذکر کیا، اور اس مسئلہ پر سیوطی کے ایک چھوٹے سے رسالہ کا بھی نام لیا، بلکہ کچھ دنون بعد انہون نے یہ رسالہ میرے پاس عاریۃً بھیج بھی دیا، جس سے مین نے استفادہ کیا، لیکن بعد کے مطالعہ سے پتہ چلا کہ ان مین سے اکثر حدیثین مسند ابی داؤد طیالسی مین موجود ہین،

اس کے تھوڑے دنون بعد سید صاحب سے میری ملاقات حیدر آباد کے دائرۃ المعارف کے جلسہ منعقدہ ۱۹۳۸ء مین ہوئی، اس جلسہ مین ہندوستان کے مختلف حصون کے اکابر علماء شریک تھے، ان مین ایک نہایت جید فاضل بھی تھے، جو میرے اور سید صاحب دونون کے دوست تھے، اُن کے علم و فضل کی سید صاحب بھی قدر کرتے تھے، اور مین تو اُن کے فضل و کمال کا قائل تھا ہی، اُن کی ایک کتاب پر دوسرے جید فاضل نے بہت سخت تنقید کی تھی، اور یہ تنقید سید صاحب نے "معارف" مین شائع کی تھی، انہون نے سید صاحب سے شکایت کی کہ یہ تنقید کیون شائع کی، سید صاحب نے فرمایا کہ یہ ایک علمی مضمون تھا، اور معارف ایک علمی جریدہ ہے، مین نے اس مضمون مین جو سخت اور نا ملائم الفاظ تھے، ان کو نکال کر شائع کر دیا، اور یہ میرا فرض تھا، آپ چاہین تو اس کا عالمانہ جواب لکھین، وہ بھی شائع کر دیا جائے گا، لیکن اگر اس مین کوئی سخت اور نا مناسب الفاظ ہونگے تو اُن کو بھی حذف کر دیا جائے گا، باوجود اس جواب کے جو میرے خیال مین نہایت معقول تھا، ہمارے دوست خفا ہوتے رہے، اور سید صاحب مرحوم سنجیدگی اور متانت کے ساتھ جواب دیتے رہے، میرے دوست کی گفتگو کی سختی کے باوجود انہون نے کسی طرح کے غم و غصہ کا اظہار نہ کیا،

سید صاحب مرحوم سے میری پانچوین اور آخری ملاقات ڈھاکہ مین آل پاکستان ہسٹوریکل کانفرنس کے جلسہ کے موقع پر ہوئی، سید صاحب مرحوم اس جلسہ کے صدر تھے، انھون نے اپنے خطبۂ صدارت مین چند تاریخی اور ادبی حقائق بیان کئے تھے جن سے کسی پڑھے لکھے آدمی کو انکار نہین ہو سکتا لیکن بعض خاص سیاسی اسباب کے باعث طلبہ مین غلط فہمی پھیل گئی، یا پھیلائی گئی، ان لوگون نے جلسہ کے دوسرے دن سید صاحب کے سامنے اُن کے خلاف نہایت سخت اور افسوسناک مظاہرہ کیا، اور اُن کو مجبور کیا کہ وہ جلسہ سے چلے جائین، جلسہ موقوف کر دیا گیا، اور مولٰنا رفع شر کے خیال سے اپنے جاے قیام پر چلے گئے مین بھی وہان گیا، مولانا لیٹے ہوئے تھے، مین نے حال دریافت کیا، فرمایا سب ٹھیک ہے، پھر یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور چند اساتذہ معافی مانگنے کے لئے آئے، اُن سے سید صاحب نے دوران گفتگو مین بلا کسی غم و غصہ کے فرمایا کہ جو کچھ مین نے کہا وہ تاریخی حقائق ہین، اور مظاہرہ اور ہنگامہ کرنے سے یہ حقائق تو بدل نہین سکتے،

اس تمام ہنگامہ اور قضیہ مین سید صاحب کا صبر و تحمل اور ضبط نفس قابل ستایش و آفرین تھا، انھون نے نہ تو طلبہ کی کسی سے شکایت کی، نہ کسی کے خلاف ایک حرف زبان سے نکالا،

ان پانچون واقعات سے سید صاحب کے کردار اور اُن کی شخصیت پر نمایان روشنی پڑتی ہے، ان کے اندر نہ تو کبر و نخوت تھا، نہ خود پسندی تھی، وہ لا طائل صحبت ناپسند کرتے تھے، چھوٹون سے محبت و خلوص سے ملتے تھے، علمی کام کرنے والون کی ہر طرح اعانت کرتے تھے، تحمل و بردباری اُن کی خاص صفت تھی، شر و فساد سے اُن کو نفرت تھی، جو لوگ ان کی تذلیل کرتے تھے، اُن کو بھی وہ مخلصانہ اور مصلحانہ نصیحتین کرتے تھے،

علماے اسلام کے طرۂ امتیاز یہی نفسانی اور اخلاقی فضائل حسنہ ہین، اگر علوم اسلامیہ کی درس و تدریس کے بعد بھی یہ خصائل نہ پیدا ہون تو سارا علم و فضل بیکار ہے، معلم الملکوت سے زیادہ بڑا عالم کون

ہو سکتا ہے؟ لیکن اس کا علم کس کام کا ہے؟

سید سلیمان ندوی مرحوم فضائل عالیہ نفسانیہ کے ساتھ متصف ہونیکے ساتھ ساتھ عالم متبحر اور فاضل اجل بھی تھے، اور مختلف علوم اسلامیہ کا وسیع علم رکھتے تھے، انھون نے اپنی پچاس سالہ علمی زندگی مین سیکڑون مضامین الندوہ، الہلال، معارف اور دوسرے جرائد کے لئے لکھے، بیسیون چھوٹے بڑے خطبے پڑھے اور درجنون چھوٹی بڑی کتابین تصنیف کین، اُن کے ہر مضمون، خطبے اور تصنیف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے موضوع سے کافی واقفیت رکھتے تھے،

سید صاحب جب کسی اہم موضوع پر قلم اٹھانا چاہتے تھے، تو اس کے متعلق کافی مطالعہ کرتے تھے، اور جہان کہین بھی ان کو اپنے موضوع کے متعلق معلومات کے ملنے کی توقع ہوتی، وہان سے جو کچھ ان کو مل سکتا تھا، اس کو اخذ کرتے تھے، اور حتی الوسع تحقیق و تنقید کے بعد جو کچھ اُن کو ملتا تھا، اس کو نہایت سلیقے اور عالمانہ طور سے سجاتے تھے،

سید صاحب کا طریق تحقیق عموماً تو وہی تھا، جو اُن کے استاد مرحوم مولٰنا شبلی کا تھا، لیکن ایک حد تک وہ آزادانہ اپنے خیال کا اظہار کرتے تھے، چنانچہ بعض مسائل مین انھون نے مولٰنا شبلی سے اختلاف بھی کیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ سید صاحب تقلید کے اُس جنجال سے جو گذشتہ دو تین صدیون مین مسلمانون مین پھیل گیا تھا، بہت باہر نکل آئے تھے، یہ لوگ تو علوم عقلیہ مین بھی اپنے اساتذہ سے اختلاف کرنے کو اثم عظیم سمجھتے تھے، چنانچہ میرے استاذ مولٰنا فضل حق رامپوری مرحوم نے جب میرزاہد امور عامہ کے حاشیہ مین مولٰنا عبد الحق خیرآبادی مرحوم پر جو میرے استاد الاستاد تھے بعض فلسفیانہ مسائل کے متعلق کچھ اعتراضات کئے، تو مولٰنا عبد الحق مرحوم کے معتقدین اور شاگردون مین غم و غصہ کا ایک طوفان اٹھا، اور مولٰنا ہدایت اللہ جونپوری مرحوم مولانا حکیم برکات احمد ٹونکی مرحوم اور مولٰنا محمد طیب عرب رامپوری مرحوم مولٰنا عبد العزیز میہارنپوری مرحوم وغیرہ ہم مین عتاب و عناد کی ایک زبردست لہر دوڑ گئی، متعدد رسالے

شائع کئے گئے، اور آخر میں نواب حامد علی خان رئیس رامپور کے دربار میں مولانا عبدالوہاب بہاری مرحوم اور مولانا برکات احمد البہاری ثم التونکی کے درمیان مناظرہ ہوا، مسلمان علماء میں جمود فکر اور تقلیدِ ذہنی کی یہ حد تھی، حالانکہ فقہی اور مذہبی مسائل میں صحابۂ کرام نے آپس میں اختلاف کیا، ائمۂ فقہ میں بعض اہم اصولی اختلافات ہوئے اور مختلف مذاہب فقیہ پیدا ہوئے، محمد بن جریر طبری نے بعض مسائل میں ائمۂ اربعہ سے اختلاف کیا لیکن ان اختلافات نے کبھی ذاتیات کی حیثیت نہ اختیار کی،

اسی طرح سید سلیمان مرحوم نے بھی بعض علمی اور تاریخی مسائل میں اپنے استاذ محترم سے مودبانہ اختلاف کر کے اپنی حریتِ فکر اور آزادانہ تحقیق کا بھی ثبوت دیا ہے،

مولانا سید سلیمان مرحوم کا طرز تحریر اور طریقۂ بیان صاف ستھرا اور سلجھا ہوا تھا، نہ تو ان کی تحریروں میں کسی طرح کی تعقید ہے نہ اُن کی تقریر میں کسی طرح کا جھول ہوتا تھا، بلکہ اُن کی تقریریں صاف ستھری اور سادی ہوتی تھیں، ان میں نہ تو ادا کا اُتار چڑھاؤ ہوتا تھا، نہ الفاظ کا خطیبانہ الٹ پھیر، تحریر میں وہ مختلف انداز میں مہارت رکھتے تھے اور ہر موضوع کے لئے وہی انداز بیان اختیار کرتے تھے، جو اس کے مناسب ہوتا تھا، چنانچہ الہلال میں جو مضامین سید صاحب کے شائع ہوئے ہیں، ان کا طرز بیان خطبات مدراس کے انداز تحریر سے بالکل مختلف ہے، "عربوں کی جہاز رانی" اور "عرب و ہند کے تعلقات" کے انداز بیان میں نمایاں فرق ہے، ارض القرآن، سیرت عائشہ اور سیرت النبی کی زبان تو یکساں ہے لیکن ان میں بھی سلاست اور علمیت کے مختلف درجے نظر آتے ہیں،

سید سلیمان مرحوم کا شاہکار عام طور پر سیرت النبی کی جلدیں ہی سمجھی جاتی ہیں، اس میں شک نہیں کہ اس کارنامے پر سید صاحب مرحوم جتنا بھی فخر کرتے کم تھا، انھوں نے سیرۃ النبی لکھ کر تمام مسلمانوں کی طرف سے ایک فرضِ کفایہ ادا کر دیا ہے جس کا اجر اُن کو خدائے تعالیٰ دے گا لیکن میرے خیال میں جس طرح مولانا شبلی مرحوم کا اہم ترین کارنامہ اُن کی تصنیفوں میں مضمر نہیں ہے اگرچہ وہ بھی یقیناً بہت اہم ہیں بلکہ ان کا سب سے بڑا کام علمی خدمت کرنے والوں کی ایک جماعت پیدا کرنا، اُن کی رہنمائی کرنا اور دار المصنفین کی تاسیس ہے، جس کے ذریعہ سے اسلامی علوم

کی مزید تحقیق اور اشاعت ہوتی رہی ہے اسی طرح سید سلیمان مرحوم کا سب سے بڑا کارنامہ دار المصنفین کے قائم رکھنے اور نئے کارکنوں کے پیدا کرنے میں مضمر ہے، دار المصنفین اب صرف مولانا شبلی کی یادگار نہیں ہے بلکہ زیادہ تر سید سلیمان مرحوم کی یادگار ہے،

دار المصنفین ہندوستان کا اپنے قسم کا سب سے پہلا قومی علمی ادارہ ہے، جس نے اب تک نہایت مفید علمی خدمت کی ہے، اس نے اب تک اپنی زندگی اور افادیت کا کافی ثبوت دیا ہے، اب اس کو قائم رکھنا اور اس کو ترقی دینا ہم لوگوں کا فرض ہے، حیدرآباد کا دائرۃ المعارف بھی اسی طرح کا ایک مفید علمی ادارہ ہے لیکن اوّلاً تو وہ سرکاری یا نیم سرکاری ادارہ ہے، دوسرے اس کی افادیت عربی خوان طبقہ تک محدود ہے، اور اس کی اشاعتوں سے استفادہ کرنے، اور اہل ہند کے لئے عموماً مفید تر بنانے کے لئے بھی دار المصنفین جیسے ادارہ کی ضرورت ہے، دہلی کا ندوۃ المصنفین دار المصنفین جیسا ایک علمی قومی ادارہ ہے لیکن ایک تو وہ ابھی نو عمر ہے، دوسرے ہندوستان جیسے وسیع ملک کے لئے ایک قسم کے دو علمی ادارے بھی کم ہی ہیں،

لہٰذا جو لوگ سید سلیمان مرحوم کی یادگار قائم کرنا چاہتے ہیں، اُن کے لئے بہترین صورت یہ ہے کہ اُن کی اس زندہ یادگار کو مزید ترقی اور وسعت دیں اور اس میں نئی شاخیں پیدا کریں،

——— ⁂ ———

سفر حجاز کے چند تاثرات

از

جناب پروفیسر عبد المنان صاحب بیدل، سابق صدر شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی

سنہ ۱۹۴۹ء سے پہلے الحاج سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بہ قصد انتفاع و استفادہ حاضر ہونے کی سعادت نصیب نہ ہوئی تھی،

سنہ ۱۹۴۹ء میں بفضل باری تعالیٰ، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی حاضری کا موقع ملا، مکہ مکرمہ میں ایک عالم دوست، رفیق سفر نے خبر دی کہ مولٰنا سید سلیمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی فریضۂ حج ادا کرنے کے لئے اپنے چھوٹے بیٹے محمد سلمان سلمہ المنان، اور چند خواتین کے ساتھ تشریف لائے ہیں، اور رباط بھوپال میں قیام فرما ہیں، مگر یہ خوشخبری ملنے کے بعد بھی میں اُن سے ملنے نہ گیا،

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ملنے کی تمنا بھی تھی، اور ضرورت بھی، مگر اُن کے پاس نہ جانے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں فطرۃً کم آمیز ہوں، اور سید صاحب رحمۃ اللہ سے عمر بھر میں چند بار سے زیادہ اطمینان کے ساتھ ملنے اور تبادلۂ خیالات کا موقع مجھے نہ ملا تھا، چند بار پٹنہ کالج کے پروفیسر محمد قاسم مرحوم کے بنگلہ پر اور چند مرتبہ ریاض حسن خان خیال مرحوم مظفرپوری کی قیام گاہ پر، پروفیسر محمد قاسم مرحوم میرے عزیزوں میں تھے، میری پٹنہ کالج کے بعض اساتذہ اور محلہ کے دو ایک وکیلوں کی شام کی نشست پروفیسر محمد قاسم مرحوم ہی کے یہاں ہوا کرتی تھی، کبھی کبھی خصوصاً جب سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی تشریف فرما ہوتے، تو سیاسی تاریخی، مذہبی اور

معاشی مسائل پر آزادانہ طور سے تبادلۂ خیالات بھی ہو جاتا، مگر علامہ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ہم لوگوں میں اکثر سیاسی مسائل میں سخت اختلاف رائے تھا،

نہ ملنے کی دوسری اور اصل وجہ یہ تھی کہ میرے بعض بزرگوں اور دوستوں نے جو سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اچھی طرح واقف تھے، بلکہ اُن کے ہم خیال و ہمراز تھے، مجھے واقف کر دیا تھا کہ اب سید صاحب اُس گروہ کے ایک بلند مقام فرد ہیں جن سے تم ملنے سے ڈرتے ہو، شرماتے ہو اور ہچکچاتے ہو،

آپ شاید سوال کریں کہ وہ کونسا گروہ ہے، جواب ہے، اہلِ دل، اور اہلِ نظر کا گروہ، آپ پوچھ سکتے ہیں، — کیوں؟ — بلا تصنع عرض کرتا ہوں — ڈرتا ہوں کہ کہیں اپنا بھرم نہ کھل جائے شرماتا ہوں کہ میرے مخفی عیوب سے اہلِ نظر واقف نہ ہو جائیں اور ہچکچاتا ہوں کہ کہیں میری حاضری سے ان لوگوں کی طبیعت منغص نہ ہو جائے،

اسلئے تمنائے قدمبوسی کے باوجود علامہ مرحوم سے ملنے کی ہمت نہ پڑی، کئی بار صحنِ حرم میں مشغول نماز یا محوِ دیدارِ کعبہ نظر آئے، دو ایک بار سعی کرتے کوہِ صفا پر دعا مانگتے اور آنسو بہاتے ہوئے بھی دیکھا، سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق آنکھ والوں کو یہ بھی کہتے سُنا کہ

"ایمان و احتساب کی جلوہ ریزیاں اُن کی ہر نقل و حرکت سے ظاہر ہیں"

مگر مجھ کو سید صاحب علیہ الرحمہ میں کوئی خاص کیفیت نظر نہ آئی، قیامِ مکہ مکرمہ کی مدت ختم ہوئی، مدینہ منورہ جانے کا حکم ملا تو میرے ایک دوست نے کہا کہ تم کو مبارکباد دیتا ہوں کہ سید صاحب بھی اسی دن تشریف لے جائیں گے جس دن تم کو جانا ہے، میں نے کہا کہ —— بھائی معاف کرنا میں نے سید صاحب کو نزدیک سے بھی دیکھا اور دور سے بھی، اور سوچتا رہا کہ تم اُن کو اب "علامہ سید سلیمان ندوی" نہیں بلکہ "سید العارفین" کہتے ہو آخر اس کی وجہ کیا ہے، مجھے تو آج سے تیس ۳۰ سال پہلے کے سید صاحب اور آج کے سید صاحب میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آیا، میرے جیسے پرانے کپڑے والے اخود فراموش

دوست نے کوئی جواب نہ دیا، اور یہ شعر گنگناتے ہوئے حرم شریف کی طرف روانہ ہوگئے،

گر نہ بیند بہ روز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب راچہ گناہ

(۲۰)

مدینہ منورہ میں ایک دن باب مجیدی کے قریب سید صاحب نظر آئے میں نے السلام علیکم کہا جواب ملا وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ اس کے بعد مولانا آگے بڑھے، میں نے قریب جاکر عرض کیا، حضور نے اس دیرینہ نیازمند کو یقیناً نہ پہچانا ہوگا فرمایا، ہاں، دیکھ کر تو نہیں پہچانا تھا مگر آواز سُن کر اب پہچان گیا، بھلا کہئے تو کیسے پہچانتا نہ وہ سوٹ میں ملبوس بھرا ہوا بدن ہے، نہ منڈی ہوئی داڑھی، نہ ہاتھ میں طلائی دستہ کی چھڑی ہے، نہ لب کے داہنے گوشہ میں نیم سوختہ سگریٹ ہے، آپنے تو ایسی صورت بنائی ہو کہ میں کیا آپ کا قریب ترین اور قدیم ترین دوست بھی شاید ہی پہچانے، عرض کیا حضور صورت ہی صرف بدلی ہے، مسکرا کر فرمانے لگے، انشاء اللہ اس دربار سے جاتے جاتے سیرت بھی بدل جائے گی، ــــ اس جملہ کے ساتھ ہی ساتھ اُن کی آنکھوں سے آنسو کے چند قطرے بھی نکل پڑے ــــ کہنے لگے، ــــ بیدل صاحب کیا عرض کردں، جلال وجبروت والے کے دربار میں بھی بہت کچھ ملتا ہے مگر رافت ورحمت والے کے دربار میں سب سے بڑی چیز یعنی محبت ملتی ہے آنا شرط ہے، آئے نہیں کہ ہدیۂ محبت ملا نہیں، ہاں ایک بات اور عرض کردوں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کو یہاں آئے بغیر بھی بہت کچھ دیدیا جاتا ہے، اللہ رے اُن کی قسمت،

مدینہ منورہ کے بارہ روزہ قیام کے زمانہ میں بھی سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سوا ایک بار کے گفتگو کا موقع نہ ملا، مجھے ایسا شبہ ہوا کہ وہ مجھ سے اس سرزمین مقدس میں ملنے سے پرہیز کرتے ہیں، کوئی تعجب کی بات نہیں صحبتِ ناجنس، عذاب الیم ہے،

ایک دن خبر ملی کہ مولانا جدہ کے لئے روانہ ہوگئے، مجھے بھی حکم ہوا کہ جدہ جاؤ جہاز تیار ہے، روانہ ہوگیا، مدینہ منورہ سے تھوڑے ہی فاصلہ پر دیکھا کہ کئی لاریاں بالو میں دھنسی ہوئی ہیں ــــ کئی دنوں سے موسلا دھار بارش ہورہی تھی کو سون تک سڑکوں پر بڑے بڑے گڈھے پڑگئے تھے، اور بھاری لاریوں کا گذرنا سخت دشوار ہوگیا تھا، حجاج کرام کو لاریوں سے اُتر کر ڈرائیوروں کی ہدایت کے مطابق اپنے اور اپنے ساتھیوں کی لاریوں کو ٹھیلنا پڑا، اس کام میں سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی کسی سے پیچھے نہ رہے، لاریوں کے پھنسنے چلنے، اور پھر رُک جانے کا سلسلہ رابغ تک رہا، رابغ پہنچکر اطلاع ملی کہ مکہ مکرمہ کے قریب تک ایسا ہی راستہ ہے، اس لئے حکومت کا حکم ہے کہ پانچ، چھ دنوں تک حجاج کرام رابغ ہی میں رہیں اور راستہ کے خشک ہوجانے اور بنجانے کا انتظار کریں، اس لئے چھ سات دن چھ سات سو حجاج رابغ ہی میں ٹھہرے رہے رابغ کے قیام کے دوران میں سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اکثر مسجد جاتے وقت یا مسجد سے لوٹتے وقت ملاقات ہوجاتی، ایک دو بار گفتگو کا موقع بھی ملا، رابغ میں دو مسجدیں ہم لوگوں نے دیکھیں، ایک منزل سے بہت قریب، اور ایک بڑی مسجد منزل سے دو تین فرلانگ کے فاصلہ پر، مگر ان دونوں مسجدوں میں سے کسی میں بھی وہ سامان نہ تھا جس کے دیکھنے اور استعمال کرنے کے ہم ہندوستانی عادی ہوگئے ہیں، ایک مسجد میں تو چراغ وغیرہ قسم کی کوئی چیز بھی نہ تھی، نمازی اندھیرے میں نماز ادا کرتے تھے بمبئی کے ایک بوہرے تاجر ظروف شیشہ کو توفیق ہوئی، انھوں نے لالٹین کا سامان کردیا، جزاک اللہ فی الدارین خیرا ایک روز مسجد سے واپس آرہا تھا کہ مولانا سے گفتگو کا موقع ملا، عرض کیا بڑے افسوس کی بات ہے مسلمانوں کا ملک ہے حجاج برابر اس راہ سے گذرتے رہتے ہیں، مگر یہاں کی مسجدیں شکستہ حال ہیں، نہ وضو کا سامان ہے، اور نہ جانماز میں قرینہ کی ہیں، صرف دو چار گرد آلود چٹائیاں بچھی ہوئی ہیں، فرمانے لگے، ــــ حالت تو ظاہر ہی ہے، مگر اس پروا ہے زنی وہی کرے، جو صاحب اختیار بھی ہو، اور دانا ہے اصول سیاست بھی، ایک دن میں نے عرض کیا، بیچارے عرب اب تک بہت مفلوک الحال نظر آتے ہیں، حالانکہ کہا جاتا ہے کہ یہ یار محبوب خدا

اور خداوند کریم کے محبوب ترین ممالک مین ہے، کاش امریکہ کی دولت کا کچھ حصہ ان لوگون کو بھی مل جاتا۔

ارشاد ہوا، — دنیا دارون خصوصاً غیر مسلمون کی ترقی پر رشک کرنا حکمتِ الٰہی سے ناواقفیت کا ثبوت ہے،
ایک روز مین نے کہا مسجد نبوی مین بعض لوگ اماموں کے پیچھے نماز نہین ادا کرتے تھے بلکہ جب نماز جماعت ہوتی تو اپنی ٹولی الگ بنا کر نماز پڑھتے تھے، ارشاد ہوا، — ہوسکتا ہے، بیدل صاحب اب مذہب تو نہ رہا مذہب کے جھگڑے رہ گئے، غرض جب تک رابغ مین قیام رہا، اور جب جب موقع ملا، سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے مختلف سوالات بہ نظر استفادہ کرتا رہا، اور ہمیشہ تشفی بخش جواب ملا، جب رابغ مین ٹھہرے ہوے کئی دن ہوگئے، اور دل گھبرانے لگا تو ایک دن سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ حضور مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے بجائے بندرگاہِ رابغ مین ہم لوگون کے ٹھہرانے مین کیا مصلحتِ خداوندی ہے، — فرمایا — دعویٔ عبودیت کا ثبوت طلب کیا جا رہا ہے، سبق یہ دیا جا رہا ہے کہ اپنی خواہش کو مرضیٔ مولا کے تابع بنانے کی عادت ڈالو،

(۳)

رابغ سے روانہ ہوکر جدہ پہنچا، جدہ مین سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے صرف دو بار عبدالمجید صاحب حریری قونصل جنرل ہند کے آفس مین ملاقات ہوئی، کسی خاص قابلِ ذکر گفتگو کا موقع نہ ملا، صرف ایک دن دورانِ گفتگو مین ایک جملہ کہہ گئے، جس کا مفہوم مین نہین سمجھا — قونصل صاحب ایک شخص کو کہہ رہے تھے کہ آپ نے رڈ بکین کیا، "مولانا نے کہا رڈ بکین نہین کیا جوانی کیا"، بعد کو معلوم ہوا، کہ وہ حضرت کسی عزیز دوشیزہ سے محبت کرنے کے جرم مین ملازمت سے برطرف کر دیے گئے تھے، اسی نشست مین ایک جملہ اور بھی ارشاد ہوا کہ — ہر جگہ کے قونصل خانہ مین "خاص قسم کے لوگون کا تقرر ہوا کرے تو زیادہ مفید ہو" معلوم نہین اس سے کس کی طرف اشارہ تھا، اور کیا مطلب تھا،

۱۴ دسمبر ۱۹۲۹ء کی شام کو عبدالمجید صاحب قونصل جنرل ہند سے ملنے گیا، تو انھون نے کہا کہ

خسرو جہاز کل بمبئی کے لئے روانہ ہو رہا ہے، چونکہ بمبئی سے جدہ آتے وقت آپ ہی امیر الحاج تھے، اس لئے ہم لوگ آپ ہی کو پھر امیر الحاج بنانا چاہتے تھے، مگر مولانا سید سلیمان ندوی صاحب بھی اسی جہاز سے تشریف لیجا رہے ہین اس لئے ان کی موجودگی مین کسی دوسرے کو امیر الحاج بنانا سخت گستاخی ہے، مین نے بھی کہا کہ ان کے ہوتے ہوے، کوئی بھی امیر الحاج ہونا پسند نہین کرے گا،

۱۵ دسمبر کو جب مین جہاز پر سوار ہوگیا، تو ظفر جمیل صاحب قونصل جنرل کے سکریٹری تشریف لائے اور مجھ سے کہا کہ مولانا (سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہین، کہ بیدل صاحب کی موجودگی مین ہرگز یہ عہدہ قبول نہ کرون گا، مین نے جب بہت اصرار کیا، تو فرمایا مین اسی شرط پر امیر الحاج کہلائے جانے پر راضی ہوسکتا ہون کہ عملاً آپ ہی اس خدمت کو انجام دین، اور کپتان کے ساتھ ہر روز گشت مین بھی آپ چلین تاکہ لوگون کو معلوم رہے کہ آپ امیر الحاج کا کام کر رہے ہین، سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے انکسار و خاکساری کا اس سے بہتر نقشہ اس سفر مین مجھے نظر نہ آیا، جہاز پر سوار ہونے کے چند دن بعد سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بخار آگیا، اور بمبئی پہنچنے کے بعد تک صحت نہ ہوئی، خسرو جہاز ۲۹ دسمبر ۱۹۲۹ء کو بمبئی پہنچا، اتنی دیر مین پہنچنے کی وجہ یہ ہوئی کہ اکثر گودیون مین ٹھہرتا ہوا آیا تھا، مدت سفر طویل تھی، اس لئے سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت مین اکثر انتفاع و استفادہ کی خاطر حاضر ہوا کرتا تھا، وہ خود بھی ازراہِ نوازش اکثر مجھے اپنے کیبن ہی مین بلا لیتے تھے، ایک روز سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بخار زیادہ تھا، اور طبیعت بے چین تھی، مین نے جہاز کے ڈاکٹر کو خبر دی، مگر وہ گھنٹون کے بعد آیا، جب مین جہاز کی رپورٹ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے لکھ کر لے گیا، اور سید صاحب کو ترجمہ کرکے سنانے لگا، تو سید صاحب نے فرمایا کہ — پڑھیے مین سمجھتا ہون، — اس کے بعد فرمایا — رپورٹ بہت خوب ہے، مگر ڈاکٹر کی شکایت والا جملہ نکال دیجئے، اور عملہ کی کارگزاری کی تعریف مین دو جملے اور بڑھا دیجئے، مین نے عرض کیا کہ ڈاکٹر کی بے پروائی، اور سخت کلامی سے اکثر مریض ناراض ہین، اور مجھ سے اس کے خلاف شکایت

کی ہے فرمایا:

"آپ اس کی شکایت نہ کیجئے! کس سے سمجھا جائے گی، اور مسلمان بھی تو ہے"

جہاز پر سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ جب تک اچھے رہے بعد نماز عصر کیبن سے باہر عرشہ پر آکر اِدھر اُدھر ٹہلتے، یا دیر تک کھڑے ہوئے سمندر کا نظارہ کرتے رہتے، میں بھی معمولاً اس وقت حاضر خدمت ہو جاتا، چونکہ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو معلوم تھا کہ ان کا مخاطب نہ مولوی ہے نہ مولانا، نہ عالم ہے نہ عارف، نہ مورخ ہے، نہ مفسر، بلکہ صرف اردو کا شاعر ہے، اور کبھی فارسی کا پروفیسر تھا، اس لئے جب وہ خود سلسلۂ گفتگو شروع کرتے، تو فرماتے — بیدل صاحب کچھ پڑھئے — عرض کرتا کہ کالج کے مشاعروں میں لڑکوں کی خاطر غزل لکھتا بھی ہوں اور پڑھتا بھی ہوں، مگر کالج کے مشاعرہ سے باہر شعر سنانے سے پرہیز کرتا ہوں، اسی لئے اشعار بھی یاد نہیں ہیں، — اس کے بعد عرض کرتا — کہ آپ بھی تو شعر کہتے ہیں، کچھ اشعار یاد ہوں تو ارشاد فرمایا جائے، میری درخواست پر اکثر سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی نظمیں اور غزلیں مجھے سنائیں میں نے عرض کیا، اگر یہ اشعار لکھوا دیے جائیں تو میں انہیں اپنے رسالہ (معاصر) میں چھاپ دوں۔ پہلے تو مسکرا کر فرمایا، "اس کی اجازت نہیں" مگر جب میں نے بہت اصرار کیا، تو فرمایا — سلمان سے کہئے وہ یہ اشعار لکھ کر آپ کو دیدیں گے، میں نے سلمان سے کہا، عزیز نے جو نظمیں مجھ کو دیں، ان میں سے حسب ذیل نعت جس کا عنوان ہے، "گل ہائے عقیدت" معاصر بابت نومبر و دسمبر ۱۹۴۹ء میں چھاپ دی،

مکی، مدنی، ہاشمی و مطلبی ہے — آدم کے لئے فخر یہ عالی نسبی ہے

پاکیزہ تر از عرش و سما جنت و فردوس — آرام گہِ پاک رسول عربی ہے

کیا شان ہے اللہ کو محبوب نبی کی — محبوب خدا ہو وہ جو محبوب نبی ہے

بجھ جائے ترے چھینٹوں سے اے ابر کرم آج — جو آگ مرے سینے میں مدت کو دبی ہے

اے زائرِ بیتِ نبوی یاد رہے یہ — بے قاعدہ یاں جنبشِ لب بے ادبی ہے

آہستہ قدم، نیچی نگہ، پست صدا ہو

خوابیدہ یہاں روح رسول عربی ہو

یاد نہیں کہ ان کے علاوہ دوسرے اشعار کہاں رکھدیئے، پھر جب دوبارہ سلمان سلمہ کو لکھا تو کوئی جواب نہیں ملا،

دوران سفر میں مولانا کا وقت اوراد و وظائف یا تبلیغ و تفہیم مسائل میں صرف ہوتا تھا، مجھے یہ دیکھکر بڑی خوشی ہوئی کہ مولانا بیانِ مسائل میں "مصلحتِ وقت" اور اظہار حقیقت میں کسی شخصیت کا کوئی خیال نہیں کرتے تھے جس چیز کو صحیح سمجھا، اس کو کہہ دیا، ایک روز مجھ سے حاجیوں نے فرمائش کی کہ مجلس میلاد شریف منعقد کرنے کا ارادہ ہے، — آپ مولانا صاحب کو راضی کر دیجئے کہ وہ بیان فرمائیں، میں نے کہا — کوشش کروں گا، — مگر شاید ہی کامیابی ہو، — لوگوں نے نہ مانا اور میں سید صاحب کو مجلس میلاد النبی میں لے آیا، اور میلاد پڑھنے کی درخواست کی، انھوں نے مختصر سی تمہید کے بعد وعظ شروع کر دیا، تقریر میں بہت سی باتوں کے علاوہ یہ بھی کہا کہ اگر مجلس میلاد آپ اظہار محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی پیروی کرنے کے طریقوں کا ذکر کرنے کے لئے منعقد کرتے ہیں، تو آپ کو سمجھ لینا چاہئے کہ ہر وہ طریقۂ اظہار محبت غلط ہے جس کا پسندیدہ ہونا خود حضور سرور کائنات صلعم یا صحابۂ کرام سے ثابت نہیں ہے، جو شخص محبت رسول اور ساتھ ہی ساتھ اللہ کی محبت کا دعویٰ کرتا ہے، اس کو چاہئے کہ ہر کام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم اور منشار کا لحاظ رکھے، صرف اسی حال میں اس کی محبت اصلی معنوں میں محبت ہوگی، رسول اللہ سے محبت کرنے کا واحد اور شرعی طریقہ رسول کا اتباع کامل ہے، اس لیجئے کہ رسول سے جس قدر محبت بڑھتی ہے اسی قدر اللہ کے محبوب رسول کریم کی تابعداری کا شوق بڑھتا ہے، — اسی طرح کی باتیں کہنے کے بعد سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے

اور مجلس میلاد ختم ہو گئی،

سفر میں عموماً اور سفرِ حج میں خصوصاً لوگوں کا مزاج چڑچڑا ہو جاتا ہے، مگر میں نے دیکھا کہ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو حاجیوں کی بیجا حرکتوں، غلط شکایتوں اور احتجاجی نقروں کے باوجود کبھی غصہ نہ آیا بلکہ جب کبھی میں تند و تیز لہجہ میں جواب دیتا، تو سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ آہستہ سے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر فرماتے

"سراپا محبت و عنایت والے کے دربار سے ابھی تو آپ آرہے ہیں"

مکہ سے کچھ عرب جہاز پر ساتھ تھے، اور اپنی سیٹ کے پاس ہی کھانا پکاتے تھے، جہاز پر اسٹوو جلا کر کھانا پکانا منع ہے، مگر وہ نہ کپتان کا حکم مانتے تھے اور نہ میری ڈانٹ سنتے تھے، میں نے سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کہا — آپ ان لوگوں کو ڈانٹے اور کہہ دیجئے کہ اگر کپتان کا حکم نہیں مانوگے، تو سزا کر دی جائے گی، — سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آپ جو کہتے ہیں، وہ تو نہ کہوں گا، مگر سمجھا دوں گا، غالباً مان جائیں گے، — چنانچہ میرے ساتھ ان عربوں کے پاس تشریف لے گئے، اور دو چار جملے عربی میں نہایت نرمی اور محبت سے ان سے کہے، کہنا تھا کہ اُن لوگوں نے اسٹوو گل کر دیا، اور کھانا پکانے کا سامان اس جگہ سے اٹھا لے گئے، جہاں جانے سے پہلے وہ انکار کر چکے تھے، میں نے سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ آپ کی زبان میں بلا کا اثر ہے، — ارشاد ہوا کہ — نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی پر غصہ نہیں فرمایا، ہم لوگوں پر اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرض ہے، درشتی و نرمی دونوں مفید ہیں، مگر نرمی زیادہ کارآمد ہے،

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ خود سے کوئی دینی، شرعی یا تاریخی مسئلہ نہیں چھیڑتے تھے، جب میں خود کچھ پوچھتا تو مختصر جملوں میں جواب باصواب دیدیتے، اور زیادہ تفصیلی گفتگو نہ فرماتے، — ایک دن میں نے عرض کیا — حج کے مقبول ہونے کی کوئی ایسی علامت بھی ہے جو ہم عامیوں کی سمجھ میں آجائے، — فرمایا — اگر آپ کی زندگی کا لاحق دور سابق سے بہتر ہو جائے تو سمجھئے کہ حج مقبول ہو گیا،

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تحمل کی داد دینی پڑتی ہے میں دینی علوم سے ناواقف ہوں، اکثر ان سے عامیانہ گفتگو اور مہمل سوالات کرتا، غیر مفید نزاعی مسائل چھیڑتا، مگر کبھی بھی سید صاحب رحمۃ اللہ کے ماتھے پر شکن نہ آتی مہمل سوالوں کے پوچھنے پر مجھے کبھی نہیں جھڑکا، پیچیدہ سیاسی مسائل بھی بحث میں آتے مگر سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نہایت نرمی اور محبت سے میری تشفی کرنے کی کوشش فرماتے ایک روز شاہ حجاز کی روز افزوں دولت اور عرب تاجروں کے آرائش و آسائش کے سامانوں کی فراوانی پر اظہار مسرت کر کے سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اپنے خیال کی تائید چاہتا تھا — کہنے لگے، — بیشک دولت نعمت ہے، اور خداوند کریم کی نعمتوں میں ایک بڑی نعمت ہے، مگر اس دور میں دولت کے وفور کے برے نتائج کی تلافی و تدارک کا امکان بہت دشوار ہے، مولانا کے سیاسی شعور کی بلندیوں تک پہنچنا میرے لئے ناممکن ہے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ہندوستان و پاکستان کے غیر دانشمندانہ تعلقات پر گفتگو کی، عربوں کی امریکہ نوازی پر رائے زنی کی، بھارت کے مسلمانوں کی بدحالی کے اسباب بیان کئے، اور جن مسائل کو میں بڑے بڑے لیڈروں کی توضیح و تفصیل کے بعد بھی نہ سمجھا تھا، سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تشریح سے پوری طرح سمجھ میں آگئے، اور کشفِ صدر ہو کر اطمینان ہو گیا، اور خدا کا شکر ادا کیا کہ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مختصر صحبت سے برسوں کی الجھن دور ہو گئی، غرض بمبئی پہنچنے تک مولانا کی تعلیمات سے اپنی معلومات میں اضافہ کرتا رہا، مگر ایک تمنائے دیرینہ پوری نہ ہوئی، — ایک دن جو چشم کرم اپنی طرف دیکھی تو عرض کیا،

آنانکہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

مسکرا کر رہ گئے اور کوئی جواب نہ دیا، صاحبِ نظر تھے، سمجھ گئے ہونگے، کہ کثرتِ گناہ سے وعظ و نصیحت کے قبول کی استعداد ہی ضائع ہو گئی ہے، سچ ہے

تہیدستانِ قسمت را چہ سود از رہبرِ کامل
کہ خضر از آبِ حیوان تشنہ می آرد سکندر را

جب جہاز بندرگاہ میں پہنچ گیا تو سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے رخصت ہونے کے لئے اُن کے کیبن میں حاضر ہوا، اور درخواست کی کہ جس کتابچہ کا نام آپ نے "اقوالِ اشرف" تجویز فرمایا ہے، اس کی تزئین کے لئے سوانحِ حیات محی الملّت مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھکر بھیجدیئے جائیں — ارشاد ہوا کہ انشاء اللہ تعالیٰ بہ شرطِ یاد ضرور بھیج دون گا، آپ تصنیفات حکیم الامت کا مطالعہ جاری رکھیئے، اچھا شوق ہے، تھوڑے دنوں کے بعد یاددہانی کی تو سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کراچی سے سوانحِ حیات لکھ کر میرے پاس بھیج دیئے، اور مین نے اقوالِ اشرف مین اُسے شامل کر دیا،

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے رخصت ہوتے وقت درخواست کی کہ میرے حالِ زار و زبون کے پیش نظر مجھ پر خاص توجہ فرمائی جائے، اور عرض کیا کہ

خورشید عمر بر سر دیوار و خفتہ ایم　　فریاد از درازیِ خوابِ گرانِ ما

جواب ملا — جدوجہد جاری رہے، سعی محمود ہمیشہ مشکور ہوتی ہے، اس کے بعد حکم ہوا کہ — جایئے، سامان کی نگرانی کیجئے، سلام عرض کیا اور چلا آیا،

ع حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد

علّامہ سیّد سلیمان ندوی مرحوم

از

جناب مالک رام صاحب ایم۔اے

آج سے رُبع صدی قبل کم و بیش ۱۹۲۵ء کی بات ہے، یا وش بخیر، میری طالب علمی کا زمانہ تھا، مین گورنمنٹ کالج لاہور مین پڑھتا تھا جب علّامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کی کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" وہان پہنچی، چونکہ موضوع میرے مذاق کے مطابق تھا، مین نے اسے شوق کے ہاتھوں لیا، اور عقیدت کی نظر سے پڑھا، اور جب پڑھ چکنے کے بعد کتاب ہاتھ سے رکھی، تو اس حسرت کے ساتھ کہ کاش یہ ابھی اور لمبی ہوتی، کتاب کی خوبی اور مصنّف کی کاوش اور دیدہ ریزی کا اندازہ کچھ اس سے لگایا جاسکتا ہے، جب معلوم ہو کہ یہ آج تک اردو ہی مین نہین بلکہ دوسری زبانون مین بھی اپنے موضوع پر اکیلی کتاب ہے لیکن مجھے یہان اس کتاب پر تبصرہ لکھنا منظور نہین،

اس مین مصنّف مرحوم نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ہندوستان کی تاریخ لکھنے والون نے جتنی توجہ فارسی ماخذون پر کی ہے، اتنی ہی عربی سفرنامون اور تاریخ و جغرافیہ کی کتابون سے بے اعتنائی برتی ہے، حالانکہ یہ قیمتی معلومات کا خزانہ ہین، اور اُن سے کما حقہ استفادہ کئے بغیر ہمارے ملک کی تاریخ مکمل ہو ہی نہین سکتی،

خدا انھین خوش رکھے، میرے ایک ہم سبق اور عزیز دوست فیروز دین گھٹی تھے، خدا معلوم

آج کل کہاں ہیں، میری عربی کی واقفیت تو شد بُد سے زیادہ نہیں تھی لیکن وہ کم از کم مجھ سے زیادہ جانتے تھے، بی اے میں ان کا اختیاری مضمون عربی رہا تھا، ہم دونوں نے مشورہ کر کے فیصلہ کیا کہ اگر ممکن ہو تو یہ کام ضرور کرنا چاہیے، ارادہ یہ تھا کہ جس طرح الیٹ نے مختلف فارسی تاریخوں کے متعلقہ حصوں کا انگریزی میں ترجمہ کر دیا ہے، اسی طرح عربی ماخذوں کو اردو میں منتقل کر دیا جائے، چنانچہ میں نے ایک خط مرحوم کی خدمت میں لکھا کہ میں نے آپ کی کتاب پڑھی ہے، اور یہ ہمارا ارادہ ہے۔ مہربانی ہوگی اگر اس معاملے میں ہمیں اپنی رہنمائی سے مستفید کریں، اور سب سے پہلی یہ بات کہ ان کتابوں کی فہرست لکھیں، جو آپکے خیال میں ترجمہ کرنے کے لائق ہیں، فوراً جواب آیا، اس میں بیس ایک کتابوں کی فہرست تھی، اس پر میں بازار سے بلاذری کی فتوح البلدان کا ایک نسخہ خرید لایا، اور ہم نے اس کے ہندوستان سے متعلق حصے کا ترجمہ شروع کر دیا، اسی دوران میں سلیمان تاجر کا سفرنامہ جو نسبتہً مختصر چیز ہے، میرے ہاتھ لگ گیا، اور میں نے جلدی سے اس کا ترجمہ بھی کر ڈالا، لیکن افسوس کہ یہ مفید کام ہماری خواہش کے مطابق جاری نہ رہ سکا، پہلے تو ہماری تعلیمی مشغولیتوں کے باعث یہ بہت آہستہ آہستہ ہوتا رہا، پھر جب تعلیم سے فارغ ہوئے، تو غم روزگار نے وہ رہی سہی عافیت بھی نہ چھوڑی، وہ جگ ٹوٹ گیا، بھٹی صاحب کہیں اور میں کہیں، اور اس کے بعد آج تک اس موضوع کے دیکھنے کا موقع نہیں ملا،

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان، لیکن پھر بھی کم نکلے

لیکن حسرتوں کے گنوانے سے فائدہ، ان کی فہرست بہت طولانی ہے، یہاں اس حکایت کے بیان کرنے سے مقصود یہ بتانا تھا کہ مرحوم سے میری واقفیت کی تقریب کیسے پیدا ہوئی، بہرحال اس کے بعد خط و کتابت کا سلسلہ قائم ہو گیا،

۱۹۳۶ء میں جناب امداد صابری صاحب دہلوی نے ایک رسالہ "علامہ سید سلیمان ندوی کی قرآنی

غلطیاں" چھاپا، میں ان دنوں دہلی میں تھا، ایک دن میں جناب نواب سراج الدین احمد خان سائل مرحوم کے مکان پر گیا، تو یہ رسالہ اُن کی بیٹھک میں پڑا مل گیا، میں اسے اٹھا لایا، اب یہ اتنے دن کی بات ہے کہ یقینی طور پر کچھ کہہ نہیں سکتا، تاہم اتنا یاد پڑتا ہے کہ اس میں سیرۃ النبی میں نقل کردہ آیات قرآنی کے ترجموں کی بعض غلطیاں مصنف نے اپنے نزدیک دکھائی تھیں، مولانا نے غالباً دسمبر ۱۹۳۶ء کے معارف کے شذرات میں اس کا اس طرح جائزہ لیا جس سے مترشح ہوتا تھا کہ اُن کے خیال میں یہ رسالہ نہ صرف جناب امداد صابری نے کسی اور صاحب کے کہنے پر لکھا ہے، بلکہ یہ غالباً ان کا لکھا ہوا بھی نہیں ہے، اور انھوں نے کسی اور سے لکھوا کے اسے اپنے نام سے شائع کر دیا ہے، اس پر صابری صاحب نے ازالۂ حیثیت عرفی اور ہتک عزت کا ہرجانے کا دعویٰ کر دیا،

مرحوم سے میری پہلی ملاقات اسی سلسلہ میں ہوئی، وہ اس مقدمے میں پیشی کے لئے دہلی آئے، تو حسب معمول جامعہ ملیہ (قرول باغ) میں بھی تشریف لائے، ان دنوں میرا بھی اسی قرب وجوار میں قیام تھا، یہیں ایک شام میں بھائی حامد علی خان صاحب کے مکان پر اُن سے ملا، نسبتہً چھوٹا قد، آفتابی چہرہ، بڑی بڑی تیز آنکھیں، کشادہ اونچی پیشانی، کسی قدر لمبی ناک، جو پھننگ کے قریب قدرے موٹی ہو گئی تھی، "قصّ الشارب اعفاء اللحی" کا مصداق چھوٹی مونچھیں اور گھنی کھچڑی داڑھی، جو بہت لمبی نہیں تھی، اور جس میں سپید بال زیادہ تھے، اور سیاہ کم، صاف ستھرا، کھلتا رنگ، گلے میں شیروانی نما بند گلے کا کوٹ، جس کی دائیں طرف کی جیب سے گھڑی کی زنجیر لٹک رہی تھی، اور دوسری طرف لکھنے کا قلم نظر آ رہا تھا، نیچے سپید پاجامہ، اور سر پر عمامہ، جس کا شملہ پیچھے سے اٹھا کر خاص طریقے سے اڑس رکھا تھا، یہ تھا اُن کا حلیہ، میں یہ الفاظ لکھ رہا ہوں اور اُن کی صورت میری آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے،

جب مجھے اس مقدمے کی روئداد معلوم ہوئی، تو میں نے پیش کش کی کہ اگر اجازت ہو تو میں دو سائل صاحب کے ذریعہ صلح صفائی کی کوشش کروں، اس پر انھوں نے رضامندی کا اظہار کیا، ہم نے

نواب صاحب مرحوم سے مل کر طے کیا کہ صابری صاحب سے ملنا چاہیے لیکن اگلی صبح اُن کے ہان جانے سے پہلے، مین پھر مرحوم کی خدمت مین حاضر ہوا، اور اُن سے دریافت کیا کہ آپ کن شرائط پر صلح کرنے کو تیار ہون گے، کیونکہ مین نے خیال کیا کہ فریق ثانی سے بات چیت کرنے سے پہلے مجھے معلوم ہونا چاہئے کہ مین اُن کی طرف سے کس حد تک جانے کا مجاز ہون،

جاڑون کے دن تھے، مین بھی آٹھ ساڑھے آٹھ بجے صبح کے وقت اُن کے پاس پہنچا، وہ جناب سید مرتضیٰ علی صاحب کے مکان پر اُترے ہوئے تھے، جب مین نے اطلاع کرائی ہے، تو وہ ناشتہ کرکے باہر برآمدے مین تشریف لا چکے تھے، بہت لطف اور مہربانی سے پیش آئے، علیک سلیک کے بعد پہلے میرے متعلق دو چار باتین ہوئین، لیکن چونکہ وقت تنگ تھا، اس لئے مین زیادہ دیر ٹھہر نہین سکا، میرے پوچھنے پر فرمایا کہ یہ مقدمہ محض غلط فہمی کی بنا پر دائر کیا گیا ہے، مین نے جو کچھ لکھا تھا، اس سے ہرگز میرا یہ منشا نہین تھا کہ کسی طرح جناب امداد صابری صاحب کی ہتک یا دل شکنی ہو، وہ اگر مقدمہ واپس لے لین، تو مین مناسب الفاظ معارف مین شائع کر دون گا، تاکہ ان کا ملال دور ہو جائے، خود مجھے بھی یقین تھا کہ معارف کے بناے دعوی شذرات سے صابری صاحب کی مخالفت مقصود نہین تھی، بلکہ مرحوم اس سے صرف یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ

ع کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری مین

بہرحال اس وقت انھون نے جو کچھ مجھ سے کہا، اس سے میرا اطمینان ہو گیا، اور اس کے بعد سائل صاحب اور مین مدعی کے پاس پہنچے،

بقیہ حالات سب کو معلوم ہی ہین، فریقین نے راضی نامہ داخل کر دیا، اور مقدمہ واپس لے لیا گیا، مجھے اس سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ اس بہانہ میرا گذشتہ چھ سات برس کا غائبانہ تعلق ذاتی واقفیت مین تبدیل ہو گیا، اور اب خط و کتابت مین بھی زیادہ باقاعدگی پیدا ہو گئی،

اس کے کچھ دن بعد مین نے عورت اور اسلامی تعلیم لکھی، یہ اتنی بڑی جسارت تھی کہ مین آج بھی بعض اوقات اپنے آپ پر تعجب کرتا ہون، موضوع نہ صرف اسلامی، بلکہ خالص علمی اور فقہی بھی، مجھے بجا طور پر اندیشہ تھا کہ کم کم عامۃ المسلمین اسے دخل در معقولات سے زیادہ وقعت نہین دین گے لیکن لکھ ڈالنے کے بعد اُسے ضائع کرنا بھی مشکل تھا، مین نے سوچا کہ اس خسارے کے سودے مین نفع حاصل کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ اُسے چھپوا کر بھیجا جائے، چنانچہ مین نے اُن سے ایک تو اس پر نظر ثانی کرنے کی درخواست کی، اور دوسرے مقدمہ لکھنے کی، انھون نے لکھا کہ مین وعدہ نہین کرتا، مضمون بھیج دین، تو دیکھ کر بتاؤن، جب مسودہ ان کے پاس پہنچا، تو انھون نے میری توقع سے بہت زیادہ اس کی تعریف فرمائی لیکن اتنا اضافہ کیا کہ مجھے تمھارے بعض خیالات سے اختلاف ہے، ظاہر ہے کہ اس صورت مین مقدمہ لکھنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا، انھون نے یہ نہین لکھا تھا کہ انھین کون سے مقامات پر مجھ سے اختلاف ہے، جب مین نے پوچھا تو فرمایا کہ لکھنے مین خواہ مخواہ طوالت ہو جائے گی، کبھی موقع ملے تو ذاتی ملاقات کے ذریعہ انھین دور کیا جا سکتا ہے، اس کے علاوہ مجھے یونہی سا خیال ہوتا ہے کہ انھین یہ بھی شبہہ تھا کہ مین نے اسے دہلی کے ایک مشہور اہل قرآن عالم سے مشورہ کرنے کے بعد لکھا ہے، حالانکہ یہ ٹھیک نہین مین نے جو کچھ لکھا تھا، بالکل اپنے ذاتی مطالعہ کے نتیجے مین لکھا تھا، بہرحال چونکہ اس کے تھوڑی مدت بعد مین ملک سے باہر چلا گیا، اس لئے معاملہ اسی پر ختم ہو گیا، نہ مین اُن سے مل سکا، نہ اس گفتگو کی نوبت آئی، یہ مسودہ بہت دن تک اُن کے پاس پڑا رہا، اور آخر انھون نے اُسے ۱۹۴۶ء مین میرے ایک دوست کے پاس لاہور بھیج دیا،

اس دوران مین خود مجھے بھی غور و فکر کا موقع ملا، پہلے مین نے پردہ کی بحث مین یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ منہ چھپانا، اسلامی پردے مین شامل نہین، لیکن بعد مین مزید مطالعے اور قرآن و حدیث پر زیادہ دقت نظر سے غور کرنے پر مین اس نتیجہ پر پہنچا کہ منہ بھی اس حکم مین شامل ہے، اور بھی دو ایک جگہ خفیف سی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی، چنانچہ مین نے نہ صرف یہ مقام ہی بدل ڈالے، بلکہ پورا مضمون نئے سرے سے دوبارہ

لکھ کے اُسے شائع کر دیا، جب یہ مطبوعہ نسخہ ان کی خدمت میں پہنچا، تو انھوں نے اُس کی تعریف فرمائی،

اس تمام زمانے میں میری ان سے خط و کتابت رہی، وہ خط لکھنے میں ذرا سست تھے لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ دیر سویر انھوں نے خط کا جواب نہ دیا ہو، مجھے اپنی ہیچ میرزی اور ہیچ مدانی کا پورا احساس ہے لیکن جانے کیوں، اس کے باوجود میں، بزرگوں کی خدمت میں ہمیشہ سے بہت بے باک رہا ہوں، اور کبھی الٹی سیدھی بات کہنے میں شرم محسوس نہیں کرتا، پھر اس پر بھی خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ وہ اس پر طرح دیتے ہیں اور چشم نمائی کی جگہ چشم پوشی فرماتے ہیں، حضرت علامہ مرحوم سے بھی میرا رویہ کچھ اس سے مختلف نہیں تھا، میں اُن کی خدمت میں بھی گستاخ تھا، جو جی میں آتی، بے جھجک لکھ دیتا، لیکن یہ اُن کی ذرہ نوازی تھی کہ وہ کبھی ماتھے پر بل نہیں لائے، لطف فرماتے، میرے لکھے سے درگذر کرتے، اور جواب دیتے،

افسوس کہ ان کے تمام مکاتیب محفوظ نہیں رہے، تقسیم کے پہلے کے بیشتر خطوط لاہور میں رہ گئے، کچھ میرے مختلف ممالک کے سفروں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل مکانی کرتے ہوئے کھو گئے، گذشتہ چند برس میں جو خط آئے تھے، ان میں سے جو اس وقت میرے پاس موجود ہیں، انھیں ضمیمہ میں درج کر رہا ہوں تاکہ کم از کم یہ ضائع ہونے سے بچ جائیں، بعض جگہ تلمیح کو واضح کرنے کے لئے میں نے حاشیہ میں چند لفظ لکھ دیئے ہیں،

اردو میں مذہبی موضوعات پر لکھنے والوں کی کمی نہیں رہی، اُن میں سے بعض حضرات کی مصنفات کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے لیکن اس کے باوجود زبان کی تاریخ میں کہیں ان کا نام نہیں ملتا، اس کے دو سبب ہیں، اول نفس موضوع، اور دوسرا اسے پیش کرنے کا طریقہ، موضوع بالعموم عام لوگوں کی دلچسپی کا نہیں ہوتا، بنیادی مذہبی عقائد کو تو رہنے دیجئے، کہ ان میں کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں لیکن جہاں موضوع میں وسعت پیدا ہو سکتی ہے، اور یہ اپنوں کے علاوہ بیگانوں کے لئے بھی قابلِ مطالعہ اور کشش کا باعث ہو سکتا ہے، وہاں بھی بہت کم ایسا اتفاق ہوا ہے کہ اُن میں سے کوئی کتاب زبان و بیان کے پہلو سے بھی معیاری رہی ہو، یہ اللہ والے لوگ اس بارے میں الا ماشاء اللہ عموماً بے نیاز واقع ہوئے ہیں، مشکل اور نامانوس الفاظ، ادق

لہ معارف: جلد کی ضخامت کی وجہ سے یہ خطوط شائع نہیں کئے گئے،

ترکیبوں کی بھرمار سے پڑھنے والے کا سر چکرانے لگتا ہے، غیر ضروری تکرار اور طول نویسی اس پر مستزاد، اور ان سب سے بڑھکر بسا اوقات اپنے طرزِ استدلال، اور متقدمین کی ہر رطب و یابس تحریر کی صحت پر اصرار، غرض کہ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کتابیں ایک خاص حلقے میں محدود ہو کے رہ گئیں، اور عام پڑھے لکھے ان سے استفادہ کرنے سے محروم رہ گئے، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں علم و ادب کی تاریخ لکھنے والے ان کا ذکر کیوں کرنے لگے تھے،

خدا مغفرت کرے مولانا شبلی نعمانی مرحوم کی، سب سے پہلے انھوں نے اس بھول بھلیاں سے نکلنے کی راہ دکھلائی، انھوں نے خالص مذہبی اور علمی مضمونوں پر کتابیں اور مقالے لکھے، اور ایسی دلکش اور شستہ زبان میں کہ اس میں شیر و شکر کی حلاوت محسوس ہونے لگی اور صرف یہی، بلکہ یہ واقعہ ہے کہ اُن سے پہلے اردو میں صحیح علمی تحقیق بھی تقریباً مفقود تھی، اس میدان میں بھی اولیت کا سہرا انہی کے سر ہے، انھوں نے مختلف اسلامی اور تاریخی موضوعات پر اپنے زندۂ جاوید مضامین لکھے، ہر طرف سے اس بدعتِ حسنہ پر آفریں اور ہل من مزید کا نعرہ بلند ہوا، اس سے دوسرے اصحابِ قلم کو بھی توجہ اور جرأت ہوئی، چنانچہ اُن کے زمانے میں بعض اصحاب نے اُن کے تتبع میں کتابیں لکھیں، اور اُن کے بعد دوسروں کے علاوہ خود اُن کے تربیت یافتہ تلامذہ نے اس میں جو اضافہ کیا ہے، وہ اردو کا مایۂ ناز سرمایہ ہے، اس گروہ میں علامہ مرحوم کی ذات رئیس الطائفہ کی حیثیت رکھتی تھی، اگر انھوں نے اپنی عمر بھر میں صرف سیرۃ النبی ہی کی تکمیل کی ہوتی، تو یہی اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ تاریخ علم و ادب میں ان کا نام زندہ رکھنے کو کافی تھا، لیکن انھوں نے اس کے علاوہ ہمیں خطباتِ مدراس دیئے، جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر بالکل اچھوتے انداز میں روشنی ڈالتے ہیں، پھر انھوں نے جو تحقیقی کتابیں ——— ارض القرآن اور عرب و ہند کے تعلقات اور عربوں کی جہاز رانی ——— لکھی ہیں، وہ ہماری زبان کی بہترین کتابوں میں شمار ہونے کے لائق ہیں، اسی طرح سوانح عمریوں میں حیاتِ امام مالکؒ، سیرۃ عائشہؓ، خیام، حیاتِ شبلی اپنے اپنے موضوع پر حرفِ آخر کا حکم رکھتی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ بنیادی طور پر ان کی تعلیم بھی سراسر مذہبی تھی، لیکن انھوں نے اپنے مطالعہ کو اسی حد تک محدود نہیں رکھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اسلوبِ فکر میں تنوع پیدا

ہوگیا، اور انھون نے اپنے گرامی قدر استاد کی پیروی مین ہماری زبان کو اپنی گوناگون تصنیفات سے مالامال کردیا، اُن کی ہمہ گیری اور جامعیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، جغرافیہ، سیرت، ادب، تنقید، شعر، سفرنامہ، کوئی موضوع اُن کے افادات سے محروم نہین رہا، ان مین سے ہر ایک پر انھون نے معیاری کتابین لکھی ہین، جو نہ صرف معلومات کا خزانہ ہین، بلکہ خیال انگیز بھی، اور مزید کام کرنے والون کیلئے مشعلِ راہ کا کام دے سکتی ہین،

جو جگہ خالی ہوئی ہے، وہ تو اب خالی ہی رہے گی، اس سے پہلے کس کی پُر ہوئی ہے جو اُن کی ہوگی، لیکن ان کے اخلاف اتنا تو کرسکتے ہین، کہ جو شمع انھون نے جلائی تھی، اگر وہ اس کی روشنی مین اضافہ نہین کرسکتے، تو کم از کم اس مین جان لڑادین، کہ اس کی تابناکی مین کمی نہ آنے پائے، اور سچ تو یہ ہے کہ یہ ان کا اپنے آپ پر احسان ہوگا کہ اس بہانے ان کا اپنا نام زندہ جاوید ہوجائے گا، ورنہ مرنے والے کے کارنامے تو ایسے ہین کہ اگر کوئی انھین بھلانا بھی چاہے تو وہ بھلائے نہین جاسکتے،

بارے دنیا مین رہو، غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کرکے چلو یان کہ بہت یاد رہو

علالت سے وفات تک

علامہ سید سلیمان ندوی

از

جناب سید ابوعاصم صاحب ایڈوکیٹ کراچی

"یہ مضمون ریاض کراچی کے سلیمان نمبر مین شائع ہوا تھا، اُس کے بعض حصے حذف کرکے جن کا تعلق علالت و وفات کے حالات سے نہین ہے نقل کیا جاتا ہے،" "م"

دم سرد ہے آہ پرآ رہے　　　تسلسل حوادث کا جانکاہ ہے

پہلی مرتبہ ۱۹۴۵ء مین مجھے اطلاع ملی کہ چچاجان کی طبیعت ناساز ہے، سیدھا اعظم گڈھ پہنچا، بیچ کا کمرہ حسب قاعدہ فرش و قالین سے مزین ہے، مسہری پر چچاجان لیٹے ہین، سب عزیز و اقارب پہنچ چکے تھے، مجھے دیکھا، مسکرا کر فرمایا،

ع کرتا ہون جمع پھر جگر لخت لخت کو

علالت کی نوعیت یہ معلوم ہوئی کہ سینہ مین شدید درد تھا جس نے کئی رات مسلسل سونے نہین دیا، ڈاکٹر حفیظ صاحب کا علاج تھا، اُن کی تجویز تھی کہ قلبی شکایت ہے، فوراً ابھی جاکر علاج ہو، مگر ڈاکٹر حفیظ صاحب ہی کے علاج سے جب افاقہ ہوگیا تو مزید جانچ نہ ہوسکی،

اسی سال جاڑے دن مین راقم کے یہان کبھی کبھی تشریف لاتے، رات کا وقت تھا کہ یک بیک تنفس کی

تکلیف شروع ہوئی، مگر مالش وغیرہ سے فوراً ہی یہ تکلیف جاتی رہی، اُس کے بعد یہ شکایت کبھی کبھی ہو جاتی تھی،
اور معمولی ہومیو پیتھی دواؤن سے چلی جاتی تھی، اس وقت اس کی تشخیص نہ ہو سکی کہ اس کی نوعیت کیا ہے،
ہمیشہ یہی خیال رہا کہ حلق کی خرابی ہے، اور سانس کی نالی مین بلغم پھنس جاتا ہے، جس سے یہ تکلیف
ہو جاتی ہے،

اتفاق سے اسی زمانہ مین بھوپال اور حیدرآباد سے بلانے کی گفتگو جاری تھی، حیدرآباد مین اگرچہ تنخواہ زیادہ
تھی لیکن بھوپال سے ایک تو شعیب قریشی صاحب مدظلہ کا اصرار تھا، دوسری طرف بقول شعیب صاحب
قاضی ریاست کا عہدہ تو ان کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکا، لیکن تعلیم عربی کی اصلاح کی خدمت کے موقع کو وہ
انکار نہ کر سکے، وہ بھوپال مین قاضی القضاۃ اور امیر جامعہ احمدیہ کی حیثیت سے بلائے گئے تھے، اور بالآخر جولائی
سنہ ۱۹۴۶ء مین وہ بھوپال تشریف لے گئے، اور سنہ ۱۹۴۹ء اکتوبر تک مسلسل اُن کا قیام وہان رہا، اور صحت اچھی
رہی، کچھ لوگون کو اُن کے دارالمصنفین چھوڑنے پر اعتراض تھا، اُن کی مظلومیت کی یہ انتہا ہے کہ خود مظلوم مورد
الزام بنایا جا رہا ہے، اس کے باوجود اس نے اپنی زندگی مین کبھی بھی کسی کو بُرا کہنا تو بڑی بات ہے، کسی کا
نام بھی اپنی زبان پر آنے نہین دیا،

ع کبھی فرصت سے سُن لینا بڑی ہے داستان میری

یون تو وہ دو مرتبہ حرمین شریفین کی زیارت کر چکے تھے، لیکن اُن کے دل مین یہ بات کھٹکتی تھی کہ وہ دونون
سفر سیاسی تھے، اس سے پہلے سنہ ۱۹۲۴ء اور پھر سنہ ۱۹۲۶ء مین وفد حجاز مین ہندی مسلمانون کے نمائندہ بن کر
تشریف لے گئے تھے، کون کہہ سکتا ہے کہ وہ بھی رضائے الٰہی کے لئے نہ تھے، لیکن اللہ کے بندے اور رسول کے
عاشق نے ان کے دربار مین صرف انہی کا نام لے کر حاضری مناسب سمجھی، چنانچہ سنہ ۱۹۴۹ء اکتوبر مین حج بیت اللہ
کے لئے تشریف لے گئے،

واپسی شاید دسمبر مین ہوتی، راستہ ہی مین طبیعت خراب ہو گئی، بمبئی مین یون تو بہت سے لوگ اپنا

مہمان بنانے کے متمنی تھے لیکن بمبئی کے مشہور مخیر تاجر بھائی عزیز صاحب کی بے پناہ محبت سب پر غالب آئی، کسی کو سبقت
کا موقع دیئے بغیر وہ اُن کو کرسی پر بٹھا کر اٹھا لائے، اور اپنی گاڑی مین بٹھایا، اپنے گھر لے آئے، جس خلوص محبت
اور تندہی سے انھون نے تیمارداری کی ہے، حق یہ ہے کہ اس نے بہت سے قریبی عزیزون کو بھی شرمندہ کر دیا، ان
ڈاکٹرون کی تشخیص یہ ہوئی کہ دوسری شکایتون کے ساتھ دل بھی بڑھ گیا ہے، لیکن انھون نے اس کو کوئی اہمیت
نہین دی، بلکہ یہی کہا کہ اس عمر مین عموماً دل بڑھ جایا کرتا ہے،

اسی زمانہ مین پاکستان آنے کی خبر گرم ہو چکی تھی، ہندوستان کے متعدد اخبار لکھ رہے تھے کہ وہ ہجرت
کرنے والے ہین، حالانکہ حقیقت اس وقت صرف اس قدر تھی کہ یہان سے دعوت ضرور دی گئی تھی، مگر انھون
نے اب تک قبول نہین فرمائی تھی، بلکہ پیشکش کی مزید تشریح چاہی تھی، وہ بستر پر بیمار تھے، لوگ چارون طرف
سے گھیرے ہوئے تھے، اتنے مین ایک اخبار کے نامہ نگار صاحب تشریف لائے، اور انھون نے سوال کیا کیا آپ پاکستان
تشریف لیجا رہے ہین؟ اسکے جواب مین انھون نے صرف یہ شعر پڑھا،

رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے

نامہ نگار صاحب تو اسی شعر کا مزہ لیتے ہوئے رخصت ہو گئے، جب صحت ہو گئی تو وہ بھوپال تشریف
لے گئے، وہان سے سبکدوش ہو کر لکھنؤ اعظم گڈھ اور کانپور مین چند مہینے قیام رہا،
مین سنہ ۱۹۴۸ء کے اوائل ہی مین کراچی آ گیا تھا، اُن کے یہان آنے سے پہلے ایک مرتبہ اُن کے پاس بھوپال اور
والدہ کے انتقال پر وطن اور بھی گیا، اُن کو پاکستان کا مشتاق اور دعا گو پایا، مگر آنے کے متعلق مجھے یقین نہین تھا
۱۳ جون سنہ ۱۹۵۰ء کی صبح کو مین نے اخبار مین یک بیک یہ خبر پڑھی کہ چچا جان لاہور تشریف لے آئے ہین،
اور ۱۴ جون کو کراچی تشریف لانے والے ہین، ہم لوگ کینٹ اسٹیشن گئے، اور ان کو ڈاکٹر [illegible] لائے، ڈاکٹر [illegible]
خواجہ شہاب الدین جو ان دنون وزیر داخلہ تھے، اُن کی عنایت خاص کی وجہ سے مجھے پہلے ہی مل چکا تھا، وہ ایک

خاص ولولہ کے ساتھ تشریف لائے تھے، اُن کی گفتگو میں کتنی امید اور کتنی آرزو جھلکتی تھی،

ڈار منزل جہانگیر روڈ کی ایک شاخ چمن اسٹریٹ پر واقع ہے، یہ ایک پچھم رُخ کا مکان ہے، پھاٹک سے داخل ہوتے ہی سامنے پندرہ فٹ بے آب و گیاہ میدان ہے، اس کے بعد ۱۵ فٹ کا پختہ صحن ہے، اسی سے ملحق تین کمرے سڑک کے رُخ پر ایک سلسلہ سے ہیں، پھاٹک کے سامنے کا کمرہ ملاقات کے لئے مقرر ہوا، اس کے بعد بیچ کا کمرہ اُن کی خوابگاہ بنا، اور آخری کمرہ میں میرا قیام تھا، کلفٹن کوارٹرز کے پاس ایک مسجد تھی، لوگوں نے اس کا نام جامع مسجد سلیمانیہ رکھنا چاہا، انھوں نے اس کو ناپسند کیا، لیکن لوگ نہ مانے، آخر وہ اسی نام سے مشہور ہو گئی، وہاں روز صبح بعد نماز درس قرآن کا سلسلہ شروع ہوا، اس مرتبہ میں نے ایک بات یہ دیکھی کہ تنفس کا دورہ عموماً رات کو کبھی کبھی پڑ جاتا تھا، ہومیوپیتھی دوا سے فوراً سکون بھی ہو جاتا تھا، یہ تکلیف کھانے کے بعد تقریر کرنے یا کوئی حرکت کرنے سے ہو جاتی تھی، اس لئے ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ یہ تکلیف ریاح اور سوء ہضم کا فساد ہے، اسی لئے ساری توجہ ریاح اور اصلاحِ معدہ کی طرف رہی،

ایک مرتبہ مسجد سلیمانیہ میں درس دے رہے تھے، اسی دوران میں اُن کی آواز مدھم ہوتی گئی، اور انھوں نے گردن جھکا لی، فوراً لوگوں نے پکڑ لیا، اور اٹھا کر گاڑی پر گھر لائے، اور ڈاکٹر میجر حسن کو ٹیلیفون کیا، میجر حسن فوراً تشریف لائے، لوگوں کو خیال ہوا کہ فالج کا حملہ تھا، میجر حسن صاحب نے معائنہ فرمایا، سب سے پہلے خون کا دباؤ دیکھا، وہ بجائے زیادہ ہونے کے معمول سے بھی کم تھا جس سے اس خیال کی تردید ہوئی، تلوؤں میں تھوڑی سی بے حسی ضرور تھی، چچا جان کو شدت سے انکار تھا کہ ان پر کسی قسم کا حملہ تھا، وہ کہتے تھے رات کو نیند نہیں آئی تھی، اسی لئے آنکھ لگ گئی تھی، بہر حال احتیاطی طور پر میجر صاحب نے انجکشن دینے شروع کئے، انھوں نے بڑی محبت خلوص اور شرافت کا ثبوت دیا، جب میں نے فیس پیش کی اور اصرار کیا تو انھوں نے سختی سے انکار کیا، اور فرمایا کہ مجھے کمانے کے مواقع تو بہت ملیں گے

لیکن آپ مجھے سعادت اور مسرت سے کیوں محروم کرتے ہیں حقیقت یہی تھی کہ یہ اُن کے دل کی آواز تھی، اس میں ذرا بھی رسمی تکلف نہ تھا، وہ باوجود بے انتہا مشغول ہونے کے خود تشریف لاتے، اور انجکشن دیتے، اُن کے علاج اور توجہ سے وہ کچھ صحت مند ہو گئے، یہ غالباً جنوری ۱۹۵۲ء کی بات ہے،

۱۹۵۲ء کی گرمیوں میں بنیادی کمیٹی کا اجلاس نتھیا گلی میں طے پایا، چچا جان بھی تشریف لے گئے، آٹھ ہزار فٹ کی بلندی اُن کے قلب و اعصاب کے لئے ناقابلِ برداشت ہو گئی، اور ان پر تنفس کا شدید دورہ پڑا، فوراً ڈاکٹر آئے، انھوں نے دیکھا اور کہا کہ خون کا دباؤ بہت بڑھا ہوا ہے، خان عبد القیوم خان اور میاں ممتاز دولتانہ نے اپنے خصوصی اثر سے فوجی اسپتال راولپنڈی پہنچایا، وہاں کرنل سرور نے معائنہ کیا، دل کافی بڑھ چکا تھا، اور سب سے پہلی بار یہ تشخیص ہوئی کہ یہ تنفس کی تکلیف بھی قلب ہی کی وجہ سے ہے، وہاں سے لاہور تشریف لائے، لاہور کے ایک تجربہ کار ڈاکٹر صاحب نے بھی وہی تشخیص کیا، اور نسخہ تجویز کیا، اور نمک کا سخت پرہیز بتایا، اس کے بعد کراچی تشریف لے آئے، یہاں ڈاکٹر رحمان کی طرف رجوع کیا، انھوں نے بھی اسی علاج سے اتفاق کیا، اور علاج ہوتا رہا، اور تنفس جاتا رہا، اور بہت دنوں تک کوئی شکایت نہیں رہی، ہاں حکیم محمد نصیر الدین صاحب ندوی نے جو اُن کے شاگرد بھی، شیدائی بھی، معالج خاص بھی، اور محرم درد دل بھی ہیں، طاقت کی دوائیں ہمیشہ جاری رکھیں،

فروری ۱۹۵۳ء میں ڈھاکہ میں مجلس تاریخ کی کانفرنس تھی، اس کے صدر منتخب ہوئے، ڈاکٹروں کا مشورہ تھا کہ اتنا طویل سفر نہ فرمائیں لیکن نہ مانے اور بذریعہ طیارہ تشریف لے گئے، ڈھاکہ کے خطبۂ صدارت میں ایک تاریخی صداقت کے اظہار کے بعد وہاں کے طلبہ نے جو شرمناک سلوک اُن کے ساتھ کیا، وہ سب کو معلوم ہے، ایک نیم جان قلب کے مریض و ضعیف کے ساتھ ایسا سلوک انسانیت سے گذری ہوئی بات تھی، جلسہ کے بعد مجتبیٰ راحت رضوی صاحب کے یہاں چند دن قیام رہا، اور وہاں سے کلکتہ تک ہوائی جہاز اور بذریعہ ریل لکھنؤ ہوتے ہوئے دہلی پہنچے، کہتے تھے کہ راہ میں بختیار پور جنکشن (جہاں سے ہمارے وطن کی ریل مڑتی ہے) پر ریل ٹھہری، بہت دیر تک حسرت بھری نگاہ ڈالتا رہا، پٹنہ جنکشن پر مقامی ندوی حضرات تشریف لے آئے تھے

کچھ دن لکھنؤ میں قیام رہا، اعظم گڈھ سے شاہ معین الدین صاحب اور سید صباح الدین صاحب بھی ملنے آئے، ان دونوں حضرات کو ان کی ذات سے والہانہ محبت تھی، اس غیر متوقع ملاقات کا ذکر مزہ لے لے کر اپنے خطوط میں کرتے رہے، اور سیر نہ ہونے کا گلہ کرتے رہے، ان حضرات کو کیا معلوم تھا کہ یہ ملاقات اُن کے لئے آخری ثابت ہوگی، اور ع

بوئے گل سیر، ندیدیم وبہار آخر شد

کا مصرعہ ان پر صادق آئے گا،

اپریل سنہ ۱۹۵۳ء میں واپس کراچی تشریف لائے، کچھ ہی دنوں کے بعد تنفس کا پھر دورہ پڑا، وہی انجکشن دیا گیا، جس سے سکون ہوگیا، اس کے بعد سیاسی ہنگاموں کا طوفان اٹھا، بنیادی کمیٹی کا جلسہ علمائے کرام کا اجتماع، کیا کچھ نہ ہوا، منتیں کیں، خوشامدیں کیں، روٹھ گیا کہ ان ہنگاموں سے آپ علیحدہ رہیں،

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں

واں ایک خاموشی تری سب کے جواب میں

ایک دن تو مجھ سے چڑھ گئے، وہ دن تھا اور آخری دن، میں نے زبان بند کرلی، میری آنکھوں میں آنسو آگئے، میرے انداز کو دیکھ کر وہ سمجھ گئے، اکثر چھیڑا کرتے تاکہ میں کچھ بولوں، لیکن میں نے طے کرلیا کہ میں ہرگز ان کی گرانی طبع کا باعث نہ ہوں گا، اس لئے صرف تعمیل حکم میں نے اپنا فرض بنالیا، کوئی آتا میں اطلاع کردیتا، لوگ آتے اور گھنٹوں بیٹھے جاتے اور ہر قسم کے موضوع پر لمبی لمبی بحثیں ہوتیں، دل کڑھتا، اکثر آنکھیں رودیتیں، چہرہ متغیر ہوجاتا، پیشانی پر شکن پڑجاتی، لیکن زبان بہرحال بند رہتی،

اگست سنہ ۱۹۵۳ء کی کوئی تاریخ تھی کہ زکامی کیفیت محسوس ہوئی، اور کچھ تنفس کی ہلکی سی تکلیف بھی، پھر حرارت آگئی یہی ۹۹ - اور ۱۰۰ کے درمیان، ڈاکٹر رحمان کے یہاں خود تشریف لے گئے، انھوں نے کھانسی زکام کا نسخہ دیدیا، دو چار دن میں بخار اتر گیا، لیکن تنفس کی تکلیف بڑھنے لگی تھیں ہوئیں، منٹ کا انجکشن دیا گیا، تنفس کم ہوگیا،

ایک دو دن اسمبلی بھی تشریف لے گئے لیکن گاڑی میں اگلی سیٹ پر شریک یا، میں نے بے قرار ہوکر پوچھا کوئی خاص تکلیف ہے، فرمایا نہیں لیکن مجھے معلوم ہورہا تھا کہ گھلتے جارہے ہیں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں، میری خواہش ہوتی کہ ان کو تکلیف نہ کرنی پڑے، اور ان کی خواہش ہوتی کہ ان کے لئے کسی کو تکلیف نہ ہو، میری خواہش ہوتی کہ ڈاکٹر ان کے پاس آتا لیکن میں ذکر نہیں کرتا، اس لئے کہ مجھے جواب معلوم تھا، وہ فرماتے مرض مجھ کو ہے یا کہ اُن کو، اور پھر جو شخص جتنا کردے، اس کا احسان ہے، نہ کرے تو اس کی کوئی شکایت نہیں، وہ پوچھتے تم کیسا ڈاکٹر چاہتے ہو، میں کہتا مجھے ایسا ڈاکٹر چاہئے جس کو جب جس وقت بلایا جائے، فوراً آجائے، خواہ اس کے لئے وہ کوئی فیس لے، وہ مسکرادیتے، بات ختم ہوجاتی، لیکن دوسرے دن کپڑے پہن کر مجھ سے پہلے گاڑی میں جاکر بیٹھ جاتے، اب میری بے بسی دیکھنے کے قابل ہوتی، میں تھوڑی دیر تذبذب کی حالت میں کھڑا رہتا، نہ کچھ کہہ سکتا، نہ کچھ کرسکتا، شکست کھاکر گاڑی میں بیٹھ جاتا، اور گاڑی چل دیتی،

ساری تکلیفیں خود اٹھانی ان کی فطرت بن چکی تھی، کسی کو ان کی ذات سے تکلیف نہ ہو، اس کا بڑا خیال رکھتے تھے، اسی لئے ڈاکٹر کو گھر پر بلانے کی مخالفت کرتے تھے، کوئی ڈاکٹر ان سے فیس نہیں لیتا تھا، اور سب انتہائی محبت سے پیش آتے تھے، ڈاکٹر فاروقی سے بالکل عزیزوں جیسے تعلقات تھے، وہ خود بھی اپنی ذات سے بڑے متواضع اور خلیق انسان ہیں ہمارے گھر میں کسی کو کچھ تکلیف ہو اطلاع ملتے ہی آجاتے، دیکھتے انجکشن لگاتے، عثمان صاحب کمپونڈر کو متعین کردیتے، عثمان صاحب بھی بڑے ہی شریف اور محبت والے آدمی ہیں، ان سب باتوں کے باوجود ان کی خواہش یہی ہوتی کہ کسی کو تکلیف نہ دیجائے،

ڈاکٹر رحمان کے علاج کو ایک دو ہفتہ ہوا ہوگا کہ ایک دن مختار صاحب نے ٹیلیفون کیا کہ کرنل شاہ سید صاحب کو دیکھنا چاہتے ہیں، کس وقت تشریف لائیں، میں بہت خوش ہوا، کرنل شاہ کے اخلاق کی دل ہی دل میں تعریف کرتا ہوا اچھا جان کو مطلع کیا، انھوں نے فرمایا جس وقت جی چاہے تشریف لے آئیں اُن کی عنایت ہوگی، چنانچہ اسی دن گیارہ بجے تشریف لائے، اور بہت دیر تک معائنہ کرتے رہے، میں نے

اُن کی رائے پوچھی، انھوں نے پورے وقار اور سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا میں ابھی کوئی رائے نہیں دے سکتا، کل اُن کو جناح اسپتال لے آیئے، میں اُن کے قلب کا اکسرے اور کارڈوگراف لینے کے بعد کوئی فیصلہ کروں گا، چنانچہ دوسرے دن ٹھیک گیارہ بجے اُن کے دفتر پہنچ گیا، وہ دفتر میں نہیں تھے، چچا جان کو دفتر میں بٹھا دیا، اور ڈاکٹر صاحب کی تلاش میں اسپتال کا رُخ کیا، وہ اسپتال کا چکر لگا کر آ ہی رہے تھے، جیسے ہی مجھے دیکھا، تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے گلے میں پڑے ہوئے اسٹتھ اسکوپ سے کھیلتے ہوئے دفتر کی طرف تشریف لائے، اور بڑی تعظیم و تکریم اور تواضع سے پیش آئے، اور دوسرے کمرے میں لے گئے، وہاں کارڈوگراف لیا گیا، اور پھر وہاں سے اپنی گاڑی پر دوسری جگہ گیا، وہاں اکسرے لیا گیا، اور پھر تیسری جگہ خون کی جانچ کے لئے خون لیا گیا، اور دوسری جانچ مکمل ہوئی،

اتنی دوڑ دھوپ میں سانس کچھ تیز ہو گئی لیکن بڑے حوصلہ اور ہمت سے سارا کام کرتے رہے، گھر پہنچے تو سب لوگوں نے گھیر لیا جیسا کہ ہمیشہ سے قاعدہ تھا جب کبھی وہ باہر سے آتے تھے، تو گھر کے سارے افراد اُن کے گرد جمع ہو جاتے تھے، لوگ تفصیل جاننا چاہتے تھے لیکن وہ چند جملوں میں ساری بات کہہ جاتے تھے جس سے گھر کے لوگوں کو تسلی نہیں ہوتی تھی، مزید تفصیل اور استفسار کے جواب میں ان کا ایک نیم تبسم بس تھا، چنانچہ اسی طرح اُن سے تفصیل کی فرمائش ہوئی، انھوں نے میری طرف اشارہ کر دیا اور خود پلنگ پر لیٹ گئے، اور زیرلب تبسم کے ساتھ اپنی ساری روداد لیٹے لیٹے سنتے رہے،

دوسرے دن شام کو ڈاکٹر صاحب کا ٹیلیفون آیا کہ میں ساری رپورٹ لے کر خود آؤں گا، اور دوا اور علاج تجویز کروں گا، چنانچہ جب وہ تشریف لائے، تو کہا کہ قلب بڑھ گیا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ قلب کی کسی شریان میں ایک ایسی گرہ بن گئی ہے جس سے دورانِ خون میں دقت ہوتی ہے، اور قلب کو زور لگانا پڑتا ہے، اور اسی سے تنفس کی تخفیف ہوتی ہے، کم و بیش تشخیص وہی تھی جو سارے اطبا اور ڈاکٹروں کی تھی، انھوں نے ایک نمیہ ڈیجاکسن کا اضافہ کیا، کچھ دوائیں کھانسی وغیرہ کی بھی دیں، دس بارہ دن

کے علاج کے بعد حالت بظاہر اچھی خاصی معلوم ہونے لگی، اب وہ بستر سے ادھر ادھر چلنے پھرنے لگے، پاخانہ جانے کے لئے کمرے سے کچھ دور پر تھا، خود سے جانے لگے، اور فرماتے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی،

ڈاکٹر دن کی شدید ہدایت تھی کہ کسی کو ملنے نہ دیا جائے تاکہ دل و دماغ کو مکمل آرام نصیب ہو، کسی قسم کی علمی اور سیاسی گفتگو میں حصہ نہ لیں، صرف انہی حضرات کو ملنے دیا جائے جن کی باتوں سے دل خوش ہو، میں نے ڈاکٹر صاحب سے اپنی عاجزی اور بے بسی کا اظہار کیا، اور ان سے استدعا کی کہ آپ خود گوش گذار کر دیں، چنانچہ ایک دن ڈاکٹر صاحب نے کہنا شروع کیا، کہ آپ نے زندگی میں بہت کام کئے ہیں، اتنی خدمت کی ہے جتنی کم ہی لوگوں نے کی ہوگی، اور ابھی قوم کو آپ کی ضرورت ہے، اس لئے کچھ دنوں قومی، ملی، اور علمی مصروفیتوں سے بالکل علیحدہ ہو جایئے، صحت کے بعد انشاء اللہ پھر حصہ لے لیجئے گا، انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ کبھی مجھے، اور کبھی ڈاکٹر صاحب کو دیکھ کر مسکراتے رہے،

اُن کی علالت کی اطلاع قصداً اخبارات میں نہیں دی تھی، اس لئے کہ لوگوں کا ہجوم بس سے باہر ہو جاتا، اس پر بھی مشتاقوں، محبوں، اور مخلصوں کا تانتا لگا رہتا تھا، بیشمار لوگ صرف دریافت حال کے بعد چلے جاتے تھے، میں لوگوں سے کہہ دیتا تھا کہ ان کا یہ حال ہے، آپ کہیں تو اُن کو مطلع کر دوں، کچھ لوگ کہتے میں اُن کی خیریت پوچھنے آیا ہوں تکلیف دینے نہیں، بعض لوگوں کو اصرار ہوتا کہ آپ میری آمد کی اطلاع کر دیجئے، میں جانتا تھا کہ اگر اطلاع کرائی گئی تو وہ ضرور بلالیں گے، اور پھر کچھ نہ کچھ گفتگو بھی ہوگی، اور موضوع اور عنوان کی کوئی حد بندی باقی نہیں رہے گی،

شروع شروع جب لوگوں کو واپس کر دیا گیا، اور انھیں علم ہوا تو بہت خفا ہوئے، اور فرمانے لگے تم لوگ مجھے وزیر اعظم بنا دینا چاہتے ہو، مجھے یہ پابندیاں پسند نہیں ہیں، میرے پاس جو آتا ہے، محبت اور خلوص سے آتا ہے کبھی غرض سے نہیں آتا ہے، کسی کو رد کرو، چنانچہ جس کی بھی اطلاع کی گئی ضرور بلایا گیا، اور اُن کے جسم ناتواں پر جتنا بھی وہ بار ڈال سکتا تھا، اس کو برداشت کرتے، اور کبھی تکدر کا اظہار نہیں فرماتے،

کراچی یونیورسٹی کے ایک لائق پروفیسر اسلامی تاریخ کے پروفیسر کے تقرر کے سلسلہ میں اُن سے مشورہ کرنے کے لئے تشریف لائے، انھیں ان کی علالت کا علم نہین تھا، ملازم کے ذریعہ انھون نے اطلاع کرائی، فوراً بلا لئے گئے، چچا جان رنج کے ساتھ اس ملک مین علمی فقدان کا ذکر کرنے لگے، اور فرمایا ہمارے پی، ایچ، ڈی زندگی میں صرف ایک مقالہ لکھتے ہین، اور ساری عمر اسی کو چومتے چاٹتے رہتے ہین، حالانکہ پی ایچ ڈی ہونا صرف اس بات کی سند ہے کہ تم تحقیق کر سکتے ہو، محقق نہین ہو، بعد میں مجھ سے پروفیسر صاحب نے فرمایا کہ علالت کا علم نہین تھا، ورنہ کبھی تکلیف نہ دیتا، پھر بھی بیچارے پوری گفتگو کئے بغیر ہی اٹھ گئے، لیکن احساس والے لوگ کم ہی آتے،

ایک مرتبہ راجشاہی یونیورسٹی کے ایک لکچرار صاحب تشریف لائے، مین نے اُن کو ان کی حالت بتادی، کہنے لگے کوئی حرج نہیں، مین بھی علیگ ہون، اس تعلق سے آپ ہی کے پاس تھوڑی دیر بیٹھ جاؤن گا، چنانچہ مجھ سے برادرانہ گفتگو کرتے رہے، اتنے مین چچاجان اندر کے کمرے سے باہر تشریف لے آئے، لکچرار صاحب نے سلام کی، اور انھین کے ساتھ صوفہ پر بیٹھ گئے، مزاج پرسی کے بعد انھون نے وحدۃ الوجود کا مسئلہ چھیڑ دیا، پہلے تو انھون نے معذرت کی کہ مین اپنی صحت سے مجبور ہون، لیکن تھوڑی دیر بعد خود اُن سے نہین رہا گیا، اور تقریباً ایک گھنٹہ تک اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے رہے، لکچرار صاحب الجھتے رہے، اور ان کی تسلی نہین ہو پائی تھی، انھون نے پھر سوال کیا، فرمانے لگے بھائی! بس اب دم نہین ہاں اس سلسلہ مین سعدی کا صرف ایک شعر سن لیجئے،

یکے قطرہ باران ز ابرے چکید — خجل شد چو پہنائے دریا بدید
کہ جائے کہ دریاست من کیستم — گر او ہست حقا کہ من نیستم

اس شعر کو سُن کر لکچرار صاحب جھومنے لگے، کہنے لگے کہ ہزارون مرتبہ اس شعر کو سنا تھا لیکن کبھی اس مطلب کو نہین سمجھا تھا، اب وحدۃ الوجود کے مسئلہ کو سمجھ گیا، آپ سے صرف ایک گذارش ہے کہ کبھی خط وکتابت

کی اجازت دیدیجئے، فرمایا بڑے شوق سے سچ ہے،

نہ کتابون سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا — دین ہوتا ہے بزرگون کی نظر سے پیدا

کچھ دنون کے بعد کراچی کے ایک پروفیسر صاحب تشریف لائے، انھون نے اپنی علمی لیاقت کے متعلق کوئی تحریر چاہی، فرمایا کہ یہ تو ایک قسم کی شہادت ہے، اور شہادت بغیر ذاتی واقفیت کے دیانت کے خلاف ہے، اس کے بعد خاموش ہوگئے، پروفیسر صاحب کے چہرہ پر افسردگی چھاگئی، یہ بھی اُن سے دیکھا نہین گیا، آخر مین اُن سے سوالات شروع کئے، اور وہ جوابات دیتے رہے، اس کے بعد انھون نے پوچھا کہ اس موضوع پر آپنے کون کونسی کتابین پڑھی ہین، ان کا نام بتایئے، جو انھین یاد تھا، بتاتے رہے، اس کے بعد خود عربی، انگریزی، اردو کتابون کا نام لے کر پوچھنا شروع کیا، بیچارے پروفیسر صاحب کو پسینہ آگیا، لیکن انھون نے نہایت صفائی سے جوابات دیئے، جو جانتے تھے اس کو بتایا، جو نہین جانتے تھے اس کا اعتراف کر لیا، اس کے بعد تحریر کا وعدہ فرما لیا، پھر خود اس سوال کا جواب دینے لگے، سوال یہ تھا کہ اسلام کے اندر غیر اسلامی عنصر کہان کہان سے اور کب داخل ہوا، وہ گفتگو کر رہے تھے، ٹھہر ٹھہر کر جیسا کہ ان کا ہمیشہ کا قاعدہ تھا، لیکن تسلسل کا یہ عالم تھا کہ جیسے بند ٹوٹ چکا ہے اور سیلاب تھمتے نہین تھمتا، اسی سلسلہ مین قدیم وجدید فلسفہ، یونانی فلسفہ، اسرائیلیات، سارے عالم کے فلسفہ کی تاریخ کی ارتقاء پر سیر حاصل بحث کرتے رہے کہ کس طرح یونانی (Logos) جس سے (Logio) وغیرہ مشتق ہین، کلمہ، کلام، اور پھر علم کلام کی بنا پڑی، اس دن کی ساری گفتگو بڑی ہی پر از معلومات تھی جو الحمد للہ محفوظ کر لی گئی،

مین بار بار کھانے کے لئے کہہ رہا تھا لیکن ان کی بات ہی نہین ختم ہوتی تھی، یہان تک کہ مین نے ان کو سہارا دے کر اٹھایا، اور دوسرے کمرے مین لے جانے لگا، پھر بھی وہ دو ایک بات بولتے ہی جاتے تھے، سانس تیز ہو چکی تھی، ایسی حالت مین خود سے کھڑے ہونے کی طاقت نہین تھی، ہاتھ میرے کاندھے پر تھا، اور مین

ان کو اپنے سہارے پر کھڑا کئے ہوئے تھا، صرف زبان اور دماغ میں طاقت موجود تھی، جو آخر وقت تک اسلام اور دین کی خدمت میں مصروف رہی،

بنیادی کمیٹی کی سفارشات پر غور کرنے کے لئے اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا، "اسلام ریاستی مذہب ہو" قوم کا مطالبہ تھا، ان کے بیان کا ایک مسودہ اُن کے سامنے پیش کیا گیا، انھوں نے اس کو پڑھا اور رد کر دیا، دوسری مرتبہ جب محترمی راغب احسن صاحب اور مولانا عبد القدوس بہاری تشریف فرما تھے، انھوں نے خود سے اپنے بیان کی اصلاح کی، اور اخبارات کو بھیجنے کی اجازت دی،

اسلام کے ریاستی مذہب کی تائیدی جلسہ کی صدارت کے لئے انھوں نے پیر غلام مجددی سرہندی کو نامزد کیا، یہاں کے تمام علماء میں وہ پیر صاحب کے خلوص اور جوش جہاد کے بہت معترف تھے، اُن کی ذات پر انھیں بہت بھروسہ تھا،

ایک مرتبہ رات کے گیارہ بجے تھے، ابھی ابھی ان کی آنکھ لگی تھی کہ کسی نے دروازہ پر دستک دی، دروازہ کھولا گیا تو دیکھا ایک مولوی صاحب اپنے ساتھی کے ساتھ ایک بیان پر دستخط لینے کے لئے تشریف لائے ہیں، اُن سے کہا گیا کہ ابھی آنکھ لگی ہے، ان حضرات کا اصرار ہوا کہ جگا دیا جائے، اور ان کی شدید علالت اور اس کی نوعیت بتائی گئی تو بڑی مشکل سے واپس تشریف لے گئے، اس ہنگامہ میں اُن کی آنکھ کھل گئی، فرمانے لگے، کہ مجھے صرف یہ بتا دو کہ کون حضرات تشریف لائے تھے؟ اُن کی غرض نہ بتاؤ، جب انھیں نام معلوم ہوا تو ایک دم خاموش ہو گئے، صبح جب ڈان میں اُن حضرات کا بیان دیکھا تو فرمایا کیا اسی لئے آئے تھے؟ دوسرے دن ڈاکٹر عبد الحئی صاحب تشریف لائے، تو اُن سے بڑے دکھ کے ساتھ شکایت کی ———

——— ڈاکٹر صاحب نے ندامت سے اس طرح سر جھکا لیا، جیسے انہی سے یہ غلطی ہوئی ہو،

ہمارے ایک عزیز لوہے کے تاجر ہیں، وہ ان سے ملنے کے لئے آئے، اُن سے تجارت کی حالت پوچھی،

انھوں نے ملک کی اقتصادی بدحالی کا بہت ہی پُر درد منظر کھینچا، وہ اُن کی بات بڑے غور سے سنتے رہے، جب وہ ختم کر چکے تو فرمانے لگے، میں تو پاکستان کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں، مشکلات فرد اور ملت کی آزمائش کیلئے ہوتی ہیں، اور آزمائش ہی فرد اور قوم کو زندہ رکھتی ہے، مشکلات سے گھبرانا نہیں چاہئے، بلکہ مردانہ وار ان کا مقابلہ کرنا چاہئے،

اب انھیں جلد جلد دورہ پڑنے لگا تھا، کرنل شاہ کی رائے ہوئی کہ اُن کو جناح اسپتال میں داخل کر دیں لیکن اسپتال میں داخل کرنے کے لئے گھر کا کوئی فرد تیار نہیں تھا، وہاں کے ماحول اور بے بسی سے اور وحشت ہوتی تھی، آخر کرنل شاہ کی رائے کے مطابق ڈاکٹر عبد الصمد کانپور والے بھی علاج میں شریک کر لئے گئے، کرنل شاہ اور ڈاکٹر عبد الصمد میں مشورہ ہوا، دونوں بالکل متفق تھے، چنانچہ اسی نہج پر علاج ہوتا رہا،

جمعرات یعنی ۱۹؍ نومبر ۱۹۵۳ء کے دن وزیر شام ۴ بجے تشریف لائے، اور انھوں نے ایک مسئلہ چھیڑ دیا، چچا جان نے گفتگو شروع کی، بار بار کلام پاک سے حوالے دیتے جاتے تھے، جب وہ تشریف لائے تھے میں انجکشن کے لئے قیوم صاحب کو لانے جا رہا تھا، میں ان کو لے کر واپس آیا تو وہ محو گفتگو تھے، حاضرین کی اجازت لے کر بستر پر لیٹ گئے، کمزوری اور ضعف کے سبب رگ کی تلاش میں بڑی دقت ہوتی تھی، کبھی کبھی غلط جگہ سوئی چبھ جاتی تھی، تو بڑی تکلیف ہوتی تھی، انتہائی ضبط کے باوجود آہ نکل جاتی تھی، ایک ہاتھ میں ناکامی ہوئی تو دوسرے میں کوشش کی گئی، بارے اس میں کامیابی ہوئی، اس کے بعد وہ اُٹھ بیٹھے، گفتگو کا تار جہاں سے ٹوٹا تھا، وہیں سے شروع کر دیا، کس کو یقین آ سکتا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جو ابھی دو منٹ قبل درد اور تکلیف سے بے چین تھا، میرا دل کڑھ رہا تھا، لیکن زبان سے بول نہیں سکتا تھا، میں قیوم صاحب کو چھوڑ کر جب واپس آیا تو دیکھا کہ گفتگو اب بھی جاری ہے، یہاں تک کہ مغرب کا وقت ہو گیا، وزیر شام نے اسی کمرہ میں نماز پڑھی، اس کے بعد کچھ دیر گفتگو کے بعد وہ رخصت ہوئے، ساری گفتگو عربی میں ہو رہی تھی، میں ان کو گاڑی تک رخصت کرنے گیا، وہ بڑے متحیر اور متاثر تھے،

جمعہ ۲۰ نومبر ۱۹۵۳ء ایک صاحب مجھ سے ملنے آئے، اُن کے ساتھ ایک اور صوفی منش بزرگ تھے، ان سے یہ طے تھا کہ ہم لوگ ماہر القادری صاحب کو دیکھنے جائیں گے، چنانچہ ان دونوں کو ملاقات کے کمرے میں بٹھایا، اور خود کپڑا بدلنے چلا گیا، اور فوراً واپس آ گیا، چچا جان اسی کمرے میں محوِ خواب تھے، ان صاحب نے مجھ سے روایت بیان کی کہ صوفی صاحب کہہ رہے تھے، عاصم صاحب جلد واپس آ گئے، سید صاحب پر انوار کی ایسی بارش ہو رہی تھی کہ اٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا،

ایک دن مجھ سے سوال کیا کہ تمھارے والد کا کس عمر میں انتقال ہوا، میں نے عرض کیا کہ رحلت کے وقت اُن کی عمر باسٹھ برس کی تھی، پھر پوچھا اور بڑے بھائی (حکیم سید ابو حبیب صاحب) کی عمر کیا تھی،

ان کی عمر تریسٹھ برس تھی،

پھر کہنے لگے کہ میں نے تو خاندان میں سب سے زیادہ عمر پائی،

میں اُن کا مطلب سمجھ گیا، اسی لئے عرض کیا، لیکن بڑے دادا (یعنی ان کے والد سید ابو الحسن صاحب) کی عمر تو ۷۰ برس کی تھی، وہ مسکرا کر خاموش ہو گئے، لیکن میں اس گفتگو سے سہم گیا، پھر اپنا وہم سمجھ کر اس کو ٹال گیا،

ایک دن حکیم نصیر الدین صاحب ندوی تشریف لائے، انھوں نے حسب عادت بڑے حوصلہ افزا الفاظ کہے،

قلب کی حالت بہت اچھی ہے، الحمد للہ نبض بھی متوازن ہے، چہرہ بھی شگفتہ ہے، ماشاء اللہ بہت اچھی حالت ہے،

وہ اُن کی باتیں سنتے رہے، اور مسکراتے رہے، صرف یہ شعر پڑھ دیا،

اُن کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

ایک مرتبہ شعیب قریشی صاحب کا لڑکا عمر جو سلمان کا ہم عمر اور مخلص دوست ہے، ان سے ملنے آیا، اس کو اپنے پاس بلایا، اور ہنس کر فرمایا، تم تو محمد علی کی جوانی کی ہو بہو تصویر ہو،

آخری دنوں میں اپنے گذرے ہوئے بزرگوں اور عزیزوں کی یاد بہت آنے لگی تھی، ہم لوگوں کو اپنے قریب بلاتے، سب لوگ اُن کے پلنگ کے پاس فرش پر بیٹھ جاتے، وہ اُن روحوں کو عجیب انداز سے یاد کرتے، کبھی اُن کے خلوص و محبت کو یاد کر کے بے چین ہو جاتے، کبھی اُن سے متعلق گذرے ہوئے واقعات اُن کو تڑپا دیتے، اُن کی آنکھوں میں اکثر محبت کے آنسو چھلکتے دیکھے، دور کے عزیزوں میں سے بھی کوئی ملنے آ جاتا، تو سب سے پہلے اُس سے اپنا رشتہ بتاتے، پھر خاندانی تعلقات و روابط کے قصے اتنا مزہ لے لیکر بیان کرتے کہ سننے والے کی آنکھوں کے سامنے ان بیتے ہوئے دنوں کا نقشہ پھر جاتا، اور اپنے پچھلے بزرگوں کی محبت اور عظمت دل میں جاگزیں ہو جاتی،

جمعہ ۲۰ نومبر ۱۹۵۳ء کو اصرار سے غسل کیا، اور مل مل کر بدن کو صاف کراتے رہے، غرض بڑی مکمل صفائی ستھرائی کرائی،

ہفتہ کا دن سکون سے گذر گیا، پچھلے پہر رات کو یک بیک میری آنکھ کھل گئی، کان میں بڑی درد بھری ایک آواز آئی، غور سے سنا تو چچا جان بڑے درد و کرب سے یہ شعر پڑھ رہے تھے،

موت کا ایک دن معیّن ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

میں مضطرب ہو گیا، اتنے میں والدہ نے آواز دی، میں تڑپ کر بستر سے کودا اور اُن کے کمرے کی طرف گیا، دیکھا کہ تنفس کا زور ہے، چہرہ درد و کرب کا آئینہ دار ہے، لیکن مجھے دیکھکر مسکرا دیئے میں نے کہا میں ابھی ڈاکٹر کے پاس جاتا ہوں، کہنے لگے ابھی نہ جاؤ، ڈاکٹر صاحب سو رہے ہوں گے، اُن کو تکلیف ہوگی، میں اب کچھ بہتر ہوں، نماز فجر کے بعد جانا،

میں نے والدہ سے کہا مجھے پہلے کیوں نہیں اٹھا دیا ؟ انھوں نے فرمایا، وہ تو اب بھی مجھے روک رہے تھے،

رات کی تاریکی دور ہو چکی تھی، سپیدۂ سحر نمودار ہو چکا تھا، ہوا تیز تھی، ٹھنڈک خاصی تھی، فضا میں

ایک عجیب اداسی محسوس ہو رہی تھی،

آج اتوار کا دن شروع ہو چکا تھا میں نے فجر کی نماز پڑھی، بارگاہ والٰہی میں اُن کی صحت عاجلہ و کاملہ کے لئے دعا مانگی، ڈرائیور کو بیدار کیا، اور ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا، ان کا پھاٹک کھل چکا تھا، لیکن کسی آدمی کا پتہ نہ تھا، میں ہر طرف دیوانوں کی طرح بھٹکتا رہا تھا، اتنے میں ایک ملازم آیا، اُس نے کہا ڈاکٹر صاحب نماز فجر کے بعد سو گئے ہیں،

میں نے کہا ڈاکٹر صاحب کو اٹھادو، لیکن وہ چلا گیا،

تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر صاحب کے لڑکے نے مجھے دیکھا،

میں نے اُن سے حال بیان کیا،

انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو باہر بھیجا،

ڈاکٹر صاحب نے کہا آپ جائیے میں ابھی آتا ہوں، جب میں لوٹ کر آیا، تو ان کو پہلے سے بہتر دیکھا، انھوں نے از خود کہا کہ مجھے دوا کی ایک ٹکیہ اور دیدو، چنانچہ دیدی گئی، اتنے میں ڈاکٹر صاحب آگئے، انھوں نے کہا اچھا کیا کہ ٹکیہ کھالی، پھر پوچھا کہ دل میں درد تو نہیں؟ فرمایا "الحمد للہ ذرہ برابر نہیں ہے"،

ڈاکٹر صاحب: پھر کوئی بات نہیں ہے،

ڈاکٹر صاحب سے سوال کیا، ڈاکٹر صاحب! یہ مرض اچھا بھی ہو جاتا ہے؟

ڈاکٹر صاحب کیوں نہیں، آپ اچھے ہو جائیں گے،

پھر فرمایا میرے خیال میں کوشش بیکار ہے،

ڈاکٹر صاحب: ایسی مایوسی کی بات نہیں ہے،

میں ڈاکٹر صاحب کو لے کر باہر آیا، اُن سے پوچھا کیا حال ہے؟ کہنے لگے حملہ ہو گیا تھا، کمزور جسم ہے، میں نے پوچھا کوئی تشویش کی بات تو نہیں؟ کہنے لگے کوئی بات نہیں ہے، آج پھر انجکشن لگوا دیجئے گا، وہ

چلے گئے، میں واپس آگیا، اس کے بعد ہم لوگوں کے ساتھ مل کر انھوں نے ناشتہ کیا، دو توس جیلی لگے ہوئے اور ایک نیم برشت انڈا کھایا،

تھوڑی دیر بعد سفیر حجاز آگئے، میں نے کہا کہ اسی کمرے میں بلا لیجئے، کہنے لگے نہیں مجھے ملاقات کے کمرہ میں لے چلو، میں نے ان کو سہارا دیا، اور اس کمرہ میں پہنچا دیا، وہاں بھی بستر لگا رہتا تھا، اس پر لیٹ گئے، خطیب صاحب بستر کے قریب ہی بیٹھ گئے، اُن سے بھی اسی طرح گفتگو کرتے رہے، جیسے ابھی دورہ پڑا ہی نہ تھا، گیارہ بجے کے قریب میں انجکشن کے لئے قیوم صاحب کو لانے گیا، حالت اتنی بہتر ہو چکی تھی کہ انھوں نے کہا کہ اگر میں ایک گھنٹہ کے بعد آؤں تو کوئی حرج تو نہیں میں نے کہا کوئی ہرج نہیں، چنانچہ وہ ایک بجے آئے، اور انجکشن لگا کر چلے گئے، ہم لوگ کھانے سے فارغ ہو کر اُن کے پلنگ کے پاس بیٹھ گئے، اس دن انھوں نے کھیر کی فرمائش کی تھی، تھوڑی سی کھائی باقی رکھوا دی کہ بعد میں کھاؤں گا، شاید دو بجے ہوں، عادل میاں پینٹ وغیرہ پہن کر آئے اور نانا کے پاس بڑی شان سے السلام علیکم مولانا صاحب کہکر کھڑے ہو گئے، اور کہنے لگے ابا ہم صاحب بن گئے ہیں، انھوں نے کہا تم صاحب ہو گئے مولوی نہیں ہو گے، انھوں نے اسی بے تکلفی سے فرمایا، نہیں ہم صاحب نہیں گے "متبسم ہو کر بولے تو پھر ہم تم سے رنج ہو جائینگے"، عادل میاں نے فوراً جواب دیا، اچھا تو نہیں بنیں گے، اس پر وہ ہنسنے لگے، اور عادل میاں پینٹ میں ہاتھ دیکر اٹھلاتے ہوئے چلے گئے، اور وہ اس کو محبت بھری نگاہ سے دور تک دیکھتے رہے،

اب اتفاق سے میں تنہا رہ گیا، مجھ سے مخاطب ہوئے، اور بہت ہی سنجیدہ ہو کر کہا عاصم میاں!

میں نے کہا جی!

آپ کو والد صاحب کی خدمت کا موقع نہیں ملا،

میں نے کہا جی نہیں،

پھر فرمایا تمہیں والدہ کی خدمت کا بھی موقع نہیں ملا، میں نے عرض کیا جی نہیں"

پھر تھوڑی دیر توقف فرمایا، اور مجھے عجیب نظروں سے دیکھتے رہے، مین ان کا مفہوم مطلق نہ سمجھ سکا، انکی باتون مین عجیب بات نظر آئی، مین اس کو بیان نہین کرسکتا ہون، شاید آنکھیں پرنم تھین، بڑے ہی درد مین ڈوبی ہوئی دھیمی آواز مین فرمایا لیکن اس مرتبہ تمھیں موقع مل گیا،

مین بیٹھا تھا، اور بے اختیار زبان سے نکلا "میرے باپ! مین نے تو آپ کی کوئی خدمت نہین کی" وہ صرف مسکرا دیئے، اور مجھے دیکھتے رہے، میرا دل بھرآیا، اور مین وہان سے اٹھکر اپنے کمرہ مین چلا آیا، والد مرحوم کی یاد نے تڑپا دیا، اپنی کم فہمی پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے کہ مین بالکل نہین سمجھا کہ یہ الوداعی فقرے تھے ورنہ قدمون سے آنکھیں ملتا، اور پیر پکڑ کر کہتا کہ مجھے بے سہارا چھوڑ کر نہ جایئے،

کوئی چار بجے کے قریب والدہ سے مخاطب ہوے، اور کہنے لگے کہ آپ عاصم کے ساتھ مطمئن ہین،

وہ کہنے لگین کہ یہ کوئی سوال ہے، ——— ؟

فرمایا میرے سوال کا جواب دیجئے، فضول باتون مین مت الجھایئے،

والدہ نے ان کے سوال کا جواب دیا، "بے شک"

پھر فرمایا الحمد للہ میرا قلب بھی بہت مطمئن ہے،

والدہ نے میرے پاس آکر اُن کے فقرون کو دہرایا،

مین نے اُن کی تسلی کر دی،

لیکن خود اپنا دل کسی نامعلوم خوف سے دھڑکنے لگا،

مجھ پر ایک عجیب اضطراب کی کیفیت تھی، کچھ سمجھ مین نہین آتا تھا، لیکن عجیب سناٹا سا معلوم ہوتا تھا، جیسی اداسی تھی وہ بیان سے باہر ہے میں اٹھا پھر اُن کے کمرہ مین گیا، دیکھا کہ سلمان وضو کرا رہے ہین، یہ خدمت اُن کی سب سے چھوٹی لڑکی کے لئے مخصوص تھی، ہمیشہ وہی وضو کرایا کرتی تھی، عصر کی نماز پڑھی اور وہ کھانے کے وقت کی بچی ہوئی کھیر سنگاکر نوش کی، پھر سلمان نے پان دیا، ان کا معمول تھا کہ ہر دو کھانے، ناشتہ

اور شام کی چائے کے بعد وہ گلوری پان کھاتے تھے، اور اقتدار خان مقتدر خان کا الائچی دانہ تمباکو نوش فرماتے تھے، اس مرتبہ پان کھانے کے بعد وہ مل نہین رہا تھا، مین نے تلاش کر کے ان کو دیا، جب مین نے تمباکو دیا، تو انھون نے مجھے بڑی عجیب نظر سے دیکھا، اور جب تک کھڑا رہا، دیکھتے رہے، مین ان کا مفہوم کچھ بھی نہین سمجھا، اب سمجھتا ہون کہ شاید وہ حسرت بھری نگاہ تھی، رخصتی کا پیام تھا، فرقت کا پیغام تھا، آہ مجھ کو کیا خبر تھی،

کیا خبر تھی انقلاب آسمان ہو جائیگا   باپ کا ملنا نصیب دشمنان[1] ہو جائیگا

ساڑھے پانچ بجے مشتاق جوہری ملنے آئے، وہ بھی چچا جان سے خصوصی محبت کرتے ہین، اُن سے وہ بیان کرتے رہے کہ رات پھر تنفس کا دورہ پڑ گیا تھا، اب اچھا ہون، اس کے بعد مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا، سلمان نے نماز پڑھوائی، بیٹھے بیٹھے نماز ادا کی، جب نماز سے فارغ ہوے تو مسکرائے سلمان نے پوچھا کیا بات ہے ؟

فرمایا آج مین نے شوکت علی کی نماز پڑھی

سلمان نے پوچھا کیا مطلب ؟

فرمایا وہ اسی صورت سے نماز پڑھتے تھے،

اس کے بعد سلمان نے کہا ابا سو جایئے آپ رات کو بھی نہین سوے ہین، انھون نے فرمایا بہت اچھا، اس کے بعد وہ بستر پر لیٹ گئے، اور روشنی بجھا دی، اسکے بعد سلمان دبے پاؤن آگے اور اُن کے سر سے ٹوپی اُتارنے لگے، انھون نے پوچھا کون ؟ سلمان نے کہا کوئی نہین، اور پھر وہ سو گئے،

مین نے باہر صحن مین مشتاق صاحب کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھی، نماز کے بعد امی جانی پر مشتاق صاحب سے باتین کرنے لگا، اتنے مین تھوڑی دیر بعد غلام محمد صاحب آ ئے اب تاریکی کچھ بڑھ چلی تھی، وہ بھی

---

[1] یہ شعر اسی ترمیم کے ساتھ میری اہلیہ کی زبان سے بے ساختہ "نکلا" ، "ہم"

وہیں چٹائی پر بیٹھ گئے، اور خیریت پوچھی، اُن کو حال بتاتا رہا، اتنے میں سلمان نے روشنی جلائی، اور پکارا دیکھئے نو دیکھئے تو، ہم لوگ دوڑ پڑے، دیکھا کہ وہ مٹھی بھینچ رہے ہیں، اور گہری سانس لے رہے ہیں، فوراً ڈاکٹر عبدالصمد صاحب کو ٹیلیفون کیا، انھوں نے فرمایا، ابھی میرے پاس دو بجے ہیں، ہم لوگوں نے سمجھا کہ شاید وہ اس وقت نہ آسکیں گے، میں دوڑا کہ کسی دوسرے کو لاؤں مگر گاڑی باہر گئی ہوئی تھی، پیدل ہی بھاگا، تھوڑی دور جاکر ٹیکسی لی، اور مارٹن ہسپتال کے ڈاکٹر فاروقی کے پاس گیا، معلوم ہوا کہ وہ گھر پر نہیں ہیں، اب وہاں سے پیر الٰہی بخش کالونی گیا، ایک ڈاکٹر صاحب سے حال بیان کیا، انھوں نے کہا یہ تو میرے مطب کا وقت ہے، میں نہیں جاسکتا، پھر پوچھا معالج کون ہیں، میں نے کرنل شاہ اور عبدالصمد کا نام بتایا، وہ کہنے لگے کہ ایسے ایسے ڈاکٹروں کے بعد میں کیا علاج کروں گا، میں نے کہا ڈاکٹر صاحب میں آپ کو علاج کے لئے کہاں کہہ رہا ہوں، میں تو صرف اس لئے آپ کو لیجانا چاہتا ہوں کہ آپ دیکھ کر مجھے یہ بتلا سکیں کہ انکی حالت کیسی ہے، کہنے لگے کوئی بات نہیں نیند آگئی ہوگی، میں نے کہا ازراہ کرم یہی بات وہاں دیکھ کر کہہ دیجئے گا، چنانچہ وہ راضی ہوگئے،

نہ معلوم کیوں یک بیک دل کا سارا اضطراب، ساری بیقراری، ساری تڑپ، ساری دھڑکن ختم ہوگئی، جیسے سکون ہوگیا، دل نے کہا شاید اب بہتر حالت ہے، شاید اب وہ خطرہ سے باہر ہیں، شاید میں اُن کو دیکھ سکوں گا، اُن سے باتیں کرسکوں گا، ان کی نورانی صورت سے اپنے قلب کو منور کرسکوں گا، اُن کی اس غفلت کی نیند پر اپنی پریشانی کا اظہار کروں گا، وہ مسکرا کر فرمائیں گے آپ کیا سمجھے تھے میں چل بسا، میں کہوں گا میں قربان ایسا کیوں ہونے لگا، تھوڑی دیر تک اسی کا چرچا رہے گا، ٹیکسی اپنی پوری رفتار کے ساتھ گھر کی طرف لوٹ رہی تھی، میرے خیالات کی رَو اس سے بھی زیادہ تیز تھی،

آہ! جب گھر پہنچا کیسی خاموشی تھی، موت کی خاموشی، تاریکی بھیانک تاریکی، دل بیٹھنے لگا، تیز تیز قدم، کھلا ہوا دروازہ، پہنچا، دیکھا غلام محمد صاحب اور مشتاق صاحب زمین پر پھیلے ہوئے بیٹھے ہیں،

میں نے ان سے لرزتے ہوئے پوچھا "خیریت!" —— انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا، صرف گردن ہلادی، ان کا اترا ہوا چہرہ اور بہتی ہوئی آنکھیں سب کچھ بتلا چکی تھیں، کمرہ کے اندر قدم رکھا، دیکھا کہ اُسی شان سے لیٹے ہوئے ہیں، اور چادر اوڑھا دی گئی ہے، عجیب قیامت کا منظر تھا، گھر کے سارے افراد اس شمع کے چاروں طرف پروانوں کی طرح کھڑے ہیں، سب کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہے، والدہ، اُف چوڑی ندارد، چہرہ سفید، آنکھیں جل تھل لیکن ضبط و صبر کی کوہ پیکر، بنی کھڑی ہیں، مجھے دیکھتے ہی لپٹ گئیں، اور کہا بیٹا ضبط و صبر کا مقام ہے، میں نے کہا اماں میں ڈاکٹر کو لاتا ہوں۔

ہاں میرے لال تم ڈاکٹر کو لاتے ہو، لیکن وہ ڈاکٹر سے بے نیاز ہوچکے،

میرا سر چکرا گیا، معلوم ہوا جیسے دل کی دھڑکن بند ہوجائے گی، حلق خشک ہوگیا، والدہ نے مجھے اپنے کلیجہ سے لگالیا، اور میرا سر اپنے شانے پر رکھ لیا، وہ میری پیٹھ پر تھپکی دیتی رہیں اور زبان سے یہی کہتی رہیں، صبر، صبر، شمیمہ کو پکار کر مفرح منگوایا، اور مجھے دیا، پھر پانی پیتا رہا، ایک بیک کچھ خیال آیا، میں ہوش میں آگیا، ڈاکٹر صاحب باہر کھڑے تھے، اُن کو دکھلا دوں، شاید ان لوگوں کا خیال غلط ہو، بس میں تیر کی طرح باہر گیا، اور ڈاکٹر کو لے آیا، والدہ کہتی رہیں کہ ابھی ڈاکٹر عبدالصمد آچکے ہیں، اور اعلان کرچکے لیکن دل نہیں مانا، ڈاکٹر صاحب نے دیکھا (آہ! کتنا شاہانہ سکوت، کتنی پروقار نیند تھی، ابدی نیند، ہائے انھوں نے بھی دوسرا فیصلہ نہیں سنایا، ان کو رخصت کیا ہی تھا کہ سلمان ڈاکٹر رحمان کو لیکر آئے اور آتے ہی چادر الٹ دی —— اور اُن کی داڑھی چھوکر بے تابانہ پکارنے لگا، ابا —— ابا —— میرے ابا —— بولئے!

ڈاکٹر رحمان نے بھی دیکھا اور کھڑے ہوگئے، سلمان کے سر پر ہاتھ پھیرا، اور کہا، صبر کرو صبر اور رخصت ہوگئے،

مجھ پر اب سکتہ کا سا عالم تھا، کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا ہوا اور کیا ہو رہا ہے، میں بُت بنا کھڑا تھا، سلمان بہت بے قرار ہو رہا تھا، والدہ سلمان کو پکڑ کر لائیں، اور مجھ سے لپٹا دیا، میں نے اس کو سینہ سے چپٹا لیا،

میرے پاس الفاظ نہیں تھے جس سے میں اُن کو تسکین دیتا، شاید دل کی بات دل تک پہنچ رہی ہو،

میں سلمان سے علیحدہ ہوا اور صوفہ پر گر پڑا، والدہ نے مجھے پھر مفرح دیا، اور کہا بیٹا تم اپنے آپ کو سنبھالو دل کو مضبوط کرو، تم پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے، سب کام تم ہی کو انجام دینا ہے،

اب میں نے دل کی قوت کو مجتمع کرنا شروع کیا، مجھے ہوش آچکا تھا، اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

— ریڈیو پاکستان کا ٹیلیفون تھا، انھوں نے پوچھا کہ میں نے بہت ہی افسوسناک خبر سنی، کیا وہ سچ ہے،

ہاں! آپ نے جو کچھ سنا سب سچ ہے،

سب بچیاں، سلمان، — والدہ پلنگ کے چاروں طرف کلام پاک لے کر بیٹھ گئے، اور تلاوت شروع کر دی، ریڈیو سے اعلان کے فوراً ہی بعد لوگوں کا تانتا شروع ہو گیا،

زہرہ آپا، مولانا محمد علی کی صاحبزادی، شوکت علی کی بہو، زاہد علی صاحب کی بیگم، روتی ہوئی آئیں، اور کہنے لگیں، للہ میرے چچا کو مجھے دکھا دو، پھر بیگم وسیم، گلنار آپا، (بیگم شعیب قریشی) تشریف لائیں،

باہر لوگوں نے تجہیز و تکفین کے متعلق سوالات شروع کر دیئے، ان مسائل پر راہ میں نے کب سوچا تھا، کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا، اتنے میں شعیب قریشی کے داماد ڈاکٹر عابد نے کہا، آپ متردد نہ ہوں، جہاں ماموں یعنی عبدالرحمن صدیقی کا مزار ہے، وہیں انتظام کر دیں گے، مجھے کچھ تجربہ ہے، اور لوگوں کی رائے ہوئی، کہ جہاں مولانا شبیر احمد صاحب مدفون ہیں وہاں انتظام کیا جائے، اس لیے سب سے پہلے میں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو ٹیلیفون کیا، اور اس جگہ دفن کرنے کی اجازت مانگی، انھوں نے کہا مجھے یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ مولانا عثمانی کہاں مدفون ہیں، میں نے اُن کو بتایا کہ میونسپلٹی کی زمین ہے اور آپ اجازت دے سکتے ہیں، میرے دماغ میں تھا کہ نقوی صاحب چیف کمشنر کی قائمقامی کر رہے ہیں، انھوں نے کہا آپ ان لوگوں سے ملئے جنھوں نے مولانا عثمانی کی تدفین کا انتظام کیا تھا،

مجھے فوراً مولانا عبدالقدوس بہاری کا خیال آیا چنانچہ ان کو ٹیلیفون کیا، ان کو کوئی پتہ نہیں تھا،

بیچارے ڈاکٹر عابد نے کہا کہ میرے ساتھ چلیے میں انہی کے موٹر پر مولانا عبدالقدوس بہاری اور دوسرے لوگوں کے یہاں سے ناکام ہو کر شعیب صاحب کے مکان پر پہنچا، اور وہاں سے ٹیلیفون کے ذریعہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے مکان کا پتہ چلایا، اور اُن کی تلاش میں نکلا، کچھ دیر تک بھٹکتا رہا، بالآخر یہ معلوم ہوا کہ کلکٹر صاحب نے میونسپل کمشنر مسٹر ہوراڈنٹ سے اجازت مانگی، انھوں نے فرمایا کہ میرا ارادہ اس زمین کو قبرستان بنانے کا نہیں، اس لیے نہیں مل سکتی،

اب میں اور عابد سیدھے اس قبرستان پہنچے، جہاں عبدالرحمن صدیقی سوئے ہوئے ہیں، اور انہی کے قریب مسجد کے دامن میں قبر کھودنے کا حکم دے کر گھر لوٹے یہاں معلوم ہوا کہ مولانا نذیرالدین خان نے نقوی صاحب چیف کمشنر کو ٹیلیفون کیا تھا انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ انشاء اللہ صبح تک انتظام ہو جائے گا اس کے بعد طے پایا کہ کل ساڑھے آٹھ بجے اس عاشق رسول کا جنازہ اُٹھے گا، دس بجے کے قریب شعیب صاحب کا اندرون سندھ سے ٹیلیفون پہنچا، کہ میں نماز جنازہ میں شرکت کی غرض سے صبح آؤنگا، لیکن راستہ میں اُن کی گاڑی خراب ہو گئی، اس لئے نماز جنازہ میں شریک نہ ہو سکے،

اب اخبارات اور خبر رساں ایجنسیوں کے مسلسل ٹیلیفون آنے شروع ہوئے، کہیں سے جنازہ کے متعلق استفسار کہیں تدفین کے متعلق بعض اُن کے سوانح حیات جاننے اور چھاپنے کے لیے چیں، اور اس پر لوگوں کا ہجوم بس قیامت صغریٰ کا منظر تھا، اپنی بے بسی اور بیچارگی کو کیا کہوں کہ اتنی بھی فرصت نہیں ملتی تھی کہ کہیں چھپ کر رو ہی لوں، دوڑتے دوڑتے پیر جواب دے گئے تھے، ایک بجے تک لوگ جمع رہے،

رات بھر دعائیں اور قرآن خوانی، اگر عود اور لوبان نے کیا سماں کھینچا تھا، اس کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے، جس کے گھر کا سب سے بیش قیمت سرمایہ اس کی آنکھوں کے سامنے اس سے چھن گیا ہو، جب کبھی فرصت ملتی میں اُن کے قریب جاتا، اور اُن کی پیشانی کو بوسہ دیتا، اُن کے جسم کو غور سے دیکھتا کہ کیونکر یقین کرنے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا، بس یہی خیال ہوتا اب اٹھیں گے، اب بولیں گے، اب عنا

کی نماز کے لئے پکارین گے، اب وضو کے لئے بلائین گے، رات ڈھلتی جا رہی تھی، سناٹا بڑھتا ہی جا رہا تھا، اب ان کے تہجد کا وقت آگیا، لیکن وہ تہجد مین ناغہ کرین گے، انھون نے تہجد کبھی ناغہ نہین کی ہے، اب وقت پر تہجد کی نماز کے لئے گھنٹی بجے گی، اب اُن کے جسم کو حرکت ہوگی، لیکن آہ کچھ بھی نہین ہوا،

اُف صبح ہوگئی، رخصت کی صبح، دائمی فرقت کی صبح، وداع کی صبح، آہ وہ صبح جس مین کوئی پیغام حیات نہین، بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری فضا نے کفن اوڑھ لیا ہے،

۱۱ ! ہم اس جسم اطہر کو اٹھا کر بیچ کے کمرے مین لائے، قینچی سے کاٹ کاٹ کر سارے کپڑے علحدہ کئے، بے اختیار جی یہی چاہتا تھا کہ بس لپٹ جاؤن اور کہون،

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملین گے کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

سب لوگون نے مل کر تخت پر لٹایا، آہ سارا جسم کتنا نرم تھا، جس طرف موڑا جاتا تھا، مڑ جاتا تھا، چہرے پر وہی سنجیدگی، وہی وقار، وہی متانت، وہی تبسم، اب تک جو تھا، مین نے پھر پیشانی کو چوم لیا، ڈاکٹر عبدالغنی صاحب نے شہادت کی انگلی چوم لی، اور لرزتی ہوئی آواز مین کہا کتنی مبارک ہین یہ انگلیان، جو سرور کائنات ﷺ کی سیرت نگاری مین زندگی بھر مصروف رہین، اللہ، میں — اور — شمون نامون پانی ڈال رہے تھے، صوفی جی کپڑے سے طہارت کر رہے تھے، ڈاکٹر بتا رہے تھے، سلمان بُت بنا کھڑا تھا، کبھی پانی ڈالتا، اور کبھی قریب آکر غور سے دیکھتا رہتا،

آخر آٹھ بجے رخصت کا لباس پہنایا گیا، داڑھی مین عطر لگایا گیا، کافور چھڑکا گیا، اور پلنگ پر لٹا دیا گیا،

دوسرے کمرے مین سفیر مصر، سفیر حجاز، ڈاکٹر محمود حسین، سابق وزیر تعلیم، اور بہت سے لوگ تھے، وہ بلائے گئے، انھون نے آخری زیارت کی، اور پھر کمرہ بند کر دیا گیا، اور عورتون کو بلا لیا گیا،

باہر ہر طرف کمپونڈ مین ہزارون کی تعداد مین لوگ جمع تھے، ہر طرف دری بچھا دی گئی تھی، سب

کلام پاک لے قرآن خوانی مین مصروف تھے،

ساڑھے آٹھ بجے گھر سے جنازہ نکلا، ٹرک پر رکھا گیا، دو بڑے بڑے بانس دونون طرف لگا دیے گئے، تاکہ ہزارون آدمی کاندھا دے سکین، لوگون نے پھول سے اُسے ڈھک دیا، اُس کے بعد جنازہ ایک جلوس کی شکل مین گھر سے رخصت ہوا، سفیر مصر نے کہا کہ آپ مسجد مین نماز کے لئے چلے جائین لیکن انھون نے کہا مجھے اس سعادت سے کیون محروم کرنا چاہتے ہین، ہر شخص کاندھا دینے مین ایک دوسرے سے سبقت کرنا چاہتا تھا،

۱۱ ! ان کے جنازہ کا منظر بھولتا ہی نہین، امیر غریب، فقیر، سفیر، سب اس طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے، جیسے اُن کا باپ اُن کا بھائی، اُن کا سب کچھ آج رخصت ہو رہا ہے، جس راستہ سے یہ جلوس گذرتا تھا، مکانون کی چھتون پر سے عورتون کی آہ و بکا کی آوازین آتی تھین، ممالک اسلامیہ کی سفراء آگے بڑھ کر کاندھا دے رہے تھے، اُن کی آنکھین نمناک اور لب کانپ رہے تھے، جیسے اُن کا عزیز ترین محبوب اُن سے چھن گیا ہو، یون تو اُن کی محبوبیت کے بہت سے واقعات دیکھے لیکن اس دن اندازہ ہوا کہ ہر خاص و عام کے قلوب مین ان کی کتنی جگہ تھی،

سفیر حجاز خطیب صاحب جنازہ کے آگے ایک طرف مجھے اور دوسری طرف سلمان کو اپنی طرف لئے ہوئے تھے،

پوری سڑک طے کرنے کے بعد نیو ٹاؤن مسجد جہان ایک مرتبہ انھون نے بقرعید کی نماز پڑھائی تھی اور ایک دو جمعہ بھی پڑھائے تھے، وہ ابھی زیر تعمیر مسجد ہے، اس کی تعمیر کا سامان پھیلا ہوا تھا، اس کے وسیع احاطہ مین مسجد کے محرابی در کے سامنے جنازہ رکھا گیا، اور ڈاکٹر عبدالحئی صاحب نے نماز پڑھائی،

۱۱ ! آفسوس کسی کا گھر لُٹ گیا، اور کوئی اپنی شہرت کے لئے اس کو بھی وسیلہ بنانا چاہتا تھا، اسی لئے ڈاکٹر صاحب کا انتخاب کیا گیا، ان سے خاص موافقت تھی، نماز کے بعد زیارت کے لئے لوگون کا اصرار ہوا، اس لئے لوگون کا ہجوم ہوا، پھر زائرین اور مشتاقین کی ایک قطار بنا دی گئی، جو یکے بعد دیگرے سامنے سے آتے، چہرۂ انور کو

ایک نظر دیکھ کر گذر جاتے تھے ہر شخص آتا اور ایک نظر دیکھتا یا پھر شاید دیکھ بھی نہیں پاتا، اور صرف محبت اور عقیدت کے آنسو ان کی بارگاہ میں پیش کر کے چلا جاتا، ایک انجینیر صاحب چیخ چیخ کر پکار رہے تھے زیارت کرتے جائیے آگے چلتے جائیے،

قطار کسی صورت سے ختم ہی نہیں ہو پاتی تھی، اُن کا چہرۂ انور نور سے معمور تھا، ایک طرف آفتاب کی روشنی اُن پر ——— پڑ رہی تھی دوسری طرف خود اس آفتاب کی تابانی لوگوں کی نگاہوں کو خیرہ کئے ہوئے تھی

کتنا شاہانہ سکون کتنا درویشانہ جلال، اور کتنا روحانی وقار تھا، سلمان اور میں اُن کے سرہانے کھڑا اس منظر کو دیکھ رہا تھا، دھوپ سے بچانے کے لئے چادر کا ایک کونہ پکڑے ہوئے تھا، تین طرف سے اور لوگ گھیرے ہوئے تھے، اس منظر کو دیکھ کر کلیجہ پھٹا جا رہا تھا، خیالات و جذبات کا سیلاب امنڈا آ رہا تھا، آنسو تھے کہ تھمتے نہ تھے کلیجہ تھا کہ بیٹھا جاتا تھا لیکن نگاہیں تھیں، کہ اُن کے چہرۂ انور پر مرکوز تھیں کہ

جی بھر کے دیکھ لیں یہ جمال جہاں فروز پھر یہ جمال نور تو دیکھا نہ جائیگا

کبھی جی چاہتا کہ چیخ چیخ کر روؤں اور سینوں کے بند شکووں کے در کھول دوں،

اے عم محترم! آج کیوں نہیں بولتے، دیکھئے آج کتنے آپکے مشتاقان دید جمع ہیں، آپ نے کسی کو کبھی مایوس نہیں لوٹایا، آپکی نصیحت سننے کے لئے لا متناہی سلسلہ کلمہ گویوں کا ٹوٹا پڑ رہا ہے، یہ تو وہی ہیں جن کے لئے آپنے اپنے چین کو چین نہیں سمجھا، اپنی راحت کو راحت نہیں سمجھا، یہ کسی خوشی سے نہیں آئے ہیں یہ آپکے محبت اور خلوص سے کھنچے آئے ہیں، انجینیر صاحب کی آواز کانوں میں ہتھوڑے کی طرح سے پڑ رہی تھی،

حکیم صاحب وائس چانسلر آئے، آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں، اور وہ گذر گئے، سابق وزیر یوسف ہارون، سابق وزیروں میں سے سب سے ذیادہ منظم ان دنوں پنجاب میں علیل تھے، اُن کا نمائندہ اور گورنر جنرل کا نمائندہ شریک تھا، خواجہ ناظم الدین باہر تھے،

یہاں سے جنازہ اٹھا اور کئی فرلانگ کی مسافت طے کر کے اٹھارہ ہزار مربع گز زمین کا وہ وسیع رقبہ

جس کے ایک طرف مولانا شبیر احمد کا مزار ہے، وہاں پہنچے اُن کے مزار کے سامنے رکھا گیا، اور چونکہ اجازت ملنے میں دیر ہوئی، اس لئے ابھی تک قبر تیار نہ تھی، مولانا عثمانی کے مزار پر جیسکے وفون لگا دیا گیا تھا، شام کو ابو الخیر صاحب نے ایسی تقریر کی، جس نے سب کو رلا دیا،

اُن کی تقریر جذبات خیالات اور معلومات سے لبریز تھی، آخری فقرہ تو ہمیشہ یاد رہیگا، انھوں نے کہا اے سلیمان! تمھارے جانے کا اتنا غم نہیں ہے جتنا اس گنجینۂ علم کا صدمہ جو تمھارے ساتھ دفن ہو رہا ہے!

اس کے بعد قبر تیار ہوئی،

قبر کے اندر ایک طرف غلام محمد صاحب دوسری طرف میں، اور میرے ساتھ صلاح الدین احمد صاحب ندوی اُترے سلمان اوپر والے حصہ میں کھڑے تھے،

آہ اس کے بعد میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنے سب سے قیمتی سرمایہ کو زمین پر لٹایا، آہ جس کی نفاست طبع شکن بستر بھی بے کلی محسوس کرتی تھی آج مٹی کی خوابگاہ میں سو رہا تھا،

چہرہ کھول دیا گیا پھر ڈھک دیا گیا۔

میرے بڑے ابا حکیم سید ابو حبیب صاحب کا نواسہ مصطفیٰ بتیابانہ چیخا،

ارے میرے چھوٹے نانا کو ایک مرتبہ اور دکھلا دو،

جس کو سردی سے گرمی سے ہوا سے لو سے ہمیشہ بچایا جاتا تھا، وہ آج منوں مٹی کے اندر چھپا دیا گیا،

میرے سامنے ہر طرف تاریکی،

ہر طرف اندھیرا،

ہر طرف سناٹا تھا،

اللہ بس باقی ہوس

ٹھہرے تھے کہاں دل، تھمیں گے اشک آہ! مگر، ابھی نہیں،

ہندوپاکستان مین ماتم

"ہندوستان و پاکستان مین اس حادثہ پر جس قدر ماتم کیا گیا، ان دونون ملکون کے اکابر

نے جو بیانات دیے، اور اخبارات و رسائل نے جس قدر لکھا، ان سب کی تفصیل کی گنجائش نہین،

نمونہ چند بیانات اور تحریرون کے مختصر اقتباسات نقل کئے جاتے ہین،" "م"

بیانات

عبدالوہاب عزام سفیر مصر:

"علامہ ندوی جیسے اہل علم کی موت سے نہ صرف پاکستان بلکہ پورے عالم اسلام کو نقصان پہنچا، وہ

قاہرہ کی عرب اکیڈمی کے ممبر بھی تھے جہان وہ عربی کے ایک بہت بڑے عالم کی حیثیت سے بڑی وقعت کی

نظر سے دیکھے جاتے تھے"......

شیخ ابوالخیر سفیر شام:

"ہم کو علامہ سید سلیمان ندوی کی موت سے دکھ ضرور ہے لیکن اس سے کہین زیادہ اس کا دکھ ہے

کہ جو علوم و فنون ان کے سینے مین تھے، وہ بھی اُن کے ساتھ دفن ہوگئے"......

گورنر جنرل پاکستان:

"...مولانا سید سلیمان ندوی کے پایہ کا عالم صرف پاکستان ہی مین نہین بلکہ تمام عالم اسلام مین بھی کوئی نہ تھا"...

خواجہ شہاب الدین گورنر سرحد:

"...علم و فضل کے لحاظ سے تمام عالم اسلام مین اُن کا پایہ بلند تھا، اُن کے انتقال سے عالم اسلام کو

زبردست نقصان پہنچا ہے، مجھکو بھی ذاتی نقصان ہوا، کیونکہ مین نے اُن سے بہت سے فیوض حاصل کئے"

سردار عبدالرشید، وزیر اعلیٰ سرحد:

.....ابھی پاکستان کو مولانا جیسے علم و کردار کے آدمیون کی سخت ضرورت تھی،

سردار عبدالرب نشتر:

....."انھون نے اسلامی تاریخ کی تدوین مین جو گران قدر خدمات انجام دی ہین، انھین ہمیشہ

قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا"

مس فاطمہ جناح:

"سید سلیمان ندوی کی وفات سے قوم ایسے جید اور فاضل عالم سے محروم ہوگئی ہے جس نے اپنی

تمام زندگی اسلام کا پرچم بلند کرنے کے لئے وقف کر رکھی تھی"

ابوصالح محمد اکرام: چیف جسٹس پاکستان و صدر قانون کمیشن:

.....مولانا ندوی قانون کمیشن کے رکن تھے، حکومت پاکستان نے یہ کمیشن ملک کی عدالتون مین

اسلامی قانون جاری کرنے کے سلسلہ مین مقرر کیا تھا، اُن کی موت نے ہمین جو نقصان پہنچایا، وہ اسکی تلافی ناممکن ہے"

چودھری خلیق الزمان:

....وہ نہ صرف ایک ممتاز عالم، بلند پایہ مورخ اور زبردست اہل قلم تھے، بلکہ دلآویز شخصیت کے بھی حامل

تھے، بڑی میٹھی گفتگو کرتے تھے، خلافت اور دوسری اسلامی تحریکون مین انھون نے جو حصہ لیا، وہ فراموش نہین

کیا جا سکتا، سچ یہ ہے جب تک سیرۃ النبی زندہ ہے، وہ بھی زندہ رہین گے،

مولانا قطب میان مرحوم فرنگی محل لکھنؤ:

"مولانا مرحوم کے ان روابط کے پیش نظر جو ہمیشہ سے ہمارے خاندان کے ساتھ قائم ہے، مجھ کو یہ

سانحہ اپنے گھر کا سانحہ نظر آرہا ہے"

مولانا عبد الشکور صاحب لکھنوی:

وہ نہ صرف علم و فضل بلکہ زہد و تقویٰ میں بھی ممتاز درجہ کے مالک تھے"

مولانا محمد سعید مجتہد:

.... علامہ کے انتقال نے سب سے زیادہ نقصان ہند و پاکستان میں عربی ادب کو پہنچایا ہے، موصوف عربی ادب میں بھی ایک ممتاز مقام رکھتے تھے، ہندی الاصل ہونے کے باوجود قدیم اور عصری عربی ادب کے ماہر تھے، اُن کے عربی مضامین کو نام ہٹا کر دیکھا جاتا تو یہ امتیاز کرنا مشکل تھا کہ یہ مقالہ کسی عرب کا ہے یا ہندوستانی کا۔

ڈاکٹر عبد العلی، ناظم ندوۃ العلماء لکھنو

.... تقریباً تیس سال موصوف کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا، یہ مدت جتنی ہی بڑھتی گئی، اتنی ہی موصوف کی قدر میرے دل میں بڑھتی گئی، میں نے ذاتی تعلقات میں انھیں شفیق بھائی پایا، تو ندوۃ العلماء کے کاموں میں اُن کی رائیں رضائے الٰہی کی طلب پر مبنی پائیں، اگر اختلاف رائے کی کبھی نوبت آئی تو میں نے انھیں ایک شریف اور کریم انسان پایا، اور جلد وہ اختلاف رائے اشتراک عمل میں تبدیل ہو گیا،

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی

مرحوم مشرقی اور اسلامی لٹریچر کے ایک مقبول ترین اور تسلیم شدہ عالم تھے، اور اس کے لئے انھوں نے عظیم ترین خدمات سرانجام دی تھیں، جدوجہد آزادی کے دوران میں قوم پرستانہ نظریات اور خیالات کے دل و جان سے حامی تھے،

مفتی عتیق الرحمان ندوۃ المصنفین دہلی،

.... آہ! کسے خبر تھی کہ عالم اسلام کا یہ گوہر شب چراغ اس قدر جلد ہم سے جدا ہو جائے گا ......"

علمائے میرٹھ کی تعزیت:

"آج کے پرآشوب دور میں اسلامی تاریخ، اسلامی علوم و فنون اور آثار اسلامی کو فلسفہ جدیدہ کی روشنی میں جس حسن و خوبی کے ساتھ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے مرتب کیا، اور تاریخ اسلامیہ کے بہت سے اہم پہلو فلسفۂ تاریخ کی روشنی میں مدون کئے، بالخصوص سیرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی تالیف و تصنیف، یہ آپ کی زندگی کی زندہ جاوید یادگار اور صفحۂ زمین کے بسنے والے انسانوں کے لئے ہدایت و تعلیم کا ایک سرچشمہ ہے، اور امت مسلمہ بجا طور پر اس مورخ اسلام کے علمی کارناموں پر ہمیشہ فخر کرے گی،

اخبارات میں ماتم

جنگ کراچی، مورخہ ۲۶ر نومبر ۱۹۵۳ء

"برصغیر بھارت و پاکستان کے عظیم ترین عالم محقق، مورخ، ادیب اور مفکر حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کی وفات ایک پورے عہد کی موت اور ایک پورے دور کا اختتام ہے، یہ عہد مسلمانوں کی علمی تحقیقی خدمات کا دور تھا، جس نے اس برصغیر میں اسلامی نشو و ارتقا اور نئی تفکر و تجسس کی نئی اساسیں استوار کیں، اور برصغیر میں حضارت اسلامیہ کی بنیادیں رکھیں،

بصیرت لاہور مورخہ ۲۷ر نومبر ۵۳ء:-

عہد حاضرہ کے فرزندان اسلام جن ممتاز اور نامور ہستیوں اور رہبروں پر بجا طور پر ناز کر سکتے ہیں ان میں سے ایک حضرت علامہ سید سلیمان ندوی ہیں......"

نوائے وقت لاہور، ۳۰ر نومبر ۵۳ء:

اسلامی علوم و فنون کی تحقیق و تصنیف کا جو پودا حضرت مولانا شبلی نعمانی نے لگایا تھا اس کی آبیاری میں سید سلیمان ندوی نے جس کاوش اور جانفشانی سے حصہ لیا، اہل علم و فضل ہمیشہ اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے رہیں گے، شاید ہی کوئی مسلمان گھرانا ہو گا جس میں سیرت نبوی، سیرت عائشہ، رحمت عالم

وغیرہ موجود نہ ہوں، یہ بلند پایہ تصنیفات اُن کے لئے لازوال خراجِ تحسین کی حیثیت رکھتی ہیں،......"

ڈان (اداریہ) کراچی :-

......وہ نہ ایک ممتاز مصنف اور مشہور اہلِ علم تھے، بلکہ اُن کی ایک یادگار دارالمصنفین کے بانی کی حیثیت سے ایک مدت مدید تک رہیگی، یہ وہی ادارہ ہے جہاں سے علم کی شعاعیں برابر پھیلتی رہی ہیں، جو علوم کا خزانہ اور صبر آزما علمی تحقیق و تدقیق کا بڑا مرکز رہا ہے، اور جس نے ایک عہد کے علمی ضمیر کو بنانے اور ترقی دینے میں گہرا اثر ڈالا ہے،

......علامہ موصوف کی زندگی کا مشن قرآن و سنت کی تعلیم کو خاطر خواہ طریقہ پر پیش کرنا تھا،......ہر شخص اُن کو محبت کی نظروں سے دیکھتا تھا، اس لئے اُن کی رحلت سے ہر شخص کو ذاتی نقصان پہنچا ہے،

ڈان (میگزین سکشن) کراچی،

"......اُن کی موت سے ایک ایسی دل آویز شخصیت، ایک ایسا متبحر اہلِ علم، ایک ایسا زبردست اہلِ قلم، ایک ایسا غیر جانب دار مورخ اور ایک ایسا عالم باعمل ہم میں سے اُٹھ گیا، جو صدیوں کے بعد پیدا ہوا کرتا ہے،

حمایت اسلام لاہور، ۱۱ر دسمبر ۵۳ء

......اُن کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ نہ صرف زمانہ حاضر کے اسلوبِ فکر سے واقف تھے، بلکہ حکمت کی پوری تاریخ اُن کے سامنے تھی، اور وہ اس حقیقت سے پوری طرح باخبر تھے، کہ فکر و عمل کے اسلوب ہر زمانہ میں بدلتے رہتے ہیں،......انھوں نے تعلیماتِ اسلامیہ بورڈ کے صدر کی حیثیت سے پاکستان کے دستور کے متعلق ہمارا درجہ بدرجہ جو رہنمائی فرمائی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم افراط و تفریط سے بچ گئے......"

الجمعیۃ دہلی، مورخہ ۲۶ر نومبر ۱۹۵۳ء

......آپ بیک وقت ادیب بھی تھے، اور شاعر بھی، مورخ بھی تھے، اور سوانح نگار بھی، فلسفی بھی تھے اور متکلم، مفسر بھی تھے، اور فقیہ بھی، سیرۃ النبی اور دوسری بلند پایہ تصانیف سے جو شہرت

اور مقبولیت آپنے حاصل کی، وہ بہت کم لوگوں کو ملا کرتی ہے، ....افسوس ہے کہ آج ہم سے وہ ہستی جدا ہو گئی، جو پروفیسر مارگولیتھ کی تاریخ کا جواب دیا کرتی تھی، اور جس کی تحقیقات کا لوہا انسائیکلوپیڈیا آف اسلام اور انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا کے مصنفین کو بھی ماننا پڑا، ....افسوس آج ہم سے ایک ایسا عالم دین، مفسر، مورخ، ادیب اور اڈیٹر جدا ہو گیا، جو عصری رجحانات اور نفسیات کا ماہر اور عقلی ترقی کے تمام تقاضوں کا شناسا تھا؛......"

مدینہ بجنور مورخہ ۲۸ر نومبر ۵۳ء،

۲۲ر نومبر کی شام کو کراچی میں مولانا سید سلیمان ندوی اللہ کو پیارے ہو گئے، وہ آفتاب علم و حکمت گہن میں آ گیا جس کی شعاعوں نے ہندوستان اور پاکستان کی علمی مجلسوں، ادبی محفلوں، اور دینی انجمنوں کو اپنی آب و تاب سے بقعۂ نور بنا رکھا تھا......رسالہ معارف کے صفحات ایک مدت سے جس راہِ فکر اور جس روشن خیالی کی دعوت دے رہے ہیں، یہ مولانا مرحوم ہی کے فیضانِ نظر کا اثر اور ان ہی کے مافی الضمیر کا عکس ہے، معارف سے قبل رسائل میں مضامین کا انداز محققانہ نہیں ہوتا تھا، سطحی موضوعات پر ہمارے ادبا جو کچھ قلم برداشتہ لکھ دیتے تھے، اسے بہزار تشکر و امتنان زیب قرطاس کر دیا جاتا تھا، لیکن معارف نے اسلوبِ نگارش کی پرانی قدریں کچھ اس انداز سے بدلیں کہ سطحی نگارشات کی کوئی وقعت ہی باقی نہ رہی، مولانا کے اس تجدیدی کارنامے کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، اگر ہم انھیں دنیائے ادب کا ایک مصلح یا ایک مجدد کہہ دیں تو یہ خطاب اس عظیم الشان شخصیت کو زیب دیتا ہے؛......"

سیاست کانپور :

......معارف میں علامہ مرحوم کے شذرات ملک بھر میں شہرت رکھتے تھے، یہی حال اُن کے قلم سے نکلنے والی تنقیدات کا تھا، گذشتہ چند سال سے وفیات کے عنوان سے وفات پانے والے معاصرین کے حالات لکھنے لگے تھے، یہ مضامین اپنے رنگ میں بہت خوب نہایت درجہ موثر، اور مرحوم کی زندگی

کی تصویر کشی مین کامل ہوتے تھے، ...."

حق، لکھنؤ :

"........ یہ عظیم المرتبت ہستی .... اپنی نیکی، اپنے علم، اپنے اخلاق، اپنی خدا ترسی اور اپنے تقوای وطہارت کے باعث زمانہ قدیم کے ان بزرگون اور پایہ کے نمونہ کی تھی، جن کے زرین نقوش آج بھی زمانہ کی ریگ پر نظر آرہے ہین، جو بھولے بھٹکے مسافرون اور گم کردہ راہ رفیقون کو صراط مستقیم بتاتے ہین ......"

شاکر، مدراس :-

"حضرت علامہ سید سلیمان ندوی کی اچانک وفات سے علم و فضل کی ایک ایسی کرسی خالی ہوگئی، جس کا پر کرنے والا اس وقت ساری دنیاے اسلام مین کوئی نظر نہین آتا،

انقلاب بمبئی، مر دسمبر ۵۳ء

...... سید صاحب شروع سے نیک طبیعت اور شریف النفس انسان تھے، ان کی نیک فطرت ماحول پر غالب رہی، یہی وجہ ہے کہ انھون نے علم و تحقیق کی راہ مین ہمیشہ صراط مستقیم ہی کو پسند کیا، ...."

جمعیۃ العلماے اسلام پاکستان کی تعزیتی قرارداد :-

"........ استاذ الاساتذہ بطل الاسلام علامۂ اجل حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات موجودہ حال و ماحول کے لئے سانحۂ عظیم اور مملکت اسلامیہ کے لئے ناقابل تلافی نقصان ہے .... ان کی رحلت سے پورے عالم اسلام بلکہ عصر حاضر کی تمام علمی و تعلیمی و فکری و اجتہادی حلقہ جات و مجالس کی تابناکیان کم ہوگئین، .... وہ اس دور مین علوم اسلامی کی عزت و آبرو تھے، معیار علم و عمل تھے، اور دینی و ملی تحریکات و دوائر کے اعتبار سے اس منصب پر فائز تھے، جو خالی ہونے کے بعد سیاٹ و الوف سنین مین مشکل سے پر ہو سکتا ہے،

انجمن ترقی اردو پاکستان :

"........ مرحوم اردو زبان کے نامی انشا پرداز اور ادیب تھے، اپنی متعدد تصانیف اور مجلۂ معارف کے ذریعہ اردو زبان اور ادب کی جو گران قدر خدمات انجام دی ہین، وہ ناقابل فراموش ہین"

نقیب امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ :

"حضرت علامہ سید سلیمان ندوی کا حادثۂ انتقال دنیاے اسلام کے لئے عظیم ترین حادثہ ہے"

قطعات اور تاریخی مادّے

از

جناب قاضی معراج الدین صاحب دھولپوری

آہ مرد پاک باطن سیّد سلیمان ندوی جانشین مولانا شبلی علیہ الرحمہ

۵۳ ۱۹ء

باسم اللہ الرّافع الدّرجات عزّ اسمہ

۷۳ ھ ۱۳

ھُو الغفور الوھاب

۷۳ ھ ۱۳

تاریخ رحلت بلند پایہ

۵۳ ء ۱۹

آہ مرد حکیم سخن سیّد سلیمان ندوی

۷۳ ھ ۱۳

فاضلِ بلیغ

۵۳ ء ۱۹

مرد میدان تحقیق مؤرخ فلک اوج

۵۳ ء ۱۹

غریق حقائق و معارف آگاہ

۵۳ ء ۱۹

جانشین خاص، جادو کلک مولانا شبلی مرحوم،

۵۳ ء ۱۹

مغز سلوک معرفت

۵۳ ء ۱۹

اے باادب واحسرتا واحسرتا

۷۳ ھ ۱۳

بہشت منزل بے خوش اقبال باد

۵۳ ء ۱۹

آج دانا ادب متقدمین کی یادگار زندہ نہیں رہی

۷۳ ھ ۱۳

(۱) آہ آن سید سُلیمان ذی حشم — پاک صورت پاک باطن پاک دین

سن بہ ہجری رحلتش معراج گفت — رونقِ ہنگامہ خُلد برین

(۲) خیر باد کہہ گئے دنیا کو آج — تھے سلیمان سیدِ عالی نشان

عیسوی میں کہہ دلِ معراج سال — عازم خلدِ برین فخر جہان

۵۳ ء ۱۹

(۳) ازین دہرِ فانی بدار بقا رفت — چو سید سلیمان بزرگ و فہیم

بہجری بیا ورد معراج سال — مہ ملک اجلال باغِ نعیم

۷۳ ھ ۱۳

(۴) وہ سید سُلیمان وذی اقتدار — گئے آج دنیا سے سوے عدم،

سنِ عیسوی میں ہے معراج سال — بہارِ تمنائے باغِ ارم

۵۳ ء ۱۹

(۵)

فضائے جہان رانمودی الم دیدہ رنج ماتم،

بشد زین سرائے خیالی، ادب راچو مغموم کردی

منظم تاریخ ہجری، حزین قلب معراج گفتا

محب ولبتانِ جنت، محمد سلیمان ندوی

۷۳ ھ ۱۳

(۶)

تلاطم سا اٹھا جہان میں، ہوا عالم حشر برپا

ہر اک سمت چھا مین گھٹا مین صفیں بچھ گئیں رنج و غم کی

مسیحی پے سال رحلت ای معراج تاریخ لکھئے

زرافشانِ خلدِ برین ہین، محمد سُلیمان ندوی

۵۳ ء ۱۹

(۷)

قیامت نے انگڑائیاں لین بنا دل سراپا محشر

زمانے نے آنسو بہائے، ہوئی غیر حالت جہان کی

فلک نے پئے سال رحلت بہجری سُنایا یہ مصرع

مقیم بہشت دل افزا، محمد سُلیمان ندوی

۷۳ ہجری ۱۳

(۸)

بگرداب رنجِ مسلسل، گرفتار کردہ جہانے

برفتہ بدریاے رحمت، محمد سُلیمان ندوی

ملائک پئے سال رحلت مسیحی بہ معراج گفتا

سخن گوے عرفان جنت، محمد سلیمان ندوی

۵۳ عیسوی ۱۹

(۹)

مچا تہلکہ اہلِ دل میں، اٹھا شورِ محشر جہان سے
زمانہ ہوا صرفِ ماتم، بہیں ندیاں اشکِ غم کی
خبر دی بسالِ بلالی، ملائک نے معراجؔ مجکو
مکین بہشتِ حسین ہیں، محمد سلیمان ندوی

۷۳ ہجری ۱۳

(۱۰)

نو دم بہ خیلے تفکر ہمگ دو و تباریخ موزون
چو رفتہ با غوش رحمت، محمد سلیمان ندوی
سروشم بسالِ مسیحی، بگفتا اے معراج محزون
تمنائے تو بیعِ جنت، محمد سلیمان ندوی

۵۳ عیسوی ۱۹

دردمندِ غمِ دل معراج دھولپوری

۵۳ عیسوی ۱۹

قطعۂ تاریخ

از

جناب قاضی فتح محمد فاتح بی اے منشی فاضل بھکر

آہ برفت آن ندوی سلیمان — جانب جنت شادان و فرحان
خلق بمرگش زار و پریشان — چاک گریبان سینہ بریان
اہلِ کراچی افتان خیزان — سوئے جنازہ زود گریزان
جملہ مسلمان ششدر و حیران — آہ سلیمان آہ سلیمان
صورت و معنی ظاہر و پنہان — اسفا تاسف خوان و گریان
اشک پیاپے ریزان ریزان — آہ تواتر افشان افشان
اشک بہ دیدہ دجلہ دجلہ — نالہ و گریہ قلزم و عمان
درد و عنا و کرب و مصیبت — ہوش ربا شد صورتِ طوفان
درد و غم و الم افزودن — رنج بردن از حیطۂ امکان

رفت مورخ و عالم و شارح — صدرِ گرامی محفلِ عرفان
سیرت احمد مرسل گفتہ — سفتہ بہ سلک لآلی تابان
نثر مقفی نظم مرصع — فکر بہ اوجِ ثریا طیران
آہ ز مرگش گشت فسردہ — مسند ایمان منبر ایقان
تختِ فقہ را صدر نماندہ — رخت سلیمان ز ملک سلیمان
صبر و تحمل ہیچ نماندہ — قلب پریشان قالبِ بے جان
یادِ شبلی تازہ گشتہ — رفت بسویش بستہ دامان
لکھنؤ پٹنہ و اعظم گڑھ را — شہرت خاص بداد سلیمان
مرقد شہر کراچی گشتہ — اللہ اللہ سبحان سبحان
قائلِ حکمت و تحقیقش را — رازی و سینا و سعدی سحبان
نازم بندش تابان ہر سو — ماہِ درخشان انجم رخشان
باز نیاید از ما رفتہ — رفت بگوشۂ روضۂ رضوان
صبر و تحمل باید کردن — اے دلِ نالان اے دلِ نادان

فاتحہ خواند و فاتح گفتہ

اہلِ ادب، دہ گونہ سلیمان
۴۳- × ۱۹۱ × ۱۰ = ۹۱۰
۱۹۵۳ء

یادِ سید

از جناب یحییٰ اعظمی

ہوگئی پھر تازہ یادِ سید معجز رقم — آگئی تیئیس نومبر کی گذشتہ شامِ غم

ہوگیا مصروفِ ماتم، پھر جہانِ علم و فن ۔۔۔ وقفِ غم پھر ہوگئی دنیائے قرطاس و قلم

مسندِ استاذ پھر سونی نظر آنے لگی ۔۔۔ بن گئی "بزمِ معارف" پھر سراپا بزمِ غم

زمزمے حکمت کے ہیں اب وہ نہ نکتے علم کے ۔۔۔ ہوگئی ہے کس کے ماتم میں جبینِ خامہ خم

دیر سے روشن تھی جو وہ شمعِ دانش بجھ گئی ۔۔۔ ہے بجا گر ہیں سیہ پوش آج اسرار و حکم

کس کی محفل میں قلم اسکا ہوا ہے معجز طراز ۔۔۔ وہ کہ مسجودِ ملک تھا جس کا ہر نقشِ قلم

نسخۂ سیرت ابھی تک تشنۂ تکمیل ہے ۔۔۔ اب کہاں سے لائیں ہم وہ خامۂ معجز رقم

ہم نے مانا منتظر تھی قدس کی محفل، مگر ۔۔۔ اس قدر عجلت بھی کیا اے سیدِ والا شیم

کارنامے تیرے مقبولِ حریمِ قدس ہیں ۔۔۔ تیری صورت کی قسم "پاکیزہ سیرت" کی قسم

سرورِ کونین کے دربار میں ہے مستجاب ۔۔۔ زندگی بھر کی تری سعیِ گرامی لاجرم

صرف کردی مدحِ سرکارِ دو عالم میں حیات ۔۔۔ تیرے طغرائے شرف کے واسطے یہ کیا ہے کم

تیری ہی ذاتِ گرامی کے لئے مخصوص تھے ۔۔۔ طرۂ تاجِ معارف، خاتمِ مجد و کرم

تیرے فیضانِ معارف سے سبھی تھے بہرہ مند ۔۔۔ ہند سے تا خاکِ پاکستان عرب سے تا عجم

روز اٹھتے ہیں کہاں ایسے رجالِ علم و فن ۔۔۔ عصرِ نو میں یہ مبارک زندگی تھی مغتنم

غیر ممکن ہے تلافی آہ اس نقصان کی ۔۔۔ تیری ہستی تھی وطن میں نازشِ خیر الامم

سینۂ امت سے مٹ سکتا نہیں ہرگز یہ داغ ۔۔۔ کس طرح ملت بھلائے "سید الملت" کا غم

تیرے اس عزمِ سفر کی ہم کو کیوں ہوتی خبر ۔۔۔ دیر سے تھے دور تیری بزم سے اے محترم

آہ کیا معلوم تھا، اے سید و مولائے ما ۔۔۔ محفلِ امکاں سے اب اٹھنے کو ہیں تیرے قدم

ورنہ کچھ جلوے جمالِ آخریں کے جا کے ہم ۔۔۔ اپنی چشمِ تر میں کر لیتے ادب سے مرتسم

آہ یہ تنہا نہیں اک ملت و امت کا غم

بلکہ ہے سارے جہانِ دانش و حکمت کا غم

صد آہ

از

جناب حکیم سید مصلح الدین صاحب کاظمی

آہ اے سید و علامہ سلیمان صد آہ ۔۔۔ آہ اے باعثِ صد نازشِ دوراں صد آہ

آہ اے پرچمِ معمورۂ شبلی منزل ۔۔۔ آہ اے طرۂ آں شبلیِ ذیشاں صد آہ

آہ اے آنکہ تو غالب و حالی نازاں ۔۔۔ آہ اے صاحبِ اقبالِ درخشاں صد آہ

آہ اے رمز شناسِ ادب و روحِ سخن ۔۔۔ آہ اے واقفِ اسرارِ قلمداں صد آہ

آہ اے شاہِ سخن، فخرِ زمن، نازِ وطن ۔۔۔ آہ ممدوحِ ہمہ گبر و مسلماں صد آہ

آہ اے متبعِ سنت و متبوعِ زماں ۔۔۔ آہ اے پیکرِ اوصافِ رسولاں صد آہ

آہ اے مجتنبِ جملہ نواہی ز شباب ۔۔۔ آہ تا شیبِ جہاں تابعِ قرآں صد آہ

عالمِ عظمتِ سرکارِ دو عالم بکمال ۔۔۔ کاتبِ سیرتِ لولاک بدیں ساں صد آہ

صدقِ بوبکرؓ، نظامِ عمرؓ، حبِ علیؓ ۔۔۔ بود روشن ز تو با غیرتِ عثمانؓ صد آہ

انجمان پرتوِ خود گرچہ فرو می ریزند ۔۔۔ بود نورِ تو دگر، اے مہِ تاباں صد آہ

آمدی دشتِ سخن گشت گلستانِ بہار ۔۔۔ رفتہ، شد ہمہ گلزار بیاباں صد آہ

گلشنِ علم و ادب آہ نمودی ویراں ۔۔۔ کردی آباد مگر شہرِ خموشاں صد آہ

ہاتفم گفت بتاریخِ وفاتش ثاقب ۔۔۔ "رونقِ باغِ ادب آہ سلیمان صد آہ"
۱۳۷۳ھ

عیسوی ہم بہمیں لہجۂ غم ظاہر کرد

"جودِ استادِ زماں رفت" زیاراں صد آہ

۱۹۵۳ء

قطعۂ تاریخ

از

جناب سید شاہ محمد منظور الرحمن اختر کاکوی

پھول پژمردہ ہیں اور کلیاں اداس ۔۔۔ روح فرسا کیا خبر لائی صبا

مرثیہ خوان کیوں ہیں مرغانِ چمن ۔۔۔ رنگ پھیکا ہو گیا کیوں باغ کا

رہبرِ قوم و امامِ اہلِ دین ۔۔۔ مخزنِ صد علم و زہد و اتقا

فخرِ اشرف، نازِ شبلی حیف حیف ۔۔۔ ہائے وہ سیرت نگارِ مصطفیٰ

گلستانِ علم کو تھا جس پہ ناز ۔۔۔ وہ گلِ سرسبد ہی مرجھا گیا

وہ سلیمان باعثِ فخرِ بہار ۔۔۔ سوگ میں ہے جس کے سارا انڈیا

ہند ہی کیا عالمِ اسلامیان ۔۔۔ وقفِ نالہ وقفِ غم وقفِ بکا

اہلِ ندوہ غم کی اک تصویر ہیں ۔۔۔ دارِ شبلی میں ہے اک محشر بپا

روح یہ کس کی چلی سوئے فلک ۔۔۔ جس سے روشن ہو گئے ارض و سما

عالمِ بالا سے آئی ہے صدا ۔۔۔ مرحبا اہلاً و سہلاً مرحبا

می شود بارانِ رحمت را نزول ۔۔۔ بر مزارش روز و شب صبح و مسا

سالِ رحلت اس سے جب پوچھا گیا

بولا اختر "فخرِ ملت ہائے وا"

۱۳۷۳ھ

آہ سید سلیمان ندوی

از جناب فانی مراد آبادی

آج اک مہرِ درخشاں تیرگی میں کھو گیا ۔۔۔ وسعتِ آغوشِ ظلمت میں سویرا ہو گیا

تلملا کر مسکراہٹ رہ گئی غنچوں کی آج ۔۔۔ ہو گئی تبدیل اشکوں میں ہنسی پھولوں کی آج

لٹ گیا تاریخِ حاضر کا موادِ بے شمار ۔۔۔ بجھ گئی شمعِ کمالی، چھن گیا جوشِ بہار

اُف کہ ماہِ بزمِ ندوہ پر گہن طاری ہے آج ۔۔۔ دودِ اسود، ابرِ تیرہ، نور پر بھاری ہے آج

ایک اعظم گڑھ ہی کیا عالم ہوا ماتم کناں ۔۔۔ جسم کیا دل بھی ہیں ملبوسِ لباسِ غم کناں

سیرتِ شاہِ دو عالم کا مصنف مر گیا ۔۔۔ گوہرِ نایاب سے پہلوئے زمیں کا بھر گیا

مر گیا سید سلیمان؟ کون کہتا ہے ندیم ۔۔۔ سو گیا وہ گور میں کس نے کہا تجھ سے ندیم

اُس کی تصنیفاتِ لافانی تو زندہ ہیں ابھی ۔۔۔ اُس نے جو سینچے تھے وہ پودے شگفتہ ہیں ابھی

موت اُس کی اصل میں اک وہی تمہید ہے ۔۔۔ ورنہ ہر سعیِ سلیمان زندۂ جاوید ہے

آنے والے ہر مورخ کے لئے زندہ ہے وہ ۔۔۔ جادۂ تاریک میں نجمِ درخشندہ ہے وہ

اس کی تصنیفات دیں گی تقویت اسلام کو

ڈال دیں گی گردشوں میں گردشِ ایام کو

تاریخ وفات حضرت علامہ سید سلیمان ندوی

از

جناب مشتاق راندیری

(۱)

سینہ کوبی میں ہر اک ہے مبتلا

ہے جہاں غمگین و دل اُدگا آج

خلد کا پروانہ سید کو ملا

داخلِ جنت ہوا دیندار آج

۱۳۷۳ھ

(۲)

سید عالی و سلیمان جاہ

وہ مورخ وہ فخرِ شبلیِ نعیم

اُن کو جنت خدا نصیب کرے

جن کی خو تھی تواضع و تکریم

۱۹۵۳ء

(۳)

موتِ عالم کی موت عالم ہے
مضطرب ہو رہے ہیں اہلِ دل
بے شبہ سید سلیمان تھے
زبدۂ خلق زینتِ محفل

۱۳۷۳ھ

(۴)

سید با خدا کے مرنے پر
موت کو موت بھی نہیں آئی
باغ نسرین پائیں خلد میں وہ
جن کے غم میں ہے خلق بلائی

۱۳۷۳ھ

قطعۂ تاریخ و تاریخی مادے

راقم تردامن سید مہدی حسن

۱۳۷۳ھ

جادو رقم ۔ سیفِ قلم ، علامہ ۔ استاد الکل

۱۳۷۳ھ

علوم اسلام کے جوئے شیر کے فرہاد
سید محمد سلیمان بدر الاسلام
۱۹۵۳ء

غفرہ المجید

۱۳۷۳ھ

ہر طرح سے وہ کامیاب ہوئے — اُس کی رحمت سے فیضیاب ہوئے
اپنی خدمات کا صلہ پایا — داخل خلد بے حساب ہوئے

۱۳۷۳ھ

در سنِ رحلتش چو شد مامور
ہاتفے گفت زاہدِ مغفور

۱۳۷۳ھ

ہجری و عیسوی تاریخی مادے

از

جناب نسیم دہلوی

برائے ۱۳۷۳ھ

۱۔ آہ مولانا سید محمد سلیمان صاحب ندوی، انا للہ وانا الیہ راجعون
۲۔ آہ علامہ سید محمد سلیمان ندوی علیہ الرحمۃ۔
۳۔ آہ سید محمد سلیمان صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ
۴۔ بلند قدر زیبائے جہان مولانا سید محمد سلیمان ندوی مرحوم
۵۔ ہادی دین سید محمد سلیمان ندوی رحلت کرد،
۶۔ ارتحال علامہ جہان سید محمد سلیمان صاحب ندوی
۷۔ یقولون انہ من سلیمٰن وانہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم،
۸۔ آہ مقبول دوران عالیجناب مولانا سید محمد سلیمان صاحب ندوی چل بسے،

برائے ۱۹۵۳ء

۱۔ آہ ہادی مخدوم مولانا سید محمد سلیمان صاحب ندوی انا للہ وانا الیہ راجعون،
۲۔ ادیب، مولانا سید محمد سلیمان ندوی غفرلہ اللہ،
۳۔ امیر علم و دین و ادب مولانا سید محمد سلیمان صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ
۴۔ موحد ادیب مولانا سید محمد سلیمان صاحب ندوی رضوان میں ہیں،
۵۔ صاحب اقبال و علم و فضل مولانا سید محمد سلیمان صاحب ندوی
۶۔ آہ واحد مورخ اسلام مولانا سید محمد سلیمان صاحب ندوی مرحوم
۷۔ ادیب مولانا سید محمد سلیمان صاحب کراچی پاکستان میں فوت ہوئے
۸۔ حضرت ادیب سید محمد سلیمان صاحب ندوی

قطعۂ تاریخ

از

جناب عطاء الرحمٰن بالوی

کرے کیا کہ انسان مجبور ہے — خدائی میں حکمِ قضا ہے اٹل
یہ سید سلیمان ندوی کی موت — ہے ماتم کی جا اور غم کا محل

یہ ان کی نہیں علم و فن کی ہے موت — نہ آنکھوں سے کیوں آئیں آنسو نکل

وہ علامۂ دہر شیریں مقال — مکمل صفات و مجسم عمل

عطا کو ہوئی فکر تاریخ کی — تو یہ مادہ خود ہی آیا نکل

نہ کچھ تعمیہ اور نہ کچھ تخرجہ

رغم عالم بے بدل با عمل

سنہ ۱۳۷۳ھ

قطعۂ تاریخ ارتحال

از

جناب اصطفا خان صاحب لکھنوی

اہل برتبت سید سلیمان ندوی

بفردوس سید سلیمان ندوی — ز دار فنا رفت شادان و فرحان

سبک گام چون بود بر جادۂ دین — گران بود منزل چہ سان گشت آسان

نماز عشا کرد و از اشارہ — بہ چیک اجل گفت لبیک شادان

بگفت اصطفا سال رحلت بہجری

ولا شیخ الاسلام سید سلیمان

سنہ ۱۳۷۳ھ

———— • ————